جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

نام کتاب ________ مطالب الفرقان (جلد سوم)

مصنّف ________ غلام احمد پرویزؒ

پبلشرز ________ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔

پرنٹر ________ خالد منصور نسیم

پریس ________ النور پرنٹرز و پبلشرز

۲/۳ فیصل نگر ملتان روڈ۔ لاہور

ایڈیشن ________ اوّل (نومبر ۱۹۷۹ء)

دوم (نومبر ۱۹۸۸ء)

سوم (مارچ ۱۹۹۳ء)

ضخامت ________ ۱۶ + ۵۳۲ = ۵۴۸ صفحات

باسمہٖ تعالیٰ

آئینہ مطالب

جلد سوم

مضمون	صفحہ
فہرست	د
حرفِ آغاز	س
پہلا باب۔ الدّین کے بنیادی اصول	۲
آیات ۲/۱۱۳ تا ۲/۱۲۳	۳
۲/۱۱۳ وقالت الیھود ...... یختلفون	
الدّین شروع سے ایک ہی چلا آتا تھا۔	۴
رسول کے بعد اس میں آمیزش ہو جاتی۔	۵
اور مذہبی فرقے پیدا ہو جاتے۔	۶
اسلام میں اس کا امکان نہیں تھا	۶
لیکن اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔	۶
ختمِ نبوت	۶
اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔	
اس کا صحیح مفہوم	۸
کتاب اللہ کی حکمرانی۔ حکومتِ خداوندی	۹
۲/۱۱۴ ومن اظلم ..... خرابھا	
مساجد کا صحیح مفہوم۔ اطاعتِ خداوندی کا نظام	۱۰
دعا کا ضمنی مفہوم۔ رہبانیت کے خلاف	۱۱-۱۲
ذرائع اور مقصد میں فرق	
ذکر کا مفہوم	۱۳
اسم اللہ کا مفہوم۔ صفاتِ خداوندی کی جلوہ باریاں	۱۴
۲/۱۱۴ اولٓئک ..... عظیم	

مضمون	صفحہ
ہماری مساجد کی حالت	۱۶
۲/۱۱۵ وللہ المشرق ..... علیم	
خدا زمان و مکان کی نسبتوں سے بلند ہے	۱۷
۲/۱۱۶ وقالوا ...... قانتون	
عیسائیوں کا ابن اللہ کا عقیدہ	۱۸
۲/۱۱۷-۱۱۸ بدیع السمٰوٰت .... یوقنون	
کلام اللہ وحی کو کہتے ہیں جس کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہوگیا۔	۱۹
حضرت موسیٰؑ سے کلام کرنے کا مفہوم	۲۰
خدا کے لئے الفاظ کا مجازی مفہوم	۲۱
حضرت موسیٰؑ کی، خدا کو بے حجاب دیکھنے کی درخواست	۲۲
خدا کے انسانوں کے ساتھ کلام کرنے کے تین طریقے	۲۲
معجزات طلبی	۲۳
کرامات کا عقیدہ	۲۵
۲/۱۱۹ انا ارسلنٰک .... اصحاب الجحیم	
رسول کا فریضہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا تھا۔	۲۶
اس راستے پر زبردستی چلانا نہیں تھا۔	۲۷
۲/۱۲۰ ولن ترضیٰ ..... نصیر	
اہل کتاب حضورؐ پر بہت کم ایمان لاتے۔	۲۸
صرف اسلام ہی سچا دین کیوں ہے؟	۲۸
ملت کا مفہوم	۲۹
مومنین اور اہل کتاب	۳۱
۲/۱۲۱ الذین ..... خسرون۔	
تلاوت کے معنے قرآن مجید کا اتباع کرنا ہیں۔	۳۲
۲/۱۲۲-۱۲۳ یٰبنی اسرائیل .... ینصرون۔	
بنی اسرائیل اور قانونِ مکافاتِ عمل۔	۳۳

دوسرا باب — معمارِ حرم

آیات ۲/۱۲۴ تا ۲/۱۴۱

مضمون	صفحہ
۲/۱۲۴ واذ ابتلیٰ ..... فاتمھن۔	
تمام رسولوں پر ایمان ضروری ہے۔	۳۶
تفریق بین الرسل جائز نہیں۔	۳۶
حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز	۳۷
ابتلائے ابراہیمیؑ	۴۰
۲/۱۲۴ قال انی جاعلک للناس اماما .... ظلمین۔	
نوعِ انسانی کی امامت	۴۱
امام کے معانی	۴۱
تفسیر ابن کثیر کی رُو سے ان ..... احکامات کی تفصیل	۴۲
نسلی امتیاز کا باطل نظریہ	۴۳
وراثت کا باطل نظریہ	۴۴
نظام کن بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے	۴۴
کعبہ۔ مرکز نظامِ خداوندی	۴۴

مضمون	صفحہ
ہجرت کا مفہوم اور اہمیت	۴۵
حضرت اسماعیلؑ کی وادئ حجاز کی طرف نقل مکانی	۵۳
تورات کا افسانہ	۵۳
بخاری کی روایت	۵۴
۲/۱۲۵ واذجعلنا ...... السجود۔	۵۵
کعبہ مرکز اجتماع امت ہے۔	۵۵
حج۔ عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع	۵۶
طواف کا مفہوم	۵۷
عاکفین کا مفہوم	۵۸
بیتی۔ خدا کا گھر ہونے کا مطلب	۵۸
مذہب میں کعبہ کی حیثیت	۶۰
رسمی اعمال کا رائیگاں جانا	۶۰
۲/۱۲۶ واذقال ابراھیم .... بئس المصیر۔	۶۰
رزق کے لئے دعائیں	۶۱
رزق کے دروازے، مومن وکافر سب کے لئے کھلے ہیں۔	۶۳
۲/۱۲۷-۱۲۸ واذیرفع ...... الرحیم	۶۴
وادئ حجاز کو مرکز بیت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا تھا۔	۶۵
۲/۱۲۹ ربنا .... الحکیم۔	۶۵
انسانی ذات کو در خور اعتنا نہ سمجھنے والے۔	۶۵
۲/۱۳۰ ومن یرغب .... صالحین	۶۵

مضمون	صفحہ
اسلاف کے اعمال اگلی نسل کے کام نہیں آتے	۶۸
۲/۱۳۱-۱۳۲ اذ قال له ..... مسلمون	۶۸
اسلام عمر بھر کا مسلسل پروگرام ہے	۶۸
قوموں کے عروج وزوال کا ابدی اصول	۶۹
۲/۱۳۳-۱۳۴ امر کنتم ..... یعملون	۶۹
اسلاف کی بابت مت بحثوں میں پڑو	۶۹
قرآن کریم نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا	۷۰
دین، اللہ کا عطا کردہ ہوتا ہے	۷۰
اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہئے	۷۱
مذہب کی نسبت اسکے بانی کی طرف ہوتی ہے	۷۱
۲/۱۳۵ وقالوا ...... مشرکین۔	۷۱
حنیف کا مفہوم	״
ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے	۷۲
۲/۱۳۶-۱۳۷ قولوا آمنا ..... علیم۔	
اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ	۷۳
جس طرح تم ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں۔	۷۳
۲/۱۳۸ صبغة الله .... عابدون	۷۴
صبغة اللہ کا مفہوم	۷۴
عیسائیوں کا بپتسمہ یا اصطباغ	۷۵
۲/۱۳۹ قل اتحاجوننا ..... مخلصون	۷۶
دین کی صداقت کا استنتاجی طریق	۷۶

مضمون	صفحہ
۲/۱۴۰-۱۴۱ ام تقولون ..... یعملون.	
ماضی پرستی کی تباہ کاریاں	۷۸
(پہلا پارہ ختم)	
تیسرا باب —— مرکزِ ملت۔ کعبہ	۸۰
آیات ۲/۱۴۲ تا ۲/۱۵۲	
کعبہ کی مرکزیت	۸۰
قریشِ مکہ اور یہودیوں کی مخالفت	۸۰
۲/۱۴۲ سیقول ...... مستقیم.	۸۲
تحویلِ قبلہ کی روایات	۸۳
معراج سے متعلق روایات	۸۴
نمازیں کیسے فرض ہوئیں	۸۶
ایسی تفسیریں کس طرح لکھی گئیں اور قرآنِ کریم کے	۸۸
اس قسم کے ترجمے کس طرح ہو گئے	
وحی کی دو قسمیں!	"
کعبہ، امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے	۸۹
۲/۱۴۳ وکذٰلک ..... رحیم.	
امتِ مسلمہ کی تشکیل اور اس کا فریضہ	۹۰-۹۲
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	"
ولتکن منکم امۃ .... کا غلط مفہوم	۹۳
جماعتِ مومنین کی اہمیت	۹۴

مضمون	صفحہ
اس امت کا موسس (حضرت ابراہیمؑ)	۹۴
تعینِ قبلہ کا مقصد	۹۵
۲/۱۴۴-۱۴۶ قد نرٰی ..... یعلمون.	
تربیتی مرکز	۹۷
اب منقولات کے بجائے استدلالی دور آچکا ہے	۹۹
۲/۱۴۷-۱۴۸ الحق .... قدیر.	
محسوس علامات کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا	۱۰۱
۲/۱۴۹-۱۵۱ ومن حیث .... تعلمون.	
کعبہ، مرکزِ قلب ونظر	۱۰۳
۲/۱۵۲ فاذکرونی ..... تکفرون	
ذکر کے معنی شرف وعظمت۔ عمرہ	۱۰۴
تقدیر۔ آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہے۔	۱۰۵
حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق	۱۰۵
چوتھا باب —— رزمگاہِ حیات	۱۰۷
آیات ۲/۱۵۳ تا ۲/۱۷۶	
استعانت بالصبر والصلوٰۃ	۱۰۹
۲/۱۵۳ یاایھا الذین .... صابرین.	
مقتولین فی سبیل اللہ	۱۱۰
(شہداء)	
۲/۱۵۴ ولا تقولوا ..... تشعرون.	

مضمون	صفحہ
شہداء جنگِ پاکستان کے متعلق افسانے	۱۱۱
۲/۱۵۵ ولنبلونکم ..... صابرین۔	
ابتلاء کا مفہوم	۱۱۲
۲/۱۵۶ الذین اذا ..... راجعون	
انا للہ وانا الیہ راجعون کا صحیح مفہوم	۱۱۲
۲/۱۵۷ اولئک ..... مھتدون	
درود کا مفہوم	۱۱۳
قرآنی اصطلاحات	۱۱۴
اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت	۱۱۴
صلّی علیہ کے معنی	۱۱۵
۲/۱۵۸ ان الصّفا .... علیم	
حج اور عمرہ کا مفہوم	۱۲۰
جُناح کا مفہوم	۱۲۰
صفا اور مروہ	۱۲۱
شعائر اللہ کا مفہوم۔ شعائر بھی ضروری ہیں۔	۱۲۲
۲/۱۵۹ ان الّذین ..... لاعنون	
قرآن بالکل واضح کتاب ہے۔	۱۲۴
قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق	۱۲۵
فقہ	۱۲۵
قرآن کے باطنی معانی	۱۲۶
لعنت ہر طرف سے	۱۲۶

مضمون	صفحہ
۲/۱۶۰-۱۶۲ الا الذین ..... ینظرون۔	
توبہ کا دروازہ کھُلا رہتا ہے۔ لیکن کس کے لئے؟	۱۲۷
اور کس کے لئے بند ہو جاتا ہے؟	۱۲۷
ہماری حالت	۱۲۸
۲/۱۶۳ والٰھکم .... الرحیم	
جملہ کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے	۱۲۹
۲/۱۶۴ اِنّ ..... یعقلون۔	
اس کی شہادت خود کارگہِ کائنات ہے	۱۲۹
۲/۱۶۵ ومن النّاس .... العذاب	
محبت (عشق) خدا کے ساتھ؟	۱۳۰
عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی!	۱۳۰
وصال اور عرس!	۱۳۰
حب اللہ کا قرآنی مفہوم	۱۳۱
۲/۱۶۶-۱۶۷ اذ تبرّا الذین .... النّار	
تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔	۱۳۳
دنیا میں لوٹ کر نہیں آیا جا سکتا	۱۳۴
۲/۱۶۸-۱۶۹ یایھا النّاس .... تعلمون	
حلال اور طیب رزق	۱۳۵
فحشاء کے معنی	۱۳۶
سیّئات کے معنے	۱۳۷
حسنات کے معنی	۱۳۷
۲/۱۷۰ واذا ..... یھتدون	

مضمون	صفحہ
مسلکِ تقلید	۱۳۸
وثن کے معنی	۱۳۸
وہائٹ ہیڈ کی وضاحت	۱۳۹
[۲/۱۷۱] ومثل الذین .... یعقلون	
حیوانی روش	۱۴۰
[۲/۱۷۲] یاایھا الذین ..... تعبدون	
حرام اور حلال کا نظریہ	۱۴۰
[۲/۱۷۳] انما حرم ..... رحیم	
حرام چیزوں کی فہرست	۱۴۳
غیر اللہ کی طرف منسوب	۱۴۴
اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا	۱۴۵
خنزیر کے گوشت سے متعلق بحث	۱۴۶
[۲/۱۷۴] ان الذین .... الیم	
حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں	۱۴۸
[۲/۱۷۵-۱۷۶] اولئک ...... بعید	
مذہبی پیشواؤں کا کاروبار	۱۴۹
پانچواں باب — بیّنات اور کتاب	
آیات ۲/۱۷۷ تا ۲/۱۸۸	
دلائل ۔ قوانین اور شمشیر ۔ تشکیلِ نظامِ خداوندی کی تین کڑیاں	۱۵۳

مضمون	صفحہ
[۲/۱۷۷] لیس البر..... المتقون	
برّ کی راہ کونسی ہے؟	۱۵۴
ذرائع اور مقصد کا باہمی تعلق	۱۵۴
پانچ اجزائے ایمان	۱۵۵
قبلہ کی طرف رُخ کر لینا مقصود بالذات نہیں	۱۵۵
اعمالِ صالح کی تفصیل	۱۵۵
ان اجزاء کی تشریح	۱۵۷
ذوی القربیٰ ۔ یتامیٰ ۔ مساکین ۔ ابن السبیل ۔	۱۵۷
سائلین، فی الرقاب، العقبۃ ۔ دین کی گھاٹی کیا ہے	۱۵۸-۱۵۹
ذلت کے اسباب	۱۶۱
یتامیٰ کی عزتمند کرنا	۱۶۱
نظامِ ربوبیت کی خصوصیات	۱۶۱
غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کی امداد	۱۶۱
جمہوریت کا بنیادی نقص	۱۶۱
نظامِ خداوندی کی عملی شکل	۱۶۲
زکوٰۃ کی مزید تشریح	//
رزق کے لئے انتظامات	۱۶۳
ایفائے عہد کا مفہوم	۱۶۳
نظریۂ میثاق	۱۶۴
امانات کا مفہوم	۱۶۴
میثاقِ خداوندی کی عملی شکل	۱۶۵
حقوق و فرائض	۱۶۵

مضمون	صفحہ
میدانِ جنگ میں، مادی اسباب کی اہمیت	۱۶۸
انسانی جان کی قدر و قیمت	۱۶۸
تشریع کا مفہوم دین میں	۱۶۸
۲/۱۷۸-۱۷۹ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ .... تَتَّقُونَ	
قصاص کا حکم	۱۷۹
کُتِبَ کے معنی	۱۷۹
جرم و سزا کا فلسفہ	۱۷۱
۲/۱۸۰ كُتِبَ عَلَيْكُمْ .... مُتَّقِينَ	
مال کی اہمیت	۱۷۶
وصیت کا حکم	۱۷۷
۲/۱۸۱-۱۸۲ فَمَنْ .... رَحِيمٌ	
موجودہ قانونِ شریعت اس کے خلاف ہے	۱۷۹
حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟	۱۷۹
ایسا عقیدہ ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف گستاخی ہے	۱۸۰
روزمرہ واقعات	۱۸۱
ائمہ کا فیصلہ	〃
وصیت کے متعلق ایسا قانون بن ہی نہیں سکتا جو کتاب و سنت کے مطابق ہو۔	۱۸۲
حق تلفی	۱۸۲
۲/۱۸۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ .... تَتَّقُونَ	۱۸۲
حکم اور قانون میں فرق	۱۸۲
صوم (روزوں) کے احکام	۱۸۴
کتاب و حکمت۔ قانون اور اس کی غایت کا باہمی تعلق	۱۸۶
ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟	۱۸۶
روزوں کے احکام کی تفصیل	۱۸۷
۲/۱۸۴ أَيَّامًا .... تَعْلَمُونَ	
الذین یطیقونہ کی قدامت پرستانہ تفسیر	۱۸۸
نزولِ قرآن۔ کائناتِ انسانیہ کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	۱۹۰
غیر مسلموں کی شہادت	۱۹۱
واقعہ نزولِ قرآن پر جشنِ مسرت منانو	۱۹۲
۲/۱۸۵-۱۸۸ شَهْرُ .... تَعْلَمُونَ	
روزوں کے مزید احکام	۱۹۳
اعتکاف کا مفہوم	۱۹۴
لیلۃ القدر	۱۹۵
شب برات کا تہوار	۱۹۵
روزوں کی غایت ـ ان سے مقصد	۱۹۷
خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم۔ نظامِ خداوندی کا غلبہ	۱۹۷
اللہ اکبر کا مفہوم	۲۰۱
حزب اللہ کا غلبہ	۲۰۱
جانور ذبح کرتے وقت تکبیر کا مقصد	۲۰۲
مالِ حرام سے اجتناب	۲۰۳
رشوت کی ممانعت	۲۰۳
دعا کا تفصیلی بیان	۲۰۴

مضمون	صفحہ
اس کے غلط مفہوم سے پیدا ہونے والے شکوک اور اعتراضات	۲۰۴
السلطان ظل اللہ علی الارض کا عقیدہ	۲۰۷
دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں۔	۲۰۸
حضرات انبیاء کرامؑ کی دعائیں	۲۱۱
مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں	۲۱۳
مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں۔	۲۱۵
دعا سے ہوتا کیا ہے؟ نفسیاتی تبدیلی۔	۲۱۷
ایک دوسرے کے لئے دعائیں۔	۲۲۱
معراجِ نبویؐ کا مفہوم	۲۲۲
مقربینِ بارگاہِ خداوندی	۲۲۳
قرآن سے جواب ملتا ہے	۲۲۴
مرشد صرف خدا ہے۔	۲۲۵
کفارہ کے روزے	۲۲۶
چھٹا باب — آل ورلڈ مسلم کانفرنس	
حج کا اجتماع	
آیات ۲/۱۸۹ تا ۲/۲۱۸	
حج اور عمرہ کے اجتماعات عہد جاہلیہ میں	۲۲۸
شهر الحرام	//
۲/۱۸۹ یسئلونك .... تفلحون	

مضمون	صفحہ
قمری اور شمسی کیلنڈر	۲۳۰
نسئ کا عملی مفہوم	۲۳۱
سال کے بارہ مہینے لیکن کیلنڈر قمری	۲۳۲
اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں	۲۳۳
اسلام توہم پرستی کو مٹانے کے لئے آیا تھا	۲۳۴
مذہب میں دین کے ارکان توہم پرستی بن جاتے ہیں	۲۳۴
حج کے اجتماع پر غیر مسلموں کو دعوتِ مشاہدہ	۲۳۵
آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵ کی تشریح — صفحہ ۲۶۶ - ۲۸۱ پر دیکھئے	
۲/۱۹۶ واتموا الحج .... شدید العقاب	۲۳۸
حج کے مزید احکام	
۲/۱۹۷ الحج .... الباب	
عقل کی اہمیت	۲۳۹
۲/۱۹۸ لیس .... الضالین	
احرام	//
۲/۱۹۹ ثم افیضوا .... رحیم	
قربانی، نسك، نحر	۲۴۴
سنتِ ابراہیمیؑ (ذبح عظیم)	۲۵۰
حجرِ اسود	۲۵۲
رمی الجمار، تین شیطانوں کو پتھر مارنا	۲۵۲
اصحاب الفیل (ہاتھیوں والے کا لشکر)	۲۵۳
۲/۲۰۰-۲۰۴ فاذا .... الد الخصام	

مضمون	صفحہ
دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں	۲۵۵
دنیا کے مقابلے میں آخرت کا مفہوم	״
مذہب میں اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں	۲۵۵
نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے مدعی	۲۵۵
سیکولرازم مذہب کے نقاب میں۔	۲۵۶
۲/۲۰۵-۲۰۶ واذا تولیٰ..... المھاد	
مستبد حکمران	۲۵۷
تکذیب دین کرنے والے	״
اثم و عدوان	۲۵۸
یہ تباہی ساری قوم کی ہوتی ہے	۲۵۸
۲/۲۰۷ ومن الناس ..... العباد	
مرضات اللہ کا مفہوم	۲۵۹
خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا تصور	۲۵۹
رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ	۲۶۰
قتال کے مقاصد اور ہدایات	۲۶۴
آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵	
۲/۱۹۰-۱۹۳ وقاتلوا..... الظلمین۔	
"اسلام بالتلوار" کا گمراہ کن پراپیگنڈہ	۲۶۶
جنگ کے متعلق تفصیلی بحث	
اسلام کی وحشت انگیز تصویر	۲۶۶
مودودی مرحوم کی تفسیر	۲۶۷

مضمون	صفحہ
مرتد کی سزا۔ قتل	۲۷۰
فی سبیل اللہ کا مفہوم	۲۷۴
طاغوت سے مراد	۲۷۴
فتنہ سے مراد	۲۷۵
۲/۱۹۴ الشھر الحرام..... المتقین	
مذہبی آزادی کی خاطر جنگ	۲۷۷
انسان کا اختیار سلب کر لینا بدترین استبداد ہے	
حرمات کے مہینوں کی پابندی	۲۸۱
۲/۱۹۵ وانفقوا فی..... المحسنین	
جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے	۲۸۱
———— (۰) ————	
۲/۲۰۸ یاایھا الذین..... مبین۔	
اسلام کی تشریح و توضیح	۲۸۲
اسلام کلی تغیر چاہتا ہے اور محیط کل نظام ہے	۲۸۳
کافۃ اسلام کا مطالبہ	
۲/۲۰۹ فان زللتم..... حکیم۔	
قوت اور حکمت کا امتزاج	۲۸۳
اسلامی نظام کو مسلسل قائم رکھنا ہوگا	۲۸۴
قانون استبدال و استخلاف قومی	۲۸۵
قوموں کی باز آفرینی کا امکان	۲۸۷
سیکولرازم کے تحت حکومت کا انجام	״
۲/۲۱۰-۲۱۲ ھل ینظرون..... حساب	

مضمون	صفحہ
اس کے لیئے خدا خود نہیں آیا کرتا۔ اس کا قانونِ مکافات یہ نتائج پیدا کر دیتا ہے۔	۲۸۸
۲/۲۱۳ کان الناس ...... مستقیم	
وحدت انسانیت۔ وحی کا منتہیٰ	۲۹۰
ہمارے اختلافات کس طرح مٹ سکتے ہیں؟	۲۹۲
نوع انسان کے اختلافات کی تاریخ	۲۹۳
امتِ مسلمہ کی تشکیل۔ ایک ملت۔	۲۹۵
اس کی مخالفت	۲۹۵
۲/۲۱۴ ام حسبتم ...... قریب۔	
جنت یونہی نہیں مل جائے گی	۲۹۶
جنگِ احزاب کا ہولناک نقشہ	۲۹۷
حصولِ جنت کے آسان طریقے	۲۹۸
جنت بطور "بخشش"	۳۰۱
یہ نظام قائم ہو کر رہیگا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔	۳۰۲
۲/۲۱۵-۲۱۶ یسئلونک ..... تعلمون	
انفاق کی اہمیت	۳۰۲
روزوں کی فرضیت پر اتنا زور، لیکن قتال کی فرضیت کا ذکر تک نہیں کیا جاتا	۳۰۴
میرزا غلام احمد نے جہاد کو منسوخ قرار دیدیا۔	۳۰۵
۲/۲۱۷-۲۱۸ یسئلونک .... رحیم	
ارتداد ـــ قومی و انفرادی	۳۰۷
ہجرت کا قرآنی مفہوم اور مقام	۳۰۸

مضمون	صفحہ
ساتواں باب ـــ درونِ خانہ	
آیات ۲/۲۱۹ تا ۲/۲۵۷	
۲/۲۱۹ یسئلونک ..... تتفکرون۔	
اثم و عدوان	۳۱۷
خمر کا مفہوم	۳۱۷
امتناعِ خمر کے تدریجی احکام	۳۱۷
جنت کی شراب	۳۲۱
بلا سمجھے نماز یا تلاوتِ قرآنِ مجید	۳۲۲
جُوا (میسرہ)	۳۲۲
نظامِ سرمایہ داری بھی میسرہ ہے	۳۲۳
انصاب۔ چڑھاوے	۳۲۴
ازلام۔ قرعہ اندازی، فالیں لینا، لاٹری	۳۲۴
قسمت کا حال پوچھنا	۳۲۴
عقیدۂ تقدیر	۳۲۴
قل العفو کی بحث۔ العفو کا مفہوم	۳۲۶
غور و فکر ـــ اخروی زندگی تک میں بھی	۳۲۷
۲/۲۲۰-۲۲۲ فی الدنیا .... متطہرین	
رسول اللہ کی یتیمی کی حالت	۳۲۹
یتیموں کے متعلق احکام	۳۲۹
یتیموں کی دوسری قسم۔ بے یار و مددگار لوگ	۳۳۲

مضمون	صفحہ
العقبہ کا مفہوم	۳۳۲
قرآن کا معاشی نظام اور اس کی غایت	۳۳۳
تکذیبِ دین کرنے والے ـ سرمایہ دار	۳۳۴
عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات	۳۳۶
نکاح کی تفاصیل و شرائط	۳۳۶
(حضرت) عائشہؓ کی عمر بوقت شادی	۳۳۸
مودودی مرحوم اور نابالغ لڑکیوں کی شادی	۳۳۸
محرمات	۳۴۲
رضاعی ماں اور بہن	۳۴۳
تعدد ازواج	۳۴۵
رسولؐ اللہ کی ازواجِ مطہراتؓ	۳۴۸
مجرد، ضبطِ (عفت) نفس سے کام لیں۔	۳۵۲
مہر	۳۵۴
اجورھن سے مراد	۳۵۴
ایک ضمنی نکتہ ـ عربوں کے ہاں کی مروجہ اصطلاحات اور قرآنی اصطلاحات میں فرق۔	۳۵۵
(ضمناً) طلاق کے متعلق ایک نکتہ	۳۵۷
جہیز محض رسم ہے	۳۵۸
الرجال قوامون علی النساء کا مفہوم	۳۵۹
نسبی اور سسرالی رشتے	۳۷۰
جنسی اختلاط کے متعلق بحث	۳۷۰
اس کا مقصد ـ خاندانی منصوبہ بندی	۳۷۳

مضمون	صفحہ
عزل ـ استمناء بالید	۳۷۴
۲/۲۲۳ نساءکم .... مومنین	
نساءکم حرث لکم کی تفسیر روایات کی رُو سے	۳۷۷
۲/۲۲۴-۲۲۵ ولا تجعلوا .... حلیم	
ظہار	۳۸۱
۲/۲۲۶-۲۲۷ للذین .... علیم	
ایلاء	۳۸۳
طلاق سے متعلق احکام	۳۸۵
۲/۲۲۸-۲۳۷ والمطلقت .... بصیر	
حلالہ	۳۹۴
مُتعہ	۳۹۵
جنسی تعلقات کے متعلق ڈاکٹر اُنون کی تحقیق	۴۰۴
عدّت	۴۰۵
رضاعت (دودھ پلانا)	۴۱۰
حضانت (بچہ کس کی تحویل میں رہے)	۴۱۲
فلسفۂ موت و حیات	۴۱۳
۲/۲۳۸-۲۳۹ حافظوا .... تعلمون	
صلوٰۃ الوسطیٰ	۴۱۳
۲/۲۴۰-۲۴۲ صفحہ ۴۰۸، ۴۰۹ پر آچکی ہیں۔	
۲/۲۴۳-۲۴۴ الم تر .... علیم	
فلسفۂ موت و حیات ۔	۴۱۴
زندہ وہ رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا	

مضمون	صفحہ
قرضِ حسنہ ۔ خدا کو قرض دینا	۴۱۶
۲/۲۴۵ من ذالذی ..... ترجعون ۔	
بنی اسرائیل کا ایک واقعہ	۴۱۹
۲/۲۴۶-۲۴۸ الم تر ...... مومنین ۔	
کمانڈر کے انتخاب کا معیار ۔ دولت نہیں ۔	۴۲۰
اہلیت اور صلاحیت ہے ۔	
تقدیراتِ الٰہیہ ہی قوانینِ خداوندی ہیں ۔	۴۲۱
(حضرت) طالوت کا انتخاب	۴۲۱
علم اور قوت کا امتزاج	۴۲۱
تابوتِ سکینہ سے مراد	۴۲۲
کثرت و قلت کا باطل اصول	۴۲۴
۲/۲۴۹-۲۵۲ فلما فصل ..... المرسلین ۔	
کامیابی کا راز تعداد کی کثرت نہیں ،	//
ایمان اور صلاحیت ہے ۔	
مغربی جمہوریت ۔	//
اذن اللہ کے معنی	۴۲۵
۲/۲۵۳ تلک الرسل .... یرید	۴۲۸
تفریق بین الرسل جائز نہیں	۴۲۹
کلام اللہ سے مراد	۴۲۹
۲/۲۵۴ یا ایہا الذین .... ظالمون	
انفاق کی اہمیت	۴۳۱
۲/۲۵۵ اللہ لا الٰہ .... عظیم	
اصل سوال صفاتِ خداوندی کا ہے ۔	۴۳۱
(آیت الکرسی)	
سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ	۴۳۲
وحدت الوجود کا نظریہ	۴۳۴
نمایاں صفاتِ خداوندی ۔ الاسماء الحسنیٰ	۴۳۳
کرسیِ خداوندی	۴۳۷
الاعلیٰ	۴۳۸
۲/۲۵۶ لا اکراہ فی الدین .... علیم	
لا اکراہ فی الدین	۴۳۹
رشد و ہدایت ۔	۴۴۰
ایمان باللہ کے لئے کفر بالطاغوت ضروری ہے	۴۴۱
کمیونزم کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	۴۴۲
۲/۲۵۷ اللہ ولی ..... خالدون ۔	
ولی کے معنی	۴۴۴
اولیاء اللہ	۴۴۵
آٹھواں باب — قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل	۴۵۲
آیات ۲/۲۵۸ تا ۲/۲۸۶	
ختم سورۃ بقرہ	
۲/۲۵۸-۲۵۹ المتر .... قدیر	
اسوۂ ابراہیمی	۴۵۵

مضمون	صفحہ
بادشاہِ وقت سے مناظرہ	۴۵۶
۲/۲۶۰ واذ قال ..... حکیم	
مردوں کے زندہ کرنے کے متعلق روایاتی تفسیر	۴۵۷
(حضرت) ابراہیمؑ کو معاذاللہ شک ۔	۴۵۹
۲/۲۶۱ مثل الذین .... علیم	
انفاق فی سبیل اللہ	۴۶۳
لفظ سبع (سات) کا مفہوم	۴۶۴
۲/۲۶۲-۲۶۵ الذین ..... بصیر	
انفاق فی سبیل اللہ کے اثرات	۴۶۵
تثبیتِ نفس	۴۶۶
۲/۲۶۶ اَیَوَدُّ ..... تتفکرون ۔	
انشورنس	۴۶۸
نذر کے معنی ۔ خدمات جو اپنے ذمے لے لی جائیں ۔	۴۷۰
۲/۲۶۷-۲۸۱ یاایھا الذین .... یظلمون	
معاشی نظام کی بنیاد	۴۷۲
صدقات کا مفہوم	۴۷۲
دل کی رضامندی ۔ مومنین کا استغناء	۴۷۳
ربٰو کی بحث	۴۷۴
نظامِ سرمایہ داری اور مودودی مرحوم	۴۷۶

مضمون	صفحہ
تجارت اور ربٰو میں فرق	۴۷۹
قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا ۔	۴۷۹
اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت	۴۸۲
۲/۲۸۲-۲۸۳ یاایھا الذین ..... علیم	
لین دین کے متعلق ہدایات	۴۸۴
دو عورتوں کی گواہی	۴۸۵
رہن یا قبضہ	۴۸۹
۲/۲۸۴ لِلّٰہ ما فی السمٰوٰت ..... قدیر	
قانونِ مکافاتِ عمل	۴۹۰
۲/۲۸۵ اٰمن الرسول ...... مصیر	
رسول کو بھی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا	۴۹۰
ایمان کے بعد سوچ سمجھ کر اطاعت	۴۹۱
۲/۲۸۶ لا یکلف اللہ ..... کافرین	
لا یکلف اللہ نفسًا الّا وسعھا	۴۹۲
کسب اور اکتساب میں فرق	۴۹۳
نسیان، عزم کی کمزوری ہے	۴۹۳
مومنین کی دعائیں	۴۹۴
مولانا ـ صرف خدا کی ذات ہے ۔	۴۹۶
انڈکس	۴۹۷

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم ط

حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ کلام

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۷ء میں۔ پروگرام یہ تھا کہ اس کی آئندہ جلدیں بھی اسی رفتار سے شائع ہوتی رہیں۔ چنانچہ میں نے جلد سوم کا مسودہ جولائی ۱۹۷۷ء میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے نظامِ کتابت وطباعت کی منزل ایسی صبر آزما ہے کہ اس میں تمام عزائم فسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب، اس کے قریب اڑھائی سال بعد قارئین کے سامنے آ رہی ہے۔ اس دوران میں، اربابِ ذوقِ قرآنی کے پیہم تقاضے ان کی جس بیتابیٔ تمنا کے آئینہ دار رہتے اس کا مجھے بخوبی احساس ہے لیکن اس بے بسی کے عالم میں خود مصنف کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا شاید کوئی اور اندازہ نہ لگا سکے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بالآخر یہ جلد شائع ہو گئی اور سابقہ جلدوں کے سے معیار کے مطابق شائع ہو گئی۔ ورنہ اس زمانے میں ایسا معیار قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔

۲۔ جلد اول، سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر مشتمل تھی اور ضخامت ۳۸۸ صفحات۔ جلد دوم سورۃ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۱۱۲ کو محیط تھی اور ضخامت ۴۷۶ صفحات۔ زیرِ نظر جلد اسی سورۃ کی آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ پر مشتمل ہے جس پر سورۃ بقرہ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ ضخامت اس کی ۵۴۸ صفحات ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں، چھتیس صفحات پر مشتمل، تینوں جلدوں کے جامع انڈکس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ انڈکس یوں تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے مضامین کا آئینہ دار ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلام سے متعلق شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس سے متعلق مجمل یا مفصل اشارہ اس میں نہ آ گیا ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مطالب الفرقان کی یہ تین جلدیں پورے کے پورے قرآن مجید کی گویا طائرانہ پیش رس ہیں۔ جو تفسیر، تصریفِ آیات کے انداز سے مرتب کی جائے اس کی جامعیت کا یہی عالم ہوتا ہے۔

۳۔ سلسلۂ مطالب الفرقان کا تفصیلی تعارف اس کی پہلی دو جلدوں میں کرایا جا چکا ہے۔ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسبِ سابق ہے۔ یعنی (۲/۱۱۳) سے مراد ہے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۱۳، انڈکس میں البتہ انہیں یوں لکھا گیا ہے (۱۱۳ : ۲)۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

۴۔ آخر میں، بدرگاہِ رب العزت عرض گذار ہوں کہ جس طرح اس کے فیضِ بے پایاں نے مجھے اپنی کتابِ عظیم کے ساتھ والہانہ طور پر متمسک رہنے کی اب تک توفیق ارزانی فرمائی ہے، یہ سلسلہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ اور مانگنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے!

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر ۔۔۔ اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

۱۲ نومبر ۱۹۷۹ء

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

جلد سوم

سورۂ بقرہ ــــ آیات ــــ نمبر ۱۱۳ تا نمبر ۲۸۶

ختم سورۂ بقرہ

پہلا باب

الدّین کے بنیادی اصول

(۱) الدّین شروع سے ایک ہی چلا آرہا تھا۔
(۲) اس کی تکمیل بعثتِ رسول اللہ سے ہوئی۔
(۳) جب دین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوجاتی تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔
(۴) مذہب میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔
(۵) فرقوں کے اختلافات صرف اس نظام میں مٹ سکتے ہیں جس میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔
(۶) لیکن اہل کتاب نہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ نہ اس نظام کو تسلیم کریں گے۔
(۷) اس نظام کا مرکز کعبہ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ دوسرے باب میں سامنے آئے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

الدّین کے بنیادی اصول

آغاز ــــــ سورۃ بقرہ ــــــ آیت نمبر ۱۱۳

مطالب الفرقان کی دوسری جلد کا اختتام سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۱۲ پر ہوا تھا۔ اُس (جلد) کا آخری حصہ بہ حیثیت مجموعی داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ زیرِ نظر جلد کے ابتدا میں بھی انہی کا تذکرہ آئے گا، لیکن جستہ جستہ مقامات پر۔ آغازِ کلام آیت نمبر ۱۱۳ سے کیا جاتا ہے جو یوں ہے:۔

۲/۱۱۳ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۔ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ (۲/۱۱۳)

مفہوم اس آیۂ جلیلہ کا یہ ہے:

حق کی مخالفت کرنے والوں کی حالت بھی عجیب ہوتی ہے۔ ان کے باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، دینِ خداوندی کی مخالفت میں یہ سب متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ یہی کیفیت ان یہود و نصاریٰ کی ہے۔ تمہاری مخالفت میں یہ سب ایک ہو جاتے ہیں، لیکن باہمی اختلافات کا یہ عالم ہے کہ یہودی، عیسائیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کا مذہب کچھ نہیں۔

عیسائی، یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ سچائی پر نہیں۔ اور لطف یہ کہ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ وہ اُس کتاب کی پیروی کرتے ہیں جس کا سرچشمہ ایک ہے (یعنی عہد نامہ عتیق و جدید کی)۔ یہی حالت ان (مشرکینِ عرب) کی ہے جنہیں کتاب (وغیرہ) کا کوئی علم نہیں۔ وہ بھی اپنے معتقدات کو حق پر مبنی قرار دیتے ہیں اور دوسروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ پارٹی بازی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ اختلافات (جو خدا کا عذاب ہیں ۳/۱۰۴) اُس وقت تک نہیں مٹ سکتے جب تک قرآن کی رُو سے انسانی معاشرہ میں انقلابِ عظیم واقع نہیں ہو جاتا۔ (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)۔ اُس وقت عالمگیر انسانیت اور وحدتِ اقتدار و قانون کا تصور غالب آ جائے گا۔ اور یوں اختلافات مٹ جائیں گے — یا پھر مرنے کے بعد ہر ایک کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ حق پر تھا یا باطل پر۔

اس آیت کی مختصر سی تشریح، مطالب الفرقان، جلد دوم (صفحہ ۱۹۲) میں، زیرِ آیت (۲/۱۴) گزر چکی ہے۔ مزید وضاحت کے سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیئے کہ :-

الدّین کی وحدت

(۱) اصولی اور اساسی طور پر دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ... (۴۲/۱۳)۔ "(اے مخاطبینِ قرآن) تمہارے لئے بھی الدّین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم (حضرات) نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (جملہ انبیاء کرامؑ) کو دیا گیا تھا، اور جس کا حکم (اے رسولؐ!) اب تمہیں دیا جا رہا ہے۔" چونکہ الدّین کا سرچشمہ ایک ہی تھا — یعنی وحیٔ خداوندی — اس لئے اس میں اختلاف اور تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر جملہ انبیاء کرامؑ سے کہہ دیا گیا تھا: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (۴۲/۱۳) "وہ اس دین (نظامِ خداوندی) کو متمکن کریں اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ کریں۔" لیکن ہوتا یہ رہا کہ جب تک رسول زندہ رہتا وہ اپنے متبعین کو وحیٔ خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق چلاتا اور اس طرح انہیں ایک مرکز پر قائم رکھتا — الدّین کی عملی تشکیل، ضابطۂ قوانین کی وحدت کی رُو سے 'امتِ واحدہ' کی تشکیل ہے — لیکن اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد، اُس وحیٔ خداوندی میں آمیزشیں شروع ہو جاتیں۔ یہ ماجرا ہر رسول کی وحی کے ساتھ گزرا۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (۲۲/۵۲)۔ (نیز ۲/۱۱۳، ۴۱/۲۵)۔ "اے رسول! تم سے پہلے جتنے ہمارے فرستادہ نبی آئے اُن کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ وہ جب، ہمارا پیغام پہنچا کر، دنیا سے رخصت ہو جاتے تو ان قوانین سے سرکشی برتنے والے، ان کی وحی میں آمیزش کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے۔" فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۲۲/۵۲)۔ "اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی سے

انسانی آمیزش کو دور کر کے، اپنے قوانین کو پھر منزّہ حالت میں محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے، اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔" (اسے ناسخ و منسوخ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا تفصیلی ذکر جلد اوّل صفحہ ۱۲۵۔ زیر آیت ۲/۲؛ جلد دوم صفحہ ۴۳۴ زیر آیت ۲/۱۰۷-۱۰۶، آچکا ہے)۔ جب الدّین میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جائے تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔ جب سابقہ رسول کی وحی سے انسانی آمیزش دور کرنے کے لئے نیا رسول آتا، تو مذہب پرست طبقہ اپنے مذہب پر بضد قائم رہتا اور اس رسول کی طرف سے پیش کردہ الدّین کی سخت مخالفت کرتا۔ یہ مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی جو مذہب کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔ (تفصیل اس کی جلد اوّل صفحہ ۲۵۶ زیر آیت (۲/۱۴)؛ اور جلد دوم صفحہ ۴۰۳ زیر آیت (۲/۷۹) دیکھئے)۔ اس طرح دنیا میں دینِ واحد کی جگہ، مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ پھر جس طرح ہر پیشہ میں ہوتا ہے، ان مختلف مذاہب کے پیشواؤں کی باہمی رقابت، انہیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھتی۔ کاروبار چلتا ہی اس طرح سے ہے ___ اس پیشہ ورانہ رقابت کو قرآن کریم نے "بَغْیًا بَیْنَھُمْ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (دیکھئے آیات ۲/۹۰؛ ۲/۲۱۳؛ ۳/۱۸؛ ۴۲/۱۴؛ ۴۵/۱۷)

اس کے بعد آپ پھر آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۱۳) کی طرف آجائیے۔ اس میں بالتصریح تو نام یہود اور نصاریٰ کا لیا گیا ہے لیکن درحقیقت اشارہ جملہ اہلِ مذاہب کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت میں کہا گیا کہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۔(۲/۱۱۳) "تمام اہلِ مذاہب کی یہی روش ہوتی ہے کیونکہ وہ الدّین کی حقیقت کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔"

نبی اکرمؐ کی طرف جو کتاب بھیجی گئی اس کے متعلق وضاحت کر دی کہ وہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶) اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔(۱۵/۹) "ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ الدّین کے متعلق جو روش پہلے چلی آرہی تھی، اس کے جاری رکھنے کی اب ضرورت نہیں تھی ___ یعنی یہ روش کہ سابقہ رسول کی وحی میں داخل کردہ آمیزش دور کرنے کے لئے ایک نئے رسول کی بعثت ___ یہ اس لئے کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اپنے اوپر لے لی، اس لئے نہ اس میں انسانی آمیزش کا امکان تھا اور نہ اس آمیزش کو دور کرنے کیلئے حضورؐ کے بعد

ختمِ نبوّت

کسی صاحبِ وحی کے آنے کی ضرورت تھی۔ اس کو ختمِ نبوت کہا جاتا ہے جو، قرآن مجید کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطہ ہونے کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے (اس کے متعلق اشارات جلد اوّل صفحہ ۲۴

زیرِ آیت ۱/۲، اور جلد دوم صفحہ ۳۶۴ . آیت ۲/۵۲ میں گزر چکے ہیں)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو الدّین رسول اللہؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا گیا تھا، قرآنِ کریم کے مکمل اور محفوظ ہو جانے کے بعد، (اس کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کا امکان نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی مذہب میں تبدیل ہو گیا اور امت، امتِ واحدہ رہنے کے بجائے فرقوں میں بٹ گئی۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھیئے کہ جس طرح یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ الدّین کے باقی نہ رہنے سے مختلف فرقے بن گئے، اسی طرح اسلام کے بہ حیثیت دین باقی نہ رہنے سے، امتِ مسلمہ مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور جس

فرقہ بندی

طرح قَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ (۲/۱۱۳) "یہودی کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں، نصاریٰ باطل پر... اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حق پر ہم ہیں اور یہودی باطل پر ہیں"۔ اسی طرح ہمارا بھی ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ حق پر ہم ہیں۔ باقی فرقے باطل پر ہیں اور تماشا یہ ہے کہ هُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ۔ (۲/۱۱۳)۔ سب فرقے قرآن کو خدا کی کتاب اور اپنے آپ کو اس کتاب کا متبع کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)۔ "کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے"۔ یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی ایک بین دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مختلف فرقے (باہمی اختلافات کے باوجود) اس کے مدّعی ہوں کہ وہ قرآنِ کریم کا اتباع کرتے ہیں، تو اس سے یہ ثابت ہو جاتے گا کہ قرآن کریم میں اختلافات ہیں۔ یعنی ہمارے فرقوں کا اختلاف، قرآن کے اس دعویٰ کا بطلان کرتا ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ (فرقہ بندی کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۰۷، زیرِ آیت ۱/۴؛ صفحہ ۱۹۳، زیرِ آیت ۱/۷؛ صفحہ ۲۱۵، زیرِ آیت ۲/۹ گفتگو کی جا چکی ہے)۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب وحیِ خداوندی میں انسانی آمیزش کر دی جاتی تھی تو دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس طرح دنیا کے مختلف مذاہب وجود میں آگئے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ہاں بھی وحیِ خداوندی (قرآن مجید) میں انسانی آمیزش ہو گئی جو دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آگئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ تو پھر ہوا کیا؟ — ہوا یہ کہ قرآن تو غیر محرف رہا لیکن مذہبی پیشوائیت نے خارج از قرآن عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا۔ اس کے بعد، غیر محرف قرآن تو محض تلاوت کے لئے باقی رہ گیا اور عمل، ان خارج از قرآن عناصر کے

مطابق ہونے لگا۔ لہٰذا، دیگر مذاہب میں وحیِ خداوندی کے غیر محرف شکل میں باقی نہ رہنے اور ہمارے ہاں اسکے غیر محرف شکل میں باقی رہنے، میں عملاً کوئی فرق نہ رہا۔ کتاب اللہ تو اسی صورت میں مؤثر رہتی اور وحدتِ امت کا ذریعہ بنتی ہے جب اسے، اور صرف اسے، دین میں سند اور آخری حجت تسلیم کیا جائے۔

مختلف مذاہب کے باہمی اختلافات کے سلسلے میں آیۂ زیرِ نظر (۲/۲۱۳) میں کہا گیا ہے: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (۲/۲۱۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ ان کے اختلافی امور کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا"۔

قیامت کا عام مفہوم "آخرت کی زندگی" لیا جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت پر ایمان، مسلمان ہونے کی لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ (اس پر تفصیلی بحث جلد اول صفحہ ۱۵۲-۱۴۴، زیر آیت (۲/۴) ہو چکی ہے۔ مختلف مذاہب یا فرقوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ "قیامت کے دن" (یعنی مرنے کے بعد کی زندگی میں) ہوگا ــــ لاریب اور برحق ــــ لیکن یہ واضح ہے کہ "قیامت کا دن" دنیاوی زندگی میں کئے گئے اعمال کے نتائج کے سامنے آنے کا دن ہے۔ لہٰذا، ان اختلافات میں قیامت کے دن فیصلہ ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں، ہر مذہب کے پیروں اور ہر فرقہ والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اور اسی کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن اس سے یہ فائدہ نہیں ہوگا کہ غلط روش پر چلنے والے کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو وہ اس روش کو چھوڑ کر، صحیح روش اختیار کرلے۔ جو اس دنیا میں غلط روش پر چلتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا: اور جہنم دار العمل نہیں، دار الجزاء ہے۔ یعنی اُس میں، اپنی اصلاح کر کے صحیح راستے پر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ (جنت اور جہنم، اور جزا و سزا کے متعلق جلد اول اور دوم ــــ بالخصوص جلد اوّل ــــ میں بڑی تفصیلی بحث آ چکی ہے۔ متعلقہ جلد کی فہرستِ مضامین کے حوالے سے اس بحث پر ایک نظر ڈال لیجئے)۔ اصلاح کا امکان تو اسی صورت میں ہوگا کہ اختلافی امور کی حقیقت اسی دنیا میں سامنے آجائے۔ قرآنِ کریم میں قیامت کا لفظ ان معانی میں بھی آیا ہے۔

قیامت کا لفظ "قِيَامٌ" سے ہے جس کے معنی کھڑے ہو جانے کے ہیں۔ اس لفظ (قِيَامٌ) کے ساتھ (ۃ) کے اضافہ سے قیامۃ بنا ہے جس کے معنی ہیں، ایک لخت کھڑے ہو جانا۔ میری کتاب ــــ جہانِ فردا ــــ کے ایک پورے باب میں اس کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس تفصیل کے اس جگہ دہرانے کا نتیجہ تحصیل حاصل ہوگا۔ موضوعِ زیرِ نظر کی مناسبت سے اس کے

قیامت کا مفہوم

وہ ایک متعلقہ اقتباسات کا پیش کیا جانا کافی ہوگا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "انسان کے اٹھ کھڑے ہونے" کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔ اس دنیا میں مستبد قوتیں، کمزوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبائے رکھتی ہیں کہ ان میں اٹھنے کی سکت تو ایک طرف، اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک ہنگامہ خیز انقلاب آتا ہے اور یہی دبی ہوئی انسانیت، یکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس دنیا میں قیامۃ ہے۔ یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدارِ خداوندی کی حامل ہے، تو معاشرہ میں، ظلم و استبداد کی جگہ عدل و احسان کا دور دورہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا، کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ حق، باطل پر غالب آجائے گا۔ اس قسم کا انقلاب، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاءؓ کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے اسے بھی القیامۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل بتائی ہیں ـــــ

رسول اللہ کی بعثت کے وقت دنیا میں، دینِ خداوندی اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ہر جگہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تمام اہلِ مذاہب کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خدائی تعلیم اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے۔ لیکن ایک کی تعلیم دوسرے سے ملتی نہیں تھی۔ ان میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں تھا جو حق و باطل میں امتیاز کر کے، ان نزاعات کو مٹا سکے، اس لئے ان میں باہمی جنگ و جدل جاری رہتی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس انقلاب سے ایک معیار سامنے آجائے گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کون سی تعلیم فی الواقعہ خدا کی دی ہوئی ہے اور کون سی انسانوں کی خود ساختہ۔ اس طرح ان کے باہمی اختلافات دور ہو جائیں گے۔ چنانچہ مختلف مذاہبِ عالم کے پیروؤں (یہود، نصاریٰ، مجوس وغیرہ) نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے اختلافات مٹ گئے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" میں ان کے اختلافات مٹ جائیں گے تو اس سے یہی مراد ہے۔ (عربی زبان اور قرآن کریم کی رُو سے، یَوْم کے معنی دن ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد زمانہ، دَور، عہد بھی ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رُو سے سامنے آیا تھا۔ اس انقلابی دور میں، ان اہلِ مذاہب کے اختلافات رفع ہوئے تھے ـــــ لہٰذا آیت (۲/۱۱۳) میں جو کہا گیا ہے کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ "یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ" میں ہو جائے گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ اب خدا کا دین پھر اپنی اصلی شکل میں آگیا ہے۔ جب اس کے مطابق معاشرہ کا نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت واضح ہو جائے گا کہ کون سی روش صحیح ہے اور کونسی غلط۔

آیت (۲۲/۵۲) میں کہا گیا ہے کہ جب سابقہ دین میں آمیزش ہو جاتی تو ایک نئے رسول کی وساطت سے اس آمیزش کو دور کر دیا جاتا۔ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۔ (۲۲/۵۲)۔ "اور اس کے بعد اللہ اپنے قوانین کو محکم کر دیتا۔" خود آیت (۲۲/۱۷) میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۔

کتاب اللہ کی حکمرانی

(حکم) کے معنی "فیصلہ کرنے" کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اختلافی اور نزاعی امور میں فیصلے وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتے۔ (یہی وجہ ہے کہ مذہب میں اختلافی امور کے فیصلے — مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے — نہ کبھی ہوتے ہیں نہ ہو سکتے ہیں)۔ فیصلہ تو وہی اتھارٹی دے سکے گی جو صاحبِ اقتدار ہو۔ اسے "استخلاف فی الارض" (۲۴/۵۵) یا نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ وہ نظام جس میں تمام امور کے فیصلے قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوں۔ مثلاً :۔

(۱) سورۂ بقرہ میں جہاں انبیائے کرامؑ کی بعثت کا ذکر آیا ہے وہاں کہا کہ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (۲/۲۱۳)۔ "ان انبیاء کے ساتھ خدا نے ضابطۂ قوانین (الکتاب) بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کیا کریں۔"

(۲) خود حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)۔ "اے رسول! تو لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کر۔"

(۳) حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۵)۔ "کیا (تم چاہتے ہو کہ) میں اللہ کے سوا کسی اور کو صاحبِ اقتدار (فیصلہ کن اتھارٹی) تسلیم کر لوں جس نے تمہاری طرف یہ نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔"

(۴) اس کتاب کے ساتھ کوئی اور ضابطۂ قوانین شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶)
"اللہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

(۵) خود رسول اللہؐ بھی اسی کا اتباع کرتے تھے (۶/۵۷ ؛ ۷/۲۰۳)

(۶) اس کی خلاف ورزی معصیتِ خداوندی تھی اور مستوجبِ عذاب۔ (۴/۱۴)

(۷) ہر اختلاف اسی کی رُو سے مٹے گا۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ (۴۲/۱۰)۔
"جن معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو، ان کے فیصلے کے لئے خدا (کی اس کتاب) کی طرف رجوع کیا کرو۔"

(۸) یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

"جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو تو کافر کہا جاتا ہے"۔

ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے مملکت کے اقتدار کی رُو سے کئے جا سکیں گے۔ اسے قرآن نے حکومتِ خداوندی کہہ کر پکارا ہے۔ لہٰذا، دنیاوی زندگی میں یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (جس میں لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کتاب کے مطابق ہوں گے) وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا کہ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (۲۲/۵۶)۔ "جس دور میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہوگا اور تمام امور کے فیصلے وہی کریگا" (یعنی فیصلے اس کی کتاب کی رُو سے ہوں گے) جب یہ نظام حضور نبی اکرمؐ کے ہاتھوں قائم ہوا، تو اس میں مختلف مذاہب کے اختلافی امور کے فیصلے ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے فرقوں کے اختلافات بھی اسی صورت میں مٹ سکیں گے جب کتاب اللہ کو حکم (فیصلہ کُن اتھارٹی) تسلیم کر لیا جائے۔ عملاً یہ شکل اسلامی نظام یا قرآنی مملکت ہی میں سامنے آسکے گی۔

اس کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی ــــ خواہ وہ یہود و نصاریٰ (دیگر مذاہب) کی پیشوائیت ہو، اور خواہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی جہاں کہا گیا،

۲/۱۱۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ..... (۲/۱۱۴)

آیت کے اتنے حصّے کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دے اور اس طرح ان کی تخریب کا باعث بنے"۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ "مسجد" اور "ذکر" کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا ضروری ہوگا۔ سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ خدا "اپنی آیات کو محکم کریگا"؛ اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایک ایسا نظام قائم ہوگا جس میں احکامِ خداوندی (آیات اللہ) مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ العمل ہوں۔ اس مفہوم کی روشنی میں "مساجد" اور "ذکر" کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

مسجد کا مفہوم

لُغت کی رُو سے مسجد کے معنی ہیں سجدہ گاہ۔ یا سجدہ کرنا۔ سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۱۰۴-۱۰۳، زیرِ آیت (۳/۴۳) بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے مراد ہے احکام و قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرنا۔ خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ (یہی معنی "عبادت" کے ہیں جس کی تشریح جلد اوّل صفحہ ۳۵ آیت ۱/۴ میں گزر چکی ہے) لہٰذا، مساجد کے معنی ہیں اطاعتِ خداوندی کے مراکز۔ وہ مقامات جہاں یہ امور طے ہوں کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور ان کے نفاذ کے طور طریق کیا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا کہ: وَّاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (۷/۲۹)۔ "تم اپنی توجہات تمام تر قوانینِ خداوندی پر مرکوز رکھو۔ ہر معاملہ میں انہی کی طرف رجوع کرو۔

ان کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دو اور اطاعت اسی کے لئے مخصوص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔" اس کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے مقام پر کہا: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (۷۲/۱۸)۔ "اطاعت و فرماں پذیری صرف احکامِ خداوندی کی ہو سکتی ہے، کسی اور کی نہیں، اس لئے کسی اور کی اطاعت کو اس میں شریک نہ کرو۔" یعنی لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۱۱۰)۔ "اطاعتِ خداوندی میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔"

ضمناً۔ آیات (۷۲/۱۹) اور (۷۲/۱۸) میں دَعَا کا لفظ آیا ہے جس کے عام معانی "پکارنے" کے کئے جاتے ہیں۔ یعنی خدا کے سوا (یا اس کے ساتھ) کسی اور کو "نہ پکارو"۔ اور اس سے یہ نظری مسائل پیدا ہو کر باعثِ بحث و جدل بن گئے کہ یا اللہ کی طرح کسی اور کو بھی "یا" کہہ کر پکارنا جائز ہے یا نہیں۔ جیسے یا رسول اللہ۔ یا علیؓ۔ یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ۔ دَعَا کے معنی محض پکارنے کے نہیں۔ اس کے معنی ہیں اپنے ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ کتاب اللہ کو "دعوت دینا" کہ وہ بتلائے کہ ہمیں اس باب میں کیا کرنا چاہیئے۔ اگرچہ دَعَا کے متعلق مختصر طور پر جلد اول صفحہ ۳۸، زیرِ آیت ۱/۴ میں لکھا جا چکا ہے لیکن اس کی تفصیلی بحث کا مقام آیت (۲/۱۸۶) ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ یہ تفصیل وہیں بیان کی جائے گی۔ یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ مسجد کے معنی یا تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا ہیں اور یا وہ مراکز جہاں ان قوانین کے نفاذ اور ان کی عملی اطاعت کے متعلق غور و تدبر اور بحث و مشاورت ہو۔ یہ اطاعت خالصتاً قوانینِ خداوندی کی ہو گی اس میں کسی اور کی اطاعت کو شامل کرنا شرک ہے۔ اسی لئے کہا کہ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ۔ (۹/۱۷) "مشرکین کے لئے جائز ہی نہیں ــــ انہیں اس کی اجازت ہی نہیں دی جا سکتی کہ وہ مساجد کی تعمیر (آباد کاری) میں حصہ لیں" جو لوگ خالصتہً قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں (BELIEVE) ہی نہ کریں، ان کے ہاتھوں اُس نظام کی بر و مندی اور فروغ کیسے ہو سکتا ہے جو خالصتہً اطاعتِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔ (۹/۱۸) اس نظام کی تشکیل، استحکام اور فروغ صرف اُن لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے جو ارشاداتِ خداوندی کی صداقت اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی محکمیت پر یقین رکھتے ہوں۔

رہبانیت کے خلاف

مذہب کی دنیا میں "خدا پرستی" سے ذہن فوراً رہبانیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یعنی "اللہ والوں" کی نشانی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا سے دُور بھاگیں۔ ترکِ لذات، ترکِ حظائظ، ترکِ خواہشات، ترکِ زیب و زینت، ان کا مسلک۔ اور خاک نشینی اور سر بزیری ان کا مشرب ہو۔ اطاعتِ خداوندی کے اس باطل تصور کی تردید کے طور پر واضح طور پر کہہ دیا: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ

مَسٰجِدَ .... (۷/۳۱)۔ "اے نوعِ انسان! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیاوی زیب و زینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی"۔ اس لئے جس نظامِ خداوندی کے قیام کی تمہیں دعوت دی جاتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ دنیا کی خوشگواریاں بھی ہیں۔

ایک طرف یہ کہا اور دوسری طرف اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اگر تم نے احکامِ خداوندی کی اطاعت محض رسمی (میکانکی) طور پر کی تو اس سے بھی اطاعت کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ ان کی اطاعت کا تقاضا تمہارے دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے۔ (اس کو خشوع و خضوع کہتے ہیں)۔ خود لفظ اطاعت کے لغوی معنوں کے اندر بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس کے معنی 'بطیبِ خاطر فرماں پذیری' ہیں۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ذرائع اور مقصد کے فرق کو بھی نمایاں طور پر واضح کر دیا ہے۔ گھر سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہونا، ٹکٹ خریدنا، ریل میں بیٹھنا، یہ سب ذرائع ہیں منزل تک پہنچنے کے۔ مقصد منزل تک پہنچنا ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے ذرائع اختیار کرنا بھی نہایت ضروری، بلکہ لاینفک اور ناگزیر ہے۔ لیکن اگر ذرائع ہی مقصود بالذات بن جائیں، اور مقصد یا نصب العین فراموش ہو جائے، تو محض ذرائع اختیار کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ ٹکٹ خرید کر گھر بیٹھے رہنے سے آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ دین میں شعائر اور مناسک، یعنی احکام کی مرئی اور محسوس شکلیں، اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ مذہب میں یہی محسوس و مرئی شکلیں مقصود بالذات بن جاتی ہیں اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

نظامِ خداوندی میں کعبہ کو اساسی مرکز کی حیثیت حاصل ہے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) اسی لئے اسے

مسجد الحرام کی دیکھ بھال

مسجد الحرام کہہ کر پکارا، اور پوری کی پوری امتِ مسلمہ کا مطمحِ نگاہ قرار دیا گیا ہے۔ دیگر مساجد اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس اساسی مرکز (کعبہ) کی دیکھ بھال ضروری ہے لیکن کعبہ بھی حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے، خود مقصود نہیں۔ اس لئے اس کی دیکھ بھال بھی ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں یہ کہا کہ مساجد (مراکزِ نظامِ خداوندی) کی تعمیر و فروغ، جماعتِ مومنین (امّتِ مسلمہ) کا فریضہ ہیں، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ: اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۹/۱۹)

"تم کہیں ایسا نہ سمجھ لینا کہ مسجدِ حرام کی آبادکاری، اور اس مرکز میں جمع ہونے والوں کی دیکھ بھال، مقصود بالذات ہے بالکل نہیں۔ اصل مقصد، خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا ہے۔ جو اس اہم کو نہیں سمجھتا وہ

حقیقت فراموش ہے اور کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔"

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ زیرِ نظر آیت (۲/۱۱۴) میں "مساجد اللہ" سے مفہوم کیا ہے۔ ان سے مفہوم ہے نظامِ خداوندی کے مراکز۔ ایوانات مملکتِ اسلامیہ۔ اس کے بعد لفظ ذکر کی طرف آئیے۔

ذکر اللہ کا مفہوم

بر سبیلِ تذکرہ تو اس کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۱۹۷-۱۹۸ زیرِ آیت (۲/۱۵۲) بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس مقام پر یہ لفظ مزید وضاحت طلب ہے۔

ذکر کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی بات کو ہر وقت ذہن میں رکھنا۔ اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا ـــ اسے نصب العین حیات قرار دے لینا۔ اس مقصد کے لئے کہ وہ کہیں فراموش نہ ہو جائے، اسے بار بار نگاہوں کے سامنے لانا، اور اس کی یاد تازہ کرنا ـــ یہ سب ذکر کے مفہوم میں شامل ہوتا ہے۔

نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد، احکام و قوانین و اصول و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا ہے۔ ان قوانین و اقدار (وغیرہ) کا ضابطہ قرآنِ مجید ہے۔ یہی اس نظام (اسلامی مملکت) کا آئین و دستور ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ ضابطۂ خداوندی ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ اس اعتبار سے قرآنِ مجید کو الذکر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۶۳ ; ۷/۶۹)، نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ (۱۵/۶)۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (۱۵/۹)۔ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الذِّكْرَ (۱۶/۴۴)۔ و دیگر مقامات۔ یعنی اس نظام کا نصب العین قرآنِ مجید ہے۔ چونکہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے نصب العین حیات ہے، اس لئے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۲/۱۰۴) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (نیز ۳۸/۸۷ ; ۶۸/۵۲ ; ۸۱/۲۷)۔ قرآنی نظام ہر قسم کے سلب و نہب اور غصب و استحصال کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مفاد پرست گروہوں کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس نظام کے ضابطۂ آئین (قرآنِ مجید) کو نگاہوں سے اوجھل کر دیں۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ (۵۸/۱۹)۔ "مفاد پرستانہ جذبات ان پر غالب آ جاتے ہیں اور اس طرح وہ اس ضابطۂ خداوندی کو فراموش کر دیتے ہیں"۔ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا طریقہ یہ ہے کہ۔۔۔ قرآن کی رُو سے انہیں ان کے صحیح نصب العین حیات کی یاد تازہ کرائی جائے۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ (۵۰/۴۵)۔ یہی فریضۂ رسالت تھا (۸۸/۲۱)۔ یعنی فراموش کردہ حقیقتوں کی یاد دہانی۔ رسول، ان لوگوں کو ان حقیقتوں کی یاد دہانی کراتا تھا لیکن یہ ان سے اعراض برتتے تھے۔ (۲۱/۳۶ ; ۲۱/۴۲)

اس ذکر سے اعراض برتنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے فرمایا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے ذکر سے اعراض برتتا ہے اس کی، اس دنیا

میں معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔"

یہ ہے حق و باطل کی وہ کشمکش اور خیر و شر کی وہ آویزش جو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ یعنی ایک طرف ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی قوتیں، اور ان کے مقابلہ میں، ضابطۂ خداوندی (ذکر اللہ) کی حامل جماعتیں جو باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کے نظام کو قائم کرنے کے لئے مصروفِ جدوجہد ہوتی ہیں۔ ان کی اس جدوجہد کو "اللہ کا ذکر کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ جلد دوم، صفحہ ۷۵-۷۴، زیرِ آیت ۲/۱۵۲ میں بتایا گیا ہے)۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا سرکش اور حدود فراموش ہوتا جا رہا ہے (۲۰/۲۴)، تو حضرت موسیٰؑ نے، اس مہم کی ہمت طلبیوں اور دشوار گزاریوں کے پیشِ نظر، علاوہ دیگر درخواستوں کے، خدا سے یہ بھی کہا کہ میرے بھائی ہارونؑ کو بھی میرے ہمراہ بھیج دیجئے۔ کَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا۔ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (۲۰/۳۳-۳۴) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے — "تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ (تسبیح کا مفہوم جلد دوم، صفحہ ۳، زیرِ آیت ۲/۳۰ بتایا جا چکا ہے)۔ ذکر کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ نے کہا تھا کہ ہم دو ہوں گے تو تیرے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل اور تیرے مقرر کردہ نصب العین کے حصول کے لئے زیادہ گرمجوشی سے جدوجہد کر سکیں گے۔ بارگاہِ خداوندی سے ان کی اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا ہوا تو ساتھ ہی اس کی بھی تاکید کر دی کہ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ۔ (۲۰/۴۲)۔ "ہم نے تمہاری مانگ پوری کر دی ہے۔ اب دیکھنا! تم میرے ذکر میں تساہل نہ برتنا"۔ یہاں سے بھی ذکر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ذکر اللہ جس کے متعلق فرمایا کہ: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (۱۳/۲۸)۔ "یاد رکھو! صحیح اطمینانِ قلب اسی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ تم قرآن کے بتائے ہوئے نصب العین کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھو اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرو۔"

آیت زیرِ نظر (۲/۱۱۴) میں تیسرا تشریح طلب لفظ اِسْمُهٗ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "خدا کا نام" لیکن (جیسا کہ

اسم اللہ کا مفہوم

جلد اوّل صفحہ ۲ پر بتایا گیا ہے)۔ اسمائے خداوندی کے معنی صفاتِ خداوندی ہیں اور اس سے ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ احکام و اقدارِ خداوندی کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس حقیقت کو اگر اور سمٹا کر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ افراد اور معاشرہ میں (تا بحدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود و ظہور ہو۔ اسلامی معاشرہ، صفاتِ خداوندی کو (محدود پیمانے پر) عملی شکل میں منعکس کرتا ہے اس طرح جلال و جمالِ خداوندی، انسانی دنیا میں "جلوہ بار" ہوتے ہیں۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹)۔ "اور یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا

اٹھتی ہے:۔

ان تصریحات کی روشنی میں آیت (۲/۱۱۴) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعت مومنین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم ہو جائے جس میں صفات خداوندی کی نمود، نصب العین اور مقصود ہو۔ لیکن مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس نظام کے مراکز آباد اور فروغ یافتہ ہونے کے بجائے ویران اور برباد ہو جائیں۔ ذرا سوچو کہ ان لوگوں سے بڑھ کر انسانیت کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں ہسپتال کھولنے کے لئے عمارت تعمیر کی جا رہی ہو اور کچھ بدقماش اس عمارت کو مسمار اور ویران کر دیں، تو ان سے بڑھ کر گاؤں والوں کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟

آیت کا باقی حصہ یہ ہے:۔

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲/۱۱۴) ۲/۱۱۴

ان لوگوں کو چاہیئے یہ تھا کہ ان انسانیت ساز مراکز نظام خداوندی کی طرف آتے تو سرکشی کے جذبات لئے ہوئے نہیں بلکہ اپنی تخریبی کارروائیوں کے تباہ کن نتائج سے ڈرتے ہوئے آتے۔ بہرحال، ان کی اس مخالفت اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں تباہی اور بربادی۔

دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں، جلد اول، صفحہ ۱۴۹ پر زیر آیت (۲/۸) تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ قریش مکہ جو اس نظام کے قیام کی راہ میں مسلسل رکاوٹیں ڈالتے رہے، ان کا انجام کیا ہوا، اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔

(۰)

صدر اوّل میں جب تک قرآنی نظام قائم رہا، مسجد کی یہی پوزیشن رہی۔ یعنی وہ امور مملکت طے کرنے کا مرکز تھی۔ نظام صلوٰۃ کے متعلق، جلد اول صفحہ ۱۰۷-۹۷ زیر آیت (۲/۳) تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مراد ان تمام فرائض منصبی کا ادا کرنا ہے جو خدا کی طرف سے امت پر عاید کئے گئے ہیں۔ اجتماعات صلوٰۃ (جنہیں بعد میں نماز کہا گیا) بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ ہیں، اس لئے صدر اول میں ان کا انعقاد بھی بہرحال مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اُس دور میں، نہ صلوٰۃ سے مراد محض نماز تھی، نہ مسجد کا مصرف صرف ادائیگی نماز۔ اُس زمانے میں قرآنی نظام کے دارالخلافہ (مدینہ طیبہ) کی مسجد (مسجد نبویؐ) امت کی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ حکومت کا جملہ کاروبار اسی میں سرانجام پاتا تھا۔ مختلف مملکتوں

کے سفراء سے اسی میں ملاقات ہوتی تھی جنگی تیاریوں کے منصوبے اسی میں طے پاتے تھے حتیٰ کہ (ایک روایت کی رو سے) حبشی طائفہ کا تماشا بھی مسجد ہی میں ہوتا تھا جسے خود حضورؐ شرفِ نظر عطا فرماتے تھے۔ یہ تھی مسجد کی پوزیشن اور اس میں ذکر اللہ کی حقیقت صدرِ اول میں جب قرآنی نظام نافذ تھا۔

اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور قرآنی نظام باقی نہ رہا، تو دین اور سیاست الگ الگ ہو گئے۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں چلے گئے اور دین (جو اب مذہب بن گیا تھا) مذہبی پیشواؤں کو تفویض ہو گیا۔ اس ثنویت کی رو سے، کاروبارِ مملکت، ایوانات حکومت میں سرانجام پانے لگے اور مساجد صرف "نماز پڑھنے" کے لئے رہ گئیں اور ذکر اللہ کا مفہوم رہ گیا "تلاوتِ قرآن مجید"۔ کچھ عرصہ بعد جب امت میں تصوف در آیا، تو اس نے ذکر اللہ کے لئے اپنے طریقے وضع کئے۔ اب اس سے مراد ہو گئی "ورد و وظائف"، ذکر خفی اور جلی۔۔۔ ھُو حق سے قلب پر ضربیں لگانا۔ چونکہ وہ اس ذکر کو اخفا میں رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اس کے لئے خانقاہیں تعمیر کر لیں۔ اس طرح ذکر اللہ مخصوص ہو گیا اربابِ طریقت کے لئے اور نمازیں رہ گئیں اربابِ شریعت کی تحویل میں۔ یہی شکلیں اب تک رائج چلی آ رہی ہیں۔ ہماری مساجد کی حالت کیا ہے، اس کی تفصیل جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۱۵ زیر آیت (۲/۱۱۴) میں دی جا چکی ہے اور اب تو حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہیں کہہ دیا کہ۔۔۔

ہماری مسجدیں

۔۔۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی ۔۔۔ مذہبی پیشوائیت کو اس قسم کا بہانہ اللہ دے، انہوں نے مساجد کو اپنی سیاسی رسّہ کشی کے مراکز بنا لیا۔ مخالفین پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ انہیں ہدفِ سبّ و شتم بنایا جاتا ہے۔ اس سے مسجدوں میں آئے دن دنگا فساد ہوتا ہے، خون خرابے ہوتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مساجد کو سیاسی اکھاڑے تو نہ بنائیے، تو جواب ملتا ہے کہ اسلام میں سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب نام ہی دین سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اقبالؒ بیچارے کو کیا علم تھا کہ اس کے پیش کردہ (قرآنی) تصور کو کن کن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ (ذکر کا ایک مفہوم اور بھی ہے جسے صفحہ ۱۳ پر بیان کیا گیا ہے)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ "مساجد میں ذکر اللہ" کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا مطلب کیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ اور امتِ مسلمہ، قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس کا اساسی مرکز کعبہ تھا۔ کعبہ کی تولیت قریش کے قبضہ میں تھی اور اس سے وہ ہزار ہا قسم کے فائدے اٹھاتے تھے۔ نظام خداوندی کے قیام سے وہ سب مفادات ختم ہو جانے تھے اس لئے وہ اس نظام کے قیام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی راہ

میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، جماعتِ مومنین مسجد (مسجدِ حرام، کعبہ) کی تعمیر چاہتی تھی اور فریقِ مخالف اس کی تخریب کے درپے تھا۔ آپ نے دیکھا کہ سوال کسی عمارت کی تعمیر اور تخریب کا نہیں تھا؛ نظامِ خداوندی کے قیام اور انہدام کا تھا۔ یہی وہ کشمکش تھی جس کے متعلق کہا کہ یہ لوگ جس قدر جی چاہے، مزاحمت کر کے دیکھ لیں یہ نظام قائم ہو کر رہے گا اور اس کے مخالفین ذلیل و رسوا ہوں گے۔ قرآنی نظام میں کعبہ (قبلہ) کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اس کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۷-۲۱۶ زیرِ آیت (۲/۱۴۴) لکھا جا چکا ہے۔ اسے خدا نے بَیۡتِیَ (میرا گھر) کہہ کر پکارا ہے اور امّتِ مسلمہ سے کہا ہے کہ وَحَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ ۔ (۲/۱۴۴)۔ "تم دنیا کے کسی گوشے میں ہو، تمہاری نگاہوں کا رُخ اسی مرکز کی طرف ہونا چاہیئے"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ اس گھر میں رہائش پذیر ہے۔ بالکل نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی تو کیفیت یہ ہے کہ:-

وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۔ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ۔ (۲/۱۱۵) ۲/۱۱۵

وہ جہت و سمت کی قیود سے بالا، اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ وہ کائنات کی تمام پہنائیوں پر چھایا ہوا ہے۔ تم جس طرف بھی رُخ کرو گے، خدا کی جلوہ باریاں تمہارے سامنے ہوں گی۔ کسی سمت کو رُخ کرنا تو ایک طرف، هُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ۔ (۵۷/۴)۔ "تم جہاں کہیں بھی ہو، خدا تمہارے پاس اور ساتھ ہوتا ہے حتیٰ کہ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (۵۰/۱۶) "وہ تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے"۔ کعبہ کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ تمہاری ہئیتِ اجتماعیہ کا مرکز ہے۔ وہ ذکر اللہ (قرآنی تصورات) کو دنیا میں عام کرنے کا سرچشمہ ہے۔

خدا کا آفاقی تصور

اسی سے اس نے قریش کو بھی متنبہ کر دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ اگر کعبہ کی عمارت پر تم نے اپنا قبضہ نہ چھوڑا تو یہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا۔ اس نظام میں کعبہ کی اہمیت اپنے مقام پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ نہیں (حضور نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق) سارا کرۂ ارض جماعتِ مومنین کے لئے "مسجد" ہے۔ جہاں بھی فضا سازگار ہوتی، یہ اس نظام کو قائم کر لیں گے۔ بنا بریں، صرف اس بنا پر کہ اس وقت تم اس عمارت پر قابض ہو، تم اس نظام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

اس نظام کے قیام کی راہ میں ایک قریش ہی حائل نہیں تھے، جملہ اہلِ مذاہب بھی اس کے خلاف تھے کیونکہ اس کے قیام سے ان کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ ان اہلِ مذاہب میں سے یہودی اور عیسائی، اس تحریک کے مراکز (مکّہ اور مدینہ)

اور ان کے ارد گرد پھیلے ہوتے تھے۔ وہ اس نظام کے کس قدر مخالف تھے اس کا ذکر چار آیات آگے (۲/۱۲۰) میں آئے گا۔ یہاں ان دونوں میں سے نصاریٰ (عیسائیوں) کی پستیٔ فکر کو پہلے سامنے لایا گیا، کہا کہ:۔

۲/۱۱۶ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۔ (۲/۱۱۶)

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کو انسانوں کی سطح پر لا کر رکھ دیا ہے۔ وہ

ابن اللہ کا عقیدہ

اس سطح سے بہت بلند اور اس تصور سے بہت دور، پاک اور منزہ ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے، اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کی طرح بیٹوں کی مدد کا محتاج نہیں۔

۲/۱۱۷ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (۲/۱۱۷)

ان کا محدود ذہن انہیں یہی بتا سکا ہے کہ خدا کا طریقِ آفرینش بھی تولید (PROCREATION) ہے۔ یعنی وہ طریق جس سے انسانی دنیا میں باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ہے جو جملہ کائنات کو کسی ساز و سامان (MATERIAL) کے بغیر عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس کا اندازِ تخلیق یہ ہے کہ وہ جب کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر وہ بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے لا انتہا قوتوں کے مالک خدا کو بیٹوں کی کیا حاجت؟ تخلیقِ کائنات، عالمِ امر و خلق اور تخلیق و تولید کے متعلق تفصیلی بحث پہلی دو جلدوں میں آچکی ہے، اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ (دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۲-۱۶۔ زیر آیت (۱/۱)؛ صفحہ ۲۹۲-۲۹۳۔ زیر آیت (۲/۱۲)؛ جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۳۔ زیر آیت (۲/۳۸)۔ حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی ضمناً تردید جلد دوم۔ صفحہ ۲۴۳۔ زیر آیت (۲/۸۳) کی جا چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح، پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں اپنے مقام پر آئے گی۔ آیاتِ زیر نظر (۲/۱۱۶-۱۱۷) میں قرآنِ کریم نے عیسائیوں کے اس باطل عقیدہ کی اصولی تردید پر اکتفا کیا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ جو قوم اس قدر توہمات میں گھری ہوتی ہو وہ دین کے نظام کے بلند تصور کو بآسانی کس طرح سمجھ سکتی ہے۔ لہٰذا، ان کی طرف سے اس کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔

(۰)

نبی اکرمؐ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد وحیٔ خداوندی پر استوار کرتے تھے، اور مخالفین وحی کے متعلق طرح طرح کے

سوالات کرتے تھے۔ ان کا مقصد تو اس نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا تھا۔ لیکن وہ کھلے بندوں اس کا اظہار کرنے کے بجائے) وحی، نبوت، رسالت کے متعلق اعتراضات کرتے تھے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۗ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (۲/۱۱۸)

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا کو ہماری راہ نمائی مقصود ہے تو وہ ہم سے براہِ راست باتیں کیوں نہیں کرتا۔ یا کوئی ایسی محیر العقول، خارقِ عادت نشانی ہمارے سامنے کیوں نہیں لے آتا جس سے ہم پہچان لیں کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے وحی ہے۔ ان کی یہ باتیں وحی کی کنہ وحقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں اور پہلی مرتبہ نہیں کہی گئیں۔ ان سے پہلے بھی، اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے، یہی کچھ کہا کرتے تھے۔ انہیں کون بتائے کہ ہماری کتنی نشانیاں صفحۂ کائنات پر بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں انہی کو نظر آسکتی ہیں جو علم و بصیرت سے کام لے کر اعترافِ حقیقت پر آمادہ ہوں۔

یہاں ان کی طرف سے پیش کردہ دو مطالبات کا ذکر ہے۔ (۱) یہ کہ وحی ان کی طرف براہِ راست آئے اور (۲) یہ رسول کوئی خارقِ عادت (معجزہ) دکھائے۔ پہلے شقِ اول کو لیجئے۔

وحی کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں تفصیلاً لکھا جاچکا ہے۔ ملخصاً یہ کہ:۔

(۱) خارجی کائنات کی ہر شے، اور جانداروں میں ہر نوع کے ہر فرد کے اندر، از خود وہ رہنمائی ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ اشیاء یا انواع وافراد، اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ اسے (ANIMAL INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (جلد اول صفحہ ۷۱۔ آیت ۱/۵)

(۲) انسانوں کی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت (جلد اول صفحہ ۱۲۔ آیت ۱/۱) (جلد دوم صفحہ ۱۲۹۔ آیت ۲/۴)۔

(۳) یہ وحی کسی منتخب ہستی کی طرف نازل ..... کی جاتی تھی اور اس سے کہا جاتا تھا کہ اسے دوسرے انسانوں تک بھی پہنچا دے۔ یہ علم، خدا سے براہِ راست حاصل ہوتا تھا اور اس میں اس ہستی کی اپنی فکر یا کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۳۔ آیت ۱/۴ و صفحہ ۱۴۰۔ آیت ۲/۴)

(۴) کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی تھی۔ وہ نبی کو کس طرح ملتی تھی؟ (جلد دوم صفحہ ۳۸۷۔ آیت ۲/۹۷)

(۵) نبی کی طرف وحی، اس کی کتاب میں محفوظ ہوتی تھی۔ اس کے باہر (خارج از قرآن) وحی کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ (جلد اوّل صفحہ ۱۴۱۔ آیت ۲/۴ ؛ جلد دوم صفحہ ۱۸۶۔ آیت ۲/۱۴)۔

(۶) وحی کے سوا، خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وجدان انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح "کشف والہام" بھی۔ یہ اصطلاحات بھی انسانوں کی خود وضع کردہ ہیں۔ قرآن کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ فنّی چیزیں ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ان پر تفصیلی بحث جلد اوّل اور دوم میں تصوّف کے عنوان میں گزر چکی ہے)۔

(۷) وحی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگئی۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

زیر نظر آیت (۲/۱۱۸) میں، ان لوگوں کی طرف سے مطالبہ یہ کیا تھا کہ خدا ان سے براہِ راست کلام کرے۔ (لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ)۔ مقصد اس سے وحی ہی تھا۔ وحی کو اللہ تعالیٰ نے خود کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۷۵ ؛ ۹/۶ ؛ ۴۸/۱۵)۔ اسی جہت سے وحی کی رُو سے عطا شدہ قوانین و احکامِ خداوندی کو کلماتُ اللہ کہا گیا ہے۔ (۶/۱۱۶ ؛ ۷/۱۵۸ ؛ ۹/۴۰ ؛ ۱۸/۲۷)

وحی کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے جبریل۔ یا روح الامین یا روح القدس (جو ایک ہی بات ہے) باذنِ خداوندی قلبِ نبویؐ پر نازل کرتا تھا (۲/۹۷ ؛ ۱۶/۱۰۲ ؛ ۲۶/۱۹۲-۹۴)۔ اسی کو ایک مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ عَلِيۡمٍ۔ (۲۷/۶)۔ خدا کی طرف سے قرآن، نبی اکرمؐ کی طرف القا کیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی اسی نہج سے ملتی تھی۔ لیکن حضرت موسےٰؑ کے سلسلے میں اسے خاص طور پر کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔

حضرت موسےٰؑ سے کلام

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا۔ (۴/۱۶۴)۔ "خدا نے موسےٰ کے ساتھ کلام کیا"۔ اس کلام کو بھی وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسےٰؑ سے کہا گیا — فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى۔ (۲۰/۱۳) — "جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے کان لگا کر سن لے"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی اگر وحی ہی تھی (جس کا قلبِ نبوی پر القا ہوتا ہے تو حضرت موسےٰؑ کے ضمن میں) اسے خاص طور پر کلام کیوں کہا گیا اور اس کی تخصیص کیوں کی گئی کہ: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا۔ (۴/۱۶۴)۔ "موسیٰؑ کے ساتھ خدا نے باتیں کیں"۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو وحی ملنے کا جہاں ذکر آیا ہے اس واقعہ کا اندازِ بیان ایسا ہے گویا کسی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان پر طور پر گئے تو نُوۡدِىَ يٰمُوۡسٰى (۲۰/۱۱)۔ "اسے پکارا گیا۔ اسے یہ کہہ کر آواز دی گئی کہ اے موسےٰؑ! اِنِّىۡۤ اَنَا رَبُّكَ۔ (۲۰/۱۲)۔

"میں تیرا رب ہوں" وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۲۰/۱۳)۔ "ہم نے تجھے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا جو کچھ تیری طرف وحی کی جاتی ہے اُسے اچھی طرح سے سن لو"۔

اسی طرح سورۂ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ "وہاں پہنچے تو نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ (۲۸/۳۰)۔ "وادی کی دائیں جانب سے اسے پکارا گیا"....... اسی طرح سورۂ نمل میں بھی نُوْدِيَ آیا ہے (۲۷/۸ نیز ۲۶/۱۰-۱۱، ۷۹/۱۵-۱۶) یعنی اسے آواز دی۔ ان تمام مقامات میں آواز دے کر بلانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔ ایسے عام الفاظ میں سوال، جواب یا عرض معروض کہہ لیجئے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں انداز ہمکلامی کا سا ہے — یعنی ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے کا — لہٰذا، اسے کلام کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مقصد اس سے ... وحی ہی ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں جان سکتے (اور کوئی غیر از نبی جان نہیں سکتا) کہ نبی کے قلب پر وحی کا نزول کس طرح ہوتا تھا، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہمکلامی کی نوعیت کیا تھی۔ واضح رہے کہ نَادَيْنٰهُ کی تخصیص حضرت موسیٰ کیساتھ نہیں تھی (۱۹/۵۲) دیگر انبیاء کرام کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔ (مثلاً) وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ (۳۷/۱۰۴) "اور ہم نے ابراہیم کو آواز دے کر کہا ...." جہاں نَدٰی کے لفظ کے بغیر يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ (۸/۶۴)، يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ (۵/۶۷)۔ کہا گیا ہے، وہاں بھی آواز دینا، پکار کر کہنا یا مخاطب کرنا مراد ہے۔ حتیٰ کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲/۱۰۴) بلکہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (۲/۱۶۸)۔ میں غیر از انبیاء انسانوں کو مخاطب کرکے احکام دیئے گئے ہیں۔ اس طرح خدا ان سب سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتی ہے۔

الفاظ کا مجازی مفہوم

واضح رہے کہ خدا کے لئے جہاں کلام کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے مراد، انسانوں کی طرح زبان سے الفاظ ادا کرکے باتیں کرنا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے محسوس ذرائع سے بلند اور ماوراء ہے۔ ایسے مقامات پر اس قسم کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی میں نہیں بلکہ مجازی معانی میں لینا چاہیئے۔ (مثلاً) جہاں اللہ تعالیٰ نے يَدُ اللّٰهِ کہا ہے (اللہ کا ہاتھ۔ ۴۸/۱۰) تو اس سے مراد، انسانوں کا سا ہاتھ نہیں۔ اس کا مطلب خدا کی قدرت اور اختیار ہے۔ اسی طرح جب کہا جائے گا کہ خدا دیکھتا ہے۔ خدا سنتا ہے تو اس سے مراد اس کا (انسانوں کی طرح) آنکھوں سے دیکھنا یا کانوں سے سننا نہیں ہوگا۔ اس سے مراد علم خداوندی ہوگا۔

بات حضرت موسیٰ کے ساتھ ہمکلامی کی ہو رہی تھی۔ اسے ایک مقام پر مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (۴۲/۵۱) — "پردے کے پیچھے سے بات کرنا" بھی کہا گیا ہے۔ یہ اس نسبت سے کہ سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے درخواست کی کہ: رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (۷/۱۴۳)۔ "اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجابانہ آ تاکہ تیرے دیدار سے میری

نگاہ بھی کامیاب ہو۔" اس کے جواب میں کہا گیا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (۷/۱۴۳) "نہیں موسیٰ! تو مجھے دیکھ نہیں سکتا"۔ تو یہ "کلام مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ" ہے ــ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اُس آیت کی مزید تشریح کر دیں جس میں مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ. خدا کے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ - (۴۲/۵۱) "کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ (بجز اُن طریقوں کے جن کا ذکر آگے آتا ہے)"۔ یہاں دیکھئے! یہ نہیں کہا کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے (بجز ان طریقوں کے)۔ کہا یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز اِن طریقوں کے۔ یعنی انسان خدا سے کلام نہیں کرسکتا۔ خدا انسان سے کلام کرتا تھا یا کلام کرتا ہے۔ کس طرح؟ اِلَّا وَحْیًا۔ وحی کے ذریعے۔ جس کا القاء انبیاء کے دل میں کرایا جاتا تھا۔ (۲/۹۷) اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ "یا پردے کے پیچھے سے" (جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا)۔ یہ دونوں طریقے حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھے۔ باقی رہے دوسرے لوگ (یعنی غیر از نبی) سو ان کے ساتھ خدا کے کلام کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ۔ (۴۲/۵۱) ان کی طرف خدا کا رسول بھیجا جاتا تھا جو اُن تک خدا کے وہ احکام پہنچاتا تھا جنہیں خدا اپنے قانونِ مشیت کی رُو سے، اس رسول کو دیتا تھا۔ یعنی غیر از نبی انسانوں سے خدا براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام، انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ وحی کے معنی، کسی کے حکم کو کسی کی طرف پہنچانے کے بھی ہیں۔

ہم نے ان تصریحات کو قرآنِ کریم کے متعلقہ مقامات کی وضاحت کے لئے پیش کیا ہے ورنہ جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے، یہ تمام بحثیں اب محض نظری ہیں۔ سلسلۂ وحی، حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہوگیا اور خدا کی طرف سے آخری وحی قرآنِ کریم میں محفوظ ہوگئی۔ اب کسی کو خدا کی طرف سے وحی نہیں مل سکتی۔ یعنی کسی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ خدا کسی انسان سے براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ لہٰذا، اب ان بحثوں کا عملی مفہوم کچھ نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا تھا۔ جسے وحی کہا جاتا تھا۔ یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو عطا کی گئی جو قرآنِ کریم کی دفتین میں موجود ہے۔ اس قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ بحثیں کہ وحی کی کنہ و ماہیت کیا تھی، وہ انبیاء کرامؑ پر کس طرح نازل ہوتی تھی، بے مقصد ہیں اور خواہ مخواہ اُلجھنیں پیدا کرنے کا موجب۔ نہ ہی یہ بحثیں کہ خدا کی طرف سے وحی تو نہیں ملتی البتہ کشف و الہام ہوتا ہے۔ یہ تمام تصورات، تصوّف کے پیدا کردہ ہیں۔ جو (بقول علامہ اقبالؒ) اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے اور بڑی خطرناک گمراہیاں پیدا کرنے کا موجب۔ جعلی نبی انہی سیڑھیوں سے "دعویٰ نبوت" کے مقام پر پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۱۸) کی طرف پھر آجاتیے۔ رسولؐ اللہ کے مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ وحی ان کی طرف براہِ راست آنی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک تو انہیں یہ بتایا گیا کہ جو وحی انسانی راہ نمائی کے لئے دی جاتی ہے، اس کا طریق ہی یہ ہے کہ ایک منتخب شخصیت کی طرف وحی کی جاتی ہے جسے وہ دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے (۴۲/۵۱)۔ دوسرے ان سے یہ کہا گیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ یہ تعلیم تمہیں کس کی وساطت سے دی جا رہی ہے۔ تم یہ دیکھو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے، وہ کیا ہے؟ اگر تم علم و بصیرت اور عقل و شعور کی رُو سے اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ تعلیم صداقت پر مبنی ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر تمہارا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دو۔ یہ تو کوئی معقول انداز نہ ہوا کہ ایک بات کسی اور کی طرف سے ملے تو اسے مسترد کر دیا جائے اور وہی بات اگر براہِ راست تم سے کہہ دی جائے تو تم اسے قبول کر لو۔ تم اپنی نگاہ اس پر رکھو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے۔ نہ اس پر کہ وہ بات تم تک پہنچی کس طریق سے ہے۔ اگر تم اس بنیادی نقطہ کو سمجھ لو تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ ایک ہی آیت آگے چل کر بتایا گیا، ان کا مقصد افہام و تفہیم تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی بات پر جمے رہنا چاہتے تھے اور اس قسم کے مطالبات اور اعتراضات، سب کٹ حجتیاں تھیں۔ دنیا میں انسانوں کی عام روش یہی ہے اور اسی سے تمام جھگڑے اٹھتے اور فسادات برپا ہوتے ہیں۔

ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ یہ رسول انہیں کوئی حسّی معجزہ دکھاتے۔ وحی کے مخالفین کی طرف سے معجزات طلبی کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۳۱-۲۰۹ - زیرِ آیت (۲/۲۳) تفصیلی بحث آچکی ہے۔ نسلِ انسانی میں بعض جذبات، خواہشات، تصورات، معتقدات انسان کے ابتدائی دور سے متوارث چلے آرہے ہیں۔ انہی میں اعجوبہ پسندی بھی ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کا شعور نیم بیدار یا نیم پختہ تھا۔ اس لئے فطرت کا قانونِ علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسی بنا پر وہ فطرت کے ہر مظہر اور کائنات کے ہر حادثہ کو خارقِ عادت خیال... کرتا تھا۔ ان کے مذہبی پیشوا ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے اور انہیں طرح طرح کے شعبدوں میں الجھائے رکھتے تھے۔

معجزات طلبی

اس سے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دعوائے "روحانیت" کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا مدعی کرئی شعبدہ دکھائے۔ انسانی شعور کہیں سے کہیں پہنچ گیا لیکن انسان کی یہ خواہش غیر شعوری طور پر متوارث چلی آرہی ہے اس لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ ان لوگوں کا یہ مطالبہ کوئی نئی بات نہیں۔ یا ایسا شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ جذبہ انسانوں میں متوارث چلا آرہا ہے (كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (۲/۱۱۸)۔ "تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جذبہ یا خواہش نوعِ انسان میں غیر شعوری طور پر متوارث چلی آرہی ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے: اَتَوَاصَوْا بِهٖ - (۵۱/۵۳)۔ یوں نظر

آئے گا جیسے ہر جانے والی قوم، آنے والی قوم کو وصیت کر جاتی ہے کہ تمہاری طرف سے اس قسم کا ردِّعمل ہونا چاہیئے اور تم اس قسم کے مطالبات پیش کرنا، اس قسم کے اعتراضات کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ، خواہ متواتر ہی کیوں نہ چلا آرہا ہو، بہرحال مبنی برجہالت ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ہر مقام پر سختی سے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ تم عقل و فکر کو سلب کرنے والی فرمائشوں کے بجائے، غور و تدبّر سے کام لو اور سوچو کہ تم سے کہا کیا جا رہا ہے؟ جب تم معجزہ طلب کرتے ہو تو اس کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ رسول تمہیں اپنی طرف سے کوئی معجزہ دکھائے۔ اس سلسلہ میں یہ رسول تم سے بار بار کہہ رہا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں"۔ (جلد اوّل صفحہ ۳۱۱۔ آیت ۲/۲۳)۔ لہٰذا، اس کے اس اعتراف اور اعلان کے بعد اس سے کسی فوق البشر یا خارقِ عادت واقعہ کے ظہور میں لانے کا مطالبہ ہی غیر معقول ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا انہیں کوئی معجزہ دکھائے۔ معجزہ کے معنی ہیں ایسی بات جس کے کرنے سے تمہاری عقل عاجز ہو۔ سو اس قسم کے (من جانب اللہ) معجزات تو خطۂ ہستی پر ایک ایک قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ زیادہ دور نہ جاؤ۔ تم بتاؤ کہ تم ایک مکھی بھی بنا سکتے ہو؟ تو کیا مکھی کی تخلیق اور اس کا وجود (خود تمہارے معیار کے مطابق) معجزہ نہیں؟ اب آؤ اس قرآن کی طرف جسے یہ رسول پیش کرتا ہے۔ سو اس کے متعلق تمہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ تم اس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ تصنیف کر کے پیش کرو..... (جلد اوّل آیات ۲/۲۳-۲۴ صفحہ ۳۱۶-۳۰۸) تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ تم اس کی مثل بنانے سے عاجز ہو۔ تو کیا یہ (قرآن) معجزہ نہیں؟

کیسی واضح اور بیّن ہے یہ بات، لیکن یہ تو اسی کی سمجھ میں آسکتی ہے جو عقل و فکر سے کام لے۔

(۰)

قرآنِ کریم نے ان ہر دو مطالبات کو مبنی برجہالت قرار دیا اور ان کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کر دیا لیکن وائے برحالِ ما کہ ہم نے انہیں خود اپنے معتقدات میں شامل کر لیا۔ اُن کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ خدا براہِ راست ہم سے ہمکلام ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہمکلامی تو صرف نبی سے ہو سکتی ہے، غیر از نبی سے نہیں۔ اور نبوت کا خاتمہ، نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ہو گیا۔ لہٰذا، رسول اللہؐ کے بعد، خدا کا کسی انسان سے براہِ راست ہمکلام ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کی طرف سے یہ سلسلۂ ہمکلامی بدستور جاری ہے۔ وہ اولیاء اللہ یا صوفیاء کرام سے براہِ راست باتیں کرتا ہے ـــ بلکہ یہ حضرات خود خدا سے براہِ راست باتیں کرتے ہیں۔ آپ غور فرمایئے کہ ایک طرف ہم ختمِ نبوت پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور اسے دین

خدا سے ہمکلامی کا عقیدہ

کی اصل و بنیاد قرار دیتے ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ کلام بدستور جاری ہے۔ البتہ اس کا نام وحی کے بجائے کشف والہام رکھ لیا گیا ہے[1] یعنی محض نام بدل دینے سے ہم مطمئن ہو گئے کہ اس سے عقیدۂ ختمِ نبوتؐ پر حرف نہیں آتا۔

کرامات

باقی رہے معجزات۔ سو اس کے لئے بزرگوں کی کرامات کا عقیدہ وضع کر لیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول کے متعلق کہتا ہے کہ وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ اس لئے اس سے فوق البشر (یا خارق عادات) واقعات کے ظہور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے ایسے واقعات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں بھی نام کے فرق سے اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلایا جاتا ہے کہ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں — اور یہ عقیدہ "بھنگڑ خانے کے ملنگوں" کا نہیں، بڑے بڑے عالمانِ دین کا ہے۔ مفتی محمد شفیع مرحوم (جن کا حال ہی میں ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا ہے) دار العلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم تھے جس کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے۔ وہ اپنی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ — اسی طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے — معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں نہیں ہوتے — ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے۔ غیر نبی سے اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔
>
> (ماہنامہ البلاغ۔ کراچی بابت مارچ ۱۹۷۷ء۔
>
> بحوالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۵۶-۵۵)

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (۸/۱۷)۔ کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ اور کرامت، حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ فرق صرف ان کے ناموں کا ہے۔ یہ ہیں ہمارے عقاید! واضح رہے کہ ہم نے مفتی محمد شفیع مرحوم، کا قول محض مثال کے طور پر درج کیا ہے' ورنہ ہمارے ہاں کے

---

[1] بعض تو اسے پکارتے بھی وحی کہہ کر ہی ہیں۔

بڑے بڑے نامور اربابِ شریعت کی کتابیں کرامات کے امکان کی بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور خود ان حضرات کی کرامات کے تذکرے ان کی تصانیف میں عام ملتے ہیں اور ان کے متبعین کی زبانوں پر رواں رہتے ہیں۔

(۰)

بہرحال، یہ تھا جو مخالفین کی معجزہ طلبی کے جواب میں کہا گیا ۔۔ اس کے بعد، خود نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے، ان لوگوں کو بتایا گیا کہ نبوت سے مقصود اور نبی کا مشن کیا ہوتا ہے۔ فرمایا:

۲/۱۱۹ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ۔ (۲/۱۱۹)

اے رسول! ہم نے تجھے الحق (قرآن مجید) کے ساتھ انسانوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کو بتا دے کہ خدا کی وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے کس طرح تباہی آ جائے گی۔ تو ان تک یہ پیغام پہنچا دے اور پھر یہ ان پر چھوڑ دے کہ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ جو انکار کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا اور اس کی تباہی کی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوگی۔

کہا یہ گیا ہے کہ:۔

رسول بالحق بھیجا گیا

(۱) رسول کو بالحق بھیجا گیا ہے۔ الحق کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۸۹ ۔ زیر آیت ۲/۱۳۱ بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی رسول زندگی کی حقیقتیں (REALITIES) پیش کرتا ہے جو مبنی بر صداقت ہوتی ہیں۔ حقائق اور اعجوبات دو متضاد باتیں ہیں۔

(۲) ان حقائق کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے، اور (ان حقائق پر مبنی) صحیح روش کا مآل، خوشگواریاں اور سرفرازیاں۔ نذیر کے معنی ہوتے ہیں خطرات سے آگاہ کرنے والا، اور بشیر اسے کہتے ہیں جو خوشگواریوں کی بشارت دے۔ (تفصیل جلد اول صفحہ ۱۶۱ زیر آیت ۲/۶ گزر چکی ہے)۔

اس کے بعد، رسول اللہ سے کہا کہ تمہارا کام ان حقائق کو ان لوگوں تک پہنچا دینا اور اس طرح انہیں صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ تمہارا فریضہ انہیں اس صحیح راستے پر زبردستی چلانا نہیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ صحیح اور غلط راستے سامنے آ جانے کے بعد، وہ خود طے کرے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ (انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق، جلد اول صفحہ ۴۱ زیر آیت ۱/۵ ۔ اور جلد دوم۔ باب تمہید و سرگزشت آدم میں

بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے)۔ بنابریں، حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ آپ نے ان حقائق کو ان لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس سے آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ، غلط راستے پر چل کر جہنم کے گڑھے میں جا گریں گے۔ تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوگی۔ بایں ہمہ، حضورؐ کی شفقتِ قلبی، ان کی اس تباہی پر خون کے آنسو روتی تھی۔ آپؐ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ وہ لوگ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۳۴۔ آیت ۲/۷۵)

یہاں ان تباہ ہونے والوں کو اصحاب الجحیم کہا گیا ہے۔ جحیم، جہنم ہی کا دوسرا نام ہے اور جہنم کے معانی جلد اوّل صفحہ ۳۲۷ زیر آیت ۲/۲۴ بیان کئے جا چکے ہیں۔ جحیم کے معنی ہیں رکاوٹ۔ یعنی جس مقام پر انسانی زندگی کا ارتقاء رک جاتا ہے وہ جحیم ہے۔ اس سلسلہ میں، جلد اوّل صفحہ ۱۴۸، آیت (۲/۲۴) میں جنّت اور انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل سے متعلق بحث بھی دیکھئے۔

(٠)

یہ کچھ واضح کر دینے کے بعد، حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ لوگ جو اس قسم کے اعتراضات اٹھاتے اور مطالبات پیش کرتے ہیں، تو یہ ان کی کٹ حجتیاں ہیں۔ ان کا مقصد حقائق کو سمجھنا نہیں۔ یہ اپنے مسلک و مشرب ہی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ تمہارے پیش کردہ مسلک (کو اختیار کرنا تو ایک طرف، اس) پر غور و فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہیں کہ صداقت اور حقیقت ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے انہیں اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے حضورؐ سے کہا گیا کہ:۔

۲/۱۲۰ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ (۲/۱۲۰)

یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہو سکیں گے جب تک تو (اپنا مسلک چھوڑ کر) ان کا مسلک اختیار نہ کر لے۔

"مذہب" کی دنیا میں بالعموم یہی ہوتا ہے۔ کوئی اہلِ مذہب اپنا مذہب چھوڑ کر، دوسروں کا مذہب اختیار کر لینے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ "دوسرا مذہب اختیار کر لینا" تو ایک طرف، وہ کبھی اس کا تصور کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتا کہ دیکھ تو لوں کہیں میرا مذہب غلط ہی نہ ہو۔ یہی کیفیت فرقوں میں ہوتی ہے۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲)۔ "ہر فرقہ کے متبعین اس خیال میں مگن ہوتے ہیں کہ صحیح راستے پر وہی ہیں"۔ باقی

سب غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضور نبی اکرمؐ پر یہود و نصاریٰ میں سے خال خال ایمان لاتے۔

اس مقام پر یہ سوال دل میں پیدا ہوتا تھا (اور آج بھی پیدا ہوتا ہے) کہ جو بات دیگر اہلِ مذاہب کہتے ہیں، وہی بات اسلام بھی کہتا ہے۔ اس کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ حقیقت اور صداقت اس کے ہاں ہے، کسی اور کے ہاں نہیں۔ پھر، یہ کیسے تسلیم کیا جاتے کہ دیگر اہلِ مذاہب کا یہ دعویٰ تو باطل ہے اور اسلام کا وہی دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے؟ سوال اہم ہے اور اس کا جواب اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں یہ کہہ کر دے دیا گیا کہ:۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۔ (۲/۱۲۰)

۲/۱۲۰ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ سوال میرے راستے اور تمہارے راستے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کا بتایا ہوا راستہ کون سا ہے اور اس راستے کی طرف راہنمائی کرنے والی تعلیم کہاں سے ملے گی؟

یہ ہے حق اور باطل۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا معیار! نظری طور پر اس کا بھی یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب اس کا مدعی ہے کہ وہ تعلیم اس کے پاس موجود ہے۔ پھر، اس کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس باب میں کس کا دعویٰ صحیح ہے اور کس کا غلط۔

صرف اسلام ہی کیوں سچا دین ہے

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے اور، اپنے مخصوص انداز کے مطابق، ٹھوس حقیقت پر مبنی جواب دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین بے شک ایک ہی تھا جو مختلف انبیاءِ کرامؑ کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا۔ اگر ان انبیاءؑ کے نام لیواؤں کے پاس وہ کتابیں ہوتیں تو بیشک ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا کہ صداقت اس کے پاس ہے اور چونکہ وہ صداقت ایک ہی تھی اس لئے ان میں نہ تفرقہ ہوتا نہ باہمی جنگ و پیکار۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبی کو دی گئی تھی۔ لہٰذا، ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ ان کے پاس ہدایتِ خداوندی موجود ہے۔ رسول اللہ نے یہ جواب (وحی کی رُو سے) اپنے زمانے کے اہلِ کتاب کو دیا، اور ان میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی۔

اور آج یہی جواب ہم اپنے زمانے کے جملہ اہلِ مذاہب کو بھی دے سکتے ہیں۔ اور ہمارا یہ جواب بلا سند اور بلا دلیل نہیں۔ میں نے اپنی کتاب —— "مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" —— میں، خود مختلف اہلِ مذاہب کی تصانیف کی اسناد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبی کو دی گئی تھی اور اس کا خود ان کو بھی اعتراف ہے۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۸۸-۱۸۲۔ زیر آیت (۲/۴۱) میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور وہاں تورات کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ دے دی گئی ہے۔ (دیگر کتب کی تاریخ،

میری مذکورہ بالا کتاب میں موجود ہے)

ان سے کہا گیا کہ :۔

(۱) تم بھی مانتے ہو کہ سچی راہ نمائی وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (۲/۱۲۰)۔ اور

(۲) اس کا تمہیں خود اعتراف ہے کہ یہ هُدَى اللّٰه (خدا کی طرف سے دی گئی ہدایت)، اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں ہے۔

(۳) میں اس ہدایت کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تم علم و بصیرت کی بنا پر، کامل غور و تدبر کے بعد، خود فیصلہ کرو کہ یہ راہ نمائی، خدائی ہدایت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ تم میرے دعویٰ پر نہ جاؤ۔ غور و فکر کے بعد خود اس کا فیصلہ کرو۔ تمہارے پاس خدائی راہنمائی ہے نہیں۔ تمہارا یہ دعویٰ کہ تمہارا مسلک صحیح ہے اور من جانب اللہ، محض تمہاری اندھی عقیدت پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے مقابلہ میں خالی عقیدت کبھی مبنی بر صداقت نہیں سمجھی جا سکتی۔ میں اَلْعِلْم پیش کرتا ہوں اور تم محض خوش عقیدگی کے جذبات۔ تم علم و عقل کی بارگاہ سے پوچھو کہ ان دونوں میں سے کون سا مسلک حق و صداقت کا مسلک کہلا سکتا ہے۔ بنا بریں، اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس ہدایتِ خداوندی کو چھوڑ کر، تمہارے جذبات کا اتباع کر لوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو غلط راستے پر چلنے کے جو تباہ کن نتائج ہوں گے، اُن سے مجھے کون بچا سکے گا؟ یہ حقیقت، آیۂ زیرِ نظر کے باقی ماندہ حصے میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ :۔

۲/۱۲۰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (۲/۱۲۰)

اے رسول! اگر اس کے بعد، تم نے، اس اَلْعِلْم کو چھوڑ کر ان کے تباہ فریب جذبات کی پیروی اختیار کر لی تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

(۰)

اس آیت میں مِلّت کا لفظ آیا ہے۔ مِلّت (مادہ م۔ل۔ل) کے بنیادی معنی ہیں ایسی دستاویز جسے املا کرا کر لکھایا گیا ہو۔ اس اعتبار سے مِلّت کے معنی ہوں گے تحریری ضابطہ قانون۔ چونکہ تحریر سے ایک چیز واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے اس لئے طَرِيْقٌ مَلِيْلٌ۔ اس راستے کو کہتے ہیں جو واضح اور

مِلّت کا مفہوم

نمایاں ہو اور اس پر بکثرت آمد و رفت ہوتی ہو۔ اس اعتبار سے مِلَّۃٌ کے معنی طریقہ اور راستہ (مسلک و مشرب) کے ہوں گے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے ۔۔۔ یعنی مسلک و مشرب۔ طریقِ راہ۔ (مثلاً) حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے (اپنا تعارف کراتے ہوئے) کہا کہ اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (۱۲/۳۷)۔ "میں نے اس قوم کے مسلک کو ترک کر دیا جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی تھی" اور اس کے برعکس وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ..... (۱۲/۳۸) اپنے آباء ۔۔۔ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کا مسلک اختیار کر لیا۔" یا (مثلاً) جب نبی اکرمؐ نے توحید کی دعوت پیش کی تو مخالفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ: مَا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ۔ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷) "جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے اس میں ہم نے نہ ایسی بات دیکھی نہ سنی۔ یہ تو ایک انوکھا سا مسلک ہے جسے یہ شخص (رسول اکرمؐ) پیش کر رہا ہے"۔

قرآنِ کریم نے (متعدد مقامات پر) اسلام کو ملّتِ ابراہیمی کہہ کر پکارا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۳۰؛ ۲/۱۳۵؛ ۳/۹۵؛ ۴/۱۲۵؛ ۶/۱۶۱؛ ۱۶/۱۲۳؛ ۲۲/۷۸)۔ اسے مسلکِ ابراہیمی کیوں کہا گیا ہے، اس کی وضاحت حضرتِ ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ میں کی جائے گی۔

بہرحال، زیرِ نظر آیت میں، یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا گیا کہ وہ رسول اللہؐ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپؐ ان کے مسلک کو اختیار نہ کر لیں۔ ان کے برعکس:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ۔ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ۔ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲/۱۲۱) | ۲/۱۲۱

اس کا عام ترجمہ ہوگا کہ "ان (یہود و نصاریٰ) کے برعکس، جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے' وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے، یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس' جو لوگ اس کے ماننے سے انکار کریں گے اور اس کے خلاف سرکشی برتیں گے' وہ آخر الامر نقصان میں رہیں گے"۔

قرآنِ کریم نے' ان اہلِ مذاہب کو جو اُس زمانے میں اس کے مدعی تھے کہ وہ اُس کتاب کے پیرو ہیں جو ان کے نبی کو خدا کی طرف سے ملی تھی، "اہلِ کتاب" کہہ کر پکارا ہے اور ان میں یہود اور نصاریٰ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا ہے۔ بعض مقامات پر انہیں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ۔ بھی کہا گیا ہے۔ (۳/۱۴۵؛ ۵/۵)۔ یعنی وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی۔ لیکن انہیں اہلِ کتاب کہنے کے باوجود ان سے کتاب اللہ (قرآنِ کریم اور نبی اکرمؐ کی نبوت) پر ایمان

لانے کا مطالبہ کیا ہے ۔ (تفصیل جلد اوّل ۔ صفحہ ۸۳ ۔ آیت (۲/۳) اور جلد دوم ۔ صفحہ ۱۸۲ ۔ آیت (۲/۱۴۳) میں پیش کی جا چکی ہے)۔

مومنین اور اہلِ کتاب

اس نے جماعتِ مومنین کو "اہلِ کتاب" کہہ کر تو نہیں پکارا، لیکن بعض مقامات پر انہیں بھی "اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ" ۔۔۔ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۴۴) یا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ (۶/۱۱۴) یعنی وہ لوگ جنہیں الکتاب دی گئی ہے۔ ایک جگہ انہیں وارثینِ کتاب بھی کہا گیا ہے (۳۵/۳۲)۔ اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرمؐ کی طرف کتاب نازل کیے جانے کے لئے عام طور پر اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ ۔ کے الفاظ آئے ہیں (۳/۳)۔ "تجھ پر (عَلَیْکَ) کتاب نازل کی ہے"۔ لیکن بعض جگہ (اِلَیْکَ) کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً ۴/۱۰۵ میں) یعنی "تیری طرف" کتاب نازل کی گئی ہے۔ جماعتِ مومنین کے ضمن میں بالعموم اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ (۶/۱۱۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی تمہاری طرف کتاب نازل کی گئی ہے۔ لیکن بعض جگہ (اِلَیْکُمْ) ۔ تمہاری طرف ۔۔ کے بجائے (عَلَیْکُمْ) کا لفظ بھی آیا ہے (۲/۲۳۱) "تم پر کتاب نازل کی ہے"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح نبی پر کتاب نازل کی گئی ہے اسی طرح تم پر بھی کتاب نازل کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ اس کتاب کو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح یہ کتاب، قلبِ نبویؐ کے اندر اتاری گئی ہے اسی طرح تم بھی اس پر غور و فکر کے بعد اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں نقش کرو۔ قرآن اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جو دل کی گہرائیوں میں نہ اتر چکا ہو۔ (۴۹/۱۴) اقبالؒ کے الفاظ میں:-

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

اس کے بعد آپ پھر آیۂ زیرِ نظر کی طرف آ جائیے (۲/۱۲۱)۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ ۔ "وہ لوگ جنہیں یہ کتاب دی گئی ہے"۔ اس سے مراد جماعتِ مومنین ہے نہ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ)۔ ایک تو اس لئے کہ آیت (۲/۱۲۰) میں یہود و نصاریٰ کا بالتصریح ذکر آیا ہے اور اس آیت میں اس جماعت کا ذکر ہے جس کا مسلک ان کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت میں ان کے متعلق کہا گیا ہے "اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (۲/۱۲۱)۔ یہ لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جماعت (مومنین) کے متعلق کہا گیا ہے کہ ۔۔ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ (۲/۱۲۱)۔ "یہ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے"۔ تلاوت

کا لفظ تشریح طلب ہے۔ ہمارے ہاں تو تلاوتِ قرآنِ مجید سے مراد، قرآن کا پڑھنا ہے خواہ وہ معنی اور مفہوم سمجھے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ (اس کے متعلق جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۹۔ زیرِ آیت (۲/۸) لکھا جا چکا ہے)۔ لیکن تلاوت کا مفہوم اس سے وسیع اور عمیق ہے۔

تلاوت کا مفہوم

لفظ تلاوت کا مادہ (ت۔ل۔و) ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ کسی کے "پیچھے پیچھے چلنا" جسمانی طور پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا۔ (۹۱/۲)۔ "چاند جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے" اور احکام کے اتباع کے لئے بھی۔ امام راغب نے کہا ہے کہ تلاوت سے مقصود تو اتباعِ کتاب ہے لیکن اتباع کے لئے ضروری ہے کہ اسے پڑھا جائے (یعنی سمجھ کر پڑھا جائے)، اس لئے تلاوت کا لفظ قرآن مجید کے پڑھنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ 'قرأت' سے مختص ہے۔ یعنی قرأت 'محض پڑھنے کو کہتے ہیں اور تلاوت میں قرأت اور اتباع دونوں آجاتے ہیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن مجید کا پڑھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھا جائے، اور سمجھنا اس لئے ضروری کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ اگر قرآن کو سمجھا نہ جائے تو اس کا پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بیکار ہے۔

آیہ زیرِ نظر میں جو کہا گیا ہے کہ: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (۲/۱۲۱)۔ تو اس سے مراد فقط پڑھنا نہیں بلکہ اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کہا کہ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ (۲/۱۲۱)۔ "یہ لوگ درحقیقت اس پر ایمان لاتے ہیں"۔ اگر تلاوت کے معنی صرف پڑھنا لیا جائے تو یہ جماعتِ مومنین کی خصوصیت نہیں۔ قرآن کو پڑھتے تو غیر مسلم بھی ہیں لیکن وہ اس کا اتباع نہیں کرتے۔ جماعتِ مومنین کی تلاوت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں۔ اسے سمجھتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کا فریضۂ رسالت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۱۵۱)

اس میں پہلا فریضہ، کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچانا۔ اسے ان کے سامنے پیش کرنا۔ اسے پڑھ کر سنانا ہے۔ دوسرا فریضہ اس کتاب کا سمجھانا ہے (يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) اور تیسرا فریضہ، ان کی ذات کی نشوونما کرنا ہے جو احکامِ قرآنیہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا 'تلاوت' میں تینوں باتیں آگئیں۔

کتاب اللہ کا پڑھنا پڑھانا۔ اس کا سمجھنا سمجھانا اور اس کا اتباع کرنا۔

رسول اللہ کو جس انداز سے الکتاب دی گئی تھی، اس کے لئے بھی تلاوت کا لفظ آیا ہے۔ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (۳/۵۷)۔ "اس طرح ہم نے، اے رسول! اس کتاب کو تمہارے سامنے پیش کیا، تمہیں عطا کیا"۔ جیسا کہ وحی کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے، ہم نہیں جان سکتے (اور کوئی بھی غیراز نبی نہیں جان سکتا) کہ نزولِ وحی کی کیفیت کیا تھی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے حضورؐ سے جو کہا ہے کہ: "نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ"۔ تو اس کی کیفیت اور ماہیت کیا تھی۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب حضورؐ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی تھی، لیکن رسول اللہ جس طرح اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے، اس کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس میں تعلیمِ کتاب بھی شامل تھی اور اس کے اتباع سے تزکیۂ ذات بھی۔

(۰)

مطالب الفرقان جلد دوم کا بیشتر حصہ، داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل تھا۔ اس داستان کا آغاز یہ کہہ کر کرایا گیا تھا کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ..... (۲/۴۰) "تم خدا کی ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے اس نے تمہیں نوازا تھا"۔ (جلد دوم صفحہ ۱۷)۔ اس کے بعد ان نعماء کی یاد دہانی آیت (۲/۴۷) میں کرائی گئی جس کی تفصیل جلد دوم صفحہ ۲۲۲ میں سامنے آ چکی ہے۔ اس سے ملحقہ آیت میں ان کے باطل عقائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو محض ان کی خوش عقیدگی پر مبنی تھے اور جو دین کے بنیادی اصول ــ قانونِ مکافاتِ عمل ــ کے خلاف تھے۔ اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۲۲۸ میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب اس داستان کا اختتام بھی اسی انداز سے کیا گیا ہے جس انداز سے اس کا آغاز کیا گیا تھا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ:۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۱۲۲-۱۲۳)

یہ آیات لفظاً لفظاً آیات (۲/۴۷-۴۸) جیسی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ انہی آیات کو یہاں دہرایا گیا ہے۔ اگر آپ جلد دوم صفحات ۲۲۸-۲۴۰ پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان آیات کو آخر میں کیوں دہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ وہاں تفصیلاً بتایا گیا ہے، بنی اسرائیل کی تمام تباہیوں اور بربادیوں کا بنیادی سبب

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی چاہیتی قوم ہے اس لئے، خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، انہیں اس دنیا میں بھی نعمائے خداوندی سے نوازا جائے گا۔ یعنی انہیں وہ بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل ہوں گی، اور آخرت میں جنت بھی اسی طرح مل جائے گی۔ یہ باطل عقیدہ ان کے رگ و پے میں سرایت، اور ان کے دل کی گہرائیوں تک میں اُتر چکا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس کی بار بار تردید کی جاتی ــ جس قدر مرض مُزمن ہوگا، اسی قدر ضرورت ہوگی کہ اس کا علاج پیہم اور متواتر کیا جائے۔ قرآنِ کریم میں تصریفِ آیات (آیات کو پھیر پھیر کر بار بار سامنے لانے۔ ان کا اعادہ کرنے) سے یہی مقصود ہے۔ لہٰذا، اس مقام پر ان کے اس بنیادی عقیدہ کی ایک بار پھر تردید کر کے، اس داستان کو سردست تہ کر کے رکھ دیا۔

دُوسرا باب

معمارِ حرم

آیات ——— (۲/۱۲۴) تا (۲/۱۴۱)

(۱) تعمیرِ حرم سے پہلے تخریبِ دَیر، لازمی مرحلہ ہے۔

(۲) نوعِ انسان کی امامت (لیڈرشپ کا استحقاق)

(۳) تخریب سے تعمیر کی طرف نقلِ مکانی ——— ہجرت۔

(۴) نوعِ انسانی کے عالمگیر مرکز کی تاسیس و تعمیر۔

(۵) حج ——— عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع۔

(۶) اس کی وجۂ جامعیت ـــ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت ـــ قوانینِ خداوندی کی۔

(۷) اس نصب العین پر یقین کا مطالبہ تمام نوعِ انسان سے ـــ خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا غیر اہلِ کتاب۔

(۸) اسی سے وحدتِ انسانیہ کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

(۹) یہی وہ صبغۃ اللہ ہے جس میں ڈوب جانے سے تمام تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور نوعِ انسان امتِ واحدہ بن جاتی ہے۔

دوسرا باب ۲

معمارِ حرم

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام، مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام کی طرف آتے اور خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ان تمام انبیاء کو من جانب اللہ ماننا، جزوِ ایمان ہے ۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ....(۲/۱۷۷) "جو ایمان لایا اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتابوں پر اور انبیاءؑ پر"۔ ان میں بعض کا ذکر تصریحی طور پر قرآن مجید میں آیا ہے اور بعض کا اس طرح ذکر نہیں آیا۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ .... (۴۰/۷۸ نیز ۴/۱۶۴) "اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ ہم تجھ سے پہلے بھی اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا ذکر تصریحاً کر دیا گیا ہے اور بعض وہ جن کا یوں ذکر نہیں کیا گیا"۔ ان میں سے بعض پر ایمان لا کر اور بعض سے انکار کر کے، انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ یہ کفار کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (۴/۱۵۰)۔ "ہم بعض انبیاء پر ایمان

تفریق بین الرسل

لاتے ہیں اور بعض پر ایمان نہیں لاتے"۔ ان کے متعلق کہا کہ: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ (۴/۱۵۱)۔ "یہ پکے کافر ہیں"۔ یعنی بعض انبیاءؑ کا ماننا، انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ اسی طرح کافر کے کافر رہتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے تمام انبیاء کو ماننا ہوگا، اور ماننا بھی اس طرح کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (۲/۲۸۵) "ان کے نبی ہونے میں کسی قسم کا فرق نہ کیا جائے"۔ (۴/۱۵۲)۔ یہ مانا جائے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے یہ سب یکساں تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان حضرات کے دوائر تبلیغ و تعلیم میں فرق تھا۔ ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی اصلاح کے لئے آتا۔ دوسرا کسی عظیم قوم کی ہدایت کے لئے۔ ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرے کا تصادم بڑی بڑی مستبد قوتوں کے ساتھ۔ اس اعتبار سے ان کے مدارج و مناصب میں فرق ہوتا۔ اور اسی نہج سے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳ ; ۱۷/۵۵)۔ اس اختلافِ مدارج اور مراتب کے باوجود یہ سب حضرات ایک ہی برادری کے افراد، ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی سلکِ مروارید کے گہر تابدار تھے۔

قرآنِ کریم نے سلسلۂ انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکار سے کیا ہے۔ ان کے بعد (قومِ عاد کی طرف) حضرت ہودؑ اور پھر (قومِ ثمود کی طرف) حضرت صالحؑ کا تذکرہ۔ ان کی دعوتِ رشد و ہدایت کا دائرہ ان کی اپنی اپنی قوم تک محدود تھا۔ لیکن اسلام تو تمام بنی نوعِ انسان کا دین ہے اس لئے اس کا

حضرت ابراہیمؑ

پیغام عالمگیر ہے۔ ان تین انبیاء کرامؑ کے بعد، قرآنِ کریم نے اُس رسولؑ کا ذکر کیا ہے جس کے ہاتھوں اسلام کی اس آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ذاتِ گرامی، پیکرِ خُلّت و صداقت، حضرت ابراہیمؑ کی ہے جنھیں مشیّتِ ایزدی نے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا اور سامی اقوام میں نبوت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نہ گئی۔ اس شجرِ مقدس کی ایک شاخِ طوبیٰ، حضرت عیسیٰؑ تک منتج رہی تو دوسری شاخ سے وہ گلِ سرسبد تبسم فشاں اور عطر بیز ہوا جس پر نور و نکہت کی تمام رعنائیاں معراج تک پہنچ گئیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی سلسلۂ نبوت کی کڑی تھے جس کے تذکرہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی گئی ہے۔ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (۳۷/۸۳)۔ "اور یقیناً ابراہیمؑ، نوحؑ کے گروہ (زمرۂ انبیاء) میں سے تھا"۔ دوسری طرف جملہ انبیاءِ بنی اسرائیل اور حضورؐ خاتم النبیین ان کی ذریت میں سے تھے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۶/۸۵)

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور (اسحٰقؑ کا بیٹا) یعقوبؑ عطا کیا۔ ہم نے ان سب کو زندگی کا صحیح راستہ دکھایا۔ وہی راستہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھایا گیا تھا اور اس کی نسل میں سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی وہی راہ دکھائی۔ ہم اس طرح حسنِ عمل کرنے والوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کا بدلہ دیتے ہیں۔

تعارفِ ابراہیمی

توراۃ میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی آٹھویں پشت میں نحور پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے دادا تھے۔ وہ آٹھ پشتیں یہ ہیں۔ نوحؑ، سام، ارفکسد، سلح، عبر، فلج، رعو، سروج، نحور، تارح، ابراہیمؑ۔

نحور سے یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔

نحور

تارح (آذر)

- حاران
  - (حضرت لوطؑ)
- حضرت ابراہیمؑ
  - (حضرت سارہ کے بطن سے) حضرت اسحٰقؑ۔ انہوں نے کنعان (یعنی فلسطین اور شام) میں حکومت قائم کی۔ جملہ انبیاءؑ بنی اسرائیل انہی کی ذریت میں سے تھے۔
  - مدیان (حضرت قطورا کے بطن سے) یہ حجاز کے قریب بحرِ احمر کے ساحل کے پاس متمکن ہوئے۔
  - (حضرت ہاجرہ کے بطن سے) حضرت اسمٰعیلؑ جو وادیٔ فاران (مکہ) میں جلوہ افروز ہوئے۔ حضورؐ نبی اکرم انہی کی ذریت میں سے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا خاندان، کلدانیوں کے شہر 'اُوْر' میں آباد تھا۔ خود اُوْر کے معنی شہر یا بستی کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد 'بابل' وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ تورات (کتاب پیدائش) میں ہے :-

> اور تارح نے اپنے بیٹے ابرام اور اپنے پوتے لوط۔ یعنی اپنے بیٹے حاران کے بیٹے۔ کو' اور اپنی بہو' سری' اپنے بیٹے ابرام کی جورو کو لیا اور ان کے ساتھ کسدیوں کے اُوْر سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہاں رہے۔ (پیدائش - ۱۱/۳۱)

کلدانیوں کا تمدن، ازمنۂ قدیم کی تاریخ کے اوراق پر نمایاں حروف میں منقوش ہے۔ تورات میں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں، عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔ جس میں شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام' امرافیل بتایا گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین مینارِ بابل پر کندہ ہیں۔ اس قیاس کی رُو سے، حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م' قرار دیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ تورات کا بیان ہو' یا عام تاریخ کا، یہ سب قیاسات ہیں۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تفصیلات سے بحث نہیں کرتا۔

جس قوم میں حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے وہ بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کے والد، مملکت کے بلند مرتبہ پجاری (آوار) تھے۔ واضح رہے کہ اُس زمانے کے پجاری، آجکل کے پنڈتوں، گرجا کے پادریوں، مساجد کے اماموں یا درگاہوں کے مجاوروں جیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ (بادشاہ کے بعد) مملکت کے بلند ترین منصب پر فائز اور وسیع اختیارات کے مالک ہوتے تھے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ بادشاہ گر ہوتے تھے اور مملکت کا سارا کاروبار انہی کی منشاء کے مطابق سرانجام پاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد (آذر) کا بھی یہی مقام تھا اور اُس کے بعد اس مقام و منصب کے وارث (حضرت) ابراہیمؑ قرار پانے والے تھے۔ اس قسم کے ماحول اور اس قسم کے گھرانے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے بچے کو انہی معتقدات کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن مشیتِ خداوندی نے جس بچے کو (آگے چل کر) نبوت جیسے منصب جلیلہ کے لئے منتخب کرنا ہوتا تھا، وہ شروع ہی سے اس قسم کے خارجی اثرات سے غیر متاثر رہتا تھا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ زندگی کا صحیح راستہ کونسا ہے (اس کی نشاندہی تو وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی) لیکن غلط راستوں سے اس کی طبیعت شروع ہی سے ابا کرتی تھی۔ (تفصیل اس اجمال کی حضور نبی اکرمؐ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں اپنے مقام پر سامنے آئے گی۔ علم النفس (PSYCHOLOGY) اس حقیقت پر انگشت بدنداں اور عمرانیات (SOCIOLOGY) سرگریباں ہے کہ اس قسم کی بت پرستی کی فضا میں پرورش پانے والا بچہ، آگے چل کر دنیا کا سب سے بڑا بُت شکن کس طرح بنا۔ اس کی یہ بت شکنی مٹی اور پتھر کی محسوس اور مرئی مورتیوں تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے زمانے میں جب انسانی نگاہ محسوسات کی چاردیواری کے باہر بمشکل جاتی تھی، تیشۂ براہیمی نے دلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوتے، غیر محسوس بتوں تک کو پاش پاش کر ڈالا اور یوں، دنیا میں توحید خالص کے انقلاب آفرین پیامبر کی حیثیت سے، ملتِ موحدہ کے مورثِ اعلیٰ قرار پاتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی فضا میں، اصنام پرستی اور بت گری کی جگہ بت شکنی کی دعوت اور اس کی عملی نمود کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس کے لئے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر کھڑے ہو جانے کی ہمت اور پہاڑوں کے ساتھ ٹکرا جانے والی استقامت کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے خدائی کے دعویدار بادشاہ (جسے نمرود کہہ کر پکارا جاتا ہے) کی قہرمانیت، آذر جیسے بُت گر باپ کی ہامانیت" اور شعلہ صفت، آتش بہ پیرہن قوم کی مذہبی دیوانگی کا تنہا مقابلہ کرنے کی بسالت درکار تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے مخالفتوں کے ان تمام ہجوموں کا مقابلہ کیا اور ان صبر آزما، جان گداز مراحل کو اس کامیابی اور کامرانی سے طے کیا کہ تاریخ کے شواہد اس پر آج تک تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس بطلِ جلیل کی داستانِ حیات کا آغاز اسی مقام

سے، یہ کہہ کر کیا ہے کہ:۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرٰهِمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۔ (۲ ۱۲۴)

۲/۱۲۴ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "جب ابراہیمؑ کو اس کے ربّ نے چند احکام میں آزمایا تو اس نے انہیں پورا کیا" اس میں "آزمایا" ترجمہ ہے ابتلیٰ کا۔ ہمارے ہاں ابتلا کا لفظ آزمائش کے لئے بولا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو مختلف مصائب میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے، ان کا امتحان لیتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے ابتلاء کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس کے صحیح مفہوم کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۴۱ ۔ زیر آیت (۲ ۹) تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ انسان کے سامنے بہت سے صبر آزما اور ہمت طلب مراحل آتے ہیں۔

ابتلاء کا مفہوم

ان میں اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ اس قسم کے مقامات درحقیقت انسان کے حقیقی کردار کی نمود کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنی ذات کی صلاحیتوں کا محاسبہ (TEST) کرتا ہے۔ لہٰذا ابتلاء درحقیقت محاسبۂ خویش کا دوسرا نام ہے۔ بنابریں، آیۂ زیر نظر کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ (حضرت) ابراہیمؑ کو حق و باطل کی کشمکش میں بڑے سخت جانگسل مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے ان تمام صبر آزما مراحل کا نہایت ثبات و استقلال سے مقابلہ کیا اور کامیاب و کامران آگے بڑھ گئے؛ اور اس طرح انہوں نے خود بھی دیکھ لیا اور دنیا کو بھی بتا دیا کہ ان کی صلاحیتیں کس قدر نشوونما پا چکی ہیں۔ قرآن کریم نے ان مراحل، اور ان میں سے حضرت ابراہیمؑ کے حسن و خوبی کے ساتھ گزر جانے کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آ جائے گی۔ یہاں مختصراً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انہیں مملکت کی بلند ترین پیشوائیت کا منصب اور اس سے وابستہ دولت، ثروت، عزت، شہرت، عظمت، اختیارات، سب بلا محنت و کاوش وراثت میں مل سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ان سب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس قسم کی جاذبیتوں اور کششوں سے، دامن جھٹک کر الگ ہو جانا، بڑی ہمت کا کام ہوتا ہے۔ اس کے بعد، بادشاہ کے ساتھ مقابلہ کا مرحلہ آجاتا ہے — اُس زمانے کے مستبد، اختیاراتِ مطلقہ کے مالک، بادشاہ۔ — اور بادشاہ بھی نمرود جیسا جس کا استبداد دنیا میں ضرب المثل ہے — اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانا اور اس طرح مقابلہ کرنا کہ (قرآن کے الفاظ میں) اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ (فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ - ۲ ۲۵۸) جس کو آسا ہمت اور جرأت کا متقاضی تھا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ پھر، اس قسم کی مذہب پرست قوم کے معبودوں کی نہ صرف نظری طور پر تنقیص و تنکیر، بلکہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دینا، جس آتش فشاں

کا سامنا کرنا تھا، اس کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس عزیمت اور خلت کے مجسمہ نے ان تمام تلاطم خیزیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تو اس کے بعد وہ مرحلہ آگیا جہاں قوم، وطن، سب کو چھوڑ کر اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹/۲۶)۔ اور اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ (۳۷/۹۹)۔ کا عملی ثبوت پیش کر کے، ایک اجنبی سرزمین کی طرف ہجرت کر جانا اور اسی پر اکتفا نہیں، اپنی اولاد (کے ایک حصہ) کو ایک بے برگ و گیاہ وادی (۱۴/۳۷ - ۳۵) میں جا بسانا، اور اس طرح اپنے گھر کو اجاڑ کر، خدا کے گھر کو آباد کرنا — سوچیے کہ اس قدر جانگداز مراحل کو انتہائی خندہ پیشانی سے طے کر جانا، کس عظمتِ کردار کا آئینہ دار ہے:۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت ابراہیمؑ نے اس قدر بلندیٔ کردار کا ثبوت دیا تو بارگاہِ خداوندی کی طرف سے انہیں یہ کہہ کر نوازا گیا کہ ابراہیمؑ! تو واقعی اس کا اہل ہے کہ تجھے عالمِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر سرفراز کیا جائے:۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۲/۱۲۴)

۲/۱۲۴ عالمِ انسانیت کا وہ بلند ترین مقام تھا جس کا اہل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا گیا؟ — نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ — کسی ایک قبیلہ، ایک خاندان، ایک قوم کی امامت نہیں — پوری کی پوری نوعِ انسانی کی امامت۔

امامت کا عام ترجمہ تو (LEADERSHIP) کیا جاتا ہے لیکن عربی زبان (اور قرآنی لسان) کی رُو سے

امامت کا مفہوم

اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا اور بلند ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس لفظ سے درحقیقت بتایا یہ گیا ہے کہ امام (لیڈر) کا منصب کیا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ معماروں کے پاس ایک چھوٹا سا آلہ ہوتا ہے — یعنی لمبے سے دھاگے کے ساتھ ایک لٹو سا بندھا ہوتا ہے۔ اس سے وہ دیکھتے جاتے ہیں کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے؟ چنائی ہموار ہو رہی ہے؟ دیوار میں کہیں خم تو نہیں آرہا؟ اس میں کجی تو نہیں پیدا ہو رہی؟ اس آلہ کو اِمام کہا جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کو اِمَامًا لِّلنَّاسِ قرار دینے سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کی کسی قوم نے اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس کے عمل و کردار کی دیوار صحیح استوار ہو رہی ہے تو اس کے پرکھنے کے لئے اسے سیرتِ ابراہیمیؑ کو بطور معیار اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سیرتِ ابراہیمیؑ کو نوعِ انسان کے لئے بہترین ماڈل (اسوۂ حسنہ ۶۰/۴) کہہ کر پکارا ہے — یعنی انسانی معاشرہ کی سیدھ اور ٹیڑھ ماپنے کا پیمانہ۔

آیت کے اگلے حصہ میں ایک اور عظیم حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے۔ لیکن اس مقام پر میں تھوڑے سے توقف کے لئے معذرت چاہوں گا۔ میں نے اس کتاب (مطالب الفرقان) میں، قرآنی حقائق کو براہِ راست پیش کئے جانے کا انداز اختیار کیا ہے اور اس کے تقابلی مطالعہ سے عام طور پر اعراض برتا ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں جہاں اس قسم کا تقابل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن مجید کو اسلاف کی تفسیروں کی رُو سے سمجھنا چاہیئے۔

روایات کی رُو سے تفسیر

چنانچہ جہاں کوئی شخص قرآنِ مجید کا کوئی مفہوم پیش کرتا ہے اس سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا اسلاف میں سے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ اگر ان میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا تو پھر اس کا پیش کردہ مفہوم بلا سوچے سمجھے مسترد کر دینے کے قابل قرار دے دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ تفسیر ابنِ کثیر ہمارے ہاں بڑی مستند تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمانے کے لئے کچھ احکام دیئے تھے جن کی انہوں نے تعمیل کی اور اس طرح اس آزمائش میں پورے اتر آئے۔ وہ احکام کیا تھے؟ غور سے دیکھیے۔ وہ احکام یہ تھے:۔

> مونچھوں کو کم کرنا۔ کلی کرنا۔ ناک صاف کرنا۔ مسواک کرنا۔ سر کے بال منڈوانا یا رکھنا تو مانگ نکالنا۔ ناخن لینا۔ زیرِ ناف بال لینا۔ ختنہ کرانا۔ بغل کے بال لینا۔ پیشاب پاخانے کے بعد استنجا کرنا۔ جمعہ کے دن غسل کرنا وغیرہ۔
>
> (تفسیر ابنِ کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پہلا پارہ صفحہ ۱۴۴)

اس کے بعد لکھا ہے:۔

> صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: دس باتیں فطرت کی اور اصل دین کی ہیں۔ مونچھیں کم کرنا۔ ڈاڑھی بڑھانا۔ مسواک کرنا۔ ناک میں پانی لینا۔ ناخن لینا۔ پوریاں دھونا۔ بغل کے بال لینا۔ زیرِ ناف بال لینا۔ استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ میں دسویں بات بھول گیا شاید کلی کرنا تھی۔ صحیحین میں ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں۔ پانچ باتیں فطرت کی ہیں۔ ختنہ کرانا۔ موئے زہار لینا۔ مونچھیں کم کرنا۔ ناخن لینا۔ بغل کے بال لینا۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۵)

یہ تھے وہ احکام جن کی تعمیل کرنے سے حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا۔ ان میں ختنے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اسّی سال کی عمر میں بسولے سے اپنا ختنہ آپ کیا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۱)

بہرحال، یہ ہے ہماری مستند تفاسیر اور روایات کی رُو سے تفسیر اس آیت کی۔

(٥)

اب آگے بڑھیے۔ قدیم زمانے میں، انسانی معاشرہ کی بنیاد نسلی امتیاز پر تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے اور ایک خاندان دوسرے خاندان سے الگ، نسلی بنیاد پر ہی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم (یا ہندو معاشرہ) میں ورنوں (ذاتوں۔ گوتوں) کی تقسیم بھی پیدائش کی رُو سے ہوتی تھی۔ جو بچہ جس گھرانے میں پیدا ہو گیا، اس گھرانے کا ورن (برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ شودر) اس کی زندگی کا جزو لاینفک قرار پا گیا۔ یعنی اس ورن کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

ابلیس و آدم کی تمثیلی آویزش کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے (جلد دوم صفحہ ۱۱۴۔ آیت ۲/۳۴) کہ ابلیس نے آدم کو اسی نسلی امتیاز کا چکمہ دے کر بہکایا تھا۔ اسی تصور کی رُو سے موروثی بادشاہت کا نظام وجود میں آیا۔ یعنی بادشاہ کا بیٹا محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے تخت و تاج کا وارث قرار پا گیا۔ یہی "اصول" دیگر مناصب و مدارج کے سلسلہ میں تسلیم کر لیا گیا۔ نسلی تفریق کا یہ باطل نظریہ،

نسلی امتیاز کا باطل نظریہ

عالمِ انسانیت میں کس قدر تباہیوں کا موجب چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۳۹ آیت ۲/۱۱-۱۲ کے تحت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دین کا مقصد ان غیر فطری تفریقات کو مٹا کر، نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دینا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے، موروثیت کے تصور کا ابطال ضروری تھا چنانچہ حضرات انبیاء کرامؑ نے اس کی عملی مثالیں قائم کیں۔ داستانِ حضرت نوحؑ کے ضمن میں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ جب انہوں نے 'موروثیت' کے اس قدیم نظریہ کی رُو سے سمجھا کہ ان کا بیٹا محض اس لئے تباہی سے بچا لیا جائے گا کہ وہ ان کا بیٹا ہے' تو ان کی اس غلط فہمی کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ دین میں "فلاں ابنِ فلاں" چیزے نیست۔ "تیرا" وہی ہے جو دین میں تجھ سے ہم آہنگ ہے۔ (آیت ۱۱/۴۶۔ تفصیل کے لئے میری کتاب — جوئے نور — میں داستانِ حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجیے)۔ وہاں 'باپ' سے کہا گیا تھا کہ جب تک تیرا بیٹا ایمان میں تجھ سے ہم آہنگ نہ ہو' وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہو سکتا۔ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں پہلے، بیٹے (حضرت ابراہیمؑ) سے کہا گیا کہ تیرا اُس باپ سے کوئی رشتہ نہیں جو تیرا ہم مسلک نہیں (جلد دوم صفحہ ۳۴۸۔ زیرِ آیت ۶/۷۵) اور آخر میں انہوں نے اس کلی اصول کا اعلان کر دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶)۔ "جو میرا اتباع کرے گا وہ میرا ہو گا"۔ جو اس راستے سے الگ راستہ اختیار کرے گا، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد آیۂ زیرِ نظر کے اگلے ٹکڑے کی طرف آئیے۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ نوعِ انسانی کی امامت، حضرت ابراہیمؑ کے حصے میں آئے گی۔ یہ بڑا جلیل القدر منصب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی وضاحت چاہی کہ کیا

وراثت کا باطل نظریہ

عام دنیاوی دستور کے مطابق یہ منصب میری اولاد کو وراثت میں ملے گا؟ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ (۲/۱۲۴)۔ جواب ملا۔ نہیں! ابراہیمؑ تجھے یہ منصب تیرے جوہرِ ذاتی کی بنا پر ملا ہے۔ تیری اولاد میں اگر یہ جوہر پائے گئے تو وہ بھی اس منصب پر سرفراز رہے گی۔ لیکن اگر ان میں یہ جوہر نہ رہے تو وہ اس منصب کے مستحق نہیں رہیں گے:۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔ (۲/۱۲۴)

۲/۱۲۴ کہا کہ نہیں! جو اس راستے سے سرکشی اختیار کرے گا، اسے یہ منصب نہیں ملے گا۔ ہمارا وعدہ مشروط ہے جوہرِ ذاتی کے ساتھ۔

اس ایک اساسی اصول سے، اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ:۔

(۱) وراثت کا نظریہ باطل ہے خواہ وہ ملوکیت کے سلسلہ میں ہو اور خواہ دیگر امتیازات اور مقامات کے ضمن میں۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی ذرّیت (نسل) میں جو انبیاء کرامؑ پیدا ہوئے تو اس بنا پر نہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں ان کے جوہرِ ذاتی کی بنا پر اس منصب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اس سے یہ دوسرا کلیہ مستنبط ہوا کہ اگر کسی شخص کا بیٹا اپنے جوہرِ ذاتی کی بنا پر، باپ کے منصب کا مستحق قرار پاتا ہے تو اسے، محض اس شخص کا بیٹا ہونے کی بنا پر اس سے محروم نہیں کر دیا جائے گا۔ اور

(۳) اس سے یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ اولادِ ابراہیمؑ ہونے کی بنا پر جنت کے مستحق قرار دیئے جا چکے ہیں۔

مساواتِ انسانیہ کے اس آفاقی اصول کے بعد، اس عمارت کی طرف آئیے جو اس سنگِ بنیاد پر استوار ہوتی ہے یعنی

نظام کی تشکیل

نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھالنے کا نظام ——— نظام کے تصور سے ایک بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ نظام متشکل ہوتا ہے ان اصولوں کی بنا پر جو اسے دوسرے نظاموں سے ممیّز اور منفرد کرتے ہیں۔ یہ اصول اس نظام کا فکری مرکز قرار پاتے ہیں۔ وحدتِ افکار کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نظام کا ایک محسوس یا مشہود مرکز بھی ہوتا ہے۔ (اس کی وضاحت

کعبہ مرکزِ نظامِ خداوندی

جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۶ ، زیرِ آیت (۲/۴۳) کی جا چکی ہے)۔ نظامِ خداوندی (الدین) کا فکری مرکز تو وحی تھی (جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے) لیکن اس کا ایک محسوس مرکز بھی ضروری

تھا۔ یہ مرکز کعبہ ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے عمل پذیر ہوئی تھی۔ ان کا یہ کارنامہ، ان کے منصب ـــ امامتِ نوعِ انسان ـــ کی اولین ذمہ داری تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن، بابل کا علاقہ تھا اور کعبہ سرزمینِ حجاز میں واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ بابل سے حجاز کیسے تشریف لائے۔ اگر یہ معاملہ محض نقلِ مکانی کا ہوتا تو ہم اسے اہمیت نہ دیتے۔ لیکن یہ تبدیلی محض جائے رہائش کی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ دین کے نظام کے قیام کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس لئے ہم نے اسے

ہجرت

درخورِ اہمیت قرار دیا ہے ـــ اور ہم کیا! خود اللہ تعالیٰ نے اسے ایک اہم انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ دین کی اصطلاح میں اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ـــ معراجِ انسانیت ـــ میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی ہے لیکن مطالب الفرقان کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اسے یہاں دہرا دیا جائے۔

آپ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ ہر تحریک تین مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ پہلا مرحلہ دعوت و تلقین اور تبلیغ و تبیین کا ہوتا ہے جس میں اس پیغام کی عام نشر و اشاعت کی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کے ذریعے سعید روحوں کو اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ اس جماعت (مومنین) کے حلقہ میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایسا وقت آجاتا ہے جب نظر آتا ہے کہ ان بقایا لوگوں میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اور ان کی طرف سے سوائے مخالفت کے اور کسی سلوک کا امکان

مرحلۂ برأت و ہجرت

نہیں۔ اس وقت برأت و ہجرت کا مرحلہ آتا ہے جس میں ان متمرد و سرکش انسانوں سے قطع علائق کر لیا جاتا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ فتح و کامرانی کا ہوتا ہے جس میں حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ اپنی نزاکت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ :-

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۔ (۷۱/۲۶)

اور نوحؑ نے کہا: "اے میرے پروردگار! انکارِ حق کرنے والوں میں سے روئے زمین پر کسی سرکشی اختیار کرنے والے (متنفس) کو (زندہ) نہ چھوڑ۔"

اور اس کے بعد اس متمرد قوم کا جو کچھ انجام ہوا اس پر بھنور کی آنکھ آج تک روتی ہے۔ یہی حضرت ھودؑ نے قومِ عاد سے کہا :-

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۔ (۱۱/۵۷)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی۔ (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں) اور (مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے۔

اور اس کے بعد:۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۔ (۷/۷۲)

"پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں، ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔"

اور حضرت صالحؑ نے بھی اس مقام پر پہنچ کر اسی طرح اعراض برتا۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ ۔ (۷/۷۹)

پھر صالحؑ ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

اور اس کے بعد:

وَثَمُودَ فَمَا أَبْقَىٰ ۔ (۵۳/۵۱)

ثمود کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

ملّتِ حنفیہ کے مؤسّسِ اوّل حضرت ابراہیمؑ کی تحریک میں یہ مقام برأت و ہجرت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے:۔

إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ۔ (۶۰/۴)

جب انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ "ہم" (حضرات ابراہیمؑ اور ان کی جماعت) ان سے جنھیں تم اللہ کے

سوا معبود بناتے ہوئے ہو۔ بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت و نفرت آشکارا ہوگئی۔ یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔

اور اس کے بعد ان سے کہہ دیا کہ :۔

اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۹/۲۶)

"میں اس وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو غالب اور حکمت والا ہے"۔

اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس ملک کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تا کہ کسی بارآور زمین میں حکومتِ خداوندی کے شجرِ مقدس کی تخم ریزی کی جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر نبی اکرمؐ نے دینِ خداوندی کے مخالفین کو مخاطب کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کیا تھا کہ :۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ. (۱۰۹/۱-۶)

(اے رسول!) تم کہہ دو: "اے منکرینِ دعوتِ حق! میں ان کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہیں کروں گا جن کی عبودیت تم اختیار کئے ہوئے ہو اور (حالات اس پر شاہد ہیں کہ) نہ تم ہی اُس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرو گے جس کی عبودیت میں اختیار کر رہا ہوں (لہٰذا میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے) اور نہ میں ان کی عبودیت (اطاعت) اختیار کر سکتا ہوں جن کی عبودیت تم نے اختیار کر رکھی ہے اور (بظاہر حالات) تم بھی اس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرنے والے نہیں ہو جس کی عبودیت میں نے اختیار کر لی ہے۔ تمہارے لئے تمہارے اعمال کی جزا ہے اور میرے لئے میرے اعمال کی جزا" (مکافاتِ عمل کے دن حقیقت واضح ہو جائے گی۔)۔

اس اعلانِ برأت و علیحدگی کی شدت، تاکید اور وضاحت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ چند جملوں کے تکرار سے حق و باطل کو کس طرح الگ الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ ان میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ وہ 'رسول' ان سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اس کے جواب میں کہتے ہو کہ نہیں! "جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ تو کامیابیوں کا راستہ ہے، لیکن جس راستے کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا ہے"۔ اب اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوئی اور صورت، بجز

اس لئے کہ تم اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے میرے راستے پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کا راستہ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ - وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ - (۱۲۲-۱۲۱ / ۱۱)

اور (اے رسول!) تم ان لوگوں سے کہہ دو "تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔ تم بھی (نتیجہ کے) منتظر رہو۔ ہم بھی منتظر ہیں"۔

———(٥)———

اب اسی موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آئیے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہوتا ہے، جس میں احکامات خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جد و جہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں، اس کی سر توڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعیٔ انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عاید ہوتا تھا، میں نے اسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد ان پیشِ نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچانا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعد ہو۔ وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں، اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک "وطن" وہ ہے جس کی زمین اس نظامِ خداوندی کے لئے سازگار اور بار آور ہو۔ لہٰذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام رسول

وطن کا مفہوم رسُول کی نگاہوں میں

کی زبان میں "ذهاب الی الله" یا "هجرت الی الله" ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، وہ اسے بلا تامّل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام، مال کی محبت، اولاد سے وابستگی، رشتہ داروں سے تعلقات، دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو "کانٹا" بھی دامن گیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے اس لئے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پابگل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں کے لئے وجہِ جامعیت اور باعثِ اتحاد و اتفاق بنی اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کر لی کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے، اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رُخ اسی بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار وہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپکے راستہ میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عناں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپکے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاعِ گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے لیکن جنکی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہرِ خودی۔ شرفِ انسانیت۔ کلمۃ الحق یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلابِ بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آ رہا ہے اور اس میں اس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں تو کہئے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردد و تامّل وطن کی خار دار جھاڑی کو اپنے راستے سے الگ پھینک دے گا اور کسی ایسے مقام کی طرف رُخ کرلے گا جہاں اس کی یہ متاعِ بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اسی نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام **هجرت** ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت

ہجرت سے مفہوم

میں اسے اپنی جان تک بھی دینی پڑجاتی ہے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہٰذا، ھجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنیٔ او از تنک آبی رم است — ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآنِ کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ۔ (۲۹/۵۶)

اے میرے بندو جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطۂ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اُس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ھوالمراد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا، اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا، یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھئے! سورۂ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ۔ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ۔ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ۔ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (۴/۹۷)

جو لوگ (غیر خداوندی ماحول میں رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، ان کی روح قبض کرتے وقت فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے؟" (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہتے ہیں۔ "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے" (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے

تھے)۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟" یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے' اور (جس کا ٹھکانا جہنم ہوا تو) کیا ہی بُری جگہ ہے!

معذورین معذرت صرف ان لوگوں کی قابلِ قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں[1]۔

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا۔ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا۔ (۴/۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ چارۂ کار نہ رکھتے ہوں' اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے' اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو:۔

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً۔ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ۔ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۴/۱۰۰)

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کریگا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی)۔ اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سرزمین نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہوگیا (وہ اپنی نیت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشوونما دینے والا ہے۔

---

[1] ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جد و جہد کریں۔ نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

مہاجرین کے مدائح

خدا کی راہ، یعنی قیامِ نظامِ حکومتِ الٰہیہ کے لئے ہجرت کرنے والوں کے فضائل و مناقب، قرآن کے مختلف مقامات پر ابھرے ہوئے حروف میں ملتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۳/۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے (اور راہِ ایمان میں ثابت قدم رہے) اور جن لوگوں نے ہجرت کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی (سچی) امیدواری کرنے والے ہیں، اور (جو کوئی اللہ کی رحمت کا سچے طریقہ پر امیدوار ہو، تو) اللہ سامانِ حفاظت اور پرورش عطا کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

———— (۰) ————

دین (نظامِ خداوندی) کے اس پروگرام کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے کنعان اور شام کے علاقوں میں آبسے۔ چونکہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا نظام متشکل نہیں ہو سکتا، اس لئے وہاں آپ نے ایک مملکت قائم کی جو آلِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں بڑی مستحکم ہوتی چلی گئی۔ قرآنِ کریم میں ہے: فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۔ (۴/۵۴) ہم نے خاندانِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی عطا کی تھی اور ان کے ساتھ ایک عظیم الشان سلطنت بھی۔ آپ کے دو بیٹے — حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ بھی منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ بڑے تھے اور حضرت اسحٰقؑ چھوٹے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے تو اُس نظام کی بنیاد رکھی تھی جو عالمگیر انسانیت کو محیط ہو۔ مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ اس نظام کا مرکزِ محسوس سرزمین حجاز میں مکّہ کے قریب، کعبہ قرار پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، آپ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کے قریب آن بسایا۔ (اس عالمگیر آفاقی مقصد کے لئے سرزمینِ حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا، اس کے متعلق، ہم بعثتِ نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم اپنے آپ کو واقعات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں)۔

لیکن اس مقام پر ایک اہم نکتہ ہمارا دامن گیر ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم تو یہ بتاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو مشیت کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اس جگہ بسایا گیا تھا۔ لیکن تورات جس طرح اس واقعہ کو بیان کرتی ہے اس

ہجرتِ اسمٰعیلؑ

سے انسانی آمیزش سے منزہ وحی، اور محرف کتاب اللہ کا فرق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں۔ سرّی (سارہ) اور ہاجرہ ــــ بلکہ یوں کہیے کہ سارہ بیوی.... تھی اور ہاجرہ لونڈی۔ سارہ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ اس کے برعکس ہاجرہ بار آور ہوگئی تو یہ بات سارہ کو سخت ناگوار گزری اور وہ اسے تنگ کرنے لگ گئی۔ چنانچہ ہاجرہ ایک مرتبہ تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی لیکن

تورات کا فسانہ

فرشتے نے اسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ "تو حاملہ ہے، ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سُن لیا ہے۔" (پیدائش - ۱۶/۱۱-۱۶)۔ آگے چل کر کہا گیا ہے کہ (حضرت) اسمٰعیلؑ کی پیدائش سے سارہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اس کے بعد جب سارہ کے ہاں (حضرت) اسحٰقؑ پیدا ہوئے تو حسد کی آگ ناقابلِ برداشت ہوگئی کیونکہ پہلوٹا بیٹا ہونے کی جہت سے باپ کے وارث (حضرت) اسمٰعیلؑ قرار پاتے تھے، (حضرت) اسحٰقؑ نہیں۔ چنانچہ سارہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔

> چنانچہ ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کے کاندھے پر دھر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اُسے رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے میدان میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ (پیدائش ۲۱/۱۴)

اس کے بعد :۔

> اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلّا چلّا کے روئی ــــ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سُنی۔ اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی ــــ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اُس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ــــ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہوگیا۔ (پیدائش - ۲۱/۱۵-۲۰)

آپ نے غور فرمایا کہ مشیّت کے پروگرام کی اس عظیم کڑی کو محرف کتاب میں کس رنگ میں پیش کیا گیا ہے؟ لیکن تورات پر کیا گلہ کہ وہ تو محرف کتاب ہے۔ آپ دیکھیے کہ خود ہماری کتبِ احادیث میں اس واقعہ کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

زگلفروشش نالم کہ اہلِ بازار است تپاک گرمیِ رفتار باغبانم سوخت

بخاری کی روایت

بخاری میں، جسے حدیث کی مستند ترین کتاب قرار دیا جاتا ہے، لکھا ہے:۔

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ اوّل اوّل جس عورت نے گھاگرہ پہنا وہ والدہ اسمٰعیلؑ ہیں انہوں نے گھاگرہ اس لئے پہنا کہ ان کے نشانِ پا کا سارہ کو پتہ نہ چلے۔ پھر ابراہیمؑ علیہ السلام انہیں اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو لے نکلے اور وہ اس کو دودھ پلاتی تھیں حتیٰ کہ ان دونوں (ماں بیٹے) کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک بڑے درخت کے پاس زمزم (کی جگہ) کے بالائی طرف موقع مسجد کے اوپر کی جانب چھوڑ گئے۔ اور اس وقت مقامِ مکہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ پس وہ وہاں ان دونوں کو چھوڑ گئے اور ان کو ایک ایک تھیلی کھجوروں اور ایک مشک پانی کی دے گئے۔ پھر ابراہیمؑ پیچھے کو چل پڑے اور والدہ اسمٰعیلؑ ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیمؑ! آپ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں جس میں نہ کوئی غمخوار انسان ہے اور نہ کوئی چیز۔ اس نے بار بار ان کو یہ کہا لیکن وہ کچھ التفات نہ کرتے تھے۔ آخرکار انہوں نے کہا کہ کیا وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا تو اللہ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کریگا۔

اس کے بعد اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ہاجرہ کس طرح پانی کی تلاش میں مضطرب و بیقرار، کبھی صحرا میں، کبھی پہاڑ پر سرگرداں پھرتی رہیں تا آنکہ خدا نے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ یعنی بعینہٖ وہی کچھ جو تورات جیسی محرّف افسانوی کتاب میں لکھا ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ وہ بلند اور عظیم مقصد تو ایک طرف، اس سے حضرت ابراہیمؑ کا کس قسم کا کردار سامنے آتا ہے جو شخص اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو، ایک لق و دق صحرا میں، پانی کا ایک مشکیزہ دے کر تنہا چھوڑ جاتے، اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اور جب اس پر یہ اضافہ کیا جاتے کہ ایسا کچھ خدا کے حکم سے کیا گیا تھا، تو اس قسم کے خدا کے متعلق آپ (معاذ اللہ) کیا تصور قائم کریں گے؟ —— بہرحال، تورات محرّف ہے اور ہماری روایات وضعی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی اس قسم کی افسانوی کتاب کو وحیِ خداوندی کہہ کر سر پر اٹھائے پھرتے ہیں اور ہم اس قسم کی وضعی روایات کو سینے سے لگائے پھرتے —— مذہب میں ایسا ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی مذہب ہو —— قرآن کریم میں اس قسم کے کسی واقعہ کا اشارہ تک نہیں۔

—— (٠) ——

قرآنِ مجید نے تعمیرِ کعبہ کا آغازِ سخن تو آیت (۲/۱۲۷) سے کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس کی غایت ان الفاظ میں بیان کر دی ہے:۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا .... (۲/۱۲۵)

۲/۱۲۵ ابراہیمؑ کا قائم کردہ یہی وہ نظام تھا جس کا مرکز، کعبہ قرار دیا گیا تھا تاکہ تمام نوعِ انسان، اپنے اختلافات دور کرکے، ایک نقطہ پر جمع ہو جائے۔ اور اس طرح ہر قسم کے خطرات سے (جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں) محفوظ و مامون ہو جائے ـــــ یہی وہ مرکز ہے جس پر نوعِ انسان نے آخر الامر جمع ہونا ہے اسی سے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوسکے گی۔ (۳/۹۶؛ ۵/۹۷؛ ۱۴/۳۵؛ ۲۲/۲۵)

کعبہ کی غایت بتائی گئی ہے ـــــ مثابة للنّاس اور امنًا ـ مثاب (مادہ ث۔ و۔ ب) کے معنی ہیں جمع ہونا۔ اور مثابة کے معنی ہیں وہ مقام جہاں ہر جگہ سے لوٹ کر، جمع ہوا جائے۔ یعنی مرجع، منزل، نقطۂ اجتماع، مرکزِ اجتماعیت ـ لہٰذا مثابة للنّاس کے معنی ہوئے، نوعِ انسان کے ایک نقطہ، ایک مشترکہ مقصد پر جمع ہونے کا مرکز۔ اور غایت اس کی بتائی امنًا ـ تاکہ وہ ہر قسم کے خطرات سے (جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہیں) محفوظ اور مامون ہو جائے۔

کعبہ۔ عالمگیر انسانیت کے لئے

یہ نقطہ بڑے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی کعبہ یا حج کا ذکر آیا ہے اسے للنّاس کہا گیا ہے۔ یعنی کسی خاص قوم، خاص گروہ، خاص فرقہ کے لئے نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے ـــــ

(۱) اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۳/۹۶)

وہ پہلا گھر جسے تمام نوعِ انسان کے لئے بنایا گیا، مکہ مبارک میں ہے۔ اور وہ تمام اقوامِ عالم کے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (۳/۹۶-۹۵) جو اس نظام میں داخل ہو جائے گا اسے امن مل جائے گا۔

(۲) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔ (۲/۱۲۵)

جب ہم نے اس گھر کو نوعِ انسان کے لئے ایک مرکز پر جمع ہونے کا مقام اور جائے امن بنایا۔

سورۂ مائدہ میں ہے:۔

(۳) جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا جس کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔

تعمیرِ کعبہ کے بعد، حضرت ابراہیمؑ نے دعا یہ مانگی کہ میں نے اپنی اولاد کو یہاں بسا دیا ہے۔

(۴) فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ ...... (۱۴/۳۷)

بارالٰہا! تو ایسا کر دے کہ لوگوں (الناس) کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔

اس شہر پر یہاں کے رہنے والوں کی اجارہ داری نہیں۔

(۵) جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، اس کے دروازے تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں کھلے رہیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں بھی کعبہ کا ذکر ہے، اسے الناس (نوعِ انسان) کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے

حج۔ تمام نوعِ انسانی کا نقطۂ اجتماع

اجتماع (حج) کے سلسلہ میں بھی، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲/۲۷) تو تمام نوعِ انسان کو دعوت دے کہ وہ یہاں آئیں لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸)۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (۳/۹۶)۔ جو لوگ (الناس) بھی اس تک پہنچنے کی راہ پائیں ان سے کہو کہ وہ یہاں آئیں۔ بشرطیکہ ان کا اس طرح جمع مقصدِ خداوندی کے حصول کے لئے ہو۔ اپنے اپنے گروہی یا قومی مفاد کی خاطر نہ ہو کہ اس سے فساد پھیلتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ الدین (اسلامی نظام) کا عالمگیر انسانیت کو امتِ واحدہ بنانے کا جو پروگرام ہے، کعبہ کس طرح اس کا مرکز قرار دیا گیا ہے اور حج کا اجتماع اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ جسے امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے، اس کے ذمہ اس مرکز کی نگہداشت اور اس اجتماع کا اہتمام کرنا ہے اس لئے اس امت کے متعلق بھی کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹)۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو اِمَامًا لِّلنَّاسِ کہا گیا تھا تو اس سے مقصد کیا تھا؟ وہ اس نظام کے داعیٔ اوّل تھے جس کا منتہیٰ تمام عالمِ انسانیت کو ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا تھا اور یہی

تھا وہ ابراہیمی مسلک (ملّۃ ابراھیمی) جس کے اتباع کا تمام اہلِ مذاہب کو حکم دیا گیا تھا (۲/۱۳۵) حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا کہ ۔۔۔ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (۱۶/۱۲۳) ہم نے تیری طرف بھی یہی وحی بھیجی ہے۔ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر، ملتِ ابراہیمی کا اتباع کرو۔ اور امتِ مسلمہ (جماعتِ مومنین) سے کہا کہ

۲/۱۲۵ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ (۲/۱۲۵)

تم مقامِ ابراہیمی کے حصول کو اپنی تگ و تازِ حیات کی جولانگاہ بناؤ۔

تمہاری سعی و کاوش کی غایت، جد و جہدِ حیات کا مقصد، مقامِ ابراہیمی کا حصول ہونا چاہیئے۔ یعنی نوعِ انسان کی امامت۔

مقامِ ابراہیمی

اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اُسی کے مسلک و مشرب (ملت) کا اتباع کرو۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ (مصلّی کے معنی جلد اول صفحہ ۹۸ بسلسلہ صلوٰۃ۔ زیرِ آیت (۲/۳) واضح کئے گئے ہیں)۔

آیتِ زیرِ نظر (۲/۱۲۵) کا باقیماندہ حصہ یہ ہے۔

۲/۱۲۵ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ (۲/۱۲۵)

ہم نے (معمارانِ حرم) ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو عالمگیر انسانیت کا مرکز بنائیں۔ اور اسے انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے پاک اور صاف رکھ کر اس جماعت کے لئے مخصوص کر دیں جس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے یعنی ان کی پوری پوری اطاعت کر کے، ایسی پوزیشن اختیار کرے کہ وہ تمام نوعِ انسان کی پاسبان اور نگران ہو۔ ان کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوارے اور ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرے۔

(رکوع اور سجود کا مفہوم، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲۔ آیت (۲/۴۳)۔ اور سجدہ کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۹۵۔ زیرِ آیت (۲/۳۴) بیان کیا جا چکا ہے۔

طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہوتے ہیں۔ اَلطَّآئِفُ، چوکیدار یا کوتوال کو کہتے ہیں جو رات کو حفاظت کے لئے پہرے اور چکر لگائے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس نظام کی حامل امت کو، جس کا مرکز کعبہ ہے، خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۰۹) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ قوم

طواف کا مفہوم

جسے نوعِ انسان کی فلاح وبہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) یہ آیت، ان آیات کے درمیان آئی ہے جن میں کعبہ کی اہمیت کا ذکر ہے۔ اس امت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُمَّةً وَّسَطًا ہے۔ وسطاً اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں میں سے ہر ایک سے یکساں فاصلے پر ہو، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ وہ قوم (امت) ہوگی جو تمام نوعِ انسان سے یکساں فاصلے پر ہو۔ جو نہ کسی کی طرف یونہی جھکے، نہ کسی سے یونہی کھنچ کر رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عدل کرنے والی قوم کا اس سے زیادہ جامع تصور کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

اس کے بعد دیکھئے کہ اس امت کا فریضہ کیا بتایا گیا ہے۔ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ تمام اقوامِ عالم کے اعمال وکردار کی نگران، یعنی یہ دیکھنے والی کہ کوئی قوم جادۂ عدل وانصاف سے اِدھر اُدھر تو نہیں ہوئی۔ اور ان کا رسول (نظامِ خداوندی کی آخری اتھارٹی) ان کے اعمال وکردار کا نگران۔ اقوامِ عالم کی اس نگرانی اور نگہبانی کی جہت سے انہیں طآئفین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی ان کی حفاظت اور نگرانی کرنے والی قوم۔

ان کی دوسری خصوصیت عاکفین بتائی گئی ہے۔ عَكَفَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے

عاکف کا مفہوم

اسے لڑی میں پرو دینا جس طرح موتیوں کو دھاگے میں پرو کر انہیں سلک گہر بار بنا دیا اور اس طرح بکھرنے سے بچا لیا جاتا ہے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں بنا اور سنوار دینا۔ ان کی مشاطگی کر دینا۔ لہٰذا، عاکفین کے معنی ہوں گے وہ امت جو اقوامِ عالم کے منتشر شیرازہ کو منظم کر دے اور ان کے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا دے۔ چونکہ اس مقصد کے لئے بڑے گہرے غور وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کسی پُرسکون ماحول میں رُک کر، ٹھہر کر، بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے ثانوی طور پر اس کے معنی کسی جگہ رک کر بیٹھنے والے ... بھی آتے ہیں۔

یہ ہوا قرآنی مفہوم، طآئفین، عاکفین اور رکع السجود کا۔ یعنی ان خصوصیات کی حامل ہوگی وہ قوم جس کے ہاتھوں وہ

بیتی کا مفہوم

نظام متشکل ہوگا جس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہاں قرآن نے کعبہ کو بَيْتِيَ کہا ہے — یعنی میرا گھر — اس کائنات میں ہر شے خدا کی ہے لیکن وہ بعض چیزوں کو خصوصیات سے "میری" کہہ کر پکارتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص قوم، خاص گروہ، خاص جماعت، یا خاص افراد کی ملک نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوعِ انسان کے مشترکہ مفاد کے لئے کھلی رہیں گی۔ اس کی بیّن مثال قومِ ثمود اور حضرت صالحؑ کی کشمکش کی داستان ہیں

ملتی ہے۔ اس قوم کی حالت یہ تھی کہ وہاں کی چراگاہیں اور چشمے بڑے بڑے سرداروں کی اونٹنیوں کے لئے مخصوص تھے اور غریبوں کے مویشیوں کی ان تک رسائی مشکل تھی۔ حضرت صالحؑ نے اس سلب ونہب اور جور واستبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ (المختصر) طے یہ پایا کہ تمام مویشیوں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور ہر ایک جانور اپنی باری پر ان سے متمتع ہو۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا کوئی بیّن ثبوت ہونا چاہیئے کہ تم اپنے اس عہد کی پابندی کرتے ہو یا نہیں۔ اور ثبوت کی عملی شکل یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی سردار کی ملکیت ہے نہ کسی غریب کی۔ بلکہ یہ سب کی مشترکہ اونٹنی ہے۔ اگر تم نے اسے اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تم اپنے عہد پر پابند رہے ہو۔ اس اونٹنی کو نَاقَۃَ اللہ کہہ کر پکارا گیا (۷/۷۳) یعنی نہ میری نہ تیری۔ بلکہ سب کی مشترکہ۔

اسی طرح اس نے کہا ہے کہ اگر کسی خاص خطۂ زمین کو مستبد قوتیں، اپنی ملکیت تصور کر کے تم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں تو تمہیں چاہیئے کہ وہاں سے کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جس پر کوئی قابض نہ ہو۔ اسے بھی خدا نے "ارضی" کہہ کر پکارا ہے (۲۹/۵۶) یعنی "میری زمین" حالانکہ ساری زمین خدا ہی کی ہے۔

ان مثالوں کی روشنی میں بَیتی کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ گھر جو دنیا میں کسی فرد یا کسی قوم کا نہیں بلکہ وہ تمام نوعِ انسان کا مشترکہ گھر ہے کیونکہ ان کے اللہ کا گھر ہے۔

یہ تھا وہ "اللہ کا گھر" جسے پاک اور صاف رکھنے کے لئے معمارانِ حرم کو تاکید کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ طہارت

تطہیرِ کعبہ

کا لفظ جسمانی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے لیکن یہ قلب ونگاہ، خیالات، نظریات، معتقدات کی پاکیزگی کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں منافقین کے متعلق ہے۔ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ۔ (۵/۴۱)۔ ان کے قلوب پاکیزہ ہو ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا "خدا کے گھر" کو پاکیزہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے جس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے اس میں انسانی خیالات اور نظریات کی آمیزش نہیں ہونی چاہیئے۔ اسے خالصتہً اقدارِ خداوندی کے لئے وقف رہنا چاہیئے۔

یہ تھی کعبہ کی حقیقت اور کیفیت دینِ خداوندی میں۔ لیکن بعد میں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ آپ مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۱۲۲ کو سامنے لائیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہار، محسوس حرکات کی رُو سے ہوتا ہے۔ دین کے نظام کی غایت تو انسانی قلب ونگاہ میں منشار ایزدی (قرآنِ کریم) کے مطابق تبدیلی پیدا کرنا ہے جس کے لئے اس نے کچھ اصول، اقدار اور احکام دیئے ہیں۔ لیکن ان اقدار واحکام کی تعمیل کے مظاہر، خارجی حرکات ہوتی ہیں۔ نماز میں رکوع وسجود اس کی بیّن مثال ہے۔

مذہب میں کعبہ کی حیثیت

اسی طرح کعبہ بھی، امّت کی مرکزیت کی محسوس علامت، اور حج ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کی محسوس شکل ہے۔ لیکن مذہب میں ہوتا یہ ہے کہ ان احکام کی غرض و غایت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی محسوس شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اب کعبہ کی حیثیت محض ایک "مقدّس مقام" کی رہ گئی ہے اور حج، ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی۔ اب تطہیرِ کعبہ کے لئے اس مکان کو گلاب اور کیوڑہ سے غسل دیا جاتا، اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے اس کے گرد طواف کر لیا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی مظاہر مقصود بالذات بن جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی سے انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے فریضۂ خداوندی ادا کر دیا۔ یہی وہ "اعمال" ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ (۱۸/۱۰۵)۔ وہ بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی ایک تو وہ لوگ ہیں جو کچھ کرتے ہی نہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں کہ اس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھاتے اور صبر آزما تکالیف برداشت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں۔ ایسے رائیگاں کہ لَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (۱۸/۱۰۵)۔ اعمال کا بدلہ (نتیجہ) متعین کرنے کے وقت، ان کے لئے میزان (ترازو) کھڑے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہیں اَخْسَرِينَ أَعْمَالًا۔ (۱۸/۱۰۳)۔ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جنھیں ان کے اعمال کی وجہ سے شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یعنی بے عملی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن اعمال کی وجہ سے جو محض رسمی طور پر ادا کئے گئے تھے۔

بات تعمیرِ کعبہ کی ہو رہی تھی۔ اس کی تفصیل اگلی چار آیات میں دی گئی ہے۔ آیت (۲/۱۲۷) میں کہا گیا ہے کہ وہ دونوں، باپ بیٹا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کعبہ کی بنیادوں کو استوار کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ خدا سے دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ ان دعاؤں میں پہلی دعا یہ تھی کہ:

۲/۱۲۶ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (۲/۱۲۶)

ابراہیمؑ نے اس مرکزیت کی بنیاد رکھ دی اور خدا سے التجا کی کہ اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے، امن اور پناہ کی جگہ بن جائے۔

(۳/۹۶) اور ان میں سے جو لوگ تیرے قوانین کی صداقتوں پر یقین اور مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھیں، خواہ وہ

کہیں کے رہنے والے بھی کیوں نہ ہوں (۲۲/۲۵)۔ انہیں زندگی کی آسائشیں اور سامانِ زیست کی فراوانیاں عطا کر دے (۱۴/۳۷)۔

خدا نے کہا کہ بے شک ان لوگوں کو یہ کچھ ملے گا۔ باقی رہے وہ جو اس سے انکار کریں گے، تو ہمارے طبعی قوانین کے مطابق، انہیں بھی زندگی کے عاجلہ مفاد ضرور حاصل ہوں گے (۱۷/۱۸-۲۰)۔ لیکن انجام کار وہ نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھنچے چلے جائیں گے ـــ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کا مآل یہ ہو!

رزق کی دُعا

دیکھئے! تعمیرِ کعبہ جیسے عظیم اور مقدس فریضہ سے سبکدوش ہونے کے بعد، سب سے پہلی دعا جو ان کے لبوں کو چومتی ہے، یہ ہے کہ انہیں رزق اور امن عطا فرما۔ اس سے رزق اور امن کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ خداوندی کی تشکیل اور استحکام کا فریضہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ یہ قوم ہر قسم کے خطرات سے مامون اور معاش کی طرف سے مطمئن ہو۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے سورۂ نحل کی آیت (۱۶/۱۱۲) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھو۔ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ .... (۱۶/۱۱۲)۔ ایک بستی تھی جسے خطرات کی طرف سے مامونیت اور معاش کی طرف سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف چاروں سمت سے سامانِ رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ ۔ (۱۶/۱۱۲) یہ انعاماتِ خداوندی تھے لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں ان بخشائشوں سے نوازا گیا تھا، انہوں نے انہیں اس کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے خدا کے مقرر کردہ معاشی نظام کے خلاف اپنا نظام قائم کر لیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔ (۱۶/۱۱۲) ان کے خود ساختہ نظامِ معیشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فلقے آنے شروع ہو گئے اور اُن کا امن خطرات میں گھر گیا۔ یہ سب اُن کے اپنے وضع کردہ غلط نظام کا نتیجہ تھا۔ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے کا لازمی نتیجہ رزق کی تنگی ہوتا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا .... (۲۰/۱۲۴) جو قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور اس طرح (یوں سمجھو کہ) وہ دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے اور ـــ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ (۲۰/۱۲۴) اور جو شخص دنیا میں اندھا ہو جاتا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہتا ہے۔ بلکہ وہاں یہ تاریکیاں زیادہ شدید ہو جاتی ہیں (۱۷/۷۲)۔ کعبہ اس نظام کا مرکز ہے جس میں رزق کی فراوانیاں بھی ہوتی ہیں اور ہر طرح کا امن و اطمینان بھی۔ چنانچہ قریش سے جو اس نظام کے قیام کی مخالفت کرتے تھے، یہی کہا گیا تھا:۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ - اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ - فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ -
الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ - (۱۰۶/۱-۴)

قریش کعبے کے متولی ہیں، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و عظمت ہے۔ اسی عزت و احترام کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹے گا۔ چنانچہ یہ سردی اور گرمی، سال بھر، اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔

کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے قریش کو اس قدر فوائد حاصل ہیں، لیکن جس مقصد کے لئے انہیں اس کا متولی بنایا گیا تھا، انہوں نے اسے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ انہیں خدا نے بھوک اور خوف سے نجات دلائی تھی، تاکہ یہ اس طرح مامون و مطمئن ہو کر، کعبے کو نظامِ خداوندی کا مرکز بنائیں۔ (لیکن انہوں نے اسے یاترا کا تیرتھ بنا کر رکھ دیا اور خود اس کے مہنت بن گئے۔)

یہ غلط ہے۔ انہیں چاہیئے کہ یہ اُس گھر کے مالک (یعنی خدا) کے قوانین کی اطاعت کریں، جس گھر کے ساتھ نسبت نے انہیں یہ مقام عطا کر رکھا ہے۔ (یہ کام اب اس جماعت کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو اس مقصد کے لئے متشکل کی جارہی ہے)۔

رزق کے متعلق دعائے ابراہیمی دوسرے مقام پر ان الفاظ میں مذکور ہے:

رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ - (۱۴/۳۷)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں نے (اس مقصدِ عظیم کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو، تیرے واجب الاحترام گھر کے پاس لا کر بسا دیا ہے (اسے "تیرا گھر" اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام انفرادی نسبتوں سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کی مشترکہ جائے امن ہے)۔ یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔

میں نے یہ سب اہتمام اس لئے کیا ہے کہ میری اولاد نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرے — یعنی اس نظام کو جس میں تمام افراد تیرے قوانین کا اتباع کریں — سو، اے ہمارے نشوونما دینے والے! ایسا کر دے کہ (ان تمام، بظاہر، ناسازگار حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز تو، ان کے لئے، زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق فراہم کر دے۔ (۲/۱۲۶) تاکہ (یہ معیشت کی طرف سے مطمئن ہو کر، اس مقصد کے حصول کے لئے،

ایسے جذب و انہماک سے کام کریں کہ) ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔

(قرآن کے معاشی نظام کے متعلق دیکھئے جلد اوّل صفحہ ۱۰۵۔ آیت ۲/۳ ؛ صفحہ ۲۹۴۔ آیت ۲/۲۲)

(٠)

یہاں ایک لمحہ کے لئے رُک جائیے۔ دعائے ابراہیمی میں کہا گیا ہے۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا۔ (۱۴/۳۵) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو اس شہر (بلد) کو امن کی جگہ بنا دے"۔ (۲/۱۲۶) اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد (حضرت اسمٰعیلؑ) کو جس جگہ بسایا تھا، وہ وادی تو ایسی تھی جہاں زراعت نہیں ہوتی تھی لیکن جہاں انہیں بسایا تھا وہ ایک شہر (مکہ) تھا۔ اس سے بھی اس روایت (اور تورات کے بیان) کی تردید ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے (اور جو پہلے گزر چکی ہے) کہ آپ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو کسی ویرانے میں چھوڑ گئے تھے۔ بہرحال اس ضمنی نکتہ کے بعد آگے بڑھئے۔

ربوبیتِ عالمینی

دعائے ابراہیمی میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ: وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (۲/۱۲۶) "یہاں کے رہنے والوں میں سے، جو اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے، اسے رزق عطا فرما"۔ یعنی انہوں نے رزقِ خداوندی کو جماعتِ مومنین تک محدود اور مختص کر دیا تھا۔ لیکن خدا تو رب العالمین ہے اس نے فوراً یہ کہہ کر اس کی تصحیح کر دی کہ:۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (۲/۱۲۶)

خدا نے کہا کہ بے شک جماعتِ مومنین کو وہ کچھ ملے گا جس کے متعلق تم نے دعا مانگی ہے۔ لیکن جو اس سے انکار کریں گے ان پر بھی رزق کے دروازے بند نہیں ہوں گے۔ انہیں ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق مفادِ عاجلہ ضرور حاصل ہوں گے۔ فرق یہ ہو گا کہ یہ لوگ آخر کار نہایت بے بسی کی حالت میں مصیبت کی زندگی کی طرف کھنچے چلے جائیں گے کہ غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل جلد اوّل صفحہ ۱۵۰-۱۴۹ زیرِ آیت (۲/۴) ؛ صفحہ ۲۵۳۔ زیرِ آیت (۲/۱۶) ؛ صفحہ ۲۷۱۔ زیرِ آیت (۲/۲۰) میں ملے گی۔

(٠)

اس کے بعد آیات (۲/۱۲۸-۱۲۷) کو سامنے لائیے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ. رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا. اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا. اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. (۲/۱۲۸-۱۲۷) ۲/۱۲۸-۱۲۷

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے اس مرکزِ نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے ہاتھ اس کی تعمیر میں مصروف تھے اور لب پر یہ وجد انگیز دعائیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما دے کہ تو، دل میں مچلنے والی آرزوؤں کو جانتا اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے، اس لئے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت اس مرکز کی تعمیر کے لئے کوشاں ہیں۔ اور وہ ارادے اس کے سوا کیا ہیں کہ اس مرکز کے ساتھ وابستہ رہ کر، ہم تیرے ضابطۂ قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور ہمارے سر اس کے سامنے جھکے رہیں ـــــ نہ صرف ہم ہی، بلکہ ہماری آنے والی نسلوں میں بھی وہ لوگ پیدا ہوں جو، اسی طرح تیرے قوانین کی اطاعت کرنے والے ہوں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمیں وہ طور طریق بتا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، اور تیری عنایات و انعامات کا رخ ہماری طرف رہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جونہی کسی نے اُس کی طرف رُخ کیا، وہ اپنے سامانِ رحمت و ربوبیت کو لئے، خود اُس کی طرف بڑھ آیا۔ (۲/۱۶۰)۔

اس کے بعد ان حسین آرزوؤں کے مقطع کا بند جس میں بتایا گیا ہے کہ وحدتِ انسانیہ کے اس مرکز (کعبہ) کے لئے وادیٔ حجاز کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے نگہ انتخاب حضرت اسمٰعیلؑ پر کیوں پڑی تھی۔ دعا مانگی کہ:-

۲/۱۲۹ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْھِمْ. اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ. (۲/۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار! ہماری اولاد میں یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے، تاآنکہ اُن میں سے، اس دعوتِ انقلاب

کو دے کر، وہ رسول اٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو اُس کی آخری اور مکمل شکل میں اُن کے سامنے پیش کر دے (۵/۱۱۹)۔ انہیں اس ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دے، اور یہ بھی بتاتے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (۲/۱۳۱؛ ۱۷/۹۳؛ ۳۳/۳۴) اور (صرف نظری طور پر ہی تعلیم نہ دے بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور اُن کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے۔

اس قسم کی نشو و نما، قوت اور حکمت، دونوں کے امتزاج سے ہو سکتی ہے، اور ان دونوں کا امتزاج تیرے متعین کردہ نظام ہی کے اندر ممکن ہے۔ (۵۷/۲۵)

حضورِ نبی اکرمؐ کی ان خصوصیات یا مناصبِ رسالت کا ذکر (۲/۱۵۱)؛ (۳/۱۶۴)؛ (۶۲/۲) میں بھی آیا ہے حضورؐ کے فریضۂ تزکیہ کی تشریح، جلد دوم، صفحہ ۲۵ زیرِ آیت (۲/۱۴) بیان کی جا چکی ہے۔

یہ تھا وہ نظام جس کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ نے کی اور حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں تکمیل تک پہنچا۔ اسی کو مسلکِ ابراہیمی (ملتِ ابراہیمی) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس مسلک کے متعلق کہا کہ:

۲/۱۳۰

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۔ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔(۲/۱۳۰)

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مسلک سے اعراض وہی برت سکتا ہے جو اپنے آپ کو بیوقوف بنائے۔ سفاہت کے معنی حماقت بھی ہیں لیکن یہاں جو مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ کہا تو اس سے فکر کا رُخ کسی اور سمت کو مُڑ جاتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ انسانی ذات کی نشو و نما تاکہ یہ اس دنیا میں بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی بسر کر سکے اور اس کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔ آسمانی رشد و ہدایت اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے نظامِ خداوندی (الدین) کی غرض و غایت یہی ہے۔ اسی کے لئے حضور نبی اکرمؐ کا فریضہ (يُزَكِّيْهِمْ) بتایا گیا ہے۔ مسلکِ ابراہیمی کے اتباع سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مسلک کو وہی اختیار کریگا جو اپنی ذات کی قدر و قیمت جانتا ہو۔ جو اس کی نشو و نما کی اہمیت کا پورا

انسانی ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنا

پورا احساس رکھتا ہو۔ جو اس کی اہمیت کا احساس نہ کرے، اس کی وقعت نہ پہچانے، اس کی صحیح قدر و قیمت نہ جانے، اس لئے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھے جس توجہ کی یہ مستحق ہے، اسے وہ توجہ نہ دے، تو وہ اس مسلک سے برگشتگی اختیار کریگا۔ مَنْ

سَفِہَ نَفْسَہٗ کے یہی معنی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ان دو لفظوں میں قرآنِ کریم انسانی زندگی کے متعلق دو زوایۂ نگاہ کو کس قدر بلیغ انداز سے سامنے لایا ہے۔ انسانی ذات کو درخورِ اعتناء نہ سمجھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سیکولر نظریۂ حیات کے قائل جن کے نزدیک انسان عبارت ہے اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے، اور بس۔ جب وہ انسانی ذات کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کے درخورِ توجہ قرار دینے کا سوال کہاں پیدا ہوگا؟

(۲) مذہبی پیشوائیت کے سامنے بھی انسانی ذات کا سوال نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک چند احکام کی میکانکی اطاعت سے اسلام کا منشاء پورا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کو عذابِ جہنم سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر اس میں کچھ کسر رہ جاتے تو اسے خدا کی بخشش یا شفاعت پورا کر دیتی ہے۔

(۳) اربابِ طریقت کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ ان کی نگاہ تزکیۂ نفس پر ہوتی ہے۔ لیکن تزکیۂ نفس سے ان کی مراد انسانی ذات کی نشوونما نہیں، بلکہ اسے فنا کر دینا ہے — اس دنیا میں ترکِ علائق سے اور آخرت میں ذاتِ خداوندی میں جذب ہو جانے سے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۴۵۔ آیت ۱/۵؛ صفحہ ۳۵۱۔ آیت ۲/۲۸؛ جلد دوم صفحہ ۲۰۵۔ آیت ۳/۱۰۲ میں ملے گی)۔

لہٰذا ان میں سے کوئی بھی مسلکِ ابراہیمی کا متبع نہیں ہو سکتا۔ اس کا اتباع وہی کرے گا جو نظامِ خداوندی کے تحت زندگی بسر کرنے سے اپنی ذات کی نشوونما کی کوشش کرے۔ اس مسلک کی بنیاد رکھنے والے (حضرت ابراہیمؑ) کی خصوصیت یہ تھی کہ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (۲/۱۳۰) اس کی اس دنیا کی زندگی بھی برگزیدہ تھی اور آخرت میں بھی اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے ہوں گے۔ (نیز دیکھئے ۱۶/۱۲۰-۱۲۲)۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (دنیاوی خوشگواریوں اور سرفرازیوں) کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے ماحصل کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔ (۴/۵۴)۔ انہیں ایک عظیم مملکت عطا کی تھی۔ دوسری جگہ ہے کہ وہ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵)۔ یعنی انہیں قوت اور بصیرت دونوں حاصل تھیں۔

یہ برگزیدگی اور مقامِ بلند کس طرح حاصل ہوا، اسے بھی قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص و منفرد انداز کے مطابق نہایت مختصر لیکن جامع شکل میں بیان کر دیا جب کہا کہ:-

۲/۱۳۱ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲/۱۳۱)

جب اُس کے نشوونما دینے والے نے اس سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جُھک جاؤ (ان کی اطاعت اختیار کرو) تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے لبّیک ! اللّٰھم لبّیک ! کہتے ہوئے ان کے سامنے جُھک گیا۔ ان احکام کی غرض و غایت کیا تھی ؟ ربوبیتِ عالمینی ــــ عالمگیر انسانیت کی نشوونما۔ (ربوبیتِ عالمینی کی تفصیل، جلد اوّل صفحہ ۱۸-۱۶ آیت (۱/۲) میں گزر چکی ہے۔)

یہاں تک بات حضرت ابراہیمؑ کی ذات تک محدود تھی۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان کے بعد اس نظام کے جاری رہنے کی کیا صورت تھی۔ ہم سابقہ صفحات میں آیت (۲/۱۲۴) کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ پر اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ نظام اور اس کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں وراثتاً منتقل نہیں ہو جائیں گی۔ ہر نسل کو اپنی سعی و کاوش سے انہیں حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے:۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۔ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ
۲/۱۳۲ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (۲/۱۳۲)

ابراہیمؑ خود بھی اس مسلک پر کاربند رہا اور اپنے بیٹوں کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تلقین و تاکید کی۔ اسی طرح (ان یہودیوں کے جدِ امجد۔ اسرائیل یعنی) یعقوبؑ نے بھی اسی مسلک کی تاکید کی اور اپنی اولاد سے کہا کہ یہی وہ نظام ہے جسے خدا نے تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ لیکن اس مسلک کی پابندی کوئی ہنگامی یا وقتی بات نہیں۔ یہ تو تمہاری ساری زندگی کا شعار ہونا چاہیئے۔ تمہیں آخری سانس تک ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔

اسلام، عمر بھر کا پروگرام ہے

اس آیت کا آخری ٹکڑا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی کا انحصار سانس لینے پر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے ایک بار سانس... لیا یا کبھی کبھی سانس لے لیا تو اس سے زندگی برقرار رہے گی۔ یہ تو زندگی بھر کا عملِ پیہم اور شعارِ مسلسل ہے۔ جونہی اس سے انقطاع ہوا، زندگی ختم ہو گئی۔ طبیعی زندگی کی طرح انسان کی "انسانی زندگی" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ حیات آور شعار ایسا نہیں کہ اسے جب جی چاہا اختیار کر لیا اور جب جی چاہا چھوڑ دیا۔ اسے تو مسلسل اختیار کئے رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے استقامت شرط ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ..... (۴۱/۳۰ ؛ ۴۶/۱۳)۔ "جن لوگوں نے اس حقیقت کا اقرار اعلان کر دیا کہ ہمارا رب صرف اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و اعلان پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے"۔ یعنی دعوائے ایمان کے بعد استقامت بنیادی شرط ہے۔ یہ ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ــ ساری عمر مسلم رہنے سے مراد۔

اس کے بعد قرآنِ کریم بالواسطہ یہودیوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تھا تمہارے اسلاف کا مسلک۔ اس کے برعکس، تم اس عقیدہ پر جمے بیٹھے ہو کہ تمہیں دنیا کی تمام خوشگواریاں، اور عاقبت کی شادابیاں محض اس لئے مل جائیں گی کہ تم اُن برگزیدہ ہستیوں کی اولاد ہو! یہ عقیدہ یکسر باطل ہے جس کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہوسکتی۔ وہ اُن سے کہتا ہے کہ :-

۲/۱۳۳ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ۚ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۔ (۲/۱۳۳)

کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے مورثِ اعلیٰ (حضرت) یعقوبؑ نے (جن کے لقب، اسرائیل کی نسبت سے تم اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہو) مرتے وقت اپنی اولاد کو کیا وصیّت کی تھی؟ تمہیں معلوم نہ ہو تو آؤ ہم تمھیں بتائیں۔ اس نے ان سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی محکومیت (عبدیت) اختیار کروگے؟ انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم اسی خدا کے قوانین کی اطاعت کریں گے جس کی اطاعت ہمارے آبا وَ اجداد — ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ — کرتے رہے ہیں، اور جس کی محکومیت خود آپ نے اختیار کی تھی۔ وہی ایک صاحبِ اقتدار ایسا ہے جس کی محکومیت اختیار کرنا وجہِ شرفِ انسانیت ہے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے، اور اسی طرح اس نظام کو مسلسل مستحکم بنائیں گے جیسے انہوں نے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد کہا :-

۲/۱۳۴ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـئَلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۔ (۲/۱۳۴)

یہودیوں سے کہا کہ یہ ہیں تمہارے اسلاف جن میں سے ہر ایک نے قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کی اور اس طرح وہ نوازشاتِ خداوندی کے سزاوار قرار پائے۔ لیکن تم ہو جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ محض ان کی نسل میں ہونے کی بنا پر تم ان تمام خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جاؤ گے جو تمہارے اجداد و اسلاف کو ان کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں ملی تھیں، یاد رکھو! ہر فرد کے لئے اس کے اپنے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ باپ کے حسنِ عمل کے نتائج بیٹے کو وراثتاً مل جائیں، چہ جائیکہ کسی قوم کے صدیوں پہلے گزرے ہوئے اسلاف کے اعمال کے نتائج ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتے جائیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے۔ قطعاً نہیں۔ یہ محض خوش فہمی اور فریبِ نفس ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے ثمرات ان کے لئے تھے، جو کچھ تم کروگے اس کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ظہورِ نتائج کے وقت تم سے پوچھا جائے کہ تمہارے اسلاف

ہر ایک کے اپنے اعمال

کے اعمال کس قسم کے تھے، اور جب تم ان کے اعمالِ حسنہ کی تفصیل بتاؤ تو کہا جاتے کہ جاؤ۔ ان کے حسنِ عمل کے ثمرات و برکات کے تم حقدار ہو۔ ان سے بہرہ یاب ہو جاؤ۔ ایسا سمجھنا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے یکسر خلاف ہے۔ وہ لوگ اپنے اعمال اپنے ساتھ لے کر دنیا سے گزر گئے۔ ان کا بدلہ انہیں ملے گا۔ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے۔ تم سے پوچھا تک نہیں جائے گا کہ تم کس کی اولاد ہو اور تمہارے اسلاف نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے تھے۔

اس آیۂ جلیلہ میں، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ایک عظیم بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ زندہ قوموں کی ہر

قوموں کے عروج و زوال کا قانون

نئی نسل اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کو لے کر، اپنی سعی و کاوش سے ان کے قائم کردہ نظام کو آگے بڑھاتی ہے اور یوں، اس تسلسلِ سعی و کاوش سے، وہ ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جب کسی قوم کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے تو وہ خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے اسلاف کے درخشندہ کارناموں کو گنا گنا، اور اچھال اچھال کر، اپنے آپ کو اطمینان (یعنی فریب) دے لیتی ہے کہ وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں۔ وہ فخر یہ کہتی ہے کہ یہ قومیں جو آج آگے بڑھ رہی ہیں، انہوں نے یہ سب کچھ ہمارے ہی اسلاف سے لیا ہے۔

آج ہماری حالت ایسی ہو چکی ہے جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو! اقوامِ مغرب نے علم و ہنر اور تسخیرِ فطرت میں کس قدر ترقی کی ہے اور وہ کس طرح مصافِ زندگی میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں، تو بجائے اس کے ہم اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی پستی سے نکلنے کی کوشش کریں، ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے آج اس قدر ترقی کر لی ہے تو پھر کیا ہوا؟ ہمارے اسلاف نے ان سے بھی کہیں بڑھ کر تحقیقات کی تھیں۔ ان کی ترقی اُنہی کی تحقیقات کی رہینِ منت ہے اور اس جواب سے ہم اپنے انا (E G O) کی تسکین کر لیتے ہیں، حالانکہ اس کی حقیقت فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

اس آیت میں دوسرا اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم اس جھگڑے میں مت پڑو کہ تمہارے اسلاف میں سے کون بڑا

اسلاف کی بابت مت جھگڑو

تھا اور کون چھوٹا۔ کون حق پر تھا اور کون ناحق۔ ہم تم سے یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ ہم یہ پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا؟ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ ان کے اعمال ان کے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔

لیکن مذہب کا تو دار و مدار ہی شخصیتوں پہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں ساری بحثیں اسلاف کے متعلق ہوتی

رہتی ہیں۔ ہر فرقہ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرقہ کے بانی اور اس کے وارثین کو افضل اور اشرف ترین ثابت کر دے۔ ہم ہزار برس سے اسی قسم کی بحثوں میں الجھے چلے آرہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم بڑا معرکہ مار رہے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم اسے، جس خدا کے "دین" کی بہت بڑی خدمت قرار دیتے ہیں، اس خدا کا ارشاد اور اعلان یہ ہے کہ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ "ہم تم سے ان بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے۔" اگر خدا کا یہ ارشاد ہمارے سامنے ہو تو یہ سارے فرقہ وارانہ نزاعات بحث و تمحیص، مناظرے اور مجادلے، جنگ و جدل سب ختم ہو جائیں۔ ان جھگڑوں سے تو مترشح ہوتا ہے گویا ہم کہہ رہے ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے ایسا کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے تمہارے بزرگوں کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے لیکن یہ (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) ہمیں دھوکے میں رکھنے کے لئے ہے۔ وہاں سب سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ فلاں بزرگ کے متعلق تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سوال کے جواب کے لئے پوری طرح تیاری کر کے خدا کے سامنے جانا چاہیئے۔

شخصیت پرستی

یاد رکھیئے۔ اس قسم کے خیالات اور معتقدات، قوم کو عالمِ کردار سے بیگانہ رکھنے کی سازشیں ہیں۔ قرآنِ کریم نوعِ انسان کو شخصیت پرستی کے طوق و سلاسل سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے وہ ہر شخص سے اس کے جوہرِ ذاتی کے متعلق پوچھتا ہے، اضافی نسبتوں کے متعلق نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایک اصول کی رُو سے، وہ انسان کو کس کس قسم کی غلامیوں کے پھندے سے آزادی دلا دیتا ہے؛ اس نے شخصیت پرستی کی غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ہم نے بعد میں زنجیروں کے انہی ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں جکڑ لیا۔

خدا ایں سخت جان را یار بادا ۔۔۔ کہ افتاد است از بامِ بلندے

(۰)

دین اللہ

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے تمام انبیاء کو دین ایک ہی ملا تھا۔ وہ دین اللہ تھا۔ یعنی خدا کا عطا کردہ الدین۔ اسے پھر سن لیجئے کہ قرآنِ کریم نے الدین (اسلام) کو دین اللہ (۳/۸۳، و دیگر مقامات) ۔۔۔ اللہ کا دین ۔۔۔ کہا ہے۔ اس کی نسبت (اور نو اور) کسی رسول کی طرف بھی نہیں کی۔ رسول، خدا کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے آتے تھے۔ وہ کوئی اپنا دین نہیں لاتے تھے لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ہر مذہب کی نسبت اُس کے بانی کی طرف ہو جاتی ہے ۔۔۔ مذہب سنت، یہ طبقہ

اس کی اولین نسبت' اس شخصیت کی طرف کر دیتا ہے جسے وہ بزعمِ خویش اس کا بانی قرار دیتا ہے حالانکہ رسوٗل کسی مذہب کے بانی نہیں ہوتے تھے (وہ مذہب لاتے ہی نہیں تھے اس لئے اس کے بانی کیسے ہوسکتے تھے۔ وہ دیٖن لاتے تھے اور چونکہ دیٖن خدا کا عطا کردہ ہوتا تھا اس لئے وہ اس دین کے بھی بانی نہیں ہوتے تھے۔) اس طرح مختلف مذاہب آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد' ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر فرقہ کی نسبت اس کے بانی (حقیقی یا مزعومہ) کی طرف کی جاتی ہے اور یوں ان فرقوں میں سر پھٹول ہوتی رہتی ہے۔ یہودی مذہب' اور عیسائی مذہب' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لائے ہوئے دینِ خداوندی کی محرّف شکلیں تھیں۔ یہ دونوں حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے تھے (حضرت عیسےٰؑ بھی بنی اسرائیل ہی سے متعلق تھے)۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ دینِ خداوندی کی دعوت دیتے تھے اور ان کی اسی دعوت (ملّتِ ابراہیمیؑ) کی طرف' رسولُ اللہ (قرآن کریم کے ذریعے) یہود و نصاریٰ کو بلا رہے تھے۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ:-

2/135 وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ (۲/۱۳۵)

یہ کہتے ہیں کہ تم مذہبِ یہودیت یا مذہبِ عیسائیت اختیار کرو تو سمجھا جائے گا کہ تم سیدھے راستے پر چل رہے ہو۔ ان سے کہا کہ یہ تمہاری خود ساختہ گروہ بندیاں ہیں جو تمہارے اپنے وضع کردہ مذہب کی پیدا کردہ ہیں۔ ہدایت' ملّتِ ابراہیمی (دینِ خداوندی) اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (یہودیت اور عیسائیت کی گروہ بندیوں کی تفصیل' جلد دوم صفحہ ۳۰۵۔ زیرِ آیات ۲/۶۱-۶۲ دی جا چکی ہے)

حنیف کا مفہوم

اس آیت میں' حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت حنیف بتائی گئی ہے اور یہ دین کی اصل و اساس ہے۔ حنیف کے معنی ہوتے ہیں اپنی توجہات کو تمام اطراف سے ہٹا کر' ایک نقطہ' ایک نصب العین' ایک مرکز پر مرکوز کر دینا۔ اپنی توجہ کو ہر دوسری سمت ہٹانا' لَآ اِلٰہَ ہے' اور ایک مرکز (دینِ خداوندی) پر مرکوز کرنا' اِلَّا اللّٰہ۔ اسی کو دوسری جگہ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۲۵۶)۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے۔ یعنی پہلے' ہر غیر خداوندی تصوّر' نظریہ' عقیدہ' مسلک سے منہ موڑنا' اور جب اس طرح انسانی فکر و نظر کی لوح صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایمان باللہ کا نقش ثبت کرنا۔ اگر غیر خداوندی تصوّرات و نظریات کا ذرا سا شائبہ بھی باقی رہ جائے تو یہ شرک ہوگا۔ دیٖن میں شرک کا سایہ تک نہیں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کفر بالطاغوت کی یہ تمام منازل ایک ایک کر کے طے کیں۔ (دیکھئے ۶/۷۵-۷۹) اور جب اس طرح ان تمام اطراف

سے منہ موڑ لیا تو پھر اعلان کیا کہ :۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (۶/۸۰)

میں ہر غیر خداوندی تصور اور عقیدہ سے بیزار ہو کر، اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے۔ میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ ہے میرا مسلک۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ دین اللہ میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اور جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں توحید باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا ہر مذہب شرک پر مبنی ہوتا ہے۔ مذہب میں فرقے ہوتے ہیں، اور فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔ (تفصیل جلد اوّل صفحہ ۱۷۲، زیر آیت ۲/۲ گزر چکی ہے)۔ لہٰذا، دین میں نہ مختلف مذاہب ہوتے ہیں، نہ فرقے۔ جہاں فرقے ہوں سمجھ لیجئے کہ وہاں نہ دین ہے نہ توحید۔

یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مذہبی گروہ بندیوں سے ہٹ کر، تمام نوعِ انسان کو دین کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کا فطری نتیجہ (یا تقاضا) اس حقیقت پر ایمان لانا اور اس کا اعلان کرنا تھا کہ تمام انبیاءِ کرام خدا کی طرف سے ہی (اور واحد) دین لے کر آئے تھے۔ اور ان کی اس حیثیت (یعنی نبوت و رسالت) میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ امتِ مسلمہ سے کہا کہ یہودی اور عیسائی تو اپنے اپنے گروہ بندانہ مسلک کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ تم اس مسلک کی دعوت دو کہ :۔

۲/۱۳۶ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (۲/۱۳۶)

تم ان سے کہو کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون سا مسلک ہے جسے اختیار کر کے ہم تمہاری خود ساختہ گروہ بندی اور نسل پرستی سے بلند ہو چکے ہیں۔ وہ مسلک یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے ہیں جو اس نے اس رسول کی وساطت سے، ہماری طرف بھیجا ہے۔ (یہ اپنی اصل و اساس کی رُو سے اسی قسم کا ضابطۂ زندگی ہے جس قسم کا ضابطہ .... اس سے پہلے) حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ نیز حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور دیگر انبیاءؑ بنی اسرائیل بلکہ تمام انبیاءؑ کی طرف نازل ہوا تھا۔ ہم ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ

کو ایک ہی سلسلہ کی کڑی سمجھتے ہیں اور منصبِ نبوت کے حامل ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرتے، اگرچہ مدارج کے اعتبار سے ان میں فرق ضرور ہے (۲/۲۵۳)۔ یہ ہے وہ مسلک جس کی رُو سے ہم خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یعنی ان قوانین کی جن میں انسانی آمیزش کا شائبہ تک نہیں۔

اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ سابقہ کتابوں پر ایمان کا مطلب کیا ہے۔ اس کی بابت جلد اول صفحہ ۱۴۳ زیرِ آیت (۲/۴) وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ جلد دوم صفحہ ۲۶۵۔ آیت (۲/۲۱۳) میں بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملی تھی۔

ہر نبی کو کتاب ملی تھی

یہ عقیدہ باطل ہے کہ رسول کتاب کے ساتھ آتا تھا اور نبی بلا کتاب۔ اس آیت میں جن انبیاء کرامؑ کا نام لیا گیا ہے ان میں صحفِ ابراہیمؑ اور کتابِ موسیٰؑ اور کتابِ عیسیٰؑ کا ذکر تو قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ باقی انبیاء کی کتابوں کا کوئی ذکر نہیں آیا، لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کی طرف بھی کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ اور "وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ" میں جامع طور پر کہہ دیا کہ تمام انبیاء کو کتابیں ملی تھیں۔

اس وضاحت کے بعد کہا کہ:-

۲/۱۳۷ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۔ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو اس وقت یہ خدا کے متعین کردہ راستے پر گامزن ہونگے۔

اہلِ کتاب سے ایمان لانے کا مطالبہ

اور اگر یہ اس سے اعراض برتیں گے تو ان کا یہ اعراض اس راستے سے الگ ہو جانے کے مرادف ہوگا جس پر حضرات انبیاء کرامؑ چلتے آئے ہیں۔ اگر انہوں نے اس راستے سے اعراض برتا تو یہ تمہاری مخالفت مسلسل کرتے رہیں گے لیکن تمہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمارے نظام میں جس کی تم اطاعت کرتے ہو، اتنی قوت ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

"فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا" ایک عظیم حقیقت کی کشاف ہے۔ دنیا میں (کم و بیش) تمام اہلِ مذاہب خدا کو بھی مانتے ہیں اور حیاتِ آخرت کو بھی۔ لیکن قرآن، ان کے اس ایمان کو ایمان

ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور آخرت کا جو تصور خود خدا نے (قرآن میں) پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق ایمان درحقیقت ایمان کہلا سکتا ہے۔ (ایمان کا مفہوم جلد اول صفحہ ۲ ۔ آیت (۲/۳) میں واضح کیا جا چکا ہے) یہی وجہ ہے کہ وہ جنہیں اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے، ان سے بھی اسی انداز کے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی وضاحت جلد اول صفحہ ۱ ۔ آیت (۲/۱) اور صفحہ ۴۳ ۔ آیت (۲/۴) میں آچکی ہے جہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ "برہمو سماجی اسلام" جسے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے خاص مصلحتوں کے تحت پیش کیا تھا، قرآنی اسلام کے یکسر خلاف تھا۔

اسلام کا یہ ہمہ گیر تصور تھا جس کے متعلق کہا کہ:-

۲/۱۳۸ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔ (۲/۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔

صبغۃ کے معنی "رنگنے کا طریق" ہوتے ہیں۔ پھر اسے خود "رنگ" کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے ۔ دین

صبغۃ اللہ

خداوندی کو صبغۃ ۔ رنگنے کا طریق یا خدا کا رنگ ۔ کہہ کر، دین کی غرض و غایت اور منتہیٰ و مقصود کے طول طویل مباحث کو جس حسنِ ایجاز کے ساتھ ایک لفظ میں سمٹا دیا گیا ہے، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کی غایت اور انسانی زندگی کا منتہائے مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی جائے، یا یوں کہیے کہ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں کس حد تک صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی ہیں (اس کی تفصیل جلد دوم۔ صفحہ ۲۵ زیرِ آیت (۲/۳۰) بعنوان نفسِ انسانی میں سامنے آچکی ہے)۔ اسے خدا سے یک رنگی اور ہم آہنگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ نیا رنگ کیا کرتا ہے؟ کپڑے پر کتنے ہی داغ دھبے یا مختلف رنگوں کے نقوش و آثار ہوں، نیا رنگ، اگر وہ گہرا ہے تو ان تمام نقوش و اثرات پر غالب آکر کپڑے کو "یک رنگ" (یعنی ہموار اور یکساں) کر دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، جب ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو انسانی کردار میں عجیب قسم کی یکسانیت اور ہمواریت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس "یکسانیت یا متوازنیت" کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے کو پورے کا پورا اسی رنگ میں ڈبو دیا جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً (۲/۲۰۸) اے مدعیانِ ایمان! تم دینِ خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اسی کو توحید کہا جائے گا۔ یعنی کپڑے کا یک رنگ ہو جانا اور اس

میں کسی دوسرے رنگ کا شائبہ تک باقی نہ رہنا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ رنگ گہرا بھی ہو اور پکا بھی۔ اگر یہ رنگ پھیکا ہے تو اس سے سابقہ نقوش و آثار صرف دھیمے پڑ جائیں گے، مٹیں گے نہیں اور اگر کچا ہو تو کچھ عرصہ کے بعد، یہ نیا رنگ اُڑ جائے گا اور سابقہ داغ دھبے پھر سے اُبھر کر سامنے آ جائیں گے۔ (صدرِ اوّل کے بعد) ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ ہم نے اپنے اوپر جو دین کا رنگ چڑھایا، تو وہ پھیکا بھی تھا اور کچا بھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑے سے عرصہ کے بعد، خارجی اثرات سے (جو خاص سازش کے ماتحت پھیلائے گئے تھے) وہ رنگ اُڑ گیا اور قبل از اسلام کے داغ دھبے، سب اُبھر کر اوپر آ گئے۔ اگر ہماری آنکھیں کھلی ہوتیں (یعنی ہم عقل و بصیرت سے کام لیتے) اور قرآنِ کریم کی روشنی ہمارے سامنے ہوتی، تو ہمیں نظر آ جاتا کہ صبغۃ اللہ باقی نہیں رہا۔ لیکن ہوا وہ جسے قرآنِ کریم نے اِن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ... (۱۶/۶۳)۔ ہمارے پست جذبات نے ان باطل نقوش کو اس قدر مزیّن اور پُرکشش بنا دیا کہ ہم نے اسی فریبِ نگاہ کو حقیقت سمجھ لیا۔ یہی ہیں وہ نقوش جنہیں ہم صبغۃ اللہ سمجھ کر سینے سے لگائے پھر رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ یہ سب غیر اللہ کے رنگ ہیں۔

عیسائیوں کا بپتسمہ

عیسائیوں کے ہاں ایک رسم ہے جسے اصطباغ (یا بپتسمہ) کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے بھی وحیِ خداوندی کی رُو سے صِبْغَةَ اللهِ کا استعارہ پیش کیا تھا۔ اس سے انکی مراد انسانی سیرت کو خدائی رنگ۔۔۔ رنگنا تھا۔ لیکن بعد میں، جب وہ رنگ اُڑ گیا تو اس اصطباغ۔ (اصطباغ۔ صبغہ) نے بپتسمہ کی رسم اختیار کر لی۔ اس رسم کی رُو سے، عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے پر رنگ (یا بعض اوقات) "مقدّس پانی" چھڑک دیتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اس بچے سے وہ آلائش دُھل جاتی ہے جو اُس کے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کا نتیجہ تھی اور جسے ہر انسانی بچہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان چھینٹوں سے (عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے) وہ آلائش دور ہو جاتی ہے اور بچہ "خدا کی بادشاہت" میں داخل ہونے کا مستحق بن جاتا ہے۔ ہم ان کی اس رسم پر ہنستے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہم خود کس طرح اسی قسم کے فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ ہم نے بھی تو مذہبی رسوم کے نقوش کو صبغۃ اللہ سمجھ رکھا ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ:۔

چہ گر تمت ز مسلمانِ نامسلمانے — جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند

(اقبال)

(۰)

اس کے بعد یہود و نصاریٰ سے کہا کہ یہ ہے خدا کا صحیح تصور جسے ہم پیش کرتے ہیں:۔

۲/۱۳۹ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ۔ (۲/۱۳۹)

کہا کہ ان سے کہو کہ کیا اس وضاحت کے بعد بھی تم ہم سے جھگڑتے ہو اور کہتے ہو کہ جب ہم پہلے ہی خدا کو مانتے ہیں تو پھر ہم سے خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ کہا کہ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ تمہارے خدا کے ماننے اور ہمارے ماننے میں کیا فرق ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ تم اس خدا کو مانتے ہو جس کی ربوبیت، رحمت، ہدایت حتیٰ کہ جنت، قومِ بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۵۔ آیت ۲/۶۲-۶۱)۔ لیکن ہم جس خدا کو مانتے ہیں وہ رَبُّنَا (ہمارا بھی رب) ہے اور رَبُّکُمْ (تمہارا بھی رب)۔ یعنی ہم خدا کی عالمگیر ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (جلد اوّل۔ صفحہ ۱۶۔ آیت ۱/۱)

دوسرا فرق یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کریں، جنت ان کے لئے ریزرو (مختص) ہو چکی ہے۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۹۔ آیت ۲/۸۰)۔ اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۹ آیت ۲/۸۰)۔ لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اس کے نتائج اس کے سامنے آ کر رہیں گے۔

قطع نظر دیگر امور، تم دیکھو کہ دین کے ان دو بنیادی ستونوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) کے تمہارے تصوّر اور ہمارے تصوّر میں کس قدر فرق ہے۔

(۰)

"وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ" کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۴۸۔ زیر آیت (۲/۲۳) میں قرآن فہمی کے تین طریقوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں پہلا طریقہ تو علم و بصیرت کی رُو سے افہام و تفہیم کا ہے۔ دوسرا طریقہ استنتاجی ہے۔ یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر کے اس کے نتائج کو اس کے دعوے کی صداقت کے لئے بطورِ شہادت اور ثبوت پیش کرنا۔ اسی سلسلہ میں نبی اکرمؐ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ اگر تم دلائل و براہین ... سے میرے دعویٰ کی صداقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سا نظام مبنی بر صداقت ہے (۶/۱۳۶)۔ اس مقام پر بھی اسی طریق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جب

استنتاجی طریق

کہا گیا کہ اگر تم اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہو تو پھر جاؤ۔ تو اپنے پروگرام پر عمل کرو ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ ہم خالصۃً اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے۔

(۰)

اس کے بعد ان کے اس دعویٰ کو پھر دہرایا جسے آیت (۱۳۵/۲) میں پیش کیا گیا تھا۔ یعنی:۔

۱۴۰/۲ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۴۰/۲)

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ یہی کہے جاتے ہیں کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل یہودی تھے یا نصرانی؟ ان سے کہو کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، خدا کی طرف سے عطا شدہ علم (وحی) کی بنا پر کہتے ہیں۔ اور

انبیاء بنی اسرائیل یہودی و نصرانی نہیں تھے

تم یا تو محض قیاسی باتیں کرتے ہو، اور یا حقیقت کو چھپاتے ہو۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ جو شخص اس بات کو چھپائے جس کا علم اُسے خدا کی طرف سے ملا ہو، اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے؟ لیکن تم ہم سے تو یہ باتیں چھپا سکتے ہو، خدا سے کس طرح چھپا سکتے ہو؟ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو اور ایسا کیوں کرتے ہو!

جہاں تک حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کتمانِ حقیقت کا تعلق ہے، دوسرے مقام پر اسے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ تورات اور انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ لہٰذا وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتے ہیں (۶۵/۳) یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جو لاکھ پردوں میں چھپائے بھی چھپ نہیں سکتی۔ لہٰذا اس قسم کے کتمانِ حقیقت سے کیا حاصل؟ (یہودیوں کی کتمانِ حق کی مذموم عادت کے متعلق جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۔ آیت ۴۲/۲ میں بھی ذکر آچکا ہے)۔

(۰)

اس کے بعد پھر آیت (۱۳۴/۲) کو دہرایا گیا:۔

۱۴۱/۲ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا

تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۱)

اس آیت میں جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے اس کا قوموں کی موت وحیات سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ اسے جتنی بار بھی سامنے لایا جائے کم ہے۔ اسلاف پرست یا ماضی پرست قوم، شاہراہِ حیات پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک زندہ قوم کی زندگی میں تسلسل ہوتا ہے اور اسی تسلسل کا نام تاریخ ہے۔ اس لئے اس قوم کا اپنی تاریخ سے منقطع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (تاریخ کی اہمیت کے متعلق جلد دوم، صفحہ ۱۵۰۔ زیر آیت ۲/۱۳۴ تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) لیکن تاریخ کے ساتھ رابطہ اور چیز ہے اور ماضی پرستی اور شے۔ ماضی پرستی، تقلید کا دوسرا نام ہے۔ تقلید کی تباہیوں کے متعلق، جلد اوّل صفحات ۶۰ و ۱۶۴؛ ۳۰۷۔ زیر آیات (۲/۱۷۰)؛ (۵/۱۰۴)؛ (۴۳/۲۲) لکھا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی آیات کو اس لئے بار بار سامنے لاتا ہے کہ قوم، ماضی پرستی کے فریب میں کھو کر، کشمکشِ حیات سے گریز کی راہیں نہ تراش لے۔

ماضی پرستی

زمانۂ نزولِ قرآنِ کریم میں تو یہودیوں کو ماضی پرستی کی تباہ کاریوں کی یاد دلانے کی ضرورت تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات کا اطلاق — بلکہ زیادہ شدت سے اطلاق — خود ہم پر ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان آیات پر غور کر کے سوچیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

اس آیت پر قرآنِ کریم کا پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں پاروں کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں۔ یہ تقسیم حفظ میں آسانی یا حوالوں کے لئے بعد میں اختیار کی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے ہاں بالعموم پاروں کے شمار کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لئے میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے کہ اس آیت پر پہلا پارہ ختم ہو جاتا ہے۔

پہلا پارہ ختم

تیسرا باب

مرکزِ ملّت ــــ کعبہ

آیات ــــ ۲/۱۴۲ تا ۲/۱۵۲

۱ - کعبہ کے مرکز قرار دینے کے خلاف یہودیوں کے اعتراضات۔
۲ - وضعی روایات جو بالبداہت یہودیوں کی تراشیدہ نظر آتی ہیں۔
۳ - امتِ مسلمہ کی تشکیل اور اس کی خصوصیاتِ کبریٰ۔
۴ - نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن کی نسبتوں کے بجائے خالص نظریہ کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ۔
۵ - اس امت کا مرکز محسوس کعبہ ہے۔
۶ - یہی ان کا قبلہ ہے۔ یعنی اس مقصدِ حیات کی محسوس علامت جسے زندگی کے ہر شعبے میں نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیے۔
۷ - مقصود بالذات اس محسوس مرکز کی معنویت ہے نہ کہ عمارتی خوبصورتی۔

شروع دوسرا پارہ

تیسرا باب

مرکزِ ملّت ـــــ کعبہ

سابقہ باب میں، معمارِ کعبہ، حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ جلیلہ وجہ فروغ دیدہ ہوا تھا۔ اب خود کعبہ کی داستان ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ایک نظامِ حیات کا نام ہے۔ جس کے لاینفک عناصرِ ترکیبی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وحیِ خداوندی پر مشتمل ایک مکمل، غیر متبدل، محفوظ ضابطہ حیات (قرآنِ کریم) جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا، تمام نوعِ انسان کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔

(۲) اس ضابطہ زندگی کی صداقت پر ایمان رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک اُمت، جو نسلی، قومی، وطنی امتیازات سے بلند ہے۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں۔

(۳) اس امت کی ایک مملکت جس میں یہ ضابطہ حیات عملی نظام کی شکل اختیار کرے۔

(۴) اس مملکت کی ایک مرکزی اتھارٹی جو اس نظام کو قرآنی خطوط پر قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ اور

(۵) اس مملکت کا ایک محسوس مرکز جسے کعبہ کہا جاتا ہے اور جس کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔

قریشِ مکہ

نبی اکرمؐ کی حیاتِ نبویؐ کا پہلا دور (جسے مکی دور کہا جاتا ہے) اس امت کے ابتدائی ہیولیٰ کی تشکیل کا دور تھا۔ اس زمانہ میں (یوں کہیئے کہ) اس نظام کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔

کعبہ ایک بُت کدہ تھا جس کے متولّی قریش تھے۔ کعبہ کی اس تولیت سے انہیں بڑی امتیازی زندگی حاصل تھی۔ یوں کہئے کہ پورے عرب کی امامت (لیڈرشپ) انہیں میسّر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس نظام کا تصور رسول اللہ پیش فرما رہے ہیں، اگر وہ قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ اس لئے وہ اس دعوت کے سخت مخالف اور شدید دشمن تھے۔ تیرہ سالہ مکی دور کے بعد، آپؐ (اور آپؐ کی جماعت) نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی کیونکہ وہاں کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار تھی۔ قریش کو اس کا احساس تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک جگہ بھی قائم ہو گیا تو کعبہ کی تولیت اور اس سے وابستہ مفادات ان کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی سرگرمیاں تیزتر کر دیں اور ان کی جولانیاں میدانِ جنگ تک پہنچ گئیں۔ سات سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد، آخر الامر مکّہ فتح ہوا اور کعبہ (جو پہلے نظری طور پر اس نظام کا مرکز تھا) عملاً اس کی تحویل میں آگیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس مملکت کا دار الخلافہ تو مدینہ ہی رہا لیکن اس نظام کا مرکز کعبہ قرار پایا۔ یہ اس لئے کہ مملکت کے دار الخلافہ کے محلّاتِ وقوع (مقامات) تو مختلف مصالح کے تحت بدلے جا سکتے ہیں لیکن اس نظام کی حامل امّت کے فکر و نظر کے مرکز کا اپنے مقام پر محکم رہنا ضروری تھا۔ اگر اس کا محلِ وقوع بھی دار الخلافوں کے ساتھ بدلتا رہتا تو یہ مرکز مقامی بن کر رہ جاتا۔ سابقہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے (زیرِ آیت ۲/۱۲۵) کہ کعبہ کو عالمگیر انسانیت (النّاس) کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ اس کی عالمگیریت کا بھی تقاضا تھا کہ یہ نت نئے دن اپنے محلّاتِ وقوع بدلتا نہ رہے۔

عرب میں اہلِ کتاب میں سے یہودیوں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں کی معیشت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور

مدینے کے یہودی

مدینہ میں بالخصوص انہیں بڑی قوت حاصل تھی۔ قریش کے علاوہ، یہ بھی اسلامی نظام کے سخت مخالف تھے۔ اس سے ان کا نظامِ سرمایہ داری درہم برہم ہو جاتا تھا۔ ان کے زمانۂ عروج میں، یروشلم (بیت المقدس) ان کا دار السلطنت تھا۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کی سلطنت تو باقی نہیں رہی تھی لیکن یروشلم بدستور ان کی عقیدتمندیوں کا مرکز تھا۔ عیسائیوں کو یہودیوں کے ساتھ سخت عداوت تھی۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کی رُو سے) یہودیوں نے ان کے نبی (بلکہ خدا کے بیٹے) کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ جب یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے اس میں یہودیوں کے مقدس مقامات (بالخصوص ہیکلِ سلیمانی) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور ان کے کھنڈرات ان کے دورِ عروج کی مرثیہ خوانی کے لئے باقی رہ گئے، اور وہ بھی اس شکل میں کہ عیسائی وہاں کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بیت المقدس بدستور یہودیوں کی عقیدت کا مقدس (نظری) مرکز تھا۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ ایک آنے والا آئے گا اور عیسائیوں کو وہاں

سے نکال کر، بیت المقدس کو پھر سے اس کا حقیقی (بلند) مقام عطا کر دیگا۔ اس لئے وہ ہر طریقہ سے اس مقام کی تقدیس، عظمت اور اہمیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

اسلام نے جب انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت کی تصدیق اور احترام کو جزوِ ایمان قرار دیا تو یہودیوں کو خیال ہوا کہ مسلمان بیت المقدس کو اپنی عقیدت کا مرکز (قبلہ) قرار دیں گے، بالخصوص اس لئے کہ کعبہ بت کدہ بن چکا تھا اور توحید پرست، ایک بتکدہ کو اپنی عقیدت کا مرکز کبھی نہیں بنا سکتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں نے کعبہ ہی کو اپنا قبلہ قرار دیا (حالانکہ وہ اس وقت قریش کے قبضہ میں تھا) تو ان کا یہ فیصلہ اُن پر سخت شاق گزرا۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ سے اعتراض کر دیا کہ (یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ) انہوں نے، بیت المقدس جیسے مقدس اور متبرک مقام کو چھوڑ کر، کعبہ کو قبلہ کیسے قرار دے لیا؟ (قبلہ، یعنی مرکزِ ملت کی اہمیت کے متعلق جلد دوم صفحہ ۲۱۶۔ زیر آیت (۲/۱۴۴) گفتگو ہو چکی ہے۔ نیز میری کتاب معراج انسانیت میں قبلہ سے متعلق باب میں) اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ (جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۲۰۵ آیات (۲/۹۱-۹۲) میں بتایا جا چکا ہے) یہودیوں نے دین کو نسلی بنا دیا تھا اس لئے بیت المقدس ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ اور اسلام، عالمگیر انسانیت کا دین تھا اس لئے اس کے مرکز کو نسلی، قومی جغرافیائی نسبتوں سے ماوراء ہونا چاہیئے تھا۔ یہی کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حقیقی وجہ۔ لیکن یہ بات نسل پرست یہودیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ اعتراض کر دیا۔ اور ان کے اسی اعتراض سے اس داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

۲/۱۴۲ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۔ (۲/۱۴۲)

یہ سمجھ بوجھ سے کام نہ لینے والے (یہودی) اعتراض کرتے ہیں کہ جب اہلِ کتاب کا قبلہ (مرکز) بیت المقدس موجود تھا، تو مسلمانوں نے اس سے روگردانی کر کے، کعبہ کو اپنا مرکز (قبلہ) کیوں قرار دے لیا؟

آگے بڑھنے سے پہلے، یہاں ایک ضمنی نکتہ غور طلب ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کو سفہا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس دین (قرآنی نظام) کی دعوت کیا تھی اور یہودی اس کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ دعوت تھی اُس کعبہ کو مرکز قرار دینے کی جسے ملتِ حنیفہ کے موسس اول، حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر، یہ دعوت تھی ملتِ ابراہیمیؑ کے احیاء کی۔ یہودی اپنی نسبت تو حضرت ابراہیمؑ کی طرف ضرور کرتے تھے لیکن وہ تمسک اپنے قومی مرکز ہی سے رکھنا چاہتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، وہ ملتِ ابراہیمی

سے اعراض برتتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ملّتِ ابراہیمی سے اعراض برتنے کو سفاہت سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آیت (۲/۱۳۰) میں دیکھا جا چکا ہے۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ...... یہ وجہ ہے جو یہاں یہودیوں کو سفہا کہا گیا ہے۔

یہودیوں کا اعتراض

اس کے بعد آئیے اس اعتراض کی طرف جو یہودیوں کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس اعتراض میں بیت المقدس کی عظمت و اہمیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ یہودی بنی اسرائیل (یعنی حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ) کی اولاد تھے اور عرب (قریش) حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد۔ بنی اسرائیل کو بنی اسمٰعیل کے ساتھ مخاصمت بلکہ عداوت شروع سے چلی آرہی تھی۔ اس حسد تک عداوت کہ (اگرچہ وہ ایک آنے والے کے نہایت شدت سے منتظر تھے) انہوں نے نبی اکرمؐ کی دعوتِ نبوت سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ آپؐ کا نسبی تعلق بنی اسمٰعیلؑ سے تھا۔ داعیٔ اسلام (حضور نبی اکرمؐ) تو ایک طرف، وہ جبرئیل کے بھی اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ وہ بنی اسمٰعیل کی طرف وحی کیوں لے گیا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۳۸۶۔ آیت ۲/۹۸-۹۷)۔ کعبہ کو مرکز قرار دینے سے (ان کے خیال میں) بنی اسمٰعیلؑ کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ اس لئے بھی مسلمانوں کے اس فیصلہ کے خلاف تھے (حالانکہ یہ فیصلہ تو خود خدا کا تھا مسلمانوں کا اپنا نہیں تھا)۔

ان کے اس اعتراض کا جواب، اصولی طور پر، یہ کہہ کر دے دیا کہ بیت المقدس، بنی اسرائیل کا قومی مرکز ہے۔ اور اسلام، تمام بنی نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اس عالمگیر دعوت کا مرکز وہی ہونا چاہیئے جو مشرق و مغرب (ساری دنیا) کو محیط ہو، نہ وہ جو کسی خاص نسل یا قوم کا منتہائے نگاہ ہو۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر، خدا نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، اس امت کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کر دی ہے۔ (اس امت کی یہ خصوصیت اگلی آیت میں سامنے آجائے گی)

تحویلِ قبلہ کی روایات

قرآنِ کریم نے تو کعبہ کو تمام نوعِ انسان کے قلب و نگاہ کا نصب العین، اور ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کا مرکز قرار دے کر، قومی مراکز کی اہمیت کو ختم کر دیا، لیکن یہودیوں نے بیت المقدس کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے جو سازش کی وہ بڑی کامیاب رہی۔ یہ سازش تھی جھوٹی روایات وضع کر کے انہیں مسلمانوں کا جزوِ ایمان بنا دینا۔ چنانچہ تحویلِ قبلہ (بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ بنانے) کے سلسلہ میں، ہمارے ہاں کی معتبر ترین حدیث کی کتابوں میں جو روایات درج ہیں، ان کا ملخص یہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ (نبوت کی) زندگی میں حضورؐ، بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ چاہتے یہی تھے

کہ رُخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔ اس کے لئے آپؐ نے شکل یہ اختیار کی کہ حرمِ کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی۔ (کعبہ اور بیت المقدس سیدھ میں پڑتے تھے) جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ شکل نباہنا مشکل ہوگیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یروشلم) اور مکہ دو مخالف سمتوں میں پڑتے تھے۔ اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور اگر منہ کعبہ کی طرف کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو جاتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، اگرچہ آپؐ اسے دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔ قریب سترہ ماہ، اور بعض روایات کی رُو سے، قریب دو سال تک آپؐ اسی نہج سے نماز ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپؐ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یہ حکم اُس وقت آیا جب آپؐ، نماز (ظہر یا عصر) کی امامت فرما رہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے۔ حکم آنے پر آپؐ نے اپنا رُخ بدلا اور اس کے ساتھ ہی مقتدیوں نے بھی رُخ بدلا۔ رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لایئے کہ اگر پہلے منہ، شمال کی طرف تھا تو اب منہ جنوب کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے اپنا رُخ تو کھڑے کھڑے بدل لیا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضورؐ) کو مسجد کا نصف چکر کاٹ کر، دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہوگا۔ (ضمناً) مدینہ میں ایک مسجد ہے جسے "مسجد ذوقبلتین" کہا جاتا ہے۔ (یعنی دو قبلوں والی مسجد)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ مسجد تھی جس میں یہ واقعہ پیش آیا۔ بہرحال، اس طرح، بیت المقدس کی جگہ، کعبہ، مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ (احادیث کے حوالوں ساتھ یہ تمام تفصیل، تفسیر ابنِ کثیر، شروع پارہ دوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ابنِ کثیر نے (یہ تفصیل دینے کے بعد) لکھا ہے:-

> مرفوع حدیث میں ہے کہ یہودیوں کو ہم سے اس بات پر بڑا حسد ہے کہ خدا نے ہم کو جمعہ کے دن کی توفیق دی اور یہ اس سے بھٹک گئے۔ اور اس پر کہ ہمارا قبلہ یہ ہے اور وہ اس سے گمراہ ہوگئے۔ اور بڑا حسد ان کو ہماری آمین کہنے پر بھی ہے جو ہم امام کے پیچھے کہتے ہیں۔
>
> (تفسیر ابنِ کثیر۔ پارہ دوم۔ اردو ترجمہ۔ صفحہ ۳)

یعنی ان احادیث کی رو سے (جو خود ہماری کتب روایات موجود ہیں) حضورؐ، قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اسی وجہ سے بیت المقدس کو (ہمارے ہاں) قبلۂ اوّل کہا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہودیوں نے کس طرح بیت المقدس کی اہمیت کو ہمارے ایمان کا جزو بنا دیا؟ اس سلسلہ میں **معراج** کے واقعہ سے متعلق روایات بھی قابلِ غور ہیں۔

معراج سے متعلق روایت

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے:-

رسول اللہ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے تقریباً بارہ سال گزر چکے تھے۔ ۵۲ سال کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریل فرشتے نے آکر آپ کو جگا دیا۔ نیم خفتہ اور نیم بیداری کی حالت میں آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور ایمان اور یقین سے بھر دیا۔

(مودودی صاحب کا ماہنامہ ترجمان القرآن۔ بابت نومبر ۱۹۷۶ء)[1]

سب سے پہلے، آپ اس ٹکڑے پر غور فرمایئے کہ بارہ سال کی مدتِ نبوت کے بعد، آپ کا سینہ صاف کیا گیا۔ اور اسے علم۔ بردباری۔ دانائی اور ایمان و ایقان سے بھرا گیا۔ گویا زمانۂ نبوت کے پہلے بارہ سال تک حضورؐ کا سینہ نہ تو (معاذ اللہ) صاف تھا اور نہ ہی اس میں علم، بردباری، دانائی حتیٰ کہ ایمان و ایقان تھا (استغفر اللہ)۔ آگے بڑھیئے۔

اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا گیا جس کا رنگ سفید اور قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ براق کی رفتار سے چلتا تھا۔ . . . (یہ مختلف منازل طے کرتا ہوا) چوتھی منزل پر پہنچا۔ جہاں بیت المقدس تھا وہاں براق کا سفر ختم ہوا . . . . وہاں آپؐ نے ان تمام انبیاء کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپؐ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کیلئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریل نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپؐ نے سب کو نماز پڑھائی۔ (ایضاً)

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جملہ انبیاء کرامؑ کا یہ اجتماع، کعبہ میں نہیں ہوا۔ بیت المقدس میں ہوا جہاں حضورؐ کو کعبہ سے اٹھا کر لے جایا گیا۔ آپنے غور فرمایا کہ اس روایت کی رو سے نہایت لطیف پیرایہ میں کس طرح کعبہ پر بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی گئی ہے؟

نمازیں کیسے فرض ہوئیں

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے تمام انبیاء کی امامت کرائی۔ ظاہر ہے کہ ان میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل تھے۔ لیکن یہودی سازش آگے بڑھی اور (حضورؐ نبی اکرم کی زبانِ مبارک سے) روایت کا باقی حصہ یوں بیان کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ شبِ معراج میں ___

---

[1] واقعہ معراج کی تفاصیل احادیث کے تمام مجموعوں میں درج ہیں۔ لیکن ہم نے انہیں مودودی صاحب کے حوالے سے لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ صرف ایسی روایات درج کرتے ہیں جنہیں ان کی نگہِ بصیرت صحیح قرار دیتی ہے۔ ویسے بھی انہیں عام طور پر دورِ جدید کا "بلند پایہ مفسّر" سمجھا جاتا ہے۔

بارگاہِ خداوندی سے۔

مجھ پر نماز فرض کی گئی۔ یعنی دن اور رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر میں واپس ہوا اور موسیٰؑ کے پاس آیا۔ موسیٰؑ نے پوچھا کہ تم کو کیا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو رات دن میں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ تمہاری امت رات دن میں پچاس نمازیں ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ خدا کی قسم! میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح اور معالجہ میں کافی کوشش کر چکا ہوں لیکن وہ اصلاح پذیر نہ ہوئے۔ تم اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور امت کے لئے تخفیف چاہو۔ چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر دربارِ الٰہی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں پھر بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوا اور دس نمازیں اور کم کر دی گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں پھر دربارِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں رات دن میں باقی رہ گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس آیا اور انہوں نے پھر بھی یہی کہا۔ میں واپس ہوا اور بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوا اور رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ میں موسیٰؑ کے پاس واپس ہوا تو انہوں نے پھر یہی کہا۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو رات دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا، تمہاری امت رات دن میں پانچ نمازیں بھی ادا نہ کر سکے گی .... تم اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور مزید تخفیف چاہو۔ میں نے کہا، میں نے بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کا سوال کیا ہے۔ اب مجھ کو شرم آتی ہے۔ میں اس پر راضی ہوں اور خدا کے اس حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۷۶ء۔ نیز مشکوٰۃ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۲۷۵-۲۷۶ جلد دوم)

آپ اس روایت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے، حضورؐ نبی اکرمؐ کس طرح (معاذ اللہ) طفل مکتب دکھائی دیتے ہیں! اور اس کے ساتھ ہی آپ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اس سے خود خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے جو پہلے اس قسم کے ناممکن العمل احکام دے دیتا ہے اور پھر ان میں بار بار تخفیف کرتا جاتا ہے! (معاذ اللہ) صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایات یہودیوں کی وضع کردہ ہیں۔ ان کی رو سے انہوں نے کعبہ کے مقابلہ میں (اپنے قبلہ) بیت المقدس کی افضلیت ثابت کر دی اور حضور نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں (اپنے پیغمبر) حضرت موسیٰؑ کی عظمت! اور ہم ہیں کہ ان روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔

(٠)

بات ہو رہی تھی تحویلِ قبلہ کی، اور اس ضمن میں ان روایات کو سامنے لایا گیا تھا جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ قریب پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس کے بعد کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ اگر تھوڑا سا بھی غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ روایات بالبداہت وضعی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ آپؐ مکے میں پیدا ہوئے۔ کعبہ وہاں موجود تھا۔ وہ توحید کا مرکز بیشک نہیں تھا لیکن عربوں کا مرکز تھا، بنی اسمٰعیل کا مرکز تھا۔ قریش اس کے متولی تھے۔ خود حضورؐ بھی قریشی تھے۔ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ کبھی کسی عرب (قریش) نے کعبہ کو چھوڑ کر، بیت المقدس کی طرف رُخ کیا ہو! وہ تو ساری دنیا کو کعبہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کیسے کر سکتے تھے! کعبہ کو اس زمانے میں اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ یمن کے عیسائی گورنر نے یہ دیکھ کر کہ کعبہ، اس کے تعمیر کردہ معبد کے مرکز بننے کے راستے میں حائل ہے، اسے مسمار کرنے کی غرض سے مکہ پر فوج کشی کر دی۔ قرآن کریم میں سورۃ الفیل اس کی شاہد ہے۔ یہ اس سال کا واقعہ ہے جب حضورؐ پیدا ہوئے تھے۔ (قبل از نبوت) چالیس سال حضورؐ نے اسی فضا میں بسر کئے جو کعبہ کی اہمیت سے اس قدر معمور تھی ۔۔۔ اور وہ بھی ایک عام عرب کی طرح نہیں۔ قریش کے ممتاز ترین قبیلہ، بنی ہاشم کے نہایت معزز اور واجب التکریم فرد کی حیثیت سے۔ آپ سوچئے کہ اس زمانے میں بھی کعبہ کی کس قدر اہمیت آپؐ کے دل میں جاگزین ہو گی۔ پھر عربوں کو اس کا بھی علم تھا (اور وہ اس پر فخر کرتے تھے) کہ کعبہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے جدِ امجد حضرت اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا۔

آگے بڑھیئے۔ زمانۂ قبل از اسلام میں بھی وہاں ایسے افراد موجود تھے جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کے متبع قرار دیتے تھے اور اسی نسبت سے حنیف کہلاتے تھے۔ یہ خدائے واحد کے پرستار تھے۔ جب حضورؐ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے تو آپ کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم ہوا۔ (دیکھئے۔ آیت ۲/۱۳۵ صفحہ ــــ) کیا اس کے بعد آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کر سکتے ہیں کہ حضورؐ پندرہ سال تک، کعبہ کو چھوڑ کر، بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے ہوں گے؟ روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ آپؐ بیت المقدس کی طرف رُخ تو کر لیتے تھے لیکن آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ اپنا رُخ کعبہ کی طرف ہی کریں۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو آپؐ نے اس مسلک (یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے) کو خود اپنے فیصلہ سے اختیار کیا تھا۔ اگر اپنے فیصلے سے اختیار کیا تھا تو پھر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی دل میں خواہش کے کیا معنی؟ اگر آپ کا جی کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو چاہتا تھا تو آپؐ کو اپنا فیصلہ بدلنے میں کیا امر مانع تھا؟ دوسری صورت یہ تھی کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم خدا کی

طرف سے دیا گیا تھا۔ سو اول تو قرآن میں کہیں ایسا حکم نہیں۔ .... دوسرے یہ کہ اگر یہ ارشادِ خداوندی کی تعمیل تھی تو کیا اسے ایک لمحہ کے لئے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اس حکم کی تعمیل (معاذ اللہ) طوعًا و کرہًا کرتے تھے۔ دلی خواہش اس کے خلاف تھی (استغفر اللہ!) کیا خدا کے رسولؐ، ارشادِ خداوندی کی تعمیل اس طرح کیا کرتے تھے؟ اور اس کے بعد اس قیامت بالائے قیامت کو دیکھئے کہ حضورؐ، حکمِ خداوندی کی (طوعًا وکرہًا) تعمیل اور اپنی دلی خواہش میں مفاہمت (COMPROMISE) کی صورت یہ پیدا کر لیتے تھے کہ نماز میں ایسے مقام پر کھڑے ہو جاتے جہاں کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی سامنے۔ چلئے! خدا بھی راضی ہو گیا اور اپنے دل کی تسکین بھی ہو گئی۔ (معاذ اللہ!)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

لیکن مدینہ میں آکر مشکل پڑی۔ آپ غور کیجئے کہ یہ سترہ ماہ یا دو سال کا عرصہ، حضورؐ نے (معاذ اللہ) کس کرب اور ضیق میں گزارا ہو گا۔ جی چاہتا تھا کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو، اور حکمِ خداوندی کی تعمیل میں رُخ بیت المقدس کی طرف کرنا پڑتا تھا! (ان روایات کی رُو سے) یہ کہنا پڑے گا کہ بالآخر، خدا نے رحیم کو آپؐ کی اس حالت پر ترس آگیا اور اس نے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دے کے آپؐ کو اس کشمکش سے نجات دلائی! (میرے اللہ! تیری پناہ)

عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھنے والے ایسے ایسے جید امام تھے انہوں نے اس قسم کی تفسیریں کیسے لکھ دیں۔ اور اگلا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنے والے اتنے اتنے بڑے عالم تھے، انہوں نے ایسے ترجمے کس طرح کر دیئے؟ اور ان سوالات کا جواب دو لفظوں میں دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس سب کی ذمہ دار یہ وضعی روایات ہیں۔ جب ان روایات کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ یہ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی ہیں تو قرآن کا مفہوم ان سے ہٹ کر یا ان کے خلاف کس طرح لیا جا سکتا تھا۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ پندرہ سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا۔ جب مفسرین نے قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھیں تو وہ قرآنِ مجید کی کسی آیت کا مفہوم اس کے خلاف لے ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہی کے مطابق تفاسیر مرتب کر دیں۔ اس طرح ہماری تفاسیر قرآن سے دور چلی گئیں۔ ان تفاسیر کی رُو سے قرآنِ کریم جس طرح سمجھا گیا، ترجمہ کرنے والوں نے اس کے مطابق آیات کا ترجمہ کر دیا۔ اس کی بیّن مثال ہمارے سامنے ہے۔ قرآنِ کریم کی آیت ہے:۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ (۲/۱۴۲)

روایات اور تفاسیر میں لکھا تھا کہ پندرہ سال تک بیت المقدس قبلہ رہا۔ اس کے بعد اسے تبدیل کرنے کا حکم آیا۔ اس کی رُو سے آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا۔

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے، جس پر وہ تھے۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اگر ذہن، روایات (اور ان پر مبنی تفاسیر) سے متاثر نہ ہوتا تو اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں کیا جاتا کہ:۔

یہ بے وقوف لوگ (یہود) کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے پھیر دیا اُس قبلہ سے جس پر وہ (یہود) ہیں ـــ یعنی یہود کے قبلے سے۔

(میں اس مقام پر گرامر کی ان بحثوں میں نہیں الجھنا چاہتا کہ "قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" کا یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہے۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے گا تو انفرادی طور پر اُسے سمجھا بھی دوں گا)۔

مشہور ہے کہ ایک غلطی کے جواز کے لئے کئی مزید غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ جب یہ سمجھا گیا کہ پندرہ سال تک رسول اللہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، تو اس سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوا کہ حضورؐ نے ایسا خدا کے حکم ہی سے کیا ہوگا۔ لیکن قرآنِ کریم میں تو ایسا حکم کہیں نہیں! اس پر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحیِ جلی اور وحیِ خفی۔ وحیِ جلی تو قرآن کے اندر درج ہے اور وحیِ خفی احادیث میں ہے۔ یہ وحی بھی، وحیِ قرآنی کی مثل ہے (مثلہٗ معہٗ قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ)۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم وحیِ خفی کی رُو سے ملا ہوگا۔ (وحی کی ان اقسام کے متعلق دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل ص ۱۴۱۔ آیت ۲/۴)

لیکن یہاں مشکل آن پڑی کہ احادیث میں اس چیز کو بطور واقعہ تو بیان کیا گیا ہے (کہ حضورؐ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے) لیکن اس کا حکم وہاں بھی نہیں ملتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وحیِ خفی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالفاظِ کتبِ احادیث میں درج ہو۔ حضورؐ نے اس پر جو عمل کر کے دکھایا اسے وحی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس لئے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم اگر بہ نصِ صریح کہیں نہیں ملتا تو اس سے کچھ ہرج واقعہ نہیں ہوتا۔ حضورؐ کا اُس طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اس کے وحی ہونے کی سند ہے۔ غرض، ایک غلط (وضعی) روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے، اس قدر الجھنیں پیدا کرنی پڑیں۔ سچ ہے۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج	تا ثریا می رَوَد دیوار کج

قرآن کو روایات کے تابع رکھنے کے بجائے، اگر روایات کو قرآن کے تابع رکھا جاتا، تو نہ، معاندینِ اسلام کی

اس قسم کی روایات کو جزوِ دین بنانے کی سازش کامیاب ہوسکتی، نہ ہی امت اس قدر الجھنوں اور تفرقہ کا شکار ہوتی۔ (امت نے جب بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا، قرآنِ کریم بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور یہ ہر قسم کے انتشار و تشتت، تفرقہ اور اختلاف سے محفوظ ہوجائے گی)۔

ان روایات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے میں وضع ہوئی تھیں جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا اور قبلہ سے مقصود وہ مکان یا مقام رہ گیا تھا جس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتے۔ دین میں، قبلہ سے مقصود نظامِ خداوندی (یا قرآنی مملکت)، کا مرکزِ محسوس تھا جو محور تھا امت کی تمام سرگرمیوں کا۔ اگر قبلہ کا یہ مفہوم سامنے ہوتا تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ حضورؐ نماز میں اپنا رُخ کس طرف کرتے تھے۔ کعبہ تو وہ نقطہ بالکہ تھا جس سے متمسک ہو کر مسلم افراد نے ایک امت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ اس کی تصریح اگلی آیت میں یوں کر دی کہ:۔

۲/۱۴۳ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ..... (۲/۱۴۳)

اس آیہ جلیلہ میں كَذٰلِكَ کا لفظ بڑا پُرمعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت بنا دیا۔ یعنی تعینِ قبلہ وہ عملی طریق (PROCESS) تھا جس سے تمہارے بکھرے ہوئے ذرّے ایک چٹان بن گئے۔ یہ اس مرکز کی کشش ثقل تھی جس سے تم سب ایک نقطہ سے وابستہ اور باہمدگر پیوست ہوگئے۔ یہاں کعبہ کو اس امت کی وجہِ جامعیت بتایا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر اس امت کا ذکر کرتے ہوئے، حبل اللہ کو وجہِ جامعیت قرار دیا گیا ہے۔ حبل اللہ کی اصطلاح (جس کے لفظی معنی اللہ کی رسّی یا بندھن ہیں) بڑی جامع ہے۔ اس میں پورے کا پورا نظام آجاتا ہے۔ وہاں کہا یہ گیا ہے کہ:۔

تشکیلِ اُمّتِ واحدہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳/۱۰۲)

تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم، سب کے سب، بلا استثنار، اجتماعی طور پر، اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور اپنے اندر فرقے یا پارٹیاں مت پیدا ہونے دو، کہ فرقہ پرستی شرک ہے (۳۰/۳۱) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (۶/۶۵)۔ تم ذرا اپنی قبل از اسلام کی حالت کو سامنے لاؤ جب تم ایک امت کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم

ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے تمہاری اس حالت میں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا جس سے تم میں، ظاہرداری کا میکانکی طور پر اتحاد ہی نہیں ہوا بلکہ تمہارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح ایک نظام کے تابع ایک برادری بن جانا کتنا بڑا انعامِ خداوندی تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظامِ خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ (۳/۱۰۳؛ ۸/۶۳؛ ۴۹/۱۰) اس طرح اللہ اپنے قوانین و ضوابط اور ان کے نتائج و ثمرات، واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

(اس کے بعد اس امّت کا ذکر ہے۔ لیکن وہ آیت (۲/۱۴۳) ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳)۔ "اس طرح (یعنی کعبہ کی مرکزیت سے) ہم نے تمہیں ایک ایسی امت (قوم) بنا دیا جو عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے"۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں، تم سے

امّت کی خصوصیات

یکساں فاصلے پر (EQUI-DISTANT) ہیں۔ نہ تم کسی کی طرف یونہی جھکے ہوئے ہو، نہ کسی کی طرف سے یونہی کشیدہ۔ تمہارے نزدیک، عدل و انصاف کے نقطۂ نگاہ سے تمام اقوام یکساں ہیں۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال و کردار کا محاسبہ کرتے رہو کیونکہ تمہارا منتہائے مقصود، تمام نوعِ انسان میں وحدت پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ خود تمہارے اعمال و کردار پر نگاہ رکھنے والا بھی کوئی ہو جو دیکھتا رہے کہ تمہارا قدم، خدا کے مقرر کردہ راستے سے اِدھر اُدھر نہیں اٹھ رہا۔ یہ ہے اس نظام کا خاکہ — قرآن کریم تمہاری وحدت کا نظریاتی (IDEOLOGICAL) مرکز۔ کعبہ اس کا محسوس مرکز۔ اور اس نظام کی مرکزی اتھارٹی، اس کا اقتداری مرکز۔ اور فریضہ اس امّت کا اقوامِ عالم کے کردار پر محاسبانہ نگاہ رکھنا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... (۳/۱۰۹)۔ "تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود اور بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان تمام امور کو جنہیں کتاب اللہ صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرتی ہے، قانوناً نافذ کرو اور جنہیں وہ غلط قرار دیتی ہے، ان سے لوگوں کو قانوناً روکو"[1]

---

[1] معروف و منکر کا تشریحی بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

یہاں اس آیت کا سامنے لانا ضروری ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (۳/۱۰۴)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ:۔

اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا۔ اور منع کرے برائی سے۔ وہی پہنچے اپنی مراد کو۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس سے مراد علماء کی جماعت ہے جس کا امت میں موجود رہنا ضروری ہے تاکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی رہے۔

آیت کا غلط مفہوم

آپ غور کیجئے کہ اس مفہوم کی رو سے، اسلام میں اس مذہبی پیشوائیت کے وجود کو سندِ دوام عطا کر دی گئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ مفہوم قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور بوجوہ غلط۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس آیت سے ذرا ہی آگے وہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس آیت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ

ساری کی ساری امت کا بتایا گیا ہے نہ کہ اُمت کے کسی خاص گروہ کا۔ اگر آیت (۳/۱۰۴) کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، امت کے ایک گروہ کا فریضہ ہے، پوری کی پوری امت کا نہیں۔ تو یہ دونوں آیتیں (۳/۱۰۴ اور ۳/۱۰۹) ایک دوسرے سے متضاد ہو جائیں گی، اور قرآنِ کریم کے اس دعویٰ کے خلاف کہ اس میں کہیں تضاد نہیں (۴/۸۲)۔

دوم۔ قرآنِ کریم نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے نہ کہ علماء کے گروہ کا۔ اس کا ارشاد ہے:۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ۔ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے اور ان کے تمام معاملات قوانینِ خداوندی

کے مطابق طے پائیں گے۔

اس آیت کی تشریح جلد اول صفحہ۱ زیرِ آیت (۲/۳) کی جا چکی ہے جہاں واضح کیا گیا ہے کہ یہ فرائض اپنی آزاد مملکت ہی میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ اور چونکہ یہ حکومت پوری کی پوری امت پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے درحقیقت امت ہی اس فریضہ کو ادا کرتی ہے۔

جب تک دین کا یہ نظام قائم رہا، یہ فریضہ اس نظام (مملکت یا حکومت) کی طرف سے ادا ہوتا رہا جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا تو بادشاہت اور مذہبی پیشوائیت میں بٹوارے کی رو سے نمازیں پڑھانے، زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ علماء کے حصے میں آ گیا جسے وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے سرانجام دینے لگے۔ اس آیت کا یہ مفہوم اُس وقت وضع کیا گیا۔ غور کیجیے کہ جس فریضہ کی ادائیگی کے لئے قرآن، اپنی مملکت کا قیام شرط قرار دے، وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے کس طرح ادا ہو سکتا ہے؟ اس میں تو آمر اور نہی کے الفاظ آتے ہیں۔ آمر کے معنی حکم دینے اور نہی کے معنی حکماً روکنے کے ہیں۔ وعظ و نصیحت سے جس طرح لوگ معروف کو اختیار کرتے اور منکر سے باز رہتے ہیں اس کا مشاہدہ ہم ہر روز کرتے ہیں!

سوم۔ اس آیت (۳/۱۰۴) کے آخر میں کہا گیا ہے: أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ "یہی لوگ کامیاب ہوں گے اور فلاح پائیں گے"۔ اگر آیت کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ایک خاص گروہ (مذہبی پیشوا) ادا کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مفلحون بھی یہی گروہ ہوگا۔ باقی امت نہیں۔ یہ مفہوم قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ جماعتِ مومنین کو مفلحون قرار دیتا ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ۔ (۲۳/۱؛ اور اسی قسم کی دیگر بے شمار آیات)۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری امت کا ہے، نہ کہ امت کے کسی خاص گروہ کا۔

آیت (۳/۱۰۴) کا ترجمہ یہ نہیں کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "تم ہی وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے"۔ کیونکہ "معروف و منکر" کا ضابطہ (قرآن مجید) تمہارے ہی سپرد کیا گیا ہے۔ لغوی تفصیل میں اُلجھے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس آیت میں، مِنْ کا حرف تبعیض کے لئے نہیں آیا۔ تبیین کے لئے آیا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تبعیض کا مفہوم لینے سے قرآن مجید میں تضاد لازم آ جاتا ہے اور تبیین کے مفہوم کی رو سے، قرآن کے دیگر مقامات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایسے مقامات میں ہمیشہ وہ مفہوم لینا چاہیئے جس سے قرآن میں تضاد

واقع نہ ہو۔ میرا مسلک بہرحال یہی ہے۔

اسلام میں جماعتی زندگی کس طرح اساسی حیثیت رکھتی ہے، اس کے متعلق جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۱-۲۱۶۔ زیرِ آیت (۳/۱۰۳) وضاحت سے لکھا جاچکا ہے۔ اس مقام پر اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس جماعت (جماعتِ مومنین) کی اہمیت کو قرآنِ کریم نے باصرار وتکرار

جماعتِ مومنین کی اہمیت

نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ: هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۲)۔ یعنی "خدا وہ ہے جس نے اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تیری تائید وتقویت کا موجب بنایا"، آپ دیکھئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تنہا اپنی نصرت کو، حضورؐ کی قوت وتائید کا ذریعہ نہیں قرار دیا۔ اس کے ساتھ جماعتِ مومنین کی رفاقت کو بھی اس کا موجب بتایا ہے۔ ذرا آگے چل کر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴)۔ یعنی "اے رسولؐ! خدا، اور یہ جماعتِ مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے"۔ یہاں بھی یہ نہیں کہا کہ اس مشن کی کامیابی کے لئے، رسول کے ساتھ صرف خدا کافی ہے۔ کہا کہ اس مقصد کے لئے خدا اور جماعتِ مومنین کافی ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ اس نظام میں جماعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؟ انہی حضرات کو قرآنِ کریم نے "وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" کہہ کر پکارا ہے (۴۸/۲۹)۔ یعنی حضورؐ کے رفقاء۔ انہی کو صحابہ کرامؓ کے لقبِ گرامی سے پکارا جاتا ہے۔ (قرآنِ کریم کی رُو سے صحابہ کبارؓ کا مقام کیا ہے، اس کی بابت متعلقہ مقام پر گفتگو کی جائے گی۔ جو حضرات اسے بلاتوقف دیکھنا چاہیں، وہ میری کتاب — شاہکارِ رسالتؐ— میں پہلا باب (اگزرگاہِ خیال) ملاحظہ فرمالیں۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کعبہ، اس امّت کا قبلہ، نصب العین حیات ہے (یعنی وہ نقطہ جسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے)۔ چونکہ اس کعبہ کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اس لئے قرآنِ کریم نے انہیں

اس امّت کا مؤسس

اس امّت کا اوّلین ہیولیٰ (FIRST CRYSTAL) یا تخمِ صالح قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے ایسے معجزانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ:-

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا۔ (۱۶/۱۲۰)

ابراہیمؑ دیکھنے میں تو ایک فرد تھا لیکن درحقیقت اس کی ذات میں ایک ایسی امّت سموئی ہوئی تھی جو اپنی تمام توانائیوں کو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کئے ہوئے تھی۔ جس طرح بیج میں پورا درخت سمویا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح (حضرت) ابراہیمؑ کی ذات میں یہ امّتِ مسلمہ سموئی ہوئی تھی۔ اس نظام کی ابتدا ابراہیمؑ تھا اور اس کا مقصد: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً

وَاحِدَةً ..... (۲:۲۱۳)، تمام نوعِ انسان کا ایک امت بن جانا۔ کعبہ اس امتِ واحدہ اور اس عالمگیر برادری کا مرکز، تقل ہوگا۔

کعبہ (قبلہ) کی اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آیۂ زیرِ نظر کے باقیماندہ حصہ کی طرف آئیے۔ فرمایا :-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ۔ (۲:۱۴۳)

مفہوم اس کا یہ ہے :-

تعیینِ قبلہ (مرکز) کا سوال بڑا اہم تھا۔ یہ سوال، درحقیقت، قومی مرکز کی جگہ، انسانیت کے عالمگیر مرکز کے اختیار کرنے کا سوال تھا۔ اس لئے جس قبلہ کو (اے رسولؐ !) تو نے اختیار کیا ہے، اُسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا ہے تاکہ دونوں قسم کی ذہنیتیں الگ الگ ہو جائیں اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ کون ہے جو، رسول کے اتباع میں، اپنا رُخ پھیر کر، ہر قسم کی قومی نسبتوں کو چھوڑ کر، خالص انسانیت کی نسبت اختیار کرتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو قومی نسبت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

یہ تبدیلی، فی الواقعہ، ان لوگوں پر گراں گزرتی تھی جن کے دل ابھی تک قومیتوں کے تنگ دائرے میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان تنگناؤں سے نکلنا اُسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے ذاتی رجحانات کے بجائے قانونِ خداوندی کو اپنا راہ نما بنالے۔

قومیت کے تنگ دائرے میں رہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ انسانیت کی وسعتوں میں پھیل جانے سے اس کا جتھہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے (۲۹/۲۵)۔ لیکن تم اِن کی باتوں میں نہ آجانا۔ عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود پر تمہارا ایمان کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ خدا کے قانون کے مطابق چلنے سے انسان، تخریبی قوتوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور اسے سامانِ نشو و نما بھی بافراط ملتا ہے۔

اگر قبلہ سے مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ نماز میں رخ کس طرف کیا جاتے، تو یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں

تعیینِ قبلہ کا مقصد

پر اس قدر گراں گزرتی اور جسے اتباعِ رسول کے ماپنے کا پیمانہ یا معیار قرار دیا جاتا؟ یہ درحقیقت قومیت کی تشکیل کا ایک نیا معیار تھا۔ یہ ایک نیا نظریۂ زندگی (IDEOLOGY) تھا جس سے تمام سابقہ نظریات منسوخ ہو جاتے تھے۔ نوعِ انسانی، نسل، رنگ، زبان، وطن اور مذہبی فرقہ بندیوں

کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی جن میں کا ہر گروہ دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار چلا آرہا تھا۔ قرآنِ کریم نے انسانی تفریق و تقسیم کے ان تمام معیاروں کو ختم کر کے، نظریۂ حیات کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کا تصور پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہونی لازمی تھی جن کے مفادات اپنے اپنے گروہوں کیساتھ وابستہ تھے۔ اس سے تعیینِ قبلہ کی حقیقت اور اہمیت سامنے آجاتی ہے۔ یہی تھی اس کی وہ اہمیت جس نے قلبِ نبوی کو وقفِ اضطراب کر رکھا تھا۔ مدینہ میں وہ مملکت قائم ہوگئی تھی جس میں نظامِ خداوندی کو مشہود انداز سے دنیا کے سامنے آنا تھا۔ اس نظام کا مرکز کعبہ تھا، اور وہ قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس تصور سے حضورؐ کے قلبِ مطہر کی کیا کیفیت تھی، اسے قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :-

۱۴۴/۲ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۔ (۱۴۴/۲)

"ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ تمہارے دل میں کس طرح بار بار یہ آرزو ابھر رہی ہے کہ جس مقام (کعبہ) کو اس نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے، اسے ہماری ہی تحویل میں ہونا چاہیئے؛ نظام ہمارا اور اس کا مرکز اس نظام کے دشمنوں کے قبضہ میں، یہ کوئی جچتی ہوئی بات نہیں۔" ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس شدتِ آرزو، اور اضطرابِ قلبی کی وجہ سے، تیری نگاہیں کس طرح بار بار ہماری طرف اٹھتی ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ بارالہا! اس مرکز کو ہماری تولیت میں دلا دے! یہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے اور ایسا ہو کر رہے گا لیکن ہمارے قانونِ مشیت کی رُو سے اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ لیکن کعبہ کو قبلہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس نظریۂ حیات کی علامت (SYMBOL) ہے، وہ (نظریہ) ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتے اور اس طرح اس کی اہمیت اور عظمت دلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو جاتے۔ اس مقصد کے لئے ضروری نہیں کہ کعبہ طبیعی طور پر بھی تمہاری تحویل میں ہو۔ سو، اس دوران میں تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ :-

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ .... (۱۴۴/۲)

تم اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز کر دو۔ یعنی اس نظریہ کی اہمیت جس کی علامت کعبہ ہے اور کعبہ کو غیر خداوندی قوتوں سے آزاد کرانے کی ضرورت پر مرکوز۔ تم اپنی جماعت کے افراد سے کہہ دو کہ تم خواہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اور زندگی کے کسی شعبہ میں مصروفِ تگ و تاز ہو، تمہاری نگاہوں سے یہ مقصد اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے تمہاری جماعت میں یک نگہی اور ہم آہنگی پختہ سے پختہ تر ہوتی جائے گی اور حصولِ مقصد کی خواہش تیز سے

تیز تر۔ تا آنکہ وہ وقت آجائے جب کعبہ کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے تمہیں سر بکف میدان میں اتر نا پڑے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں؛ ؎

بانشہ درویشی درساز و دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را، بر سلطنتِ جم زن

تربیتی مرکز مصر میں جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کے پنجہ میں جکڑے ہوتے تھے اور حضرت موسیٰؑ، اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے، ان کی تعلیم و تربیت کر رہے تھے، تو اس وقت اسی قسم کا پروگرام ان کے لئے بھی تجویز کیا گیا تھا جب کہا کہ:۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۱۰/۸۷)

اس لئے ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی (ہارونؑ) کو حکم دیا کہ سر دست مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کر دو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تم اپنی جماعت کے لئے کوئی تربیتی مرکز قائم کرو جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں۔ اس لئے تم فی الحال اپنی جماعت کے افراد کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کر دو۔ انہی کو قبلہ بنا کر نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کر دو۔ اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوشخبری دیتے رہو (تاکہ ان کے حوصلے بلند اور ہمتیں جوان رہیں)۔

اس سے (ضمناً) یہ بھی واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے طریقِ نبوی کیا ہوتا ہے۔ افراد کی تعلیم و تربیت جس سے وہ نفسیاتی تغیر پیدا ہو جائے جس کے بغیر کوئی خارجی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو قبلہ، اس جماعت کی تربیت گاہ بھی ہوتا ہے۔ نیز اس آیت میں جہاں "اقیموا الصلٰوۃ" آیا ہے، اس سے نظامِ صلوٰۃ کا تصور بھی سامنے آجاتا ہے۔ (وہ تصور جس کی تشریح، جلد اول صفحہ ۹۷-۱۴ زیرِ آیت (۲/۳) کی جا چکی ہے) اس کے بعد کہا کہ:۔

۲/۱۴۴ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۴)

اصل یہ ہے کہ یہ اہلِ کتاب بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہاری یہ دعوت ان کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک حقیقت ہے (اس لئے کہ خود ان کے ہاں اس کا ذکر موجود ہے)۔ لیکن اس کے باوجود، یہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں۔ ہم ان کی ایک ایک

حرکت سے باخبر ہیں۔

اس سے ایک ہی آیت بعد کہا گیا ہے کہ یہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ لہٰذا ان کی مخالفت بربنائے جہالت یا ناواقفیت نہیں، تعصب اور عداوت کی بنا پر ہے۔

(۰)

اس سے واضح ہو گیا کہ تعینِ قبلہ کا صحیح مفہوم کیا تھا اور یہودیوں کو اس پر اس قدر شدید اعتراض کیوں تھا کہ مسلمانوں نے، بنی اسرائیل کے قبلہ کی جگہ کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے۔ یہ درحقیقت دین کا اختلاف تھا۔ نظامِ زندگی کا اختلاف تھا۔ نظریۂ حیات کا اختلاف تھا۔ مقصود و منتہیٰ کا اختلاف تھا۔ قبلہ تو محض اس کی محسوس علامت تھا۔ اس لئے فرمایا کہ:-

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۲/۱۴۵
وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۔
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲/۱۴۵)

یہ ظاہر ہے کہ جہاں ضد اور تعصب کارفرما ہو، وہاں دلیل و برہان کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے، اگر تو ان کے سامنے دنیا جہان کی دلیلیں بھی پیش کر دے، یہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی تم (علم و بصیرت کے خلاف) ان کے قبلہ کی پیروی کر سکتے ہو۔ ان کی تو خود اپنی حالت یہ ہے کہ (تمہاری مخالفت میں تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن) اپنے اپنے قبلے الگ رکھتے ہیں، اور ایک مرکز پر جمع ہی نہیں۔

بہرحال، ایک عالمگیر انسانیت کی طرف دعوت دینے والا، اُن لوگوں سے مفاہمت کر ہی نہیں سکتا جو قومیتوں کے تنگ دائرے میں مقید ہوں۔ اگر (بفرضِ محال) وحی کی رُو سے حقیقتِ حال کا علم ہو جانے کے بعد بھی، تو اِن کی خواہشات کا اتباع کرنے پر آمادہ ہو جائے، تو تیرا شمار انہی میں سے ہو گا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔

تصریحی طور پر: اس مقام پر ذکر یہودیوں اور عیسائیوں کا چلا آ رہا ہے۔ ان کی باہمی دشمنی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یروشلم ان دونوں کا مقدس شہر تھا۔ اسی میں یہودیوں کا قبلہ تھا اور اسی میں عیسائیوں کا۔ لیکن عیسائیوں نے

مخالفت کا متحدہ محاذ

یہودیوں کے قبلہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور وہاں، ان کے ہیکل (معبد) کے کھنڈرات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ یہ (عیسائی) یہودیوں کو اس شہر میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ باہمی عداوت کا تو یہ عالم۔ لیکن اسلام کی دعوت کی مخالفت میں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھی! تاریخ کی یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ باطل پرست گروہ، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی کیوں نہ ہوں، حق کی مخالفت میں سب متحد ہو جاتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں کے مختلف مذہبی فرقوں کو دیکھئے۔ ان میں مسلسل سر پھٹول ہوتی رہتی ہے لیکن قرآنی دعوت کی مخالفت کے لئے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کی مزید وضاحت کر دی جس کی طرف اجمالاً آیت (۲/۱۴۴) میں اشارہ کیا گیا تھا کہ:-

۲/۱۴۶ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۴۶)

یہ لوگ ان حقائق سے اچھی طرح باخبر ہیں اور تمہاری دعوت کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح انسان اپنے بیٹوں کو پہچان لیتا ہے۔ (اس لئے کہ تمہاری آمد کی پیش گوئیاں ان کی مبینہ آسمانی کتابوں تک میں موجود ہیں) لیکن ان کے علماء و مشائخ کا گروہ دیدہ دانستہ انہیں چھپاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ کے ظہور کے متعلق یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں پیش گوئیاں موجود تھیں۔ اور وہ (مسخ اور تحریف شدہ حالت ہی میں سہی) موجودہ تورات (عہد نامہ عتیق) اور انجیل (عہد نامہ جدید) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں، اہلِ کتاب کے دعاوی کی تردید کے لئے ان کی کتابوں سے اسناد و دلائل پیش کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ اسی کو فیصلہ کن معیار قرار دیتے تھے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، عیسائیوں کے ساتھ مناظروں میں یہ انداز بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب اس کی چنداں اہمیت نہیں رہی۔ اب دنیا منقولات (کتابی

استدلالی دور

اسناد) کے بجائے، معقولات (علمی اور عقلی دلائل) کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس لئے اب، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے استدلالی (RATIONAL) طریق کی ضرورت ہے۔ "دیگر مذاہب کے مقابلہ" میں ہی نہیں؛ (کیونکہ اب نفسِ مذہب کی اہمیت ہی کم ہوتی جا رہی ہے)، بلکہ دنیا کے اربابِ علم و بصیرت کو اس کا قائل کرنے کے لئے کہ اقوامِ عالم اس وقت جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس سے نکلنے کے لئے، قرآنی نظام کے سوا کوئی چارۂ کار

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے سامنے حق و صداقت کو پیش کرنے کا وہ دَور ابھر کر مشہود ہو رہا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ . . . (۴۱/۵۳)

جوں جوں انسانی علم بڑھتا جائیگا اور نئے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے ـــ وہ خارجی کائنات سے متعلق ہوں یا انسان کی داخلی دنیا سے متعلق ـــ وہ سب قرآن کے دعاوی کی زندہ شہادتیں بنتے جائیں گے اور یوں دنیا دیکھ لے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔

میں بھی اثباتِ حق و صداقت کے لئے اس علمی اور فکری طریق کو ترجیح دیتا ہوں اور قرآنی حقائق کو اپنی بصیرت کے مطابق، علمی اور عقلی دلائل کی رُو سے پیش کرتا ہوں۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بعثت نبی اکرمؐ کے متعلق جو کچھ کتبِ سابقہ میں آیا ہے اسے یہاں درج کیا جائے۔ دنیا نظامِ محمدی کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس لئے اسے اب (کتبِ سماوی کی پیش گوئیوں کی رُو سے) ظہورِ محمدیؐ کے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دلائل مانگتے ہیں۔ اُن کتابوں کے حوالے نہیں۔ بہرحال، نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ:۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۔ (۲/۱۴۷)

۲/۱۴۷ حقیقت تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ تم اس سے متمسک رہو۔ ان کٹ حجتیاں کرنے والوں سے بحث و جدل کی ضرورت نہیں۔

تمہارا فریضہ، حقیقت کو ان تک پہنچا دینا تھا سو اس سے تم سبکدوش ہو گئے۔ اب ان سے بحث و جدل بے کار ہے۔ جو جان بوجھ کر، حقیقت کی مخالفت کرتا جائے، بحث و نظر اُسے کیا فائدہ دے گی؟

―――― (۰) ――――

مطالب الفرقان، جلد اول میں، صلوٰۃ کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے کہ غیر مرئی اور غیر محسوس نظریات جب عملی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کے لئے جسمانی حرکات یا محسوس علامات ناگزیر ہوتی ہیں۔ (دیکھئے جلد اوّل صفحہ ۱۲۲۔ زیرِ آیت ۲/۳)۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ نظریات نگاہوں سے گم ہو جاتے ہیں اور ان کی محسوس علامات ان کی جگہ مقصود بالذات

مقصد اور محسوس علامات

بن جاتی ہیں۔ یوں مذہب ہیں، دین، بے جان پیکر، بے روح جسد، یا ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ گزشتہ آیات میں، کعبہ کی اہمیت کا ذکر مسلسل ہو رہا تھا، اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ لیکن قرآن کریم نے اس مسلسل داستان کے عین درمیان، ذرا رک کر، اور یوں کہیے کہ موضوع سے ذرا ہٹ کر، اس خطرہ کا ازالہ کر دیا جو محسوس علامات کے مقصود بن جانے سے لاحق ہوتا تھا اور جس کا شکار جملہ اہلِ مذاہب ہو چکے تھے۔ اس نے رک کر کہا کہ کعبہ کی معنوی عظمت بجا اور درست، لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تم اس عمارت کی خصوصیات بیان کر کے، دیگر اہلِ مذاہب کے مذہبی مراکز پر اس کی افضلیت ثابت کرنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ - (۲/۱۴۸)

۲/۱۴۸ ہر قوم نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی مذہبی مرکز تجویز کر رکھا ہے۔ محسوس طور پر کعبہ کی عمارت کی بھی اتنی ہی حیثیت ہے۔ دیکھنا! تم اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ تم ایسے کتنے کام سرانجام دیتے ہو جو نوعِ انسانی کی منفعت کا باعث ہوں، تمہاری ذات میں وسعت پیدا کرنے کا موجب ہوں۔ اسے شرف و افضلیت کا پیمانہ قرار دے کر دیکھو کہ تم دیگر اقوام سے کس قدر آگے ہو۔ نہ اس بنا پر کہ تمہارا کعبہ کس قدر خوشنما، مزین، آراستہ پیراستہ شاندار اور خوبصورت ہے۔

چند آیات آگے جا کر، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ۔ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ۔ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا۔ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ - (۲/۱۷۷)۔

یہ لوگ، دین کے مقصد سے بے گانہ ہو جاتے ہیں، اور چند رسوم و مناسک کو اصلِ دین سمجھ کر ان کی پابندی کو اس کی غایت سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن، تم کہیں اس فریب میں نہ آ جانا۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے، وسعت و کشاد کی راہ (جس سے انسان معیارِ خداوندی پر پورا اترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف [اگرچہ امت میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کیلئے

اس قسم کے محسوس شعائر کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتے)، مقصود اُس نظام کا قیام ہے جس کے اصولِ اساسی یہ ہیں:-

اللہ پر ایمان، قانونِ مکافات اور حیاتِ آخروی پر ایمان، ان کائناتی قوتوں پر ایمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں۔ انبیاء کرامؑ پر ایمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے اور اُن کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر ایمان۔ (۲/۴)

اِس ایمان (آئیڈیالوجی) کے بعد عملی دنیا میں یہ روش کہ مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا (۲/۱۹) ـــــ وہ رشتہ دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں لاوارث اور تنہارہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے، یا ان میں کام کاج کی استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو کسی وجہ سے زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی، ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ اِن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی دولت کو وقف کر دینا۔ مختصر الفاظ میں، نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنا تاکہ تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشوونما مہیا ہوتا رہے۔ اپنے عہد و پیمان کا احترام کرنا اور قول و قرار کا پکّا ہونا۔ لیکن اگر مخالف قوتیں آمادہ پیکار ہو جائیں تو پھر مصائب و مشکلات کا نہایت ثابت قدمی اور استقامت سے مقابلہ کرنا، اور خوف و ہراس کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔

جو لوگ اِس روش پر استقامت سے گامزن رہتے ہیں، وہ اپنے دعوائے ایمان میں سچّے ہوتے ہیں اور انہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں (نہ وہ جو چند رسومات کے مجموعہ کا نام دین رکھ کر، ان کی ادائیگی سے جنّت کا وارث بننے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔)

دین میں، ظواہر، محسوس علامات، جہت اور مکان مقصود بالذات نہیں ہوتے لیکن (جیسا کہ اوپر کہا، اور سابقہ صفحات میں آیت ۲/۱۱۵ کے تابع بھی لکھا جا چکا ہے) مذہب میں یہی ظواہر عین مقصد قرار پا جاتے ہیں جب اسلام دین تھا تو اس میں کعبہ کی عمارت اور دیگر ملحقات اور متعلقات کی حیثیت اتنی ہی تھی۔ لیکن اب ہمارے ہاں بھی ظواہر، عینِ دین بن چکے ہیں۔ کعبہ کی (پتھروں اور چونے گچ کی) عمارت کی تقدیس ہمارا جزوِ ایمان بن چکی ہے۔ (عقیدہ یہ بھی ہے کہ حجرِ اسود کو حضرت آدم جنّت سے اپنے ساتھ لائے تھے) اور اس

عمارت کی تزئین و آرائش، اور مناسکِ حج کی میکانکی ادائیگی، مقصودِ شریعت۔ مسابقت فی الخیرات کا تصور جو نظامِ خداوندی ہی میں ممکن تھا، نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ کعبہ کی عمارت تمہاری تحویل میں نہ بھی ہو، تو بھی اس کی غرض و غایت اگر تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے تو اس سے تمہاری ہئیتِ اجتماعیہ قائم رہے گی۔

۲/۱۴۸ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۲/۱۴۸)

تم کہیں بھی ہو گے، اس طرح تم میں حقیقی اجتماعیت پیدا ہو جائے گی کیونکہ حقیقی اجتماعیت کا مدار نکرد نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی پر ہے۔ کعبہ تو اس کی محسوس علامت ہے۔ یہ معیار خدا کا مقرر کردہ ہے — اس نے ہر مقصد کے لئے معیار اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

اس کے بعد قرآن پھر اس نکتہ کی طرف آ گیا جس کی توضیح سابقہ آیات میں، کئے چلا آ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ :-

۲/۱۴۹ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔ (۲/۱۴۹)

مرکزِ قلب و نگاہ

کعبہ تمہاری تحویل میں ہو یا نہ ہو، تم اس کی غایت اپنے سامنے رکھو۔ تم دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنی تمام توجہات کو اسی مقصد اور غایت پر مرکوز رکھو۔ یہ تمہارے خدا کا مبنی برحقیقت پیغام ہے۔ اس کے مطابق عمل کئے جاؤ۔ اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ برحق کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا۔ اس سے تم میں وہ نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جائے گی جو خارجی تبدیلی کی شرطِ اوّلین یا اس تبدیلی کی علت (CAUSE) ہے۔

اس نکتہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بار بار دہرایا گیا اور کہا کہ :-

۲/۱۵۰ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ (۲/۱۵۰)

تم کہیں بھی ہو، اور وہاں سے کہیں بھی جانے کا ارادہ کرو، اپنے قلب و نگاہ کا مرکز کعبہ ہی کو رکھو۔ اسے ذہنی طور پر اپنا قبلہ بنائے رکھو۔ اے رسول! تم بھی ایسا ہی کرو اور تمہاری جماعت کے افراد بھی ایسا ہی کریں۔ یہ تم سب کا اجتماعی پروگرام ہو۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو تمہاری سعی و عمل کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آ جائیں گے جو تمہارے نظام کی صداقت کا زندہ ثبوت بن جائیں گے اور کسی کو اس سے مجالِ انکار نہیں ہوگی بجز ان کے جو اس کی مخالفت میں ظلم و استبداد پر اتر آئیں۔ لیکن تمہیں ان سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ڈرنا صرف اس سے چاہیئے کہ کہیں قانونِ خداوندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ ہم نے تو یہ ضابطہ قوانین دیا ہی اس لئے ہے کہ انہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں حاصل ہوں اور تمہارا ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اٹھتا جائے۔

۲/۱۵۱ كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ‎(۲/۱۵۱)

اور اس مقصد کے لئے ہم نے تمہاری طرف اس رسول کو بھیجا ہے کہ یہ ہمارا پیغام تم تک پہنچائے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ یعنی یہ بتائے کہ خدا کا قانون (کتاب) کیا ہے اور اس کی غرض و غایت (حکمت) کیا۔ یعنی وہ کچھ بتائے جسے تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ اگر تم اس سے واقف ہوتے تو وحی کے بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہاری تربیت اس طرح کرے کہ تمہاری ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ تم اس پروگرام پر عمل پیرا رہو اور پھر دیکھو کہ منزل کس طرح خود کھنچ کر تمہاری طرف نہیں آجاتی۔

المختصر:-

۲/۱۵۲ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ‎(۲/۱۵۲)

تم اس طرح، ہمارے مقرر کردہ نصب العینِ حیات کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اَذْكُرْكُمْ ـــــ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔

ذکر کا وسیع تر مفہوم

لفظ ذکر کا ایک مفہوم سابقہ صفحات میں آیت (۲/۱۵۲) کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہیں کسی کے حقوق کی حفاظت کرنا، شرف و عظمت عطا کرنا۔ سورۃ مومنون میں ہے کہ بَلْ أَتَيْنَاهُم بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ ‎(۲۳/۷۱) ذرا ان عقل کے اندھوں کو دیکھو۔ ہم ان کے ہاں ان کی بڑائی اور عظمت، شرف و مجد، سرفرازی اور سربلندی کا سامان

لے کر آتے ہیں (یعنی وہ ضابطۂ ہدایت جو انہیں یہ سب کچھ عطا کرے گا) اور ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اُس عظمت اور سرفرازی سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اس سے اعراض برت رہے ہیں" (۲۳/۷۱)۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۲۱/۱۰)۔ "ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں، اگر تم ذرا عقل و فکر سے کام لو، تو تمہیں نظر آئے گا کہ خود تمہارا ہی ذکر ہے"۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرآن، جو کچھ بیان کرتا ہے وہ انسانی زندگی ہی سے متعلق ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس میں خود تمہاری عزت و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ ذرا آگے چل کر، حضور نبی اکرمؐ کی لسانِ مبارک سے کہلوایا: هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (۲۱/۲۴)۔ جو مسلکِ حق و صداقت میری جماعت اختیار کر رہی ہے اور جسے انبیاءؑ سابقہ کے متبعین نے اختیار کیا تھا، اس کے نتیجہ میں جو شرف و مجد اُنہیں حاصل ہوا وہی انہیں بھی حاصل ہوگا۔ سورۂ زخرف میں ہے: اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (۴۳/۴۴)۔ "اس قرآن میں، اے رسولؐ! تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے شرف و عظمت کا سامان مضمر ہے"۔

ذکر کے اس مفہوم کی روشنی میں زیرِ نظر آیت کی طرف آئیے جس میں کہا گیا ہے کہ: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲)۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ "تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو۔ اسے اپنا نصب العین حیات قرار دے لو۔ میں اس کے بدلے (نتیجہ) میں تمہیں شرف اور عظمت عطا کر دوں گا"۔

تقدیر کے متعلق، جلد اوّل میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۵۴۔ آیت ۱/۲؛ صفحہ ۱۶۳ آیت ۲/۴؛ صفحہ ۱۸۰۔ آیت ۲/۷؛ صفحہ ۲۷۴۔ آیت ۲/۳۰)۔ اس مقام پر صرف اتنا دہرا دینا کافی ہوگا کہ آغازِ کار (INITIATIVE)

آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہے

انسان کی طرف سے ہوتا ہے، اور خدا کا قانون اس کا اتباع کرتا ہے (اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ فَاذْكُرُوْنِيْ ۔ تم میرے مقرر کردہ پروگرام کو اپنے سامنے رکھو — اَذْكُرْكُمْ — اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں شرف و عظمت عطا کر دوں گا — تم یہ کر دو گے تو میں یہ کر دوں گا۔ تقدیر — یعنی قانون اور اس کے نتیجے کا ربطِ باہمی ان دو لفظوں میں واضح ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے حقوق (RIGHTS) اور ذمہ داریوں (RESPONSIBILITIES)

حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق باہمی

کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ حقوق، ذمہ داریوں کے پورا کرنے سے ثبت ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا، اس کا کوئی حق ثبت نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس پر کوئی ذمہ داری عائد کی جائے، اسے

اس امر کا یقینِ محکم ہو کہ اگر میں نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا تو میرا یہ حق ثبت ہو جائے گا۔ مجھے یہ کچھ مل کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوگا۔ اس اعتماد اور یقین دہی کے لئے قرآنِ کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک نکتہ سے وہ تمام الجھنیں کس طرح دور ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس وقت دنیا میں اس قدر انتشار اور فساد پھیلا رکھا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ کا عملی پروگرام یہ ہے کہ:۔

وَاشْكُرُوْا لِيْ ۔ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۔ (۲/۱۵۲)

۲/۱۵۲ تمہیں جو ایسی عظیم نعمت دی گئی ہے، اس کی قدر کرو۔ اس ضابطہ کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

شکر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۶۳ زیرِ آیت (۲/۵۲) بتایا جا چکا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ اگر تم ہمارے مقرر کردہ پروگرام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لوگے تو ہم تمہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں عطا کر دینگے۔ لیکن اسے یاد رکھو کہ تمھیں ان نعماتِ خداوندی کا شکر ادا کرنا ہوگا یعنی انہیں، خدائی راہنمائی کے مطابق، منفعتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا۔ دبا کر بیٹھ نہیں جانا ہوگا۔ حج کے سلسلہ میں جو کہا تھا کہ تم اقوامِ عالم کو دعوت دو کہ آکر دیکھیں کہ ہمارا نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے — لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ۔ (۲۲/۲۸) ۔ تو اسی کا نام "شکر" ہے جس کی ضد "کفر" ہے۔ کفر کے معنی چھپانا اور دبانا ہیں۔

چوتھا باب

رزمگاہِ حیات

آیات — ۲/۱۵۳ تا ۲/۱۷۶

(۱) نظامِ خداوندی کی راہ میں پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ۔
(۲) درُود کا مفہوم۔
(۳) شعائر اللہ صفا و مروہ
(۴) قرآن مجید واضح کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔
(۵) قرآنی حقائق کو چھپانے کی کوششیں۔
(۱) ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔
(۲) وحی خفی اور جلی کا عقیدہ۔
(۳) فقہ۔
(۴) باطنی معانی۔

(۶) لعنت، ہر طرف سے۔
(۷) بازآفرینی کے مواقع۔
(۸) خدا کے ساتھ محبت کا غلط مفہوم۔
وصال اور عرس کی تقریبات۔
حب اللہ کا قرآنی مفہوم۔
(۹) تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔
(۱۰) فحشاء اور سیّآت کا مفہوم۔
(۱۱) مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں۔
(۱۲) حرام اور حلال کا نظریہ۔ حرام اشیاء کی فہرست۔
(۱۳) مذہبی پیشوائیت کا کاروبار۔

چوتھا باب

رزمگاہِ حیات

سابقہ باب میں یہ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ :-

(۱) اسلامی نظام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کا مرکزِ محسوس (کعبہ) اس جماعت کی تحویل میں رہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے۔

(۲) مخالف قوتوں کی انتہائی کوشش ہوگی کہ یہ مرکز اس جماعت کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اس لئے ان قوتوں سے تصادم ناگزیر ہوگا۔

(۳) اس تصادم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری پوری تیاری کی ضرورت ہوگی اور اس تیاری کے سلسلہ میں قدم اوّل، اپنے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کرنا ہوگا۔

(۴) نفسیاتی تغیر کے ضمن میں یہ سمجھ رکھنا ضروری ہے کہ وہ تغیر، خود بخود مقصد حاصل کرکے نہیں دے دیتا۔ اس سے وہ صلاحیتیں بیدار اور وہ توانائیاں متحرک ہو جاتی ہیں جو حصولِ مقصد کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس تصادم کا مقابلہ ان صلاحیتوں اور توانائیوں کے بل بوتے پر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں، اس نفسیاتی تغیر کا نام ایمان ہے تو حصولِ مقصد کے لئے ان صلاحیتوں کی نمود اور اس توانائی کا شہود **اعمالِ صالحہ** کہلائے گا۔

آئندہ آیات میں اس تصادم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس اصول کو نمایاں کیا گیا ہے کہ :-

۲/۱۵۳ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۲/۱۵۳)

اس نظام کی اقامت کی راہ میں (جو محدود گروہوں اور قوموں کے مفاد کے خلاف عالمگیر انسانیت کے مفاد کا علمبردار ہے)، بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی اور سخت مشکلات کا سامنا ہوگا (مفاد پرست گروہ اسے آسانی سے قائم نہیں ہونے دیں گے)۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کو یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ، کچھ بھی ہو۔ استقامت اور ثبات کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اُسی راستے پر چلو جو تمہارے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے ــــ اس سے تمہیں، قانونِ خداوندی کی رُو سے، بڑی تقویت حاصل ہوگی۔ جماعتِ مومنین سے کہا یہ گیا ہے کہ ان مشکلات پر قابو پانے اور ان تصادمات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ خطرات کتنے ہی حوصلہ شکن اور مشکلات کیسی ہی ہوش رُبا کیوں نہ ہوں، استقامت اور ثبات کا

استعانت بالصبر والصلوٰۃ

کا دامن تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ تمہارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے اور دوسرے یہ کہ مخالفین خواہ کوئی راہ اختیار کریں، تم اسی راستے پر چلتے جانا جسے تمہارے خدا نے تمہارے لئے متعین کیا ہے کوئی غلط راہ اختیار نہ کرنا۔ اس سے تمہیں بھرپور توانائیاں حاصل ہو جائیں گی۔

اس آیت میں تین الفاظ آئے ہیں۔ استعانت۔ صبر اور صلوٰۃ۔ استعانت کا مفہوم، جلد اول صفحہ ۳۷، زیرِ آیت (۱/۴) بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے اتباع سے انسانی صلاحیتوں اور توانائیوں کا نشوونما پانا اور ان میں کامل اعتدال اور توازن پیدا ہو جانا۔

صبر کا مفہوم، جلد دوم صفحہ ۲۲۲، زیرِ آیت (۲/۴۵)، سامنے آچکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں خطرات کے مقابلہ میں اس طرح جم کر کھڑے ہو جانا کہ پائے استقامت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنا لینا کہ حوادثِ زمانہ کے ہچکولے اسے ذرا بھی ڈانواں ڈول نہ کر سکیں اور صلوٰۃ کی پوری تشریح جلد اول صفحہ ۹۸، زیرِ آیت (۲/۳) سامنے آچکی ہے۔ اصولی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کا مسلسل اتباع کئے جانا۔ کسی کے ساتھ بالالتزام وابستہ اور پیوستہ رہنا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے الفاظ آیت (۲/۴۵) میں بھی آچکے ہیں۔ (دیکھئے جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۲) وہاں ان (الفاظ) کے بعد کہا گیا تھا کہ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ (۲/۴۵)۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے اعانت طلبی بڑا ہمت آزما مرحلہ اور بڑی کٹھن منزل ہے اس لئے عام لوگوں پر یہ مہم بڑی گراں گزرتی ہے

اسے وہی لوگ سر کر سکتے ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور جو ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کے احساس سے خائف رہتے ہیں۔ یہاں پھر ان الفاظ (صبر اور صلوٰۃ) کو دہرایا گیا اور ان کے بعد کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ (۱۵۳/۲) ۔ خدا کی رفاقت، اس کے قوانین کی رُو سے حاصل ہونے والی تائید و تقویت صرف انہی کو ملتی ہے جو خطرات کا مقابلہ استقامت اور استقلال سے کریں۔ اس اصولی وضاحت کے بعد کہا کہ یہ خطرات بڑے لرزہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے مصائب جھیلنے اور ہر طرح کے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا — لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ:

۱۵۴/۲ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ۔ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۱۵۴/۲)

یاد رکھو! دنیا میں نظامِ خداوندی کو متشکل کرنا پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی راہ ہوتی ہے۔ اس میں، اوروں تو اور، جان تک بھی دے دینی پڑتی ہے۔ لیکن جو اس جدوجہد میں جان دیتا ہے، وہ مرتا نہیں — اُسے مردہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (۱۶۹/۳)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح تم اس طبیعی زندگی کا ادراک، حواس کے ذریعے کر سکتے ہو — یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا نہیں — اُس زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ محسوسات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے۔ (البتہ اس کے امکان کو سمجھ سکتے ہو)۔

مقتولین فی سبیل اللہ

جو ان خطرات کا سامنا اور ان تصادمات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں، وہ مرتے نہیں۔ انہیں مردہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (۱۶۹/۳)۔ وہ حیاتِ جاوداں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح تم انسان کی طبیعی زندگی اور موت کا ادراک حواس کے ذریعے کر سکتے ہو — یعنی تم دیکھ سکتے ہو کہ فلاں شخص زندہ ہے یا مردہ — راہِ حق میں جان دینے والوں کی زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ ان کی وہ زندگی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے۔ تم عقل کی رُو سے اس کے امکان کو تو سمجھ سکتے ہو، اس کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یعنی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہے۔ "شعور" کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۰ - زیرِ آیت (۹/۲) بتایا جا چکا ہے کہ اس سے بالعموم مراد، ادراک بالحواس ہوتا ہے۔ یعنی (SENSE-PERCEPTION) - اس ذریعۂ علم سے تم ان کی اُخروی زندگی کی کنہ و حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو ہمارے ہاں شہید (جمع شہداء) کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ان کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ اس میں ان کے لئے "مقتولین فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آئی ہے جس کی تشریح جلد اول صفحہ ۲۵۵ آیت (۲/۱۵۴) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں مُردہ مت کہو۔ آیت (۳/۱۶۹) میں ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۔ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۔ (۳/۱۶۸) "ان لوگوں کے متعلق گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے۔ وہ خدا کے ہاں زندہ ہیں اور وہاں انہیں رزق بھی عطا ہوتا ہے۔" مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات کے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ اُس دُنیا میں زندہ ہوتے ہیں جسے آخرت کہہ کر پکارا گیا ہے اور جسے یہاں عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (اپنے خدا کے ہاں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اُن کی اُس زندگی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ۔ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۲/۱۵۴)۔ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے متعلق بحثیں اور

شہداء کے متعلق افسانے

مناظرے ہوتے رہتے ہیں اور دعوے کئے جاتے ہیں کہ ہم نے انہیں یہاں دیکھا اور وہاں دیکھا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ (مابین پاکستان اور بھارت) کے زمانے میں تو ان سبز عماموں اور سفید گھوڑیوں والوں "کے شریک جہاد ہونے" اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے افسانے عام زبان زد خلائق تھے لیکن یہ سب "افسانے" تھے جن کے خلاف میں نے اُسی زمانے میں لکھا تھا۔ (ضمناً) اُس جنگ میں چونکہ ہماری فتح ہوئی تھی اس لئے اس میں تو انہیں شریک ہوتے اور "راوی کے پل پر بم پھینکتے" سب نے دیکھا لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمیں شکست ہوئی تو یہ کسی کو نظر نہ آئے!! بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ نہ ہی ان کا کوئی تعلق ہماری دُنیا سے ہوتا ہے۔ وہ "عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔" (اپنے رب کے ہاں) زندہ ہوتے اور سامانِ نشوونما (رزق) پاتے ہیں۔ اگلی آیت میں کہا کہ:-

۲/۱۵۵ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۲/۱۵۵)

ان تصادمات میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا۔ کہیں سامانِ خورد نوش کی کمی ہوگی کہیں مال و

ابتلاء کا مفہوم

جان کا نقصان ہوگا۔ کہیں باغ اور کھیت اجڑیں گے۔ یہ تمام خطرات اور نقصانات درحقیقت تمہارے لئے یہ دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائیں گے کہ تمہاری ذات کی کس قدر نشوونما ہو چکی

ہے اور تم میں مقابلہ کی کس قدر صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ جو لوگ ان دشوار گذار مراحل میں ثابت قدم رہیں گے ان کے لئے کامیابی اور کامرانی کی خوشخبریاں ہوں گی۔

(ابتلاء کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۲۴۱ زیر آیت (۲/۹۴) اور زیر نظر جلد میں زیر آیت (۲/۱۴۳) پیش کیا جا چکا ہے۔)

۲/۱۵۶ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ (۲/۱۵۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ہجوم مصائب اور انبوہ نوائب میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصد زندگی، نظام خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے (۹/۱۱۲) کیا مال اور کیا جان، ہم نے اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہوا ہے (۹/۱۱۱)۔ یہ ہمارا اپنا ہے ہی نہیں۔ اس لئے اسے اس کے اصلی مالک (خدا) کے حوالے کر دینے میں ہمیں تامل کیا ہو سکتا ہے؟ مشکلات آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا (۹/۵۹)۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ مصیبتوں سے ڈر کر کسی اور طرف رخ نہیں کریں گے۔

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کا صحیح مفہوم بڑا اہم اور گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس کی تفصیلی تشریح جلد اول میں کی جا چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۴۴۔ آیت (۱/۵)، صفحہ ۲۶۳۔ آیت (۲/۱۸)۔ بالخصوص صفحہ ۳۵۰۔ آیت (۲/۲۸)۔ جہاں مذکورہ بالا مفہوم کی وضاحت ملے گی۔

اس کے بعد ہے:۔

۲/۱۵۷ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔ (۲/۱۵۷)

یہی وہ جماعت ہے جو اپنے رب کے نزدیک مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہی کے لئے سامان نشو و نما کی فراوانیاں اور سحاب کرم کی گہرباریاں ہیں اور ان کا منزل مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (نیز دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۵۵۔ آیت ۲/۱۱)

آیت کا مطلب واضح ہے لیکن اس میں " صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ " سے نگاہ کا رخ ایک اور گوشے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بڑا اہم ہے اور خصوصی غور و فکر کا مستحق۔

سورۃ احزاب کی حسب ذیل آیت آپ نے ہزاروں مرتبہ سنی ہوگی۔ اسے وعظ کی ہر مجلس میں، میلاد کی ہر محفل میں، نعت خوانی کے ہر اجتماع میں دہرایا جاتا اور انتہائی خلوص اور عقیدت سے پڑھا اور سنایا جاتا ہے یعنی:۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے :-

تحقیق اللہ اور فرشتے اس کے، درود بھیجتے ہیں اوپر نبی کے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، درود بھیجو اوپر اس کے اور سلام بھیجو سلام بھیجنا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

آیت کے الفاظ ہیں "یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" سوال یہ ہے کہ اس کا ترجمہ "درود بھیجنا" کیسے کیا گیا۔ درود کا لفظ

درود کا مفہوم

عربی زبان کا نہیں۔ لفظ نماز کی طرح یہ بھی قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا ہے۔ ایران کے مجوس (جنھیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریق پرستش کو نماز کہتے تھے اور دعا پڑھنے کو درود۔ وہیں سے یہ دونوں لفظ ہمارے ہاں آ گئے اور ان کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ قرآن کریم کی دونوں اصطلاحات، صلوٰۃ اور صلوات نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں ــــ ایسی اوجھل کہ اب ان کا تصور تک ذہن میں نہیں آتا۔ (نماز کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۲۲۔ آیت (۲/۳) میں گفتگو ہو چکی ہے) نتیجہ یہ کہ وہ انقلابی پروگرام جو ان اصطلاحات میں مضمر تھا، گم ہو گیا۔ صلوٰۃ کا مفہوم، خاص طریق پرستش میں محدود ہو گیا اور صلوات اللہ علیہم۔ کا مقصود، درود پڑھنے میں تبدیل ہو گیا۔ بیسیوں قسم کے درود تصنیف ہوئے اور ہر درود کے وظیفے کے مختلف طریق وجود میں آ گئے ــــ کچھ جلی، کچھ خفی ــــ کچھ کتابوں میں، کچھ سینہ بسینہ۔ کچھ روایات کے ذریعے، کچھ علم لدنی (باطنی علم) کی رُو سے۔ درود شریف کی فضیلت میں کتابوں پر کتابیں لکھی گئیں چنانچہ اب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ درود شریف اور اس کی برکات ایسا مسلّمہ بن چکے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس کے حقیقی (قرآنی) مفہوم کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرے تو دُہائی مچا دی جاتی ہے کہ اس کے ایمان میں خلل واقع ہو گیا ہے۔ اسے ان شیطانی وساوس سے فوراً توبہ کرنی چاہیے ــــ آپ نے غور فرمایا کہ یہ مقام کس قدر نازک اور یہ مرحلہ کیسا دشوار گزار ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کے طالب العلم ہونے اور اس کے مفہوم کو واضح طور پر بیان کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں ان تمام مقامات کا مفہوم قرآن کی روشنی میں سامنے لاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ قرآن سے بد دیانتی کے مرادف ہو گا جو بارگاہِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔

میں شروع سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اپنی اپنی استعداد

اور بصیرت کے مطابق، اور چند شرائط کے تحت، اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ صورت عام قرآنی مفردات (الفاظ) کی ہے تو اس کی اصطلاحات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم اور مشکل ہے۔ قرآنی اصطلاحات بڑی جامع اور خاص تصورات کی حامل ہیں اس لئے ان کی جگہ کوئی اور اصطلاح استعمال نہیں کی جا سکتی۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہم قرآن سے دُور ہٹ جائیں گے۔ مثلاً ہم نے قرآنی اصطلاح صلوٰۃ کی جگہ نماز کی اصطلاح وضع اور اختیار کی تو ارباب

قرآنی اصطلاحات

فکر و بصیرت جانتے ہیں کہ ہم قرآنی تصورِ صلوٰۃ سے کس قدر دور چلے گئے۔ یہ وجہ ہے جو میں تاکیداً کہا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی اصطلاحات کی جگہ دوسری اصطلاحات کبھی اختیار نہیں کرنی چاہئیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، نماز اور درود (وغیرہ) قدیم پہلوی زبان کے الفاظ ہیں جو مجوسیوں کے مذہب میں عام مستعمل تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی (عربی زبان کی) اصطلاحات کی جگہ یہ اصطلاحات اُس وقت رائج ہوئیں جب اسلام، ایران میں پہنچا۔ اس امر کی تحقیق کرنا اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) مرتب کرنے والے کی ذمہ داری ہوگی کہ قرآنی اصطلاحات کی جگہ یہ مجوسی اصطلاحات کن عوامل و عناصر کے ذریعے اسلام میں در آئیں، انہیں رائج کرنے کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اس سے مقصد کیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ــ شاہکارِ رسالت ــ کے آخری باب میں مختصراً اس پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ موضوع اس سے زیادہ تفصیلی تحقیق کا متقاضی ہے۔ اس قسم کی (اسلام کی) تاریخ مرتب کرنے کا خیال ایک عرصہ سے میرے ذہن میں ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ جو پروگرام اس وقت میرے زیرِ نظر و ترتیب ہے، وہ مجھے اس کی فرصت دے گا یا نہیں۔ اس ضمن میں، میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ :-

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

میں نے یہ الفاظ اس لئے صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی صاحبِ ہمت، الدین کے صحیح تصور کو امت کے سامنے لانے کا ارادہ کرے، تو اسے معلوم ہو کہ اس تحقیق میں اسے قدمِ اوّل کس سمت کو اٹھانا ہوگا۔

——— (٠) ———

اس تمہید کے بعد آیئے آیت اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ...... (۵۶/۳۳) کے قرآنی مفہوم کی طرف۔ اس آیت کو تو آپ نے (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) ہر منبر و محراب اور ہر مذہبی محفل و مجلس سے ہزاروں مرتبہ سُنا ہوگا۔ لیکن اس آیت سے چند ہی آیات پہلے، ایک اور آیت ہے جسے آپ نے بہت کم سُنا ہوگا۔

وہ آیت یہ ہے:-

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۔ (۳۳/۴۳)

اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ یوں کرتے ہیں۔

(اے جماعت مومنین۔ اللہ) وہ ہے جو رحمت بھیجتا ہے اوپر تمہارے اور فرشتے اس کے تو کہ نکالے تم کو اندھیروں سے طرف روشنی کے۔ اور ہے ساتھ ایمان والوں کے مہربان۔

آپ سردست، اس آیت کے صرف پہلے حصے کو لیجئے۔ یعنی هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ کو۔ آیت (۳۳/۵۶) میں کہا گیا تھا کہ "إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ....." اور آیت (۳۳/۴۳) میں ہے هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ۔ یعنی اللہ اور اس کے ملائکہ جو عمل نبی کے ساتھ کرتے ہیں، وہی عمل وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں تو وہ اسی طرح مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ (الفاظ دونوں آیتوں میں ایک ہی ہیں)۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم کی ان دو آیتوں میں جو ایک ہی سورۃ میں، تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہوئی ہیں) اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے جو بات نبیؐ کے لئے کہی گئی ہے وہی بات مومنین کے لئے بھی کہی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں، نبی اکرمؐ پر درود بھیجنے کا ذکر تو اس کثرت سے ہوتا ہے لیکن مومنین پر درود بھیجنے کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا۔ ہم پہلے آیت —— هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ (۳۳/۴۳) کو لیتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مفہوم واضح ہو جانے سے آیت (۳۳/۵۶) کا مفہوم خود بخود سامنے آجائے گا۔

مفرداتِ امام راغب میں صَلَّى عَلَيْهِ کے معنی لکھے ہیں، تعظیم کرنا، دعا دینا، حوصلہ افزائی کرنا۔

صلّی علیہ کے معنی

پروان چڑھانا، نشوونما کرنا۔ کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا (لغات القرآن صفحہ ۱۰۴۵)۔ آیاتِ قرآنی میں جہاں "صَلَّى عَلَى" آئے گا، وہاں دیکھا جائے گا کہ ان معانی میں سے کون سا معنی زیادہ موزوں ہے۔ آیت (۳۳/۴۳) میں کہا گیا ہے کہ: هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ...... اللہ اور اس کے ملائکہ، مومنین کے ساتھ "صلّی علیٰ" کا عمل کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا اور ملائکہ کی طرف سے "صلّی علیٰ" کا عمل ایسا ہے جس سے جماعتِ مومنین تاریکیوں سے روشنی کی طرف آجاتی ہے۔

ظلمت (تاریکیوں) سے نور کی طرف آنے کا مطلب کیا ہے، اسے سورۃ ابراہیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ... (۱۴/۵) "ہم نے موسیٰ کو اپنا ضابطہ قوانین دے کر اس مقصد کے لئے (مصر واپس) بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمت سے نور کی طرف نکال لائے۔" قوم بنی اسرائیل مصر میں فرعونی محکومیت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ان کی اس حالت کو قرآن کریم نے ظلمات کہہ کر پکارا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو وہاں بھیجا گیا کہ وہ اس مظلوم و مقہور قوم کو فرعون کی غلامی کے شکنجہ سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط کی طرف لے آئے۔ اسی سورۃ میں چار آیتیں پہلے کہا گیا ہے کہ: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱۴/۱) "اے رسول! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ اس کے ذریعے نوع انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے آئے۔" سورۃ بقرہ میں ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ... (۲/۲۵۷) "اس جماعت (مومنین) کو اللہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے جو انہیں ظلمت سے نور کی طرف لے جائیگی۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (۳۳/۴۳)۔ اللہ اور اس کے ملائکہ کا ایسا عمل ہے جس سے یہ جماعت ہر نوع غلامی سے رستگاری حاصل کر کے، صحیح آزادی اور حریت کی فضا میں بال کشا ہو جائے گی۔ ایسا نظام قائم کرلے گی جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم۔ اس نظام کا قیام خود منشاء خداوندی ہے لیکن یہ قائم ہوتا ہے ایک جماعت کے ہاتھوں۔ جو جماعت اس مقصد کو لے کر اٹھتی ہے اسے خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔ "اے جماعتِ مومنین! اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوگے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور وہ مدد کیا ہوگی ــــ وہ تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا۔ تمہارے پاؤں میں لغزش نہیں آنے دے گا۔" کہا کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷)۔ "جماعتِ مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہو جاتا ہے۔" خدا کی یہ مدد، جس سے اس جماعت کو ثبات و استقامت حاصل ہو جاتی ہے، ملائکہ کی وساطت سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگِ بدر جیسے زلزلہ انگیز معرکہ کے سلسلہ میں، کہا کہ خدا نے ملائکہ کو حکم دیا کہ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... (۸/۱۲)۔ جماعتِ مومنین (مجاہدین) کو ثبات و استقامت عطا کر دو۔ اسی کو نصرتِ خداوندی کہا گیا ہے۔ (۹/۲۵-۲۶ ؛ ۳/۱۲۲-۱۲۴)۔ (ملائکہ کے متعلق جلد دوم، باب اول صفحہ ۶۶ پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے)۔

تصریحاتِ بالا کی روشنی میں آیت (۳۳/۴۲) کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اس میں سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا۔ (۳۳/۴۱)۔ اے جماعتِ مومنین! تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اس ضابطہ قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے بھی رکھو اور دنیا میں اس کا زیادہ سے زیادہ چرچا بھی کرو۔ وَ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۔ (۳۳/۴۲)۔ اور اس کی عملی تنفیذ کے لئے دن رات سرگرمِ عمل رہو۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ (۳۳/۴۳)۔ اگر تم ایسا کرتے رہے تو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تمھیں حاصل رہے گی۔ تمھاری سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ تمھارے نظام میں کسی قسم کا خلل اور فساد واقع نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم زندگی کی ہر قسم کی تاریکیوں سے نکل کر جگمگاتی روشنی میں آجاؤ گے اور تمھاری صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں گی۔

یہاں سے ہم آیت (۳۳/۵۶) کی طرف آجاتے ہیں جس میں کہا کہ: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ۔ اس نبی کو خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہے جیسا کہ فرمایا۔ وَیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا۔ (۴۸/۳)۔ اے رسول! اللہ تمھیں ایسی نصرت عطا کرے گا جس سے تمھیں غلبہ اور تمکن حاصل ہو جائے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا..... (۴۰/۵۱) ہم اپنے رسولوں اور جماعتِ مومنین کی اسی دنیاوی زندگی میں مدد کیا کرتے ہیں۔

آیت کے پہلے حصہ میں کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ۔ اس نبی کو اللہ اور اس کے ملائکہ کی نصرت حاصل ہوگی۔ لیکن دوسری جگہ رسول اللہ سے کہہ دیا کہ: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۴) اے رسول! تمہارے لئے صرف اللہ کی مدد کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس جماعت کی مدد بھی ضروری ہے جو تمھارا اتباع کرتی ہے۔ یعنی رسول اللہ کے مشن کے کامیاب ہونے کے لئے اللہ، اس کے ملائکہ اور جماعتِ مومنین کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کہا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ۔ (۳۳/۵۶) اے جماعتِ مومنین! خدا کے اس پروگرام کو پروان چڑھانے کے لئے تم بھی اس رسول کی مدد کرو۔ دوسری جگہ ہے۔ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ..... (۴۸/۹)۔ اس کی مدد کرو۔ اس کی عظمت کو قائم رکھو۔

مومنین رسول اللہ کی مدد کیسے کریں گے؟ فرمایا۔ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۳۳/۵۶) تم اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کی اطاعت کرو جیسا کہ اطاعت کرنے کا حق ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عَزَّرُوْهُ

وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۷/۱۵۷) "تم اسے تقویت پہنچاؤ۔ اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ تم اس کتاب روشن کا اتباع کرو جسے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس طرح تمہارا مشن کامیاب ہو جائے گا۔"

اب پوری آیت کو سامنے لائیے :۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

یہ حقیقت ہے کہ خدا اور اس کے ملائکہ اس نبی (کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے اس) کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کی مدد کرتے ہیں۔ اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس کی مدد کرو۔ وہ اس طرح کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔

یہ ہے وہ آیت جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ :۔

اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر۔ اے جماعتِ مومنین! تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔

اور درود اور سلام بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ ...... الخ کے الفاظ دہراتے رہو۔ دن رات اس میں مشغول رہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ کا ترجمہ "درود بھیجنا" کر کے، کس طرح ایک عظیم عملی انقلاب آفریں پروگرام کو چند الفاظ دہراتے رہنے میں تبدیل کر دیا؟ ـــــ تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات ـــــ وہ قوم جس نے دنیا کے ہر باطل نظام کی بساط الٹ کر، ان کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا تھا، کس طرح چند الفاظ کو دہرا کر نجات حاصل کرنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا کر بیٹھ گئی!۔

اس تبدیلی کے لئے کچھ زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ "تلاوتِ قرآن مجید" کا ترجمہ کر دیا "قرآن پڑھا کرو"۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ کا ترجمہ کر دیا "نماز پڑھا کرو"۔ اور صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ کا ترجمہ کر دیا "رسول پر درود و سلام بھیجا کرو۔ یعنی چند الفاظ پڑھا کرو۔ یوں یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ "کیا کرو" کو "پڑھا کرو" میں تبدیل کر دیا۔ وہی آیت جو شعلۂ جوالہ تھی، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ۔۔۔ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

جہاں تک محض پڑھنے، یعنی الفاظ دہراتے رہنے کا تعلق ہے، اس کا سلسلہ بہت پیچھے جاتا ہے۔ علم الانسان کے

کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کا پہلا دور، عہدِ پرستش (AGE OF WORSHIP) تھا۔ اس سے اگلا دور، عہدِ سحر (AGE OF MAGIC)۔ اس دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض الفاظ میں (ان کے معانی میں نہیں بلکہ ان الفاظ میں) خاص تاثیر ہوتی ہے۔ اگر ان الفاظ کو خاص طریقہ سے دہرایا جائے تو وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے دورِ جہالت کے ان باطل تصورات کو ختم کر دیا لیکن ہم (قرآن کو چھوڑنے کے بعد) پھر اُس عہدِ سحر کی طرف لوٹ گئے۔ قرآنی آیات کے ورد وظیفے اور ان کے الفاظ کو دہراتے رہنے کا مسلک، سب اُسی دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، جلد دوم، صفحہ ۱۷۱۔ آیت (۲/۱۰۲) دیکھئے۔ "درود پڑھنا" بھی اسی زُمرے میں آتا ہے۔ یہ کچھ کرنے کا کام تھا۔ محض پڑھنے کا نہیں۔

(۰)

ہم نے دیکھا ہے کہ "صَلِّ عَلٰی" کے معنی حوصلہ افزائی کرنا اور دعا دینا بھی ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ہے کہ ان اعراب میں ایسے لوگ ہیں جو اس نظام کے قیام کے لئے 'بطیبِ خاطر' مالی امداد دیتے ہیں۔ ان کا اس سے مقصد ہوتا ہے قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ۔ (۹/۹۹)۔ خدا کے ہاں بلند درجات اور رسول کی طرف سے حوصلہ افزائی۔ یہ کس طرح سے ہوتی ہے، اس کے لئے رسول اللہ سے کہا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹/۱۰۳) تم ان کے عطیات قبول کر لیا کرو، مناسب تعلیم و ترتیب سے ان کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرو۔ اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری تحسین (شاباش۔ یعنی شاد باش) ان کے لئے بڑی تسکینِ خاطر کا موجب ہوتی ہے۔

اور اس کے بعد آیئے آیۂ زیرِ نظر کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔ (۲/۱۵۷) یہ وہ سرفروش ہیں، جن پر خود خدا تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتا اور ان کی ذات کی مزید نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

(۰)

کعبہ سے متعلق آیات کے درمیان، محافظینِ کعبہ (نظامِ اسلامی کے خدام) کی صفات بیان کرنے کے بعد، پھر ایک آیت حج کے ضمن میں سامنے لائی گئی۔ کہا۔

۲/۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۱۵۸)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے :۔

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ۔سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کا، تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ۔ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدردان ہے سب کچھ جاننے والا ۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس آیت میں حج ، عمرہ ، صفا ، مروہ ، جناح کے الفاظ محتاجِ تشریح ہیں ۔حج کے متعلق، کعبہ کے سلسلہ میں سابقہ صفحات (دوسرا باب ۔صفحہ ۵۶) میں ضمناً بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ اسلامی نظام میں امت کی "سالانہ کانفرنس" ہے ۔ (اس کی تفصیل حج سے متعلق آیات کے ضمن میں متعلقہ مقام پر پیش کی جائے گی ۔)

حج کا مفہوم

لفظ الحج کا مادہ (ح ۔ ج ۔ ج) ہے جس کے بنیادی معانی (۱) ارادہ کرنا ۔(۲) روکنا ۔ (۳) جھگڑا کرنا ۔اور (۴) دلائل پیش کرنا ہیں ۔آخری معانی کے اعتبار سے قرآنی دلائل کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَة "حقیقت رس دلیل" (۶/۱۵۰) کہا گیا ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ ان معانی کی رو سے، حج ، اُمّت کے اس اجتماع کو کہا جائے گا جہاں نظامِ خداوندی سے متعلق جملہ اہم معاملات کا فیصلہ دلائل وحجت کی رُو سے کیا جائے ۔مشاورتی نظام میں اس قسم کے اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں ۔میری بصیرت کے مطابق، اس نظام نے ایک عالمگیر سالانہ اجتماع ضروری قرار دیا تھا، اور سال بھر میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات عندالضرورت اس پر مستزاد۔

عمرہ

ان اجتماعات کو عمرہ کہا جاتا ہے ۔عمرہ (مادہ ع ۔ م ۔ ر) کے بنیادی معانی آباد کرنا ۔ باقی رکھنا ، خرابی سے محفوظ رکھنا ہیں ۔ان معانی سے عمرہ کے اجتماعات کا مقصد خودبخود واضح ہوجاتا ہے ۔یعنی ان اجتماعات میں اس بات پر غور وفکر کیا جائے گا کہ یہ نظام کس طرح ہر قسم کی خرابی اور کمزوری سے محفوظ رہ کر مستحکم تر ہونا جائے ۔

جناح کا مفہوم

لفظ جُناح کے متعدد معانی ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی ۔اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان میں گناہ بن گیا، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ لفظ گناہ، عربی میں آکر جُناح بن گیا ۔حقیقت کچھ بھی ہو، ہمارے ہاں اس کے معنی گناہ کیے جاتے ہیں ۔ہمارے موجودہ مذہب (اسلام) میں گناہ کا لفظ بھی، اس کی ضد ثواب کی طرح، ایسا مبہم سا ہے جس کا کوئی متعین

مفہوم سامنے نہیں آتا۔ دراصل یہ لفظ (جناح) ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، چنداں مضائقہ نہیں۔ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے آپ دیکھیں گے کہ وہاں اس کا یہی مفہوم موزوں ہے۔

صفا اور مروہ

صفا اور مروہ مکہ سے ملحق دو پہاڑیاں ہیں۔ حج کے سلسلہ میں ان پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگانا (جسے سعی بین الصفا والمروہ کہا جاتا ہے) حج کے ارکان میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی ایسا کرنا ضروری ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تورات کے بیان کردہ قصہ کی رُو سے (جس کا اتباع ہماری کتب روایات میں بھی کیا گیا ہے) جب اس مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا جسے حضرت ابراہیمؑ، اپنی بیوی (حضرت ہاجرہؑ) اور شیر خوار بچے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو لق و دق صحرا میں چھوڑ کر چلے گئے تھے، تو مامتا کی ماری ماں (حضرت ہاجرہؑ) پانی کی تلاش میں ان وادیوں میں سرگرداں پھرتی تھیں۔ کبھی ایک پہاڑی پر چڑھتیں، کبھی دوسری پر۔ سعی بین الصفا والمروۃ کو سنتِ حضرت ہاجرہ کے اتباع میں، ارکانِ حج میں واجب سمجھا جاتا ہے۔

لیکن زیرِ نظر آیت میں تو یہ نہیں کہا گیا کہ ان پہاڑیوں (کی وادیوں) میں طواف کرنا لازمی ہے۔ اس میں تو کہا یہ گیا ہے کہ ان میں طواف (گھومنے پھرنے) میں کوئی حرج نہیں (یا گناہ) کی بات نہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عرب جاہلیہ میں عام عقیدہ یہ تھا کہ یہ ایسے مقدس مقامات ہیں جن میں گھومنا پھرنا منع ہے۔ قرآنِ کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی۔ اور کہا کہ ان میں گھومنے پھرنے میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کا مروجہ عقیدہ (کہ ان پہاڑیوں میں طواف ارکانِ حج میں سے ہے۔ یعنی لازمی ہے) قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ان میں چلنے پھرنے میں کوئی گناہ (یا حرج) کی بات نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جس طرح قریش نے خانہ کعبہ کو بتوں سے بھر رکھا تھا، اسی طرح انہوں نے ان پہاڑیوں پر بھی دو بُت نصب کر رکھے تھے اور ان کی تعظیم کے لئے وہ ان کا طواف کیا کرتے تھے۔ اسلام نے جب وہ بُت اٹھوائے تو مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح اب ان پہاڑیوں کا طواف بھی ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کی تردید کے لئے کہا کہ ایسا نہیں۔ ان کا "طواف" ممنوع نہیں۔

لیکن یہ توجیہہ کچھ جچتی نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا کہ ان کا طواف ممنوع نہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں، لیکن ہمارے ہاں اسے ارکانِ حج کے زمرہ میں شامل کر کے، لازم قرار دے دیا گیا۔ یعنی کہا یہ گیا کہ جس طرح تم حالتِ کفر میں ان کا طواف ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح اسے اب بھی ضروری سمجھو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم کی آیت کی روشنی میں، ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ (زمانہ کفر میں) قریش، ان وادیوں کو (بتوں کا مسکن ہونے کی وجہ سے) مقدس خیال کرتے تھے اور ان میں گھومنا پھرنا ممنوع سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے اس غلط عقیدہ کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ بھی باقی پہاڑیوں اور وادیوں کی مانند ہیں۔ ان میں تقدیس کی کوئی بات نہیں۔ تم ان میں بلا تامل چلو پھرو۔ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

البتہ قرآن کریم نے صفا اور مروہ کو (کاروانِ حجاج کے ہمراہ جانے والے جانوروں کی طرح ۲۲/۳۶) شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۱۵۸) اور ان شعائر کا ادب ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے (۵/۲ ؛ ۲۲/۳۲)۔ شعائر کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۲۲ آیت (۲/۱۵۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی مجرد (ABSTRACT) حقیقت یا نظریہ کی محسوس علامات (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ مثلاً مملکت کا جھنڈا۔ شعائر کی حیثیت سے وہ بڑا واجب الاحترام ہوتا ہے لیکن اس کے کپڑے یا بانس کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جھنڈا بوسیدہ ہو جائے اور اس کے کپڑے کو اتار پھینکا جائے، تو اس کپڑے کی حیثیت دوسرے کپڑوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ وہ کپڑا واجب التکریم نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا کہ یہ پہاڑیاں منجملہ شعائر اللہ ہیں۔ لیکن اس سے ان کے اردگرد کی زمین یا ان کے پتھر ایسے مقدس نہیں ہو جاتے کہ ان میں چلنا پھرنا ممنوع ہو۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) حج میں ساتھ لے جانے والے مویشیوں کو بھی شعائر اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں مقدس نہ سمجھ لیا جائے۔ ان سے، دوسرے جانوروں کی طرح کام لو اور پھر انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت کھاؤ۔ (۲۲/۳۶ – ۳۲)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان پہاڑیوں کو شعائر اللہ کیوں قرار دیا گیا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرح ان کی تعظیم بھی حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آرہی تھی، اگرچہ زمانہ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے مقاصد مسخ ہو چکے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے مقاصد کا صحیح تعین کر دیا لیکن ان کے محسوس علامات ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا اور اسلامی نظام باقی نہ رہا، تو مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ان علامات کی تعظیم مقصود بالذات بن گئی۔ اس لئے قرآن کریم نے انہیں شعائر اللہ قرار دینے کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم اپنے دل کی کامل رضامندی سے خیر کے کاموں میں کس قدر حصہ لیتے ہو۔ یہی وہ کام ہیں جن کے بھرپور نتائج خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے حاصل ہوں گے۔ اس خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جو جانتا ہے کہ تم کارِ خیر میں کس قدر حصہ لیتے ہو اور ان رسوم و مناسک کی میکانکی تعظیم کس قدر کرتے ہو۔

یہ ہے وہ حقیقت (یعنی مقصود اور رسوم کا بنیادی فرق) جسے مذہب میں نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔

یہ (کتمانِ حقیقت) کس قدر جرمِ عظیم ہے، اس کے متعلق فرمایا کہ :-

۲/۱۵۹ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ - (۲/۱۵۹)

خدا نے بیّنات اور ہدایت کو اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ جو لوگ ان پر پردے ڈال دیں گے وہ زندگی کی شیرینیوں سے محروم ہو جائیں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خدا نے بیّنات اور ھدایت کو اپنی کتاب میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ ھدایت کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۲ آیت (۲/۵) میں شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ دوسری چیز ہے بیّنات۔

بیّنات

بَیِّنَاتٌ - واحد بَیِّنَۃٌ کا مادہ (ب۔ ی۔ ن) ہے جس کے معنی ہیں (۱) الگ الگ کر دینا۔ (۲) اُبھارنا نمایاں کرنا۔ اَلْبَیَانُ کے معنی ہیں کسی بات کا کھل کر، واضح طور پر سامنے آجانا۔ بَیِّنَۃٌ کے معنی ہیں واضح دلیل۔ مُبِیْنٌ کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا۔ واضح کرنے والا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کِتَابٌ مُّبِیْنٌ بھی کہا ہے (۵/۱۵)۔ یعنی نہایت واضح ضابطہ حیات، اور تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ بھی (۱۶/۸۹)۔ ہر بات کو واضح کر دینے والی کتاب۔ یعنی اپنے مطالب میں بھی واضح اور جملہ حقائق کو واضح کرنے والی بھی۔ سورۃ النحل میں ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (۱۶/۴۴) "ہم نے اس ضابطہ حیات کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لئے نازل کیا گیا ہے، تو اُسے ان پر ظاہر کر دے۔ اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر سے کام لیں۔ (نیز ۱۶/۶۴) اس سے ظاہر ہے کہ:-

(۱) خدا نے اپنے رسول کی طرف کتاب نازل کی (انزلنا الیک)

(۲) لیکن یہ کتاب درحقیقت تمام نوعِ انسان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ) اس لئے :-

(۳) رسول اللہ کا فریضہ تھا کہ اسے اپنے تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ)۔ اسے ان تک پہنچا دے: بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ .... (۵/۶۷)

خود اس کتاب کے متعلق بتا دیا کہ :-

(۱) یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے (۱۶/۸۹)۔ یعنی جن امور کا بذریعہ وحی بتانا ضروری تھا، انہیں اس میں

قرآن واضح کتاب ہے، واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کتاب خود مکتفی اور مکمل ہے، اور اپنے مطالب کو واضح کر دینے کے لئے کسی اور بذریعہ کی محتاج نہیں۔

(۲) یہ کتاب تمام نوعِ انسان کے لئے اظہارِ حقیقت ہے۔ بَيَانٌ لِّلنَّاسِ۔ (۳/۱۳۷)

(۳) اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل واضح اور الگ الگ ہو گئے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲/۲۵۶)

(۴) یہ کتاب مبین ہے۔ یعنی بالکل واضح۔ (۵/۱۵)

(۵) یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔ (۵/۱۵)۔ روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشنی ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے، دوسروں چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے اپنی اصلی شکل میں نکھر اور اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اسی لئے اسے تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (۱۲/۱۱۱) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھا دینے والی۔ (فَصَّلَ کے معنی الگ الگ کر دینا ہوتے ہیں)۔

(۶) اس کی وضاحت خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (۷۵/۱۹)۔ اس کے مطالب کو خدا نے کس طرح واضح کیا ہے اسے بھی خود ہی بتا دیا جب کہا کہ: وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۶/۱۰۵)۔ ہم اس طرح قرآن کی آیات کو پھیر پھیر کر، بار بار، سامنے لاتے ہیں تاکہ یہ کہیں کہ تو نے واقعی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا ہے۔ اس طرح ہم اس کے مطالب کو ان لوگوں پر واضح کر دیتے ہیں۔ جو علم و بصیرت سے کام لیں۔ بیّنات (دلائل) انہی لوگوں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں جو غور و تدبر اور علم و دانش سے کام لیں۔

یہ تھی اس علم کی حقیقت جسے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے، نبی اکرمؐ کی وساطت سے، تمام نوعِ انسان کی راہنمائی (ہدایت) کے لئے عطا کیا۔ اس میں کوئی سِر مستور نہیں۔ کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ صاف، واضح، ظاہر، بیّن، کتاب — خود بھی روشن اور ہر دیدۂ بینا کے لئے روشنی۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی التباس نہیں، کوئی مشکوک بات نہیں۔ یہ اپنے مطالب آپ واضح کرتی ہے اور اس کے لئے کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں۔ (جہاں تک اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام متعین کرنے کا سوال ہے، اس کی بابت جلد اوّل ص ۱۲۵۔ آیت (۲/۴) میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے)۔ اس سلسلہ میں ضمناً جلد اوّل ص ۲۶۱۔ آیت (۲/۱۲)؛ جلد دوم ص ۲۲۸۔ آیت (۲/۴)

اور صفحہ ۳۶۶۔ آیت (۷۸/۲) میں بھی ذکر آچکا ہے۔

یہ ہے وہ کتابِ مبین، جس کے متعلق کہا کہ جو لوگ اس کے حقائق کو چھپاتے ہیں، وہ خدا کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کتاب اللہ (وحیٔ خداوندی) کو چھپانے کا ایک طریق وہ تھا جسے سابقہ اہلِ کتاب نے اختیار کیا تھا۔ یعنی خود کتاب میں تحریف کر دینا۔ قرآن کریم کے سلسلہ میں یہ طریق تو کامیاب نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس کے حقائق اور تعلیم کو چھپانے کے لئے اور طریقے اختیار کئے گئے۔ مثلاً:-

قرآنی تعلیم کو چھپانے کے طریق

(۱) یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات منسوخ ہیں۔ یعنی انہیں صرف پڑھا جائے گا، حکم ان کا منسوخ ہوچکا ہے۔ یہ تحریف فی الکتاب کا بالکل انوکھا لیکن بڑا کامیاب طریق ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۱۲۵-۱۲۶۔ زیرِ آیت (۱۰۶/۲) گزر چکی ہے)۔

(۲) پھر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ جلی یا متلو اور دوسری وحی خفی یا غیر متلو۔ وحیٔ جلی تو قرآنِ مجید میں درج ہے اور وحی خفی کتب روایات میں ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول صفحہ ۱۴۱۔ آیت (۱۲۹/۲)۔ اور جلد دوم صفحہ ۱۸۶۔ آیت (۱۵۱/۲) میں آچکی ہے)۔

وحیٔ خفی کے متعلق کہا گیا کہ یہ قرآنِ مجید کے ساتھ، قرآنِ مجید کی مثل ہے۔ اس کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اور ان پر قاضی بھی ہے۔ قاضی کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی احکام کے متعلق جو فیصلہ روایات دیں گی، اُسے شریعتِ خداوندی کہا جائے گا۔

فقہ

(۳) روایات (یا احادیث) کے بعد فقہ سامنے آتی ہے۔ فقہ ان احکام کو کہتے ہیں جو مختلف ائمۂ فقہ (امام ابوحنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگردوں) نے مدون کئے۔ فقہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کے احکام، قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے مسلّم امام، ابوالحسن عبیدہ الکرخی نے کہا ہے کہ "ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ ہے۔" (تاریخ فقہ اسلامی، علامہ خضری۔ اردو ترجمہ شائع کردہ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ صفحہ ۲۲۱)۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کی جن آیتوں کو منسوخ سمجھا جائے یا جنہیں احادیث یا فقہ منسوخ ٹھہرا دے، وہ نہ صرف

مکتوم (چھپائی ہوئی) ہوں گی، بلکہ وہ تو سرے سے معدوم ہی ہو جائیں گی۔ موجود تو وہی آیات سمجھی جاسکتی ہیں جن کا حکم زندہ اور واجب العمل ہو۔

(۴) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو وحی کی زندہ حقیقتیں، رسمی نقل و حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس میں رسوم باقی رہ جاتی ہیں اور مقاصد معدوم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ انہی رسوم کی ادائیگی جو دین میں حصولِ مقاصد کا ذریعہ تھیں، مقصود بالذات بن جاتی ہے اور اس پر قوم مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ کتمانِ کتاب اللہ کا سب سے بڑا اور مؤثر ترین ذریعہ مذہب کا وجود ہے جو مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم رہتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کے متعلق جو کہا ہے کہ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (۹/۳۴) یہ لوگ، خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر بیٹھ جاتے ہیں، تو اس سے یہی مراد ہے۔ یہ کتاب اللہ کو سامنے آنے ہی نہیں دیتے۔

(۵) کتمانِ کتاب اللہ کے یہ طریق تو اربابِ شریعت نے وضع اور اختیار کئے۔ اصحابِ طریقت ایک قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآنِ مجید کے وہ معانی ہیں ہی نہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

باطنی معانی

ان الفاظ کے باطنی معانی ہیں جو ہم پر، خدا کی طرف سے، کشف و الہام کے ذریعے وا نکشاف کئے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ اور ان کے باطنی معانی کا یہی فرق ہے جسے (مولانا) رومؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

ما ز قرآں مغز را برداشتیم — استخواں پیشِ سگاں انداختیم (معاذ اللہ)

باطنیت کے متعلق جلد دوم۔ آیت (۲/۳) صفحہ ۱۲۳ پر بحث کی جاچکی ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ کتمانِ کتاب اللہ کے لئے کس کس قسم کے نگاہ فریب پردے وضع کئے گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم محض تلاوت (اس کے الفاظ کو دہرا کر) "ثواب" حاصل کرنے کے لئے رہ گئی ہے اور یہ نگاہ فریب پردے اس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ اگر ان کی طرف انگلی بھی اٹھائیے تو قیامت برپا کر دی جاتی ہے۔

قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ جو لوگ کتمانِ کتاب اللہ کرتے ہیں، وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتے، وہ خود ہی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (لعنت کے معنی جلد دوم صفحہ ۳۷ زیر آیت (۲/۸۸)

لعنت ہر طرف سے

بیان کئے جاچکے ہیں)۔ یہاں کہا کہ: أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ۔ (۲/۱۵۹) زندگی کی خوشگواریاں دو طریق سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ایک، کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے براہِ راست۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، ان کے ساتھ روابط قائم رکھنے سے۔

کتمانِ کتاب اللہ کے مرتکب، خود تو اس کے متعلق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے، جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کرتے، یا کرنا چاہتے ہیں، یہ ان کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں کسی گوشے سے بھی ثمراتِ حیات نصیب نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا انسان کی یہ محرومی ابدی ہوتی ہے۔ کہا کہ ایسے لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ:۔

۲/۱۶۰ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ (۲/۱۶۰)۔

اگر تم کسی وقت ایسا کر بیٹھو، تو یہ نہ سمجھ لینا کہ بس، اب یہ محرومی ابدی ہے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں۔ تم جب بھی اُس مقام پر واپس آجاؤ جہاں سے تمہارا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا تھا، اور صحیح راستے پر چل پڑو، اور اس طرح اس نظام کو پھر سے عملاً متشکل کر کے نمایاں طور پر دنیا کے سامنے لے آؤ، تو اس کی برکات پھر تمہاری طرف لوٹ آئیں گی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون، اپنی برکات و ثمرات کو لئے، اُس قوم کی طرف تیزی سے بڑھ آتا ہے جو اُس کی طرف رُخ کرتی ہے، اور اس کے لئے برومندی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

جو لوگ یہ محسوس کر کے کہ ہمارا قدم غلط راستے کی طرف اُٹھ گیا تھا، اس سے لوٹ جائیں اور صحیح راستہ اختیار کر لیں، انہیں یہ ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں۔ خدا (معاذ اللہ) منتقم مزاج نہیں کہ وہ چڑ جائے کہ انہوں نے غلط راستہ کیوں اختیار کر لیا تھا، اس لئے ان کے لئے بازیابی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ تو اپنی مخلوق کی نشو و نما چاہتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی قوم اس کی کتاب (ضابطۂ قوانین) کی طرف لوٹتی ہے، اس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جاتی ہے۔ (توبہ اور رحمت کا مفہوم جلد اول صفحہ ۲۶۔ آیت (۲/۱)۔ اور جلد دوم صفحہ ۲۶۶ آیت (۵/۳۹) میں بیان کیا جا چکا ہے)۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو:۔

۲/۱۶۱ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ (۲/۱۶۱)

لیکن جو قوم ایسا نہیں کرتی، اور عمر بھر غلط روش پر ہی چلے جاتی ہے، تو وہ یقیناً اس ضابطۂ قانون کی برکات سے، فطرت کی قوتوں کی تائید سے، اور اُن تمام انسانوں کے تعاون سے محروم رہ جاتی ہے جنھوں نے اس باب میں ان کا ساتھ دینا تھا۔

یہ لوگ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہتے ہیں حتیٰ کہ قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ (ملائکہ کے متعلق دیکھئے جلد دوم صٓ ۲۲)

۲/۱۶۲ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۔ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۲/۱۶۲)

اس قوم کی یہی حالت رہتی ہے۔ اس کی تباہیوں اور بربادیوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی حتیٰ کہ ان پر موت وارد ہو جاتی ہے، اور چونکہ موت سے باز آفرینی کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے انہیں زندگی میں جو مہلت کا وقفہ حاصل تھا، وہ بھی باقی نہیں رہتا۔

ہم یہاں دہرادیں کہ یہ سب کچھ کہا گیا ہے اس قوم کے متعلق جو کتمانِ کتاب اللہ جیسے سنگین جرم کی مرتکب ہو۔ اقوامِ سابقہ نے اس باب میں جو کچھ کیا، اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اسے چھوڑیئے۔ آپ یہ دیکھیئے کہ ہم نے جس طرح کتاب اللہ کو

ہماری حالت

مختلف رنگین پردوں کے پیچھے چھپایا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم صدیوں سے غلامی و محکومی اور محتاجی و محرومی کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ نظامِ خداوندی کے قیام سے ہمیں جو نعمائے حیات میسر آتی تھیں، اُن کا تو ذکر ہی کیا، مذہب میں چونکہ عقل و فکر سے کام لینا جرمِ عظیم اور مادی دنیا سے نفرت، تقویٰ شعاری قرار پاتا ہے، اس لئے ہم فطرت کی قوتوں سے بھی متمتع نہیں ہو سکے۔ اب رہی انسانوں کی طرف سے مدد تو محتاج اور محروم قوم کا دنیا میں کوئی حامی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہوتا۔ طاقتور قومیں انہیں اپنے مطلب کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کرتی ہیں اور اس کے عوض اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں ان کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ یہ ہے وہ الم انگیز عذاب جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آرہے ہیں، اور چونکہ مذہب (شریعت اور طریقت دونوں) ہمیں تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں۔ اس لئے ہم اپنی غلط روش کو چھوڑنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لاتے۔

قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے والی قوموں کی یہ حالت یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتی۔ یہ خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل کا حتمی، لازمی نتیجہ ہوتی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ کائنات میں اس کے قانون کے سوا کسی کا قانون نافذ العمل نہیں۔

۲/۱۶۳ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲/۱۶۳)

کائنات میں قانون صرف ایک ہی کا جاری و ساری ہے۔ یعنی خدا کا قانون جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ کائنات نشوونما حاصل کرتے ہوئے، ارتقائی منازل طے کرتی جائے۔

یہ ہے خدا کی رحمت کا مفہوم۔ (جلد اوّل صفحہ ۲۔ آیت (۱/۲))۔ جو قومیں اس کے قوانین پر پردے ڈال کر، اپنے خود ساختہ قوانین وضوابط کی پیروی کریں گی، وہ آخر الامر تباہ اور برباد ہو کر رہیں گی۔ اس کا ثبوت؟ اس کا ثبوت خود یہ کارگہ کائنات ہے۔

۲/۱۶۴ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ (۲/۱۶۴)

تم نے یہ دیکھنا ہو کہ کائنات میں کس طرح خدائے واحد کا قانون کار فرما ہے، اور وہ قانون کس طرح تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے، تو، اس کے لئے کائنات کی حیرت انگیز مشینری پر غور کرو اور دیکھو کہ اس کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔ دن اور رات کی گردش مدام کس نظم وضبط سے جاری ہے۔ اتنے اتنے بڑے جہاز، منفعت بخش سامان سے لدے ہوئے، کس طرح سینۂ بحر پر تیرتے پھرتے ہیں (اور وہ کون سا قانون ہے جو انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے)۔ اُس صاف اور شفاف پانی کو دیکھو جو بادلوں سے برستا ہے اور زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ نیز، اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ صفحۂ ارض پر، انواع واقسام کے چلنے پھرنے والے ذی حیات کس طرح پھیل رہے ہیں۔ ہوائیں کس طرح، خاص خاص موسموں میں، اپنی سمت بدلتی ہیں۔ بادل کس طرح زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں، قانونِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑے، اِدھر سے اُدھر کھنچے چلے جاتے ہیں۔

ان تمام مظاہرِ فطرت پر غور کرنے سے انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کائنات کا نظم وضبط ایک ہی ذی اقتدار ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ لیکن اس نتیجہ پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیں۔

اشیائے کائنات چونکہ مجبور پیدا کی گئی ہیں اس لئے وہ قوانینِ خداوندی کی بے چون وچرا اطاعت کئے جاتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کائنات کی یہ محیر العقول مشینری اس حسن وخوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل چلی جا رہی ہے۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے، اور وہ اس مرحمتِ خداوندی کا بڑا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس کی حالت

یہ ہے کہ :-

۲/۱۶۵ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (۲/۱۶۵)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔ اور اللہ والوں کو اس سے زیادہ تر محبت ہے اللہ کی۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

خدا کے ساتھ محبت

"محبت" کا جو تصور ہمارے ہاں ہے، اس کی رُو سے سوچیئے کہ اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ کسی اَن دیکھی، غیر مرئی، غیر محسوس چیز کے ساتھ محبت نہیں کر سکتے۔ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) یا مجرّد نظریات کی عظمت کا احساس آپ کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن اسے بھی "محبت" سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ ذاتِ خداوندی وہ ہے کہ اسے دیکھنا تو ایک طرف، وہ ـــ برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ـــ ہے۔ (۶/۱۰۴)۔ اسے کسی محسوس شے کے ساتھ تشبیہ بھی نہیں دی جا سکتی، اسے مثال کے ذریعے بھی سمجھایا نہیں جا سکتا۔ (۴۲/۱۱)۔ لہٰذا اس کے ساتھ اس قسم کی محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن ہمارے ہاں اہلِ تصوّف نے اللہ کے ساتھ محبت کو اصلِ دین قرار دیا اور پھر اس بنیاد پر ایسی ایسی تصوراتی عمارتیں استوار کیں جو طلسمِ ہوش رُبا کو بھی شرمائیں۔ اللہ کو محبوب بلکہ معشوق قرار دیا اور اسے بالکل انسانی معشوق کی شکل میں پیش کیا۔ اسے عشقِ حقیقی کہہ کر پکارا گیا اور اس کا اوّلین زینہ عشقِ مجازی بتایا گیا۔ "عشقِ مجازی" کیا ہے؟ امرد پرستی! آپ فارسی شعرا کا صوفیانہ کلام دیکھیئے۔ وہ "مغبچوں" کی محبت سے پٹا پڑا ہے۔ ساری شاعری اُنکے خط و خال۔ لب و رخسار۔ زلف و کاکل کے گرد گھومتی ہے۔ وہیں سے یہ انداز اُردو شاعری میں در آیا۔ جب ان حضرات سے پوچھیئے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب مجازات ہیں جو خدا کے ساتھ عشق و محبت کا زینۂ اوّلیں ہے۔ اس زینۂ اوّلین کو تو سب سمجھتے اور دیکھتے ہیں، لیکن، زینۂ آخریں کو آج تک نہ کسی نے دیکھا ہے، نہ سمجھا۔ زیادہ کریدیئے تو کہا جاتا ہے کہ یہ رموز و اسرار الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے ـــ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانچشی ـــ جو تن لاگے سو تن جانے۔ ـــ اس کی منزلِ آخریں فنا فی اللہ بتائی جاتی ہے۔ یعنی ـــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ـــ اسی کا نام وصال ہے۔

وصال اور عُرس

آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی وفات کو وفات نہیں کہا جاتا، وصال کہا جاتا ہے اور پھر اُن کا "عُرس" منایا جاتا ہے۔ "عُرس" کے معنی شادی ہیں۔ (تقریبِ عروسی

کے الفاظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتے ہیں) اسی قسم کی ہیں وہ تصوّراتی عمارتیں جو "حبّ اللہ" کی بنیادوں پر استوار کی جاتی ہیں۔ تصوّف پر تفصیلی بحث جلد دوم صفحہ ۔ زیر آیت (۲/۱۰۲) گزر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیسائیت میں (GOD IS LOVE) کا عقیدہ تھا۔ (یعنی خدا محبت ہے)۔ اسی نے ہمارے ہاں "حبّ اللہ" کا لبادہ اوڑھ لیا اور عین دین بن گیا۔ اس قسم کے تمام تصوّرات دُوسروں سے مُستعار لئے ہوئے ہیں۔

اب آیئے قرآن کریم کی طرف۔ اَلْحُبُّ (مادہ ح۔ ب۔ ب) کے متعدد معانی ہیں جن میں سے تین چار زیادہ اہم ہیں۔ یعنی (۱) کسی چیز کو لازم پکڑنا۔ اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا۔ (۲) کسی کام کے نتائج کا اُبھر کر سامنے آ جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ اَحَبَّ الزَّرْعُ۔ کھیتی کے خوشوں میں دانے پڑ گئے۔ (۳) چاہنا یا پسند کرنا۔ اور (۴) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے تھامے رکھنا۔

حبّ اللہ کا قرآنی مفہوم

ان معانی کی رُو سے ظاہر ہے کہ انسان کے خدا سے "محبت کرنے" سے مراد ہوگی، کتاب اللہ یا قوانینِ خداوندی کو محکم طور پر پکڑنا یعنی ان کی لزوم و استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ قرآنِ کریم نے اسی کو "اعتصام بحبل اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۳/۱۰۲)۔ اور خدا کے انسان سے "محبت کرنے" کے معنی ہوں گے انسان کی حفاظت کرنا۔ اسے تھامے رکھنا۔ اس کے حسنِ عمل کو نتیجہ خیز بنانا۔ اسی کو خدا کی پسندیدگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ۔ (۳/۳۰)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ خدا کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (۴/۸۰)۔ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی"۔ اس سے واضح ہے کہ آیت (۳/۳۰) میں جو کہا گیا ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ، تو اس کے معنی اللہ کی اطاعت کرنا ہیں یعنی آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم اللہ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے رسول کا اتباع کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۳/۳۰) "اللہ" تم سے محبت کرے گا، یعنی تمہاری لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہ حفاظت اور رحمت کرنے والا ہے۔ اس آیت میں دیکھئے۔ بندوں کی طرف سے خدا کے ساتھ محبت کے معنی اس کی اطاعت کرنا ہیں، اور خدا کی طرف سے بندوں کے ساتھ محبت کے معنی، بندوں کی حفاظت کرنا، انہیں سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا۔ ان کے حسنِ عمل کی "کھیتیوں میں دانے پیدا کرنا" ہیں۔ "محبت" کے یہ تمام معانی اُوپر دیئے جا چکے ہیں۔

سورۃ المائدہ میں ہے: یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ۔ (۵۴/۵) اے جماعت مومنین! جو کوئی تم میں سے دینِ خداوندی سے پھر جائے تو (وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔) فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔ (۵۴/۵)۔ خدا ان کی جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کی اطاعت کریں گے۔ اور خدا ان کی حفاظت کریگا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے بریشم کی طرح نرم اور شاخِ ثمربار کی طرح خمیدہ ہوں گے۔ لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۲۹/۴۸) وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی (مخالف) کی طعن وتشنیع سے اثر پذیر نہیں ہوں گے۔ یہاں سے یحبونہٗ (ان کا خدا سے محبت کرنا) کا مفہوم واضح ہے۔ باقی رہا "یُحِبُّھُمْ" (یعنی خدا کا ان سے محبت کرنا) تو اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (۵۴/۵) وہ نوازشاتِ خداوندی کے مستحق قرار پائیں گے۔ ان کی سعی وعمل ثمربار ہوگی۔ "محبت" کا مزید مفہوم ایک آیت بعد ان الفاظ سے واضح کر دیا کہ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ (۵۶/۵)۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) سے روگردانی کریگا تو...... یعنی یہاں "خدا کے ساتھ محبت" کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے جس کے معنی روگردانی کرنا۔ اعراض برتنا۔ نافرمانی کرنا ہیں۔

ان اور ان جیسی دیگر آیات سے واضح ہے کہ بندوں کی خدا کے ساتھ محبت کے معنی ہیں۔ احکامِ خداوندی کی ثبات واستقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ اور خدا کی بندوں کے ساتھ محبت کے معنی ہیں، خدا کی طرف سے ان کی حفاظت اور نشوونما کا سامان بہم پہنچنا۔ ان اطاعت کرنے والوں کی مختلف مقامات پر خصوصیات بتائی گئی ہیں (مثلاً) اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (۱۹۵/۲) اللہ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔ دیگر مقامات پر انہیں تَوَّابِیْنَ (۲۲۲/۲) مُتَطَھِّرِیْنَ (۲۲۲/۲) مُتَّقِیْنَ۔ (۷۶/۳) صَابِرِیْنَ۔ (۱۴۶/۳) وغیرہ کہہ کر پکارا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آیۂ زیرِ نظر (۱۶۵/۲) کا جتنا حصہ پہلے درج کیا گیا ہے۔ یعنی وَمِنَ النَّاسِ...... حُبًّا لِّلّٰہِ۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا۔

> دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور ہستیوں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ انہی اختیارات واقتدارات کے مالک ہیں جو خدا کو حاصل ہیں۔ وہ ان کے احکام وارشادات کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح خدا کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں وہ نہایت شدت سے ان

قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی انسان کو خدائی اختیارات میں شریک نہیں کرتے۔ وہ ان قوانین کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے۔

" اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ " کا مفہوم جلد اوّل صفحہ ۲۹۸ ۔ زیر آیت (۲/۲۲) دیا جا چکا ہے۔ آیت کا باقی حصّہ یہ ہے :-

۲/۱۶۵ وَلَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ ۔ (۲/۱۶۵)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، وہ ان لوگوں کی سمجھ میں اس وقت نہیں آسکتا۔ جب ان کی اس غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ فی الواقعہ کائنات میں اقتدار و اختیار خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اس کے قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے وضع کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے اور اس طرح انسانوں کو خدا کا درجہ دیدینے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد کہا :-

۲/۱۶۶ اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا وَرَاَوُا الۡعَذَابَ وَتَقَطَّعَتۡ بِہِمُ الۡاَسۡبَابُ ۔ (۲/۱۶۶)

اس وقت یہ دیکھیں گے کہ جن (حکمرانوں، لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں) کی یہ پیروی کیا کرتے تھے وہ کس طرح ان سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ وہ سہارے کس طرح ٹوٹ رہے ہیں جو انہوں نے اُن سے وابستہ کر رکھے تھے اور ان کے باہمی رشتے کس طرح منقطع ہو رہے ہیں۔

جب ان لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی تو اس وقت ان کے معتقدین اور متبعین (FOLLOWERS) کی کیفیت کیا ہوگی، فرمایا :-

۲/۱۶۷ وَقَالَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡہُمۡ کَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ کَذٰلِکَ یُرِیۡہِمُ اللّٰہُ اَعۡمَالَہُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَمَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ ۔ (۲/۱۶۷)

اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ اگر وقت کا دھارا ایک بار پیچھے کی طرف مڑ جائے تو ہم بھی ان لیڈروں اور پیشواؤں سے اسی طرح آنکھیں پھیر لیں جس طرح انہوں نے آج ہم سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔

یوں ان کی غلط روش کے نتائج بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور یہ دیکھ لیں گے کہ جن ہستیوں

کو وہ اپنے لئے اس قدر محکم سہارے سمجھتے تھے، انہوں نے انہیں کس قدر عاجز و ناتواں بنا ڈالا ہے۔ ایسا عاجز و ناتواں اور افسردہ و واماندہ کہ ان میں اس تباہی سے نکلنے کی سکت ہی نہیں رہی۔

کس قدر حسرتناک ہے ان کا یہ انجام! پُرفریب سہاروں پر تکیہ کرنے والوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جب ان کے لیڈروں کی فریب دہی کا پردہ چاک ہوگا تو یہ کہیں گے کہ اگر ایک بار گزرا ہوا وقت واپس آجائے تو ہم انہیں اس کا مزہ چکھائیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکے گی۔

وقت کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا

اس میں ایک عظیم نکتہ بیان کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں — ماضی کبھی مستقبل نہیں بن سکتی۔ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا۔ زمان (TIME) آگے کی طرف جاتا ہے، پیچھے کی طرف نہیں۔

یونانیوں کے ہاں زندگی کا تصور دائری (CYCLIC) تھا، اس لئے ان (کے ہاں کے بعض فلاسفرز) کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان بار بار اس دنیا میں آتا ہے۔ اسے تناسخ کا عقیدہ کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان کے ہاں سے یہ نظریہ مستعار لیا اور "آواگون" کے نام سے اسے اپنے مذہب کا جزو بنا لیا۔ اس نظریہ کا ابطال جلد اوّل ۴۴ آیت (۲/۲۸) میں کیا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم بالتصریح کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتا۔ سورۃ مومنون میں ہے۔

تناسخ کا عقیدہ باطل ہے

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۔ لَعَلِّىْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۔ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۔ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳/۹۹-۱۰۰)

تا آنکہ جب ان لوگوں کے سرہانے (جو غلط راستے پہ چلتے تھے) موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں بہت اچھے اچھے کام کروں۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزوئے خام ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ پیچھے نہیں جا سکتے۔

سورۃ شعرآ میں ہے کہ اہلِ جہنم قیامت میں کہیں گے کہ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۲۶/۱۰۲) ہم کہیں ایک بار پھر دنیا کی طرف لوٹ سکیں تو ہم بھی ایمان لانے والوں سے ہو کر بتائیں۔ (نیز ۳۹/۵۸ ؛ ۶/۲۸)

وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑا ہی نہیں کرتا۔ یہ یا تو ایک مقام پر رک جاتا ہے (جیسے جسم کی موت کے سلسلہ

ہیں) اور یا آگے بڑھتا ہے (انسانی ذات کے اس دنیاوی زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں)۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود　　　این مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تشریح جہنم سے متعلق مقام میں سامنے آئے گی۔ آیہ زیر نظر (۲/۱۶۷) میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا عوام کو سبز باغ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور عوام کے سامنے یہ حقیقت اس وقت آتی ہے جب اُن کی اِن فریب کاریوں کا پردہ چاک ہوتا ہے لیکن اس وقت ان کی غلط روش کے نتائج ان کی تباہی کا موجب بن چکے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے واویلا مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (اس میں خود عوام کی کس حد تک ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے اس مقام پر بیان کیا جائے گا جہاں جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے مکالمات کا ذکر آئے گا۔ جو حضرات اسے بلا تاخیر دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب "جہانِ فردا" میں جہنم کا عنوان ملاحظہ فرمالیں۔

(۰)

اس کے بعد بتایا کہ یہ اپنے آپ حاکم بن بیٹھنے والے اور خدائی فوجدار (مذہبی پیشوا) کرتے کیا ہیں:-

۲/۱۶۸-۱۶۹

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۶۸-۱۶۹)

یہ لوگوں کو سبق پڑھاتے رہتے ہیں کہ تم معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرو اور صرف اپنے مفاد کا خیال رکھو اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے جاؤ۔ اور ستم ظریفی یہ کہ یہ اپنے اس خود ساختہ مسلک کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ فرمودۂ خداوندی ہے۔ یہ شریعتِ حقہ ہے۔

اے نوعِ انسان! دیکھنا تم کہیں ان قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں، مفاد پرستوں کے پیچھے نہ لگ جانا۔ ان کی بات نہ ماننا۔ یہ تمہارے بھلے کی نہیں کہتے۔ یہ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ خدا کا فرمان یہ نہیں کہ تم سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو اور اس طرح معاشرہ میں ایسی شکل پیدا کر دو کہ کسی کے ہاں دولت کے انبار لگے ہوتے ہیں اور کسی کو ایک وقت کی روٹی تک میسر نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ تم خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھو اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لو۔ یہ رزق خداوندی کے حلال اور طیب طریق

حلال اور طیّب رزق

سے کھانے کا طریق ہے۔

حلال اور طیّب رزق کی تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے۔ اسے ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ [حوالوں کے لئے دیکھئے۔ جلد اوّل صفحہ ۱۰۵ آیت (۲/۳)، نیز صفحہ ۲۳۶۔ آیات (۱۱-۱۲/۲)، نیز صفحہ ۳۰۵-۲۹۴۔ آیت (۲/۲۲)، نیز صفحہ ۳۵۴۔ آیت (۲/۲۹)۔ جلد دوم صفحہ ۲۸۳۔ آیت (۲/۵۷)]

طیّب کا لفظ پہلے آچکا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۲۸۳۔ آیت (۲/۵۷)۔ اور شیطان کے متعلق تفصیلی بحث جلد دوم۔ باب اوّل صفحہ ۵ میں گزر چکی ہے۔ حلال کا لفظ تشریح طلب ہے لیکن ذرا آگے چل کر [آیت (۲/۱۷۳) میں] حرام کا لفظ آتا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ حلال و حرام دونوں کی وضاحت وہاں کی جائے۔ اس کے لئے تھوڑا سا توقف فرمائیے۔ سوء اور فحشا کے الفاظ پہلی بار آئے ہیں اور وضاحت طلب ہیں۔

فحشاء کے معنی

پہلے فَحْشَآءُ کو لیجئے۔ اَلْفُحْشُ (مادہ ف۔ ح۔ ش) کے بنیادی معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ زیادتی کر بیٹھنا۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر معیوب، قابلِ مذمت اور بے حیائی کے کاموں کے لئے استعمال ہونے لگا۔

لیکن فَحْشَآء کے معنی بخل کے ہیں۔ (شاید اس لئے کہ عربوں کے نزدیک بخل سب سے زیادہ امرِ شنیع تھا)۔ اس کی وضاحت آیت (۲/۲۶۸) سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا کہ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلًا۔ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۔" شیطان تمہیں ڈراتا ہے کہ اگر تم نے فاضلہ دولت کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیا، تو تم غریب اور محتاج ہو جاؤ گے۔ اس لئے وہ تمہیں بخل کی تلقین و تاکید کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ خداوندی تمہیں اس کی ضمانت دیتا ہے کہ تم ہر قسم کی احتیاج سے محفوظ رہو گے اور تمہیں رزق فراواں ملتا رہے گا۔ یہ اس خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے جس کے اسباب و ذرائعِ رزق بڑے وسیع ہیں اور وہ ہر ایک کی ضروریات کا علم بھی رکھتا ہے۔"

قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں بھی اسے دہرایا گیا ہے کہ فَاِنَّہٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ..... (۲۴/۲۱)
اس کے برعکس، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ..... (۷/۲۸)۔ خدا بخل کا حکم نہیں دیتا بلکہ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ ..... (۱۶/۹۰) اس سے روکتا ہے۔ وہ نظامِ خداوندی کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ..... (۲۹/۴۵)۔ نظامِ صلوٰۃ بخل (خود غرضی۔ مفاد پرستی) اور قابلِ نفرت امور کو روک دیتا ہے۔ (واضح رہے کہ فحشاء کا لفظ۔ بخل کے علاوہ دیگر قابلِ مذمت امور کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی

مثالیں متعلقہ مقامات پر سامنے آئیں گی)۔

آیت (۲/۱۶۹) میں دوسرا تشریح طلب لفظ السُّوٓءِ ہے جس کی جمع اَلسَّیِّئَاتُ ہے۔ سُوٓءٌ کی ضد حَسَنَۃٌ ہے۔

سیئآت کے معنی

اور سیئاتٌ کی ضد حَسَنَاتٌ۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں بکثرت آتے ہیں۔ ہمارے ہاں حسنات کے معنی نیکیاں اور سیئات کے معنی برائیاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن نیکی اور بدی کا جو محدود مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے، قرآن کی ان اصطلاحات کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ علماء لغت نے کہا ہے کہ حُسْن سے مراد ہوتی ہے کسی چیز کے تناسب و توازن (PROPORTION) کا صحیح صحیح ہونا۔ اس کے مقابل لفظ فَسَادٌ آتا ہے جس کے معنی ہیں معاشرہ کا غیر متوازن ہو جانا۔ قرآن کریم میں، قارون کے قصہ کے سلسلہ میں، نظام سرمایہ داری کو الفساد کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کے مقابل میں حسن کا لفظ آیا ہے (۲۸/۷۷) اس مقام

حسنات کے معنی

پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ حَسَنَۃٌ اور حَسَنَاتٌ کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ کا حسن — یعنی توازن و تناسب — برقرار رہے، اور (اس کے مقابلہ میں) سَیِّئَۃٌ اور سَیِّئَاتٌ کے معنی ہوں گے ایسے کام جن سے انسان کی ذات اور معاشرہ کا حسن (توازن) بگڑ جائے۔ اس سے واضح ہے کہ حسنۃ اور سیئۃ کا حقیقی مفہوم، ان کے مروجہ معانی (نیکی۔بدی) کے مقابلہ میں کس قدر وسیع اور جامع ہے۔ جب انسانی ذات میں توازن پیدا ہو جائے (جسے BALANCED PERSONALITY کہتے ہیں) تو اس سے اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کوئی معاشرہ متوازن ہو جائے تو اسے زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، جس کسی فرد کی ذات کا توازن بگڑ جائے تو نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے اور اس کی سیرت اور کردار غیر صحت مندانہ ہو جاتے ہیں اور جب کسی معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو اس سے زندگی کے ہر گوشے میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ (میں نے مفہوم القرآن میں صحیح توازن کے لئے "ہمواریاں" اور بگڑے ہوئے توازن کے لئے "ناہمواریاں" کی اصطلاحات استعمال کی ہیں)۔

حسنات اور سیئات کے سلسلہ میں اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائے گی۔

السُّوٓءِ اور الفحشاء کے ان معانی سے، آیت (۲/۱۶۹) کا وہ مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا جسے اوپر لکھا گیا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ رزقِ حلال و طیب سے کیا مراد ہے۔ منشاء خداوندی یہ ہے کہ اس نے جو سامانِ زیست بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے (مِمَّا فِی الْاَرْضِ) اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ وہ ہر شخص

کو اس کی ضروریات کے مطابق، بلا منتِ غیرے، ملتا جائے اور یوں معاشرہ کا توازن نہ بگڑے۔ اس میں ناہمواریاں نہ پیدا ہوں۔ لیکن مفاد پرست، خود غرض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیں، اور اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیں۔ یہ لوگ نوعِ انسان کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ یہ اس قسم کا (ناہمواریاں پیدا کرنے والا) نظام قائم کرتے ہیں، اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھ کر اسے سندِ الوہیت عطا کر دیتی ہے۔ یعنی وہ یہ فتویٰ دیدیتے ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری منشاءِ خداوندی کے عین مطابق ہے۔ نزولِ قرآن مجید سے پہلے تو اس کی وجہ جہالت ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے پاس منشاءِ خداوندی معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے پاس خدا کی کوئی کتاب اصلی، حقیقی، (غیر محرف) شکل میں موجود نہیں تھی۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد تو یہ صورت نہیں رہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، ان کے پاس، اس غلط اور باطل نظام کی تائید کے لئے دلیل یا سند کیا ہے؟ وہی دلیل اور سند جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شروع سے پیش کی جاتی رہی ہے اور آج بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی

۲/۱۷۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۔ (۲/۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اس کا اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی راستے پر چلتے جائیں گے جس راستے پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے — یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں، اور نہ ہی وحی کے راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے! یا للعجب۔

مسلکِ اسلاف کی کورانہ تقلید کے متعلق، مطالب الفرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے

مسلکِ تقلید

ایک نظر دیکھ لیا جائے (حوالوں کے لئے دیکھئے صفحہ ۶۔ آیت (۱/۲)؛ صفحہ ۱۶۴۔ آیت (۲/۴)؛ صفحہ ۳۰۷ آیت (۲/۴۴)۔ زندگی کی علامت 'حرکت' ہے، اور 'موت' جمود سے پہچانی جاتی ہے۔ اسلام میں بُت پرستی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے۔

وثن کے معنی

(۲۲/۳۰) جو وَثَن کی جمع ہے۔ وَثَن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت۔ جامد و غیر متحرک ہو جانا۔ بُت کو وَثَن اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ جامد ہوتا ہے۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نہجِ زندگی جس میں حرکت نہ رہے، وہ جامد ہو جائے، وَثَن ہے۔ جب قرآنی

ضابطہ حیات کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا جائے حیرت ہے کہ ہم نے تو قرآنِ کریم کے اس عظیم نکتہ کو پسِ پشت ڈال دیا لیکن مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ (ہمارے دور کا نامور فلاسفر) وائیٹ ہیڈ لکھتا ہے :-

بت پرستی مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے کا نام ہے۔[1]

اس قسم کی بت پرستی میں ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے نظریات اور مناسک کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں اور ان کے معانی، مفہوم اور مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے جس کے محافظ مذہبی پیشوا ہوتے ہیں۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق یہی مفکر لکھتا ہے :-

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رو زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرائے چلے جاتے ہیں ...... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً ص۳۵)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے، بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت نہیں رہتی (ان میں اس کی صلاحیت ہوتی نہیں کیونکہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہوتے)۔ بھیڑ، جو کچھ آج سے پانچ لاکھ سال پہلے تھی، وہی کچھ آج ہے۔ بھیڑ کا بچہ بھیڑ ہی بن سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اسلاف کے مسلک و منہاج کی کورانہ پیروی کا نتیجہ خواہ وہ حیوانات میں ہو، اور خواہ اسے انسان نما حیوان اختیار کریں۔ قرآنِ کریم نے اس مسلک کے سمجھانے کے لئے یہی مثال دی ہے جب کہا ہے کہ :-

---

[1] A.N. WHITE HEAD — ADVENTURE OF IDEAS P. 12

۱۷۱/۲ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ
نِدَآءً ۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (۱۷۱/۲)

مذہبی پیشواؤں اور ان کے پیچھے چلنے والے (مقلدین) کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں: بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے، اور بھیڑ بکریاں جو ان آوازوں پر لگی ہوتی ہیں، ان کے مطابق ادھر ادھر مڑتی رہتی ہیں۔ نہ چرواہے کو اس کا علم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا منطوق اور ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے، اور نہ ہی وہ بھیڑ بکریاں ان آوازوں کا مطلب سمجھنے کی اہل ہوتی ہیں۔ یہ ہیں تقلید آبا کرنے والے

حیوانی روش

بہرے، گونگے، اندھے، عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ (۱۷۹/۷) بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، کہ حیوان تو معذور ہوتے ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی حاصل نہیں ہوتی، اور یہ انسان نما حیوان، ان صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہوئے، حیوانوں کی روش اختیار کئے رہتے ہیں۔

اس کے بعد کہا:۔

۱۷۲/۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (۱۷۲/۲)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا تم کہیں ایسی روش اختیار نہ کر لینا اور ان کی اس قسم کی باتوں پر کان نہ دھرنا کہ ہمارے اسلاف نے اسے حلال قرار دیا ہے اور اسے حرام۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو رزق خدا نے عطا کیا ہے، اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق۔ حلال و طیّب طریق سے کھاؤ پیو، اور اس کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤ۔ یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ تم خدا کی اطاعت کرتے ہو، ان کے اسلاف کی نہیں۔

مسلکِ اسلاف کو دینِ خداوندی سمجھنے والے مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ بیٹھے حرام اور حلال کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے، اور انسانی آزادی کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑتے رہتے ہیں۔ تم اُسے حلال سمجھو جسے خدا نے حلال قرار دیا ہے اور اُسی کو حرام جسے اس نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا ہے۔ اور یہ فہرست بڑی مختصر ہے۔

حرام اور حلال کا نظریہ

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس فہرست کی طرف آئیں، حرام اور حلال کا نظریہ قرآنی روشنی میں سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ دین میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابن آدم۔ ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنالے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔ اسے اپنے احکام کے تابع رکھے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اُسے ضابطہ قوانین، یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو، کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو" لہٰذا قرآنِ کریم کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً:۔

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم نے اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیبِ خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلسِ قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون پر پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی امتِ مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (AUTHORITY) ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآنِ کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں تیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا، منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔

قرآنِ کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۃ بقرہ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۔۔۔۔ (۲/۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مُردار اور (بہتا ہوا ۶/۱۴۵) خون اور سوٴر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں اُن کے ساتھ اشیاء مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔۔۔۔ (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے:۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۔۔۔۔ (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ [1]

ان آیات سے ظاہر ہے کہ:۔

(۱) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۲) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(۳) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(۴) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے اُن کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

---

[1] لفظ حرام کے دیگر استعمالات اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔

ان تصریحات کے بعد اب آیۂ زیرِ نظر کیطرف آئیے جس میں کہا گیا ہے:۔

۲/۱۷۳
إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (۲/۱۷۳)۔ نیز (۱۶/۱۱۵)

خدا نے تم پر صرف یہ چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔ مردار۔ خون۔ خنزیر کا گوشت۔ اور ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

پھر اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے پینے کے لئے کچھ اور نہ ملے اور تم جان بچانے کے لئے مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی یا لذّت یابی کی نہ ہو، تو اس صورت میں، ان چیزوں کو بقدرِ ضرورت کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔ چونکہ اس میں تمہاری نیت قانون شکنی کی نہیں، اس لئے اس سے تمہاری ذات پر جو اضمحلال واقع ہونا تھا، قانونِ خداوندی یہ محکم یقین تمہیں اس سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری ذات کی نشوونما پر مضر اثر نہیں پڑے گا۔

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی کھانے پینے کی حرام چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہی چار چیزیں گنائی گئی ہیں۔ البتہ بعض آیات میں ان کی مزید تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں مَيْتَةٌ (مردار) کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ...... (۵/۳) یعنی جو جانور طبعی موت مر جائے (ميتة) اس کے علاوہ۔ جو گلا گھونٹ کر مر جائے۔ چوٹ کھا کر مر جائے جو اُوپر سے گر کر مر جائے، کسی جانور کا سینگ لگنے سے مر جائے یا جسے درندوں نے پھاڑ کھایا ہو۔ یہ بھی حرام ہیں۔ ہاں اگر ان جانوروں کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو پھر ان کا کھانا جائز ہے۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ۔ (۵/۳)۔ نیز جن جانوروں کو استھانوں پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کیا جائے وہ بھی حرام ہیں۔ یعنی ان مقامات پر جو لوگوں نے نذر نیاز کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ یا جن کا گوشت پانسوں کے ذریعے تقسیم کیا جائے (عہدِ جاہلیہ میں یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی۔ تفصیل اس کی میسِر کے ضمن میں آئے گی جہاں بتایا جائے گا کہ قرعہ اندازی یا فال لینا بھی ازروئے قرآن ممنوع ہے)۔ آیت (۵/۴) میں کہا گیا ہے کہ جو شکار، شکاری جانور تمہارے لئے پکڑیں، وہ بھی حلال ہے۔

آیت (۵/۳) میں دَمٌ کہا گیا ہے۔ (یعنی خون)۔ آیت (۶/۱۴۵) میں دَمًا مَّسْفُوحًا کہہ کر اس کی وضاحت

کر دی۔ یعنی بہتا ہوا لہو۔

آیت (۵/۳) میں "فَمَنِ اضْطُرَّ" کہا تھا۔ یعنی جو مجبور ہو جائے۔ آیت (۵/۳) میں "فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ" کہہ کر اس کی وضاحت کر دی۔ یعنی جو بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے۔ آیت (۲/۱۷۳) میں اضطراری حالت کے بعد کہا۔ "غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ"۔ بَاغٍ کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانے والا۔ قانون شکنی کرنے والا۔ بغاوت کرنے والا۔ عَادٍ کے معنی بھی حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ آیت (۵/۳) میں "غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ" کہا۔ یعنی اثم (قانون شکنی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے نہیں۔ معنی واضح ہیں۔ یعنی اضطراری حالت کے معنی ہیں، بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جانا۔ لہٰذا، ایسی حالت میں حرام چیز کو اتنا ہی کھانا جائز ہو گا جس سے بھوک رفع ہو جائے۔ اس سے زیادہ کھانا۔ یا محض لذت کے لئے کھانا، حد سے تجاوز ہو جائے گا۔

کھانے پینے کی جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے، ان میں تین چیزیں تو مادی ہیں۔ یعنی مُردار، خون اور خنزیر کا گوشت اور چوتھی چیز اعتقادی۔ یعنی ہر وہ حلال شے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جائے گی۔

غیراللہ کی طرف منسوب

اس سلسلہ میں فرمایا۔ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ (۶/۱۱۹)۔ جس چیز پر خدا کا نام لیا جائے اسے ہی کھاؤ۔ یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ قوانینِ خداوندی پر تمہارا ایمان ہے۔ ذرا آگے جا کر کہا: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (۶/۱۲۲)۔ جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے، اسے مت کھاؤ۔ ان آیات میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی گئی لیکن جس سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق حلال جانوروں کے ذبح کرنے سے ہے۔ آیت (۵/۴) سے اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ:۔

(۱) کھانے پینے کی چیز جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ حرام ہو جاتی ہے۔

(۲) حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو ان کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ وہ اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ یعنی خدا کا نام لینا لازمی ہے۔

ان امور کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ لیکن آپ اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ہاں مُردار اور سؤر کا کھانا تو ایک طرف، ان کا نام تک لینا بھی قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے لیکن پیروں، فقیروں کے نام کی نذر نیاز اور مزاروں، مقبروں پر چڑھائے ہوئے چڑھاوے، نہ صرف یہ کہ انہیں شیرِ مادر کی طرح حلال اور طیب سمجھا جاتا ہے بلکہ انہیں متبرک

قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے بہ نصِ صریح حرام ہوتے ہیں۔ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲/۱۷۳)۔ ہیں۔ اُهِلَّ کا مادہ (ھ - ل - ل) ہے جس کے بنیادی معنی آواز بلند کرنا یا پکارنا ہیں۔ [ابتدائی تاریخوں کے چاند کو هِلَالٌ اس لئے کہتے ہیں کہ جو اسے دیکھ لے وہ بآوازِ بلند اس کا اعلان کرتا ہے۔ ہمارے ہاں هَلَّلَ کے معنی تہلیل یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کہنے کے ہیں] پکارنے کا عملی مفہوم، غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (۶/۱۲۰)۔ خدا نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کیا کیا چیزیں حرام ہیں۔ ان کے سوا سب چیزیں حلال ہیں۔ سو جب کسی جانور کو خدا کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو اس کا کھانا از روئے دینِ خداوندی حلال ہو جائے گا۔ اسے کسی کے فتوے کی رُو سے حرام سمجھنا، قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تمہارے مرغوب خاطر نہ ہو یا طبی طور پر مضر صحت ہو۔ (یعنی تمہارے لئے طیّب نہ ہو)۔ اس سے واضح ہے کہ (بجز اضطراری حالت کے) حرام چیزوں کو تو کھایا ہی نہیں جا سکتا، لیکن ہر حلال شے کا کھانا لازمی اور فرض نہیں۔

حالتِ احرام میں صَيْدُ الْبَرِّ۔ بھی حرام ہے۔ (۵/۱)؛ (۵/۹۵-۹۶)۔ اس کی تفصیل حج کے ضمن میں سامنے آئے گی۔

اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا

سورۃ المائدہ میں ہے۔ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ .... (۵/۵)۔ "اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا تمہارے لئے حلال" ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اہلِ کتاب کے ہاں کا ہر کھانا حلال ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں کا وہی کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا جسے قرآن نے حرام قرار نہیں دیا، ورنہ یہ بات تو عجیب ہوگی کہ (مثلاً) اپنے ہاں سؤر کا گوشت پکاؤ تو وہ حرام ہو' اور وہی گوشت کسی عیسائی کے ہاں پکا ہو تو وہ حلال قرار پا جائے۔ کسی چیز کے حلال ہونے کی جو شرائط قرآنِ مجید نے عائد کی ہیں، اگر کسی اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا ان شرائط پر پورا اترتا ہو تو اس کا کھانا حلال ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی جانوروں کو اُسی

ل اسے کہتے ہی تبرک ہیں۔

طرح ذبح کرتے ہیں جس طرح مسلمان ذبح کرتے ہیں، اور وہ اس پر خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ (اسے ان کی اصطلاح میں کوشر کہا جاتا ہے)۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حلال جانور کے گوشت کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہوگا۔ لیکن اس میں دوسری شرط یہ بھی ہے کہ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ۔ (۵ : ۵)۔ وہ بھی تمہارے ہاں کے کھانے کو حلال سمجھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں کے حلال کھانے کی جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ ان کے ساتھ تمدنی روابط ہیں۔

قرآنِ کریم نے اہلِ کتاب کے ہاں کے کھانے کی تخصیص کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر اہلِ کتاب کے ہاں کا کھانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں، خواہ وہ حلال ہونے کی شرائط کو پورا بھی کیوں نہ کرتا ہو۔

(۰)

لحمِ خنزیر

قرآنِ کریم نے جن تین مادی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں مُردار اور خون کے متعلق کوئی بات نہیں کی جاتی۔ البتہ لحمِ خنزیر (سور کے گوشت) کے متعلق اکثر بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ (ان کے ایک آدھ فرقہ کے سوا) عیسائی اس کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی طرف سے اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمان اسے کیوں حرام سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے اس ضمن میں مجھے اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے اہلِ قلم کی طرف سے لکھا تو بہت کچھ گیا ہے لیکن اس کے خلاف بنیادی دلائل دو ہی دیئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جانور (خنزیر) بڑا بے حیا ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے گوشت میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو انسان کے لئے مضرِ صحت ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ میں ان دلائل سے مطمئن نہیں۔ جہاں تک اس کے بے حیا ہونے کا سوال ہے، تو یہ دلیل بڑی بودی ہے، حیا اور بے حیائی تو انسانی خصوصیات ہیں۔ حیوانات میں نہ اس کا احساس ہوتا ہے، نہ تمیز۔ باقی رہا اس کے گوشت کا مضرِ صحت ہونا، سو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا اہل (COMPETENT) نہیں۔ یہ الگ سائنس ہے جو میرا میدان نہیں۔ لیکن جو کچھ مسلمان محقق اس کے متعلق لکھتے ہیں، عیسائی ریسرچ کرنے والے اس کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ میں اس دلیل سے اس لئے بھی مطمئن نہیں کہ کئی جانور ایسے ہوں گے جن کا گوشت انسانی صحت کے لئے لحمِ خنزیر سے بھی زیادہ مضر ہوگا۔ اگر علتِ حرمت یہی تھی تو قرآنِ کریم میں بہت سے ایسے اور جانوروں کو بھی حرام قرار دینا چاہیئے تھا، اس میں خنزیر کی تخصیص کیا تھی؟

جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، اس کی علتِ حرمت، طبیعی (PHYSICAL) نہیں، جذباتی اور نظریاتی ہے۔
آپ دنیا کی کسی قوم، اور کسی زمانے کے لٹریچر کو دیکھئے (خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی) اس میں سوّر کو انتہائی قابلِ نفرت جانور قرار دیا گیا ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ لفظ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس جانور کے خلاف اس قسم کی عالمگیر نفرت کی وجہ کیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نفرت، زمانۂ قدیم سے، ہر قوم میں چلی آ رہی ہے۔ یہودیوں کے ہاں تو خیر یہ حرام ہی ہے، لیکن عیسائی، جو اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں، وہ بھی (YOU SWINE) گالی کے طور پر بولتے ہیں۔ اور (PIG - HEADED) بھی۔ انجیل میں، حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہا گیا ہے کہ "اپنے موتی سوّروں کے آگے نہ ڈالو" (متی - ۶/۷)۔ ابتدائً عیسائی بھی سوّر کے گوشت کو حرام سمجھتے (اور ختنہ کراتے) تھے کیونکہ وہ شریعتِ موسوی کے پابند تھے۔ لیکن بعد میں جب یہودیوں کے خلاف ان کی نفرت شدت اختیار کر گئی تو انہوں نے، اُن کے علی الرغم، سوّر کا گوشت کھانا شروع کر دیا اور ختنہ کرانا بند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود، سوّر کے خلاف ان کا جذبۂ نفرت بدستور رہا۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اس جانور کے خلاف یہ جذبہ، (بجز وحشی قبائل کے) نوعِ انسان کے تحت الشعور میں چلا آ رہا ہے۔ (جیسے مردار خوار — اور خونخوار، قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں)۔ میرا خیال ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کے اس جذبہ کا احترام کرتے ہوئے اسے حرام قرار دیا ہے۔ (حرام اور احترام کا مادہ بھی ایک ہی ہے)۔

ایک دفعہ ایک انگریز (عیسائی) مفکر مجھے ملنے کے لئے آیا، اور منجملہ دیگر امور، اس نے خنزیر کے گوشت کی حرمت کے متعلق بھی بات چھیڑ دی۔ حسبِ معمول اس نے کہا کہ ہمارے ہاں خنزیروں کی اس طرح پرورش کی جاتی ہے کہ ان کے گوشت میں کوئی چیز مضرتِ رساں نہیں ہوتی۔ کیا آپ اس قسم کے گوشت کو بھی حرام قرار دیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کے حرام ہونے کی علت، مادی نہیں، جذباتی ہے۔ اس نے کچھ خندۂ استہزاء سے کہا کہ مادی چیزوں میں جذباتی علت کا کیا سوال؟ میں نے نہایت متانت سے کہا کہ کیا آپ اپنی حقیقی بہن سے شادی کریں گے؟ اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا سوال کر دیا؟ اپنی بہن سے شادی کون کر سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ معاف فرمائیے! اپنی بہن اور کسی اور لڑکی میں جس کے ساتھ آپ بلا تکلف شادی کر سکتے ہیں، عورت ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سو جب دونوں کا جسم ایک جیسا ہوتا ہے، تو بہن کے ساتھ شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ خاموش ہو گیا اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ حلت و حرمت کی وجوہ، مادی سے کہیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔

سو میرے نزدیک، قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی جن چیزوں، اور جن رشتوں کو حرام قرار دیا ہے، اس کی وجہ

یہ ہے کہ اس نے انسان کے ان جذبات کا احترام کیا ہے جو نوعِ انسان کے تحت الشعور میں عام طور پر، بطور قدرِ مشترک متوارث چلے آرہے تھے۔ لیکن یہ بہرحال میری توجیہہ ہے جس کے ساتھ ضروری نہیں کہ آپ بھی متفق ہوں، لیکن جس بات کے متعلق نہ کسی مسلمان کو اختلاف کی اجازت ہے، نہ شک و شبہ کی گنجائش، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے یہ حرام ہیں۔ اگر ان کی علتِ حرمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے تو صوالمراد۔ اس سے ہماری ذہنی تسکین ہو جاتی ہے گی۔ لیکن اگر یہ اطمینان بخش طور پر سمجھ میں نہیں بھی آتی، تو بھی یہ حرام ضرور رہیں گی ـــــ ہر سوسائٹی اور تنظیم کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہنا چاہتا ہے، اسے ان اصولوں کو ماننا ہوگا۔ اگر ان پر اس کا دل نہیں ٹھکتا، تو اسے اس سوسائٹی سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ حرام اور حلال، اسلامی سوسائٹی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ جو شخص اس سوسائٹی میں رہنا چاہتا ہے اسے قرآن کے حرام کردہ کو حرام سمجھنا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس کے حرام کو حرام نہ سمجھیں اور اس کے باوجود اس کی قائم کردہ سوسائٹی (امتِ مسلمہ) کے رکن بھی رہیں۔ یہ ہے حرام اور حلال کی بنیادی اہمیت۔

(۰)

آپ نے غور فرمایا کہ دین میں حلال و حرام کا مسئلہ کس قدر بنیادی اور اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے اس قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے بہ شد و مد پکار پکار کر کہا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار خدا، اور صرف خدا کو ہے۔ الدین میں یہ اختیار کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کتاب اللہ کے حرام کردہ کو حرام قرار دیا جاتا ہے۔

حرام کی فقہی فہرستیں

لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے، اس خدائی اختیار پر چھاپہ مارتی ہے، وہ خدا کی متعین کردہ فہرست کو تو پسِ پشت ڈال دیتی ہے اور اپنی الگ فہرستیں مرتب کر کے، انہیں شریعتِ خداوندی کے نام سے مشہور کر دیتی ہے اور انہی کی پابندی لوگوں سے کراتی ہے۔ اسی کو تھیاکریسی کہتے ہیں ـــــ یعنی خدا کے نام پر مذہبی پیشواؤں کی حکومت۔ اسے قرآن کریم نے جرمِ عظیم قرار دیا ہے جب فرمایا۔

۲/۱۷۴ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (۲/۱۷۴)

جو لوگ خدا کے حرام کردہ کو پسِ پردہ ڈال کر، حرام وحلال کی اپنی فہرستیں مرتب کرنے لگ جائیں اور اس طرح خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر، انہیں دنیاوی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیں، تو وہ بظاہر کتنے ہی مرفہ الحال اور مقدس کیوں نہ دکھائی دیں، یوں سمجھو کہ وہ سامانِ زیست حاصل نہیں کر رہے، انگاروں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ آج تو یہ بڑے فرحاں وناز اں پھر رہے ہیں، لیکن ظہورِ نتائج کے وقت تم دیکھو گے کہ خدا ان سے بات تک نہیں کرے گا۔ یعنی اُس کے قانون کی رُو سے ملنے والی سعادتیں اور خوشگواریاں ان سے آنکھ تک نہیں ملائیں گی اور ان کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں گی۔ یہ بڑا ہی الم انگیز عذاب ہوگا۔ اس وقت انہیں اس کا احساس اور اندازہ ہوگا کہ انہوں نے شرفِ انسانیت کو جن داموں بیچا تھا وہ کس قدر حقیر اور کم مایہ تھے۔

یہ اس لئے کہ:۔

۲/۱۷۵ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ (۲/۱۷۵)

یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کی متعین کردہ سیدھی راہ کو بیچ کر غلط راستوں کو خریدا۔ خدا کی حفاظت کے بدلے میں تباہیاں مول لیں ـــ ذرا سوچو کہ سب کچھ دیکھتے بھالتے، تباہیوں کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جانا، کتنی بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے۔ یہ اپنی قوتِ برداشت کے متعلق کس قدر غلط فہمی میں ہیں۔ اس کا کس قدر غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ یہ اس تباہی کا مقابلہ کرہی نہیں سکیں گے۔

مذہبی پیشوائیت اور ان کے کاروبار کے متعلق سابقہ دو جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ دیکھئے بالخصوص جلد اوّل صفحہ ۳۳۔ آیت (۱/۳)؛ صفحہ ۶۲۔ آیت (۱/۲)؛ صفحہ ۲۳۵۔ آیات (۲/۱۲-۱۱)؛ صفحہ ۲۵۶۔ آیت (۲/۱۹) اور جلد دوم صفحہ ۱۹۴۔ آیت (۲/۴۱)؛ صفحہ ۳۴۰۔ آیت (۲/۷۹)

ان کا ایسا انجام کیوں ہوگا؟

۲/۱۷۶ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ۔ (۲/۱۷۶)

اس لئے کہ خدا نے جو کتاب نازل کی ہے وہ اٹل حقیقت ہے جس میں اختلاف کا شائبہ تک نہیں۔ (۴/۸۲) لیکن جب انسان اپنے ذہن سے شریعتیں وضع کرکے اس کتاب میں اختلاف پیدا کرنے لگ جائیں، تو پھر وہ صحیح

راستے سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

اگر ہر معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار، خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے، تو فیصلوں میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کتاب کی جگہ، ذہنِ انسانی کے وضع کردہ معیار لے لیں تو پھر بات بات پر اختلاف ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ الدّین میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا، اور مذہب، فرقوں کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا نے مذہبی پیشوائیت کو جو "کاروبار" قرار دیا ہے تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار ہے۔ کاروباری حلقے ہمیشہ ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہوتے ہیں۔ یہ کاروبار کا تقاضا ہوتا ہے۔ الدّین میں ساری کی ساری امت کا نصب العین ایک ہوتا ہے۔ مذہب میں ہر فرقہ کے پیشِ نظر اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے۔

اس مفاد طلبی کے لئے مذہبی پیشوائیت کیا کرتی ہے، اسے اگلے باب میں بیان کیا جائے گا۔

پانچواں باب

بیّنات اور کتاب

دلائل اور قوانین

آیات — ۲/۱۷۷ تا ۲/۱۸۸

۱- دلائل ۔ قوانین اور شمشیر کا باہمی تعلق
۲- اعمالِ صالحہ کی تفصیل
۳- اسبابِ ذلت
۴- زکوٰۃ کی مزید تشریح
۵- انسانی جان کی قدر و قیمت
۶- قصاص کا حکم
۷- قرآن اور حدیث
۸- صیام (روزوں) کے احکام اور غایت
۹- نزولِ قرآن
۱۰- خدا کی کبریائی کا قیام
۱۱- دعا کا تفصیلی مفہوم
۱۲- قربِ خداوندی کا مفہوم
۱۳- معراجِ نبویؐ کا مفہوم
۱۴- مرشد خدا کی ذات ہے۔

پانچواں باب

بیّنات اور کتاب

دلائل اور قوانین

سورۃ الحدید میں ہے :۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۔ (۵۷/۲۵)

اس مقصد کے لئے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ مختلف اقوام کی طرف اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجتا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ (رسول) اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لئے خدا نے ضابطۂ قوانین کے ساتھ، شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لئے یہ نوعِ انسان کے لئے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے وفاشعار بندے ہیں جو اس نظامِ خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز، مرئی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے ہوتے اور وہ اپنے یقینِ محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام جو اپنے اندر غلبہ اور قوت رکھتا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ البیّنات۔ اَلۡکِتٰب اور اَلۡحَدِیۡد۔ ان کے منزّل من اللہ ہونے کی تشریح تو آگے چل کر آئے گی، یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس ترتیب سے ان تینوں چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے پروگرام کی ترتیب وار کڑیاں یا مدارج (STAGES) ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بیّنات (دلائل) اور کتاب (قوانین) دونوں قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک حکم دیتا... یا قانون سامنے لاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے اور اس کی تعمیل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے اس نے حکمت کہہ کر بھی پکارا ہے۔ وَاَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ۔ (۴/۱۱۳) و دیگر متعدد آیات)۔ نظامِ خداوندی کی دعوت میں پہلا مرحلہ بیّنات (دلائل) کا ہوتا ہے۔ رسول اپنے مخالفین کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھاتا تھا کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر نقصان دِہ اور تباہ کن ہوگا، اور صحیح راستہ

دلیل، قانون اور شمشیر

اختیار کرنے کے ثمرات کس قدر خوشگوار ہوں گے۔ جو لوگ عقل و بصیرت کی رو سے ان دلائل سے مطمئن ہو کر اس (رسول) کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیتے وہ اس رسول کی جماعت (امت) میں شامل ہو جاتے۔ ان افراد کو وہ قوانین اور ان کی غرض و غایت بتائی جاتی جن کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی تھی۔ اس طرح انہیں اس نظام کی عملی تشکیل کے لئے تیار کیا جاتا۔ لیکن مفاد پرست گروہ اس نظام کی تشکیل کی مخالفت کرتے اور اسے ختم کرنے کے لئے قوت کے استعمال پر اتر آتے۔ اس وقت ضروری ہو جاتا کہ ان کی مدافعت قوت کے ذریعے کی جائے۔ یہ تیسری سٹیج الحدید یعنی شمشیر کے استعمال کی ہوتی۔ علامہ اقبالؒ نے کتاب اور حدید (قرآن اور شمشیر) کے باہمی تعلق کو اپنے مخصوص، بلیغ اور نہایت دلآویز انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ــــ مومناں را تیغ با قرآں بس است!

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

ایک قوت قانون کی ہے اور ایک قوت شمشیر کی۔ نظامِ خداوندی میں یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہوتی ہیں۔ شمشیر، قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ حق کی مخالف قوتیں اسے بے بس نہ بنا دیں۔ اور قرآن، شمشیر کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کا بے محابا کا نہ استعمال نہ ہونے پائے۔ اس کی قوت قانونِ خداوندی کے تابع رہے۔ اس وقت تک ہمارے سامنے بیّنات آئے ہیں۔ اب قانون اور شمشیر کا مرحلہ آتا ہے۔ مطالب الفرقان، جلد اول صـ۱۲۲۔ زیر آیت (۲/۲) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کے لئے انسان کے دل سے ایک جذبہ ابھرتا ہے لیکن اس جذبہ کا اظہار محسوسات کے ذریعے ہوتا ہے ــــ انسانی جسم کی حرکات و سکنات یا شعائر (SYMBOLS)

قوانینِ خداوندی کے احترام کی شکلیں ہیں۔ یہ حرکات و سکنات یا شعائر مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ (مثلاً) آپ نے ریل کے ذریعے کہیں جانا ہو تو اس کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ ٹکٹ خرید کر آپ عازمِ سفر ہو جاتے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ٹکٹ خرید کر آرام سے گھر بیٹھے رہیں تو آپ قیامت تک اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتے خواہ ٹکٹ کو کتنا ہی حفاظت سے کیوں نہ رکھیں۔

ذریعہ اور مقصد کا باہمی تعلق

الدّین میں نگاہ مقصود (منزل) پر ہوتی ہے اور شعائر اس تک پہنچنے کی محسوس علامات ہوتی ہیں۔ لیکن مذہب میں یہی شعائر مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان محسوس علامات کو عین دین کہہ کر ان کی اہمیت کو دلوں میں جاگزین کرتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ اس ٹکٹ کو نہایت مقدّس قرار دیکر اس کی حفاظت کی سخت تاکید کرتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر جلد کے دوسرے اور تیسرے ابواب میں کعبہ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعبہ کو نظامِ خداوندی کا مرکزِ محسوس قرار دیا گیا اور جماعتِ مؤمنین کو تاکید کی گئی کہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں اس مرکز کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں تاکہ اس نظام کے ساتھ ان کی وابستگی قائم رہے۔ اس کی محسوس شکل کے پیشِ نظر یہ انداز اختیار کیا گیا کہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں ہر ایک کا رُخ کعبہ کی طرف رہے اور یوں کعبہ، قبلہ کی حیثیت اختیار کر لے۔

اور رُخ جانبِ کعبہ اس کی محسوس علامات

الدّین میں نظامِ خداوندی کے ساتھ وابستگی نصب العینِ حیات تھی اور رُخ جانبِ کعبہ اس کی محسوس علامت۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو کعبہ کی حیثیت نماز میں "منہ طرف قبلہ شریف" کی رہ گئی اور اس کی اہمیت کا یہ عالم کہ کسی نمازی کا رُخ ذرا اِدھر اُدھر ہو جائے تو دُہائی مچا دی جائے کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ رُخ سیدھا کر کے نماز پھر پڑھو۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی سامنے نہیں لایا جاتا کہ اس سلسلے پروگرام سے مقصد کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے بار بار متنبہ کیا ہے کہ دیکھنا کہیں ان محسوس شعائر کو مقصود بالذات نہ بنا لینا۔ چنانچہ سابقہ صفحات میں زیرِ آیت (۲/۱۱۵) کہا گیا کہ تم کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ خدا مغرب کی سمت (کعبہ میں) رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اُسے اپنا گھر (بیتی) کہہ کر پکارا ہے۔ خدا نہ مشرق میں رہتا ہے نہ مغرب میں۔ مشرق و مغرب جملہ کائنات اس کی مملکت ہے اور وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا کہ:-

(۲/۱۷۷) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۔ (۲/۱۷۷)

برّ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔

لفظ برّ کا ترجمہ نیکی کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ جلد دوم ص ۲۱۹ زیرِ آیت (۲/۴۴) بتایا جا چکا ہے، اس کا مفہوم اس سے

وسیع تر ہے۔ اسے آپ کشاد اور کامیابی کی راہ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ کشاد، کامیابی اور فائز المرامی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف ۔۔ غور کیجئے کہ یہ بھی حکم ہے کہ: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ: (۱۴۹؍۲) "تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رُخ اس کی طرف رکھو" اور یہ بھی کہ کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف' پہلا حکم' ایک بلند مقصد کے حصول کے ذریعے (MEANS) کے طور پر ہے اور دوسرا اس تنبیہ کے لئے کہ تم اس ذریعے کو مقصدِ زندگی (END) نہ سمجھ لینا۔ پہلا حکم (مثال کے طور پر) یہ ہے کہ ٹکٹ ضرور خریدو' اور دوسرا حکم یہ کہ ٹکٹ کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ مقصود و مطلوب تو منزل تک پہنچنا ہے ٹکٹ صرف اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے دین اور مذہب کے فرق کو کس طرح چار لفظوں میں واشگاف کر کے رکھ دیا اور مذہبی پیشوائیت کی غلط نگہی کا پردہ چاک کر دیا۔

جب یہ کہا کہ کشاد کی راہ یہ نہیں تو اس سے فطری طور پر دل میں یہ خیال ابھرا کہ اگر کشاد کی راہ یہ نہیں تو پھر کشاد کی راہ کون سی ہے؟ قرآن مجید نے فوراً اس سوال کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ: وَلَكِنَّ الْبِرَّ ۔۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ ....

اور اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ جو کچھ اگلے الفاظ میں کہا گیا ..... کس قدر اہم ہے۔ یوں کہیئے کہ وہ دین کا ملخّص ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں سامنے لایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ :۔

۳/۱۷۷　وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۔ (۱۷۷؍۲)

کشاد کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر۔ قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر، ملائکہ پر۔ انبیاء کرام پر جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے۔ اور ان کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر۔

اجزائے ایمان

ایمان کا مفہوم کیا ہے، اسے جلد اوّل ص۶۷ زیرِ آیت (۳؍۲) بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مفہوم ص۱۱ زیرِ آیت (۱؍۱)۔ انبیاء کرامؑ، کتبِ سابقہ اور آخرت پر ایمان کا مطلب ص۱۴۳،۱۴۴ زیرِ آیت (۴؍۲) ہیں۔ ملائکہ کے متعلق جلد دوم ص۶۶ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اجزائے ایمان یہی پانچ ہیں[1]۔ اور دوسری بات یہ کہ ایمان جذبۂ محرکہ ہوتا ہے عملِ صالح کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر جگہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ کو لازم و ملزوم کر دیا ہے۔

(۱؎ فٹ نوٹ ص۱۵۶ پر ملاحظہ کریں)

نہ ایمان، بلاعمل کچھ قیمت رکھتا ہے نہ اعمال بلاایمان منتیجہ خیز ہو سکتے ہیں۔ جب تک آپ کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ ٹکٹ خرید کر ریل میں سوار ہو جانے سے آپ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے، آپ نہ ٹکٹ خریدیں گے نہ ریل پر سوار ہوں گے۔

یوں ایمان، انسان کے لئے جذبۂ محرکہ بنتا، یا اسے آمادہ بہ عمل کرتا ہے۔ اور اگر آپ اس یقین کے ہوتے ہوئے بھی نہ ٹکٹ خریدیں اور نہ ریل پر سوار ہوں، تو بھی آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں ایمان بلاعمل کچھ قیمت نہیں رکھتا — مردہ آں ایماں کہ ناید درعمل۔

اس ایمان کے بعد عمل کے مختلف اجزا سامنے لائے گئے ہیں۔ فرمایا۔

۲/۱۷۷ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ (۲/۱۷۷)

جو شخص مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے — وہ ان کے رشتہ دار ہوں یا قرب وجوار میں بسنے والے دیگر افراد۔ یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا یا لاوارث رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا ان میں کام کرنے کی صلاحیت یا استعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں۔ انہیں آزادی دلانے کے لئے کشادگی راہ ان کی ہے جو اس قسم کے مقاصد کے لئے اپنی زائد از ضرورت دولت کو وقف کر دیں۔

ان اجزاء کا مفہوم تو واضح ہے لیکن چونکہ قرآنِ کریم انہیں البرّ (کشادگی راہ) کے بنیادی اور لازمی ارکان کی حیثیت سے بیان کیا ہے اس لئے ان کی تھوڑی سی مزید وضاحت غیر از محل نہ ہو گی۔ اس لئے بھی کہ آئندہ چل کر یہ اصطلاحات بار بار سامنے آئیں گی۔

ایتائے مال علیٰ حبہٖ۔ یعنی مال و دولت کی کشش کے باوجود اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دینا۔

---

۱ (فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۵) یہ جو ہمارے ہاں ایمان کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ 'امنت باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔ تو اس میں "والقدر خیرہ وشرہ"... کا اضافہ خارج از قرآن ہے اور مسئلہ تقدیر کو جزوِ ایمان قرار دینے کی عجمی سازش — تفصیل اس کی میری تصنیف — کتاب التقدیر — میں ملے گی۔

ان اجزا کی تشریح

اسے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳/۹۲) "تم کامیابی (برّ) سے ہمکنار ہو نہیں سکتے جب تک تم اپنی پُرکشش متاع کو (دوسروں کی ضروریات کے لئے) کھلا نہ رکھو"۔ انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق جلد اوّل صفحہ ۱۰۵ زیر آیت (۲/۳)، شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیا جائے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ جب نظامِ اسلامی قائم ہو جاتے تو پھر ہر شخص کی زائد از ضرورت کمائی اس نظام کی تحویل میں چلی جائے گی جو اسے ان مقاصد (یا ان جیسے دیگر مقاصد) کے لئے اجتماعی طور پر صرف کرے گا۔ لیکن جب وہ نظام ہنوز قائم نہ ہو تو انفاق انفرادی طور پر ہوگا۔ قرآن کریم میں انفرادی انفاق (جسے صدقہ اور خیرات کہہ لیجئے) سے متعلق احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں جب وہ نظام زیرِ تشکیل ہو۔

انفاق کے لئے ابتدا ذوی القربیٰ سے کی گئی ہے۔ اس کے عمومی معنے ہوں گے "تمہارے قرب و جوار میں بسنے والے ضرورت مند لوگ"۔ لیکن اصطلاحی طور پر القُربیٰ کے معنے ہوتے ہیں رشتہ داری۔

ذَوِی القُربیٰ

اس لئے ذَوِی القُربیٰ کے معنی ہوں گے رشتہ دار۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اصلاح کا آغاز ہر فرد کے قریبی دائرے سے کرتا ہے اور پھر اسے وسعت دے کر پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے انفرادی انفاق کے لئے بھی ابتدا اس سے کی کہ تم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاؤ اور ان میں جو صاحبِ احتیاج ہوں ان کی امداد کرو۔ اور پھر اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے جاؤ۔

یتامیٰ

ہمارے ہاں یتیم سے مراد صرف وہ بچے لئے جاتے ہیں جن کے ماں باپ مر جائیں۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) میں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی آتا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جائیں۔ آپ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے کتنی وسیع حقیقت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس کی تشریح جلد دوم صفحہ ۳۴۹۔ آیت (۲/۸۳) میں کی جا چکی ہے۔ اس نے، بھرے معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے والوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ دیا کہ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵)، "اس قدر قربا کی موجودگی میں یتیم" بھری دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے والا! اُف! کس قدر حزن انگیز ہے تنہائی کا یہ احساس! فانی کے الفاظ میں:-

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

لہٰذا، کشاد کی راہ اس پر کھلے گی جو ہر اس شخص کا ساتھی بن جائے جو اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس کرے۔

مساکین ہمارے ہاں مسکین کا تصور عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مادہ (س۔ک۔ن) ہے جس کے معنی ہیں ساکن ہو جانا۔ حرکت کا باقی نہ رہنا۔ اس لئے انفرادی طور پر مسکین وہ شخص ہو گا جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی وجہ سے رُک جائے یا جس میں کام کاج کرنے کی سکت نہ رہے اور یوں وہ محتاج ہو جائے۔ اور اجتماعی طور پر مسکین وہ قوم ہو گی جس پر مسکنت کا عذاب طاری ہو جائے۔ یعنی جس میں قوتِ عمل نہ رہے۔ جس پر جمود و تعطل طاری ہو جائے۔ یہاں ان لوگوں کی مالی امداد کرنے کے لئے کہا گیا ہے جن کا کاروبار رُک جائے۔ یا جو محنت کرنے سے طبعی طور پر معذور ہو جائیں۔ (تفصیل اس کی جلد دوم صفحہ ۳۵۔ آیت (۲/۸۳) میں گزر چکی ہے۔)

ابن السبیل سبیل کے معنی راستہ ہیں اور ابن السبیل کے عمومی معنی مسافر کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن عربوں کے ہاں یہ اصطلاح بالخصوص اس مسافر کے لئے استعمال کی جاتی تھی جس کا زادِ سفر ختم ہو جائے۔ اور اس طرح وہ اس ملک کے باشندوں کی مدد کا محتاج ہو جائے جس میں وہ سفر کر رہا ہو۔ آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے کہ قرآنِ کریم نے جن لوگوں کی مالی امداد کی تاکید کی ہے ان میں مسلمان و غیر مسلم کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ مدد کا محتاج کوئی بھی ہو، اہلِ ایمان پر اس کی امداد ضروری ہو جاتی ہے۔ اگلی شق ہے:۔

سائلین ہمارے ہاں سائل (سوالی) سے مراد مانگنے والے ہوتے ہیں جنہیں فقیر بھی کہا جاتا ہے۔ عربی لغت میں لفظ سوال کے معنی احتیاج کے ہوتے ہیں۔ اس لئے سائل کے معنی ضرورت مند یا صاحبِ احتیاج کے ہیں۔ مسکین اور سائل میں یہ عمومی فرق سمجھئے کہ مسکین تو وہ ہے جو کام کاج سے معذور ہو جائے لیکن سائل وہ ہے جو کام تو کرے لیکن اس کی کمائی اس کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔

یہاں پھر اس کی وضاحت کر دی جائے کہ احتیاج کی یہ شکلیں غیر قرآنی نظام میں پیدا ہوں گی۔ قرآنی نظام میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہو گی۔ تفصیل جلد اول صفحہ ۱۰۱۔ زیرِ آیت (۲/۳) میں گزر چکی ہے۔ اگلی شق ہے:۔

فی الرقاب اَلرَّقَبَۃُ گردن کو کہتے ہیں۔ اور رَقَبَہٗ کے معنی ہیں اس نے اس کی گردن میں رسّی ڈال کر اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اس لئے فی الرقاب کے معنی ہیں غلام۔ ہمارے دور میں غلامی (SLAVERY) کی وہ شکل اب کم و بیش ختم ہو گئی ہے جسے عہدِ جاہلیت کی لعنت کہا جاتا تھا۔ لیکن اس نے اب جو مہذب شکل اختیار کی ہے (یعنی کسی قوم کو اپنا محکوم بنا لینا) وہ اس سے بھی زیادہ اذیت رساں اور وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس لئے اب فی الرقاب میں وہ قومیں بھی آ جائیں گی جن کی آزادی سلب کر لی گئی ہو اور

وہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ ان کی مدد کرنا جماعت مومنین (اسلامی مملکت) کا فریضہ ہوگا۔ جہاں تک زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں میں رائج غلامی کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے اسے کس طرح ابدی طور پر ختم کرایا اسکی بابت جلد اوّل صفحہ ۲۶ آیت (۲/۱۲) اور جلد دوم صفحہ ۳۵۸ آیت (۵/۴۸) میں لکھا جا چکا ہے۔ جو غلام اور لونڈیاں

تحریر رقبہ

عربی معاشرے میں پہلے سے موجود تھے قرآنِ کریم نے ہر موقع پر انہیں آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لئے اس نے تحریر رقبہ کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی غلام اور محکوم کو آزاد کرنا (مثلاً) قتلِ خطاء کے کفارہ کے طور پر تحریر رقبہ (۴/۹۲)۔ لغو قسموں کے توڑنے کا کفارہ تحریر رقبہ (۵/۸۹)۔ ظہار (بیبیوں کو ماں وغیرہ کہہ دینے کی لغویت) کا کفارہ تحریر رقبہ (۵۸/۳) اسی طرح قرآنِ کریم نے صدقات کے مصارف میں بھی فی الرّقاب کو مستحق امداد قرار دیا ہے۔ سوچئے کہ جو قرآن قدم قدم پر غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید کرتا ہو، وہ دوسروں کو غلام بنا لینے کی اجازت دے گا؟ لیکن ان لوگوں کا کیا علاج جو آج بھی جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کو شریعت کا حکم قرار دیتے ہیں؟ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۵۶ آیت (۵/۴۸)۔ یہ ہیں وہ امداد کے مستحق جن کی مالی امداد کو قرآنِ کریم نے بِرّ کی راہ قرار دیا ہے۔ ان شقوں کا دیگر متعدد مقامات پر بھی ذکر آیا ہے۔ ان میں سے دو ایک مقامات کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سورۃ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو حیوانات کے مقابلہ میں صاحبِ ارادہ کیا بنایا کہ اس نے سمجھ لیا کہ مجھے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوگیا ہے۔ میں جس طرح جی چاہے زندگی بسر کروں۔ مجھے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ وہ تن آسانی کی زندگی گزارنے اور مفاد پرستی کی آسان راہ اختیار کرنے کو پسند کرتا ہے۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۹۰/۱۱) اور ہمت طلب اور صبر آزما راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتا۔ اس راستے کے لئے العقبۃ

دین کی گھاٹی

کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ یہ "دین کی راہ" کی بڑی برجستہ اور جامع تشبیہ ہے۔ پہاڑ پر ایک تو بھاگ کر نہیں چڑھا جاتا، قدم قدم، آہستہ آہستہ بتدریج چڑھا جاتا ہے۔ پھر اس میں سانس پھول جاتی ہے تکان بھی ہو جاتی ہے لیکن یہ راستہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی دین کی راہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ: وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ (۹۰/۱۲)۔ تو خود نہیں جان سکتا کہ العقبۃ کیا ہے۔ اسے تمہیں ہم بتاتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ دین کی اس دشوار گزار، ہمت طلب راہ کی تفصیل کیا ہے۔ فرمایا فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳)۔ یہ کہ انسان صرف اپنی فکر نہ کرے۔ بلکہ یہ دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی مستبد قوت کی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں تو

نہیں جکڑی ہوتی۔ لہٰذا کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جائے جس میں ہر انسان گردن اُٹھا کر چلے۔ جس میں ہر ایک کو حریت اور آزادی حاصل ہو۔

اس گھاٹی کا اگلا قدم کیا ہے۔ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۔ (۹۰/۱۴)۔ جب اور جہاں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر کمزور انسانوں کے لئے بھوک اور واماندگی کو عام کر دیں۔ یعنی سامانِ زیست ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہو جائے تو وہ نظام ان لوگوں کے رزق کا اہتمام کرے جنھیں محتاج بنا دیا گیا ہو۔

تیسرا قدم یہ کہ جب اور جہاں ایسا باطل معاشرہ قائم ہو جس میں کمزور انسان ہزار ہا انسانوں کے درمیان رہتے ہوتے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائے ۔۔ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ (۹۰/۱۵)۔ تو یہ نظام ان بے یار و مددگار انسانوں کا رفیق و یاور بنے اور انہیں تنہا محسوس نہ ہونے دے۔

اور چوتھا قدم ۔۔ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۔ (۹۰/۱۶)۔ جس معاشرہ میں یہ حالت ہو کہ ایک معذور انسان بھی اپنی روٹی کمانے کے لئے دن بھر مٹی میں لتھڑا رہے۔ یعنی محنت کش طبقہ کی یہ حالت ہو، اس معاشرہ کو بدل کر ایسا نظام قائم کرے جس میں ہر فرد اپنی معاش کی طرف سے بے فکر ہو جائے۔ یہ ہے اَلْعَقَبَةُ کی تشریح۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ راستہ بڑا ہمت طلب ہے اور تنہا نہیں کاٹا جا سکتا۔ یہ اجتماعی سفر ہوتا ہے۔ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۔ (۹۰/۱۷) ایسا شخص اس کارواں میں شامل ہو جاتا ہے جس کے افراد خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تاکید و تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ اس راہ میں ثابت قدم رہیں اور خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ۔ (۹۰/۱۸) یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو صاحب یمن و سعادت ہیں جنہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں گی۔

سورۃ الفجر میں ہے کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دے تو وہ بڑا تلون مزاج اور عجلت پسند ہو جاتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَکْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ ۔ (۸۹/۱۵)۔ جب ایسے شخص کو خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اس مرفہ الحالی میں کتنے اور عوامل شریک ہیں۔ اور یہ ان سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں کسی اور کا کیا عمل دخل ہے؟ یہ خدا کا فضل ہے جس سے اس نے مجھے نوازا ہے۔ یعنی اس کے لئے نہ کوئی قاعدہ مقرر ہے نہ قانون۔ وہ جسے چاہے، عزت اور آسائش

عطا کر دے۔ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۔ (۸۹/۱۶)۔ لیکن جب اس کی زندگی دوسرا رُخ بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق بلا سبب ذلیل و خوار کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے یونہی بلا سبب اور بلا قاعدہ ہو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا نے تمہیں ناحق یونہی ذلیل کر دیا۔ ناحق ذلیل نہیں کر دیا۔

یتامیٰ کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ (۸۹/۱۷)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے معاشرہ ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں عزت کا معیار دیانت و شرافت نہیں، بلکہ جتھہ اور پارٹی تھا۔ جس کی پارٹی زیادہ قوت والی تھی اس کی عزت و توقیر ہوتی تھی۔ جو تنہا رہ جاتا تھا (یتیم)، اس کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔ تکریم اور عزت کے معیار بدلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تم ذلیل و خوار ہو رہے ہو۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ جتھہ کی مضبوطی اور اکثریت کا معیارِ عزت و اقتدار ہونا عہدِ جاہلیت ہی کی روش نہیں۔ اس دورِ تہذیب و تمدن میں بھی حکومت و سطوت اور قوت اور عزت کا یہی معیار ہے۔ آج جمہوریت (ڈیموکریسی) کو، ساری "مہذب" دنیا میں، بہترین اور مسلّمہ اندازِ تمدن سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریت اس کے سوا کیا ہے کہ جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو، زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آجاتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قوت، جاہ و حشمت، عزت اور

جمہوریت کا بنیادی نقص

دولت سب زمامِ اقتدار کے ساتھ بندھے چلے آتے ہیں۔ جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، جمہوریت وہ نظام ہے جس میں :۔

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ جو تنہا رہ جائے اس کی خبر گیری کیا کرو۔ کہا یہ ہے کہ جو تنہا رہ جائے اسے ذلیل مت سمجھو۔ اس کی عزت کرو۔ یعنی معیارِ تکریم، پارٹی یا جتھہ یا قبیلہ یا خاندان قرار نہ دو۔ جوہرِ ذاتی وجہ توقیر سمجھو۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔ (۴۹/۱۳)۔ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ جس کا کردار سب سے بلند ہو۔ دوسری جگہ کہا (فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ (۹۳/۹) جو تنہا رہ جائے۔ اسے دھتکارا نہ کرو۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ قرآنی نظام میں تنہا رہ جانے والوں کے محض روٹی کپڑا کا انتظام نہیں کیا جائے گا۔ انسان ہونے کی جہت سے ان کی عزت بھی کی جائے گی۔ بالفاظ دیگر انہیں اس معاشرہ میں رزقِ کریم حاصل ہوگا ــــ باعزت سامانِ زیست۔

بنایا جارہا تھا کہ خدا کسی قوم کو یونہی ذلیل و خوار نہیں کر دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قوم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں (۱) یتیم کی عزت نہیں ہوتی تھی اور (۲) لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ (۸۹/۱۸)۔ جس کی چلتی گاڑی کسی حادثہ کی وجہ سے رک جاتی تھی، صاحب استطاعت لوگ نہ اس کی خود مدد کرتے تھے نہ دوسروں کو اس کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ یہاں پھر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنی نظام میں سائل و محتاج کے رزق ہی کا انتظام نہیں کیا جاتا، ان کی عزت اور خودداری پر بھی حرف نہیں آنے دیا جاتا۔ اس میں وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰)۔ سائل اور محتاج کو قابلِ نفرت نہیں سمجھا جاتا۔

(۰)

بات یہ چلی آرہی تھی کہ کامیابیوں کے راستے اس طرح کشادہ نہیں ہوتے کہ تم پرستش کی چند رسوم کو میکانکی طور پر ادا کر لو اور سمجھ لو کہ ہم فریضہ خداوندی کی ادائیگی سے سبکدوش ہوگئے۔ کامیابیوں کے راستے ان پر وا ہوتے ہیں جو ہر صاحبِ احتیاج کی مدد کرتے اور محکوموں اور غلاموں کی آزادی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہا:-

۲/۱۷۷　وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ (۲/۱۷۷)

اور اس کے ساتھ وہ لوگ ہی ایسا نظام قائم کرتے ہیں جن میں تمام افراد معاشرہ احکام و قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۴۷-۹۰ زیر آیت (۲/۳) تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کہا:-

۲/۱۷۷　وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ۔ (۲/۱۷۷)

وہ ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں۔ اس کی تشریح جلد اول صفحہ ۱۰۵ زیر آیت (۲/۳) اور جلد دوم صفحہ ۲۰ زیر آیت (۲/۴۳) کی جا چکی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ نظامِ خداوندی کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے اور ان کی انسانی صلاحیتیں پروان چڑھتی جائیں۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مفہوم فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جمع شدہ دولت کا ایک خفیف سا حصہ سال کے بعد بطورِ خیرات دے دیا جائے۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا ہے کہ کامیابیوں کی راہ ان پر کھلتی ہے جو اٰتَى الْمَالَ .... دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا۔ وَ اٰتَى

زکوٰۃ کی مزید تشریح

الزَّكٰوةَ ..... جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ سے مراد مال دینا ہی ہوتا تو یہ بات اٰتَى الْمَالَ۔ سے پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اٰتَى الزَّكٰوةَ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ، ایتائے مال سے کچھ الگ چیز ہے۔ یا یوں کہیے کہ فقط اٰتَى الْمَالَ

سے ایتائے زکوٰۃ کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) ایتائے زکوٰۃ سے مراد ہے انسانی ذات یا صلاحیتوں کی نشوونما کا اہتمام کرنا۔ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہو گی لیکن یہ چیز اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہو گی۔ خود مقصد نہیں ہو گی۔

(۱)

اب آگے بڑھیئے۔ کہا کہ کامیابیوں کی راہ اُن پر وا ہو گی۔

۲/۱۷۷ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ...... (۲/۱۷۷)

اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن وعدہ اور عہد میں ایک اہم فرق ہے۔ وعدہ تو ہر (PROMISE) کو کہتے ہیں۔ یہ عام طور پر انفرادی ہوتا ہے۔ لیکن عہد کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبرگیری کرنا۔ اسکی پیہم نگہداشت کرنا۔ اور (۲) ذمہ داری۔ لہٰذا عہد کے معنی ہوں گے اپنی ذمہ داریوں کی پیہم نگہداشت کرنا۔ اس سے ایفائے عہد کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

ایفائے عہد

سورۃ المومنون میں، مومنوں کی چند ایک بنیادی خصوصیات کا ذکر ہے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (۲۳/۸)۔ "وہ اپنی امانات اور عہد کی نگہداشت کرتے ہیں"۔ اس میں دو چیزیں، امانات اور عہد، الگ الگ آئی ہیں۔ اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔

جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی وہ ایک مثالی نظامِ حکومت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے مختلف نظام وضع اور اختیار کئے اور جب وہ ناکام ثابت ہوئے تو ان کی جگہ دوسرے نظام اپنائے۔ اس کی یہ مسلسل ناکام کوششیں بالآخر اس نظام پر منتج ہوئیں جسے جمہوری نظام کہا جاتا ہے اور جو آج کل ساری (مہذب) دنیا میں رائج ہے اور جسے فکرِ انسانی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے جمہوری نظام کی بنیاد نظریہ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) پر استوار.... ہے جس کا بانی رُوسو (ROUSSEAU. 1712 – 1778 A.D) کو قرار دیا جاتا ہے؛ اگرچہ اس سے پہلے ہابز اور لاک جیسے مفکرین نے بھی اس کا تصور پیش کیا تھا۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مملکت اور افرادِ مملکت میں ایک میثاق (معاہدہ) ہوتا ہے جس کی رُو سے افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لے لیتے ہیں اور ان کے عوض مملکت ان افراد کے حقوق ادا کرتی ہے لیکن اس نظریہ کا بنیادی سقم یہ ہے کہ اس میں افراد

نظریہ میثاق

اور مملکت کو دو الگ الگ فریق تصور کر لیا جاتا ہے۔ جبھی تو ان میں میثاق قرار پاتا ہے۔ میثاق ہمیشہ دو فریقوں کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن مملکت یا حکومت تو افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے وہ افراد سے الگ، ایک فریق (فریقِ مقابل) کس طرح بن سکتی ہے؟

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، نظریۂ میثاق کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بانی روسو ہے لیکن جن کی نگاہیں تاریخ کے وسیع افق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ نظریہ روسو سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے پیش کیا تھا اور وہ اس سقم سے منزّہ تھا جو روسو کے نظریہ میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے نظامِ مملکت کے بنیادی تصور کے متعلق کہا ہے کہ۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)۔ "اللہ مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ یہ ہے وہ میثاق جو خدا اور مومنین کے مابین طے پاتا ہے۔ اس کی رُو سے خدا اور مومنین دو الگ الگ فریقوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ایک فریق (مومنین) کچھ فرائض (OBLIGATIONS) اپنے ذمہ لے لیتا ہے ــ یعنی عند الطلب مال اور جان حاضر کر دینا ــ اور دوسرا فریق (خدا) انہیں کچھ حقوق (RIGHTS) عطا کر دیتا ہے۔ یعنی الجنۃ۔ آیت (۲/۲۳) میں مومنین کے ان فرائض کو "امانات" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی ادائیگی کے بعد ان افراد کو ہر طرح کے امن کی ضمانت مل جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم میں الجنۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ..... (۷/۴۹)۔ "تم جنت میں داخل ہو جاؤ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن"۔ (اس کی تشریح جلد دوم ص۱۳۳۔ آیت (۲/۴) میں کی جا چکی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس نظریۂ میثاق میں دو فریق موجود ہیں جن میں ایک کے ذمے امانات ہوتی ہیں (یعنی فریقِ مقابل کے سپرد کچھ کر دینا) اور دوسرے کے ذمہ عہد (یعنی اس کے بدلے میں کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینا)۔ فریقِ اوّل (خدا) فریقِ ثانی (مومنین) کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اس کی طرف سے اس عہد کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہو گی۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ۔ (۲/۸۰)۔ لیکن اس عہد کے پورا کرنے کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ فریقِ مقابل بھی اپنے عہد (ذمہ داریوں) کو پورا کرے۔ فرمایا۔ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔ (۲/۴۰) "تم اپنا عہد پورا کرو، میں اپنا عہد پورا کروں گا"۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا تو ایک بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے۔ وہ اس میثاق میں عملاً فریق کس طرح بن سکے گا؟ یہ تو محض ذہنی نظریہ یا عقائد کا میثاق ہو گا جو محسوس شکل (CONCRETE FORM) میں استوار نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اللہ نے خود ہی یہ واضح کر دیا کہ یہ محض نظری میثاق نہیں ہو گا۔ عملی

امانات کا مفہوم

اور محسوس میثاق ہوگا۔ اور وہ اس طرح کہ نظامِ خداوندی کا سربراہ (یا اربابِ حل و عقد) جو خدا کی جانب سے (ON BEHALF OF ALLAH) یہ عہد کریگا، وہ اس کے پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورۃ الفتح میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ۔ (۴۸/۱۰) اے رسول! (آیت ۹/۱۱۱ میں بیان کردہ میثاق کی رُو سے) جو مومن اپنی جان اور مال کو تیرے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خدا کے ہاتھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس معاہدہ کی توثیق کے لئے ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں ہوتا درحقیقت خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔" اب ظاہر ہے کہ جو سربراہِ نظامِ خداوندی، خدا کی جانب سے یہ معاہدہ کرتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہے جو انسانوں کے سلسلہ میں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی جلد اول صفحہ ۱۱۲ آیت (۲/۳) میں گزر چکی ہے)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ آیت (۲/۱۷۷) میں جو کہا گیا ہے کہ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتے ہیں انہیں پورا کرتے ہیں۔ یہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اس نظام میں اسلامی حکومت اس طرح قائم ہوتی ہے۔ اس میں ذمہ دار ارکان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے عہد کو پورا کرو اور دیگر افرادِ مملکت سے تاکید کی جاتی ہے کہ تم اپنی امانت میں خیانت نہ کرو۔ (۸/۲۷)۔

حقوق و فرائض

(٠)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بیّنات اور کتاب (دلائل اور قوانین و احکام) کے بعد اگلا مرحلہ شمشیر کا آتا ہے۔ یعنی مفاد پرست گروہ اس نظام کی مخالفت میں میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں گے اور اس نظام کے حامیوں پر یہ فریضہ عائد ہو جائے گا کہ وہ ان کی مدافعت بزورِ شمشیر کریں۔ یہ مرحلہ بڑا جانگداز اور مشقت طلب ہوگا۔ اس لئے کشاد کی راہ طلب کرنے والوں کی اگلی خصوصیت یہ بتائی:-

۲/۱۷۷ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ۔ (۲/۱۷۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو مصائب و مشکلات کا مقابلہ نہایت استقامت سے کرتے ہیں اور تزاحم و تصادم کے وقت جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں

اَلْبَاْسُ۔ سخت مصیبت، بالخصوص میدانِ جنگ میں پیش آنے والی مشکلات کو کہتے ہیں۔ اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اَلْبَاْسُ۔ مال و دولت کے نقصان کو کہتے ہیں اور اَلضَّرَّآءُ جسمانی نقصان کو۔

ان تصادمات میں مصائب اور نقصانات کی تفصیل آیت (۲/۱۵۵) میں سامنے آچکی ہے۔ یہاں بھی اسی قسم کے مصائب اور ضیاع وزیاں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ کہا گیا تھا، یعنی خوشگواریوں کی نویدِ جانفزا ہے ان کے لئے جو..... ایسے صبر آزما مراحل میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیتے اور اس طرح خدا کی تبریک و تہنیت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ (۲/۱۵۵)۔ یہاں کہا کہ :-

۲/۱۷۷ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ . (۲/۱۷۷)

یہ ہیں وہ جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں اور انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو متقی کہہ کر پکاریں۔ یعنی یہ کہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوتے راہِ حیات میں آنے والے خطرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

آپ " اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا " پر غور کیجئے اور جھوم جھوم جایئے۔ بات یوں شروع کی گئی تھی کہ کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم احکامِ خداوندی کے ظواہر کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ ظواہر (رسوم ومناسک) کی ادائیگی تو نہایت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ان کی ادائیگی دعویٰ ایمان کا ثبوت نہیں۔ اس کا ثبوت وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو دین کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جان اور مال کو قربان کر دیتے ہیں۔ انہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مؤمن اور متقی کہیں۔ یہ ہے دین اور مذہب میں فرق !

الفاظ ومعانی میں تفاوت نہیں لیکن　　ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور　　(اقبالؔ)

مذہب میں ساری نیکیاں " منہ طرف قبلہ شریف " میں سمٹ آتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا جہادِ عظیم، نمازیوں کا رُخ سیدھا کرنا قرار پا جاتا ہے — ان نمازیوں کا جن میں سے (امام سمیت) ہر ایک کا قبلۂ مقصود الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ وہ " باجماعت نماز " ہوتی ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (۵۹/۱۴) تم خیال کرو گے کہ یہ سب ایک جماعت ہیں۔ یہ ایک جماعت نہیں۔ ان کے صرف جسم ایک قطار میں نظر آتے ہیں، دل ان کے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

خدا کا اعلان ہے کہ اس قسم کی ظواہر پرستی (لَيْسَ الْبِرَّ) کوئی نیکی نہیں۔ لیکن جنت کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہی اصل نیکی ہے۔ تم (معاذاللہ) خدا کی باتوں پر نہ جاؤ۔ تم وہی کیے جاؤ جو ہم کہتے ہیں۔ ہم تمہیں جنت میں داخل ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دینگے !

(٥)

بیّنات کے بعد اب کتاب کی طرف آیئے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔

پیچھے سے بات ذرائع اور مقاصد کی چلی آ رہی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر ذرائع کو مقصد سمجھ لیا جاتے تو ایسے لوگوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ ان کی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ذرائع بیکار ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ اور جب اس خیال کو تقویت پہنچانے، بلکہ مقدس بنانے کے لئے تصوف آگے بڑھے، تو ذرائع (مادی اسباب) سے نفرت برتنا اور انہیں ترک کر دینا، دین کا منشاء و مقصود قرار پا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم بڑی پُر حکمت کتاب ہے۔ اور اس قسم کے وساوس پہلے سے اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵۰/۱۶)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ (یعنی ہم انسان کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو بھی جانتے ہیں)۔ چنانچہ وہ ایسے مواقع پر اس قسم کے وساوس کے ازالہ کا ساتھ ہی انتظام کر دیتا ہے۔ سابقہ آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ حق کی مدافعت میں مصائب و مشکلات کا استقامت سے مقابلہ کرنے والے سچے مومن ہیں۔ اور اگر وہ اس مقابلہ میں جان دے دیں تو وہ حیاتِ جاوید کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآنِ کریم کے نزدیک انسانی جان کی چنداں اہمیت یا قدر و قیمت نہیں۔ اگلی آیت میں (جو اب ہمارے زیرِ نظر آئے گی) اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

ہم نے ذریعہ اور مقصد کے تعلق کو سمجھانے کے لئے ریلوے ٹکٹ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی مثال دی تھی۔

مقصد اور ذرائع

اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ آپ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے گھوڑے پر سفر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں مقصد منزل تک پہنچنا ہے اور گھوڑا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ تصوف نے کہا کہ گھوڑا بے کار شے ہے بلکہ حصولِ مقصد کے راستے میں رکاوٹ۔ اس لئے اسے ہلاک کر دینا چاہیئے۔ ترکِ دنیا اور نفس کُشی کا یہی مفہوم ہے۔ سیکولر تصوّر نے کہا کہ گھوڑا ہی مقصدِ حیات ہے۔ ساری توجہ اسی پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔ یعنی زندگی اسی دنیا کی زندگی، اور اس کا مقصد انسانی جسم کی آسائش و زیبائش ہے۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں نظریات کی تردید کی اور کہا کہ گھوڑا اگرچہ منزلِ مقصود نہیں لیکن منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے اس کی نگہ پرداخت، پرورش اور حفاظت بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے موجودہ زندگی میں انسان کا مقصد اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ لیکن یہ نشو و نما (زندگی کی موجودہ سطح پر) مادی اسباب و علائق اور انسانی جسم و جان کے ارتباط ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے تسخیرِ مادہ اور جسم و جان کی پرورش و حفاظت بھی نہایت ضروری ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات کا باہمی تعلق کیا ہے، اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۱۱-۱۲۔ آیت (۲/۱) و صفحہ ۱۶۲،

مادی اسباب کی اہمیت

آیت (۲/۹) وصفحہ ۲۰۶ آیت (۲/۹) وصفحہ ۲۵۰ آیت (۲/۱۹)۔ نیز جلد دوم باب اول میں نفس کے عنوان میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور دنیا اور آخرت کے باہمی تعلق کے متعلق جلد اول ص ۲۵۳ آیت (۲/۱۴) کے تحت۔ یہاں پیش نظریہ نکتہ ہے کہ قرآنِ کریم انسان کی طبیعی زندگی .... کو مقصود بالذات تو قرار نہیں دیتا لیکن وہ اس کی حفاظت کو ضروری ٹھہراتا ہے ...... اس کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس ایک آیت سے لگایئے جس میں اس نے کہا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۵) "جس نے کسی ایک جان کو بھی ہلاک کر دیا بجز اس کے کہ وہ جرمِ قتل یا فساد برپا کرنے کے جرم کی سزا کے طور پر ہو۔ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی تلف ہونے سے بچایا، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی"۔ دوسری

انسانی جان کی قدر و قیمت

جگہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۱۷/۳۳)۔ "انسانی جان کو خدا نے قابلِ احترام قرار دیا ہے (اس کا ناحق ضائع کرنا حرام قرار دیا ہے) اس لئے کسی کو ناحق قتل مت کرو (ناحق کے معنی ہیں خلافِ قانونِ خداوندی)۔ انسانی جان کی حفاظت اور قتل و جرائم کی روک تھام کے سلسلہ میں کہا۔

۲/۱۷۸

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (۲/۱۷۸)

اے جماعتِ مومنین! تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی کی جان محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ جرمِ قتل کے مرتکب کو معاشرہ کی طرف سے سزا ملے۔ سزا کے سلسلہ میں عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی اس میں چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسان کی جان یکساں واجب الاحترام اور قیمتی ہے۔

قصاص کا حکم

(مثلاً) قاتل اگر آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اسے سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ اسے بھی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جرم قتل کی دو صورتیں ہیں۔ قتلِ عمد (بالارادہ) اور قتلِ سہو (نادانستہ۔ بلا ارادہ) اول الذکر کی صورت میں جرم کی سزا موت ہے یا جرم کی نوعیت کے لحاظ سے موت سے کم کوئی سزا (۴/۹۲-۹۳)۔ خون بہا لے کر اسے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اگر قتل عمداً نہیں کیا۔ یونہی سہواً ہو گیا ہے۔ تو اس صورت میں (۴/۹۲) کے مطابق دیت ــ خون بہا ــ ادا کرنا ہوگا۔ اس دیت کی رقم سے اگر مقتول کا وارث برضا و رغبت کچھ چھوڑنا چاہے تو اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے (۲/۱۷۸)۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ جو کچھ طے ہو جائے مجرم اس کی پابندی کرے اور حُسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ قتلِ سہو کے لئے دیت مقرر کرنے میں تمہارے رب کی طرف سے قانون میں رعایت رکھ دی گئی ہے تاکہ اس سے تمہاری صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ لیکن جو شخص اس طرح معاملہ طے ہو جانے کے بعد زیادتی کرے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

س آیت میں پہلا لفظ کُتِبَ ہے۔ لفظ کتاب کے متعلق جلد اوّل ص۱ آیت (۲/۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی

کُتِبَ کے معنی

ضابطۂ احکام و قوانین کے ہیں۔ اس آیت میں لفظ کُتِبَ سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے معنیٰ ہیں "تم پر لازم قرار دیا گیا ہے، تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے"۔ قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی احکام کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

اس میں دوسرا غور طلب لفظ قصاص ہے۔ عام طور پر اس کے معنیٰ سزا کئے جاتے ہیں لیکن اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ اس مادہ (ق۔ ص۔ ص) کے معنیٰ ہیں۔ کسی کا پیچھا کرنا۔ کسی کا تعاقب کرنا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ کوئی جرم (UNTRACED) نہ رہ جائے، کوئی مجرم قانون کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ملزم کا تعاقب کیا جائے تاآنکہ وہ گرفتار ہو جائے۔ اس کے بعد اس پر مقدمہ چلے گا۔ اس کا فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت میں ملزم، مجرم نہ ثابت ہو، اس لئے اسے کوئی سزا نہ ملے۔ لیکن اس سے قصاص کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔

اس حکم کی رُو سے قصاص کو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ کا فریضہ۔ لہٰذا، اس میں جرائم کا بدلہ لینے کو متعلقہ افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ اسے معاشرہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ جس معاشرہ میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) ہو، اس میں جرم اور اُس کے مؤاخذہ کی یہی صورت ہونی چاہیئے۔ اس میں

جرم، متعلقہ افراد کے خلاف نہیں ہوتا، خود حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ اس میں مستغیث افراد نہیں ہوتے خود حکومت ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے (...... CROWN ... VS) کہا جائے گا۔ لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرمِ قتل کے مرتکب کا پیچھا کرے۔ اسے سزا دے۔

اس سے آگے ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، عدل کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے، اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مردِ آزاد کی ہو یا غلام کی، عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصولِ مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مردِ آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مردِ آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل مردِ آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ۔ ”جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے تو اُسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمھارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے“۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں، سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ”کچھ معاف کر دینا“ (شیءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں، اس لئے کہ سزائے موت میں سے ”کچھ معاف کر دینے“ (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ”کچھ معاف کر دینے“ کی شکل اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیّت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

یہ ہے وہ القصاص جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

۱۷۹/۲ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (۱۷۹/۲)

اے اربابِ عقل و بصیرت اگر تم غور سے دیکھو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ القصاص کے نظامِ عدل میں تمہاری قوم کی اجتماعی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے تم خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

قرآنِ کریم مناسب تعلیم و تربیت سے قلوب و اذہان میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے افرادِ معاشرہ خود بخود قانون کی خلاف ورزی (ارتکابِ جرم) سے محترز رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جن کے قلب و دماغ میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو اور وہ جرائم کے مرتکب ہوں۔ ان کی اصلاح اور معاشرہ کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے سزا ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآنِ کریم کی روشنی میں مختصر الفاظ میں جرم اور سزا کا فلسفہ سامنے لایا جائے۔

جرم و سزا کا فلسفہ

قرآنِ کریم میں دو قسم کے احکام ملیں گے — ایک اخلاقی اور دوسرے تعزیری۔ تعزیری سے مراد ہیں ایسے احکام جسے سوسائٹی کا جُرم قرار دیا جائے اور اخلاقی احکام سے ایسے احکام مراد ہیں جن کی خلاف ورزی معاشرتی جرم قرار نہ پائے۔ مثلاً: لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا۔ (۱۷/۳۷)۔ "زمین میں اکڑ کر نہ چلو" قرآن کا حکم ہے لیکن یہ ایسا حکم نہیں جس کی خلاف ورزی معاشرہ کا جرم قرار دیا جائے۔ اسی سُورت میں دوسرا حکم ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى۔ (۱۷/۳۲) "زنا کے قریب مت جاؤ" ظاہر ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی معاشرتی جُرم ہوگی۔ واضح رہے کہ احکام کی اخلاقی اور تعزیری تقسیم محض زیرِ نظر سوال کے سمجھنے کے لئے کی گئی ہے ورنہ قرآنِ کریم کے ہر حکم کی بنیاد اصلاحِ اخلاق پر ہے۔ اور اخلاق سے مراد ہے انسانی ذات کی نشوونما کے ذرائع۔

تعزیری احکام بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن نے خود ہی تجویز کر دی ہے (مثلاً زنا) اور دوسرے وہ جن کی سزا اُس نے خود تجویز نہیں کی بلکہ اسے اسلامی نظام پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات کے مطابق ان کی سزا خود متعین کرے۔ مثلاً، اس نے 'الخمر' (عرفِ عامہ میں شراب) کے استعمال سے منع کیا ہے لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی سزا مقرر نہیں کی۔

یہ مسئلہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآنِ کریم نے جن احکام کی سزا خود مقرر نہیں کی، ان میں سے کون کون سے ایسے ہیں

جنہیں تعزیری احکام کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کوئی ایک فرد نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی حکم کی خلاف ورزی کو معاشرتی جرم قرار دے کر اسے مستوجب سزا ٹھہرائے۔ یہ فیصلہ اسلامی نظام کے کرنے کا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو فیصلے اسلامی نظام کریگا ان میں وقتاً فوقتاً (بہ تقاضائے حکمت) تبدیلیاں کی جاسکیں گی۔ احکام ہی نہیں، قرآن کریم نے جن امور کو بطورِ اصول بیان کیا ہے، یا جو حدود مقرر کی ہیں، ان کی خلاف ورزی کی مخصوص شکلوں کو جُرم قرار دینا بھی اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ حدود سے مراد ہے اعمال کا وہ دائرہ جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا منع ہے۔ حدود اور اصول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اسلامی نظام کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد اپنے بنیادی حق، اپنی ہر متاعِ زیست کو اس طرح محفوظ سمجھے کہ اسے اس باب میں ذرا سا تردد، فکر یا تشویش لاحق نہ ہو۔ اسے اس کے متعلق پورا پورا اطمینان اور یقین حاصل ہو۔ قرآنی نظام کا لازمی نتیجہ اس قسم کی فضا کا وجود میں لانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۲ ؍ ۳۸)۔ اس میں انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔" وہ اس فضا کو قرآنی اقدار کے مطابق تعلیم و تربیت، اور افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دینے سے پیدا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو "نفسیاتی مریض" ہوں اور ان کا "پاگل پن" افرادِ معاشرہ سے امن و اطمینان کا احساس چھین لے۔ ایسے مریضوں کا علاج ضروری ہے اور جب تک وہ پورے طور پر شفایاب نہ ہوں افرادِ معاشرہ کو ان کے جنون کے پیدا کردہ خطرات سے محفوظ رکھنا از بس لازمی۔ یہ علاج اکثر و بیشتر ان مریضوں (مجرموں) کی قلبی اور ذہنی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے بطورِ آخری اقدام تخویف و ترہیب کی بھی ضرورت پیش آتی ہے — کئی نفسیاتی امراض ایسے ہیں جن کا علاج خوف کی احساس دہی سے کیا جاتا ہے — اس طریقِ علاج کو سزا کہا جائے گا۔ اس سے مقصد اولاً ممکن العمل حد تک خود اس مجرم کی اصلاح ہوتی ہے اور ثانیاً ان کی اصلاح جن کے تحت الشعور میں ارتکابِ جرم کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں۔ سزا بطورِ انتقام کا تصور غیر قرآنی ہے۔

یہ تو ہوا سزا کا ایک مقصد۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم نے جس شخص کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کے ہاں چوری کی ہے۔ اگر عدالت نے اس مجرم کو دس سال قید کی بھی سزا دے

دی تو اس سے اس مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا نقصان پورا کیا جائے۔ اگر مال مسروقہ برآمد ہو گیا ہے تو اُسے واپس دلایا جائے۔ اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو مملکت اُسے خود مہیا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ قرآنی تصورِ "جرم و سزا" کی رُو سے مستغیث مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا۔ وہ نظامِ معاشرہ (حکومت) کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔ مملکت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کریگی۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ مملکت نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک 'مجرم' نظامِ مملکت ہے نہ کہ وہ خاص فرد جس نے ارتکابِ جرم کیا ہے۔ یہ نظامِ مملکت کے دیکھنے کی چیز ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کراتا ہے یا خود پورا کرتا ہے۔ مظلوموں کو اس سے واسطہ نہیں ـــ نظامِ مملکت کا فریضہ مظلوم یا اس کے وارثوں کا پشت پناہ بننا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔ (۱۷/۳۳)۔ اگر نظامِ معاشرہ مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتا تو وہ اس کا پشت پناہ کیسے بن سکتا ہے، اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر نقصان کی تلافی روپے سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن نظامِ مملکت کو بہرحال اس کی تلافی کی شکل پیدا کرنی ہوگی، بشرطیکہ وہ نقصان' اس شخص کی غفلت یا تساہل کی وجہ سے نہ ہوا ہو ـــ اس کی تلافی بھی کرنی ہوگی' اور اس کے ساتھ اس کا انتظام بھی کہ آئندہ معاشرہ میں ایسا نہ ہو۔

اوپر کہا گیا ہے کہ تعزیری سزاؤں سے مقصود یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے نفسیاتی مریضوں کا علاج ہوجائے۔ نفسیاتی علاج کی کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ مریض کو مرض کا احساس ہوجائے۔ یعنی مجرم دل سے اعتراف کرے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجرم کے دل میں فی الواقعہ یہ احساسِ ندامت بیدار ہوجائے تو اس کی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ "سزا دینے" کے بجائے معاف کر دیتا ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ وہ شخص اپنی اصلاح کرے اور ایسا کرنے میں معاشرہ اس کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا سے پہلے عفو (درگزر کرکے اصلاح کرنے) کی گنجائش رکھی ہے۔ وہ 'سزا' اُس صورت میں تجویز کرتا ہے جب مجرم میں اس کے سوا اصلاح کا امکان نہ ہو۔

قرآنِ کریم 'بدنی سزائیں' (CORPORAL PUNISHMENT) تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ چور کو جیل خانے بھیج دے جہاں اسے روٹی کپڑا ملتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھوکے مرجائیں۔ یعنی جرم وہ کرے اور سزا یہ بے گناہ بھگتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوف جس سے عادی مجرموں کی اصلاح کا امکان ہوسکتا ہے،

یا جس سے امکانی مجرموں کو ارتکاب جرم سے باز رکھا جا سکتا ہے، بدنی سزا ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اب ان اصولوں کو دیکھئے جنھیں قرآنِ کریم اس باب میں بنیادی قرار دیتا ہے۔

(۱) **قصاص**۔ اس کے معنیٰ جرم کی سزا دینا نہیں۔ اس کے معنیٰ ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے۔ یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو (UNTRACED) نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ اس قسم کے محکم نظامِ تفتیش میں حیاتِ اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (۲/۱۷۹)

(۲) **عدل**۔ یعنی فیصلہ کرتے وقت مجرم کی پوزیشن، عدل کے تقاضے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے پائے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ۔ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (۲/۱۷۸) کا اصول ہمیشہ کارفرما رہے۔

(۳) جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰) یہ بھی اس صورت میں جب اس کے بغیر اصلاح کا امکان نظر نہ آئے۔

(۴) جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، ملزم کو بے گناہ سمجھنا اور معاشرہ کو اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے۔ سورۃ نور میں ہے کہ مدینہ میں بعض لوگوں نے کسی عورت کیخلاف تہمت تراشی کی اور لوگ اُسے لے اُڑے۔ اس پر قرآنِ کریم نے یہ ہدایت دی کہ تم نے جب یہ افواہ سُنی تھی تو تمہارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ... بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (۲۴/۱۲-۱۶) یہ ایک مستقل راہنمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوءِظن سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ جب ملزم کے متعلق (اثباتِ جرم سے پہلے) سوءِظن کی بھی ممانعت ہے تو دورانِ تفتیش اسے کسی قسم کی اذیت دینا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے۔ ایسا کرنا بجائے خویش جرم ہے۔

کسی قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو، جو اس قانون کے خلاف ہو تو اُسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر کسی قانون کا اطلاق کسی سابقہ تاریخ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے ہوگا۔ قرآنِ کریم میں کئی ایک احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ (۴/۲۳)۔ جو اس سے پہلے ہو گیا، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو (یعنی عمداً نہ کیا گیا ہو) اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ (۳۳/۵)۔ جو کچھ تم سے سہواً ہو جائے اس پر مؤاخذہ نہیں۔ مؤاخذہ اس پر ہے جس میں تمہارے دل

کا ارادہ شامل ہو۔

لیکن لاپرواہی بھی ایک جرم ہے اور قابلِ سرزنش۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں قتلِ خطا (سہواً) کی سزا بھی تجویز کی ہے۔ اگرچہ وہ سزا جرمِ قتل کی نہیں۔ بطور کفارہ کے ہے۔ (۴/۹۲)

بڑے بڑے جرائم سے بچنے والوں سے اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے تو وہ قابلِ معافی ہوتی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ (۵۳/۳۲)۔

جو لوگ بڑے بڑے جرائم سے بچتے ہیں، ان سے کبھی کوئی معمولی سی لغزش ہو جاتے تو وہ قابلِ عفو ہے۔

سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احوال و کوائف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے (اُس زمانے کی) لونڈیوں کی جرمِ زنا کی سزا شریف عورتوں سے نصف قرار دی تھی۔ (۴/۲۵) کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتی تھیں اس کے پیشِ نظر ان سے بلند اخلاق کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس رسول اللہ کے گھرانے کی خواتین سے کہا گیا کہ اگر اُن سے کوئی جرم سرزد ہوا تو اس کی سزا دُگنی ہوگی۔ (۳۳/۳۰)

قرآنِ کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرتا اور اس میں افرادِ معاشرہ کی تربیت جس انداز سے کرتا ہے اس سے وہ توقع رکھتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے گی تو وہ خود اس کا اعتراف کرے گا اور صحیح صحیح بات کہدے گا، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے (۴/۱۳۵)۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآن کریم نے شہادت کے سلسلہ میں ایسا بلند اصول پیش کیا ہے جس کی موجودگی میں عدل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ (اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)۔

قرآنِ مجید کے پیشِ نظر مجرم کی اصلاح ہے، اس لئے وہ اس کے دل میں جرم کے مذموم ہونے کا احساس بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک عجیب و غریب اصول پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَکْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ۔ (۴/۱۱۱)۔ جو کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرتا ہے ــ وہ بزعمِ خویش سمجھتا ہے کہ اس نے اس سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے اور اس کا نقصان خود اس کی ذات کو ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جرم سے خود مجرم کی اپنی ذات پر ایسا نقصان رساں اثر پڑتا ہے جس کی تلافی کسی خارجی سزا سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر مجرم کسی ترکیب سے اپنے آپ کو سزا سے بچالے تو بھی اس سے جو نقصان اس کی ذات کو ہوا ہے وہ اس سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات؛ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانتوں اور

دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے"۔ یہ ہے وہ تعلیم جس سے وہ مجرم کے دل میں احساسِ ندامت بیدار کرتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اسے سزا دینے کے بجائے اصلاح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے "مال صدقہ جان۔ جان صدقہ آبرو"۔ یعنی مال و دولت بھی اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ مال اور جان میں (TIE) پڑجائے۔ یعنی ان میں سے ایک ہی محفوظ رہ سکے تو اس وقت جان بچانے کے لئے مال صرف کر دینا چاہیئے۔ اور اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑجائے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان تک بھی قربان کر دینی چاہیئے۔

مال کی اہمیت

قرآنِ کریم بھی مال و دولت کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے۔ اس نے مال کے متعلق کہا ہے کہ: جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا۔ (۴/۵)۔ مال سے انسان (اقوام) اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مال کی غلط تقسیم سے جو بھی خرابیاں پیدا ہوتی اور تباہیاں آتی ہیں ان کی روک تھام اور ازالہ کے لئے قرآنِ کریم نے پورا معاشی نظام متعین کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل جلد اول ص ۱۰۵۔ آیت (۲/۱۷۷) اور ص ۲۹۴۔ آیت (۲/۲۴) میں گزر چکی ہے۔ جب وہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے نہ جائیداد۔ یہ سب اس نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور وہ نظام تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کر دینے کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ لیکن جب تک وہ نظام قائم نہ ہو، وہ اس عبوری دور میں مال و دولت کے صرف اس کی ملکیت، اور تقسیم کے متعلق ضروری احکام بھی دیتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم حکم وصیت کا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

۲/۱۸۰ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (۲/۱۸۰)

تمہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے، تمہارے لئے یہ قانون مقرر کیا جاتا ہے کہ جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے، اور تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو تو تم اپنے والدین اور دیگر اقرباء کے لئے (یعنی جنہیں بھی تم اپنا قریبی سمجھو خواہ وہ تمہارے رشتہ دار ہوں یا نہ) قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضہ خداوندی ہے۔

اس آیت سے وصیت کے حکم کی اہمیت واضح ہے۔ اس میں پہلے كُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا گیا ہے۔ یعنی تمہیں اس کا

وصیّت کا حکم

حکم دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں دہرایا گیا ہے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ ایسا کرنا متقین پر (یعنی جو بھی کتاب اللہ کو اپنا راہ نما سمجھتے ہیں۔ (۲/۲)۔ ان پر لازم ہے۔ یہ فریضۂ خداوندی ہے جس کا ادا کرنا ان پر واجب ہے۔ اس سے اس حکم کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا عمومی انداز یہ ہے کہ وہ احکام اور قوانین اصولی شکل میں دیتا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ (اس کی حکمت جلد اول صفحہ ۱۴۰، ۹۶ زیر آیت (۲/۴) بیان کی جا چکی ہے)۔ لیکن بعض احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی اس نے خود متعین کر دی ہیں۔ وصیت سے متعلق حکم میں جس ”معروف“ (قاعدہ) کا ذکر ہے اس کا تعین بھی قرآن نے خود ہی کر دیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ
فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللّٰهِ
إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ
إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِيْنَ۔ فَإِنْ عُثِرَ عَلٰى أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ
يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِاللّٰهِ
لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (۵/۱۰۶-۱۰۷)

پہلے کہا گیا ہے کہ ہم نے بالعموم دین کے اصول دیئے ہیں، ان جزئیات متعین کر کے نہیں دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے کسی قانون کی جزئیات بھی متعین نہیں کیں۔ بعض اہم قوانین کی جزئیات اور عملی طریق ہم نے متعین کر دیئے ہیں۔ ان میں قانونِ وصیت وشہادت بھی ہے۔ اس باب میں یاد رکھو کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو (کیونکہ وصیت کرنا فرض ہے، ۲/۱۸۰)۔ تو اس کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سو تم اپنے لوگوں میں سے دو ایسے گواہ مقرر کرلو جو انصاف پسند ہوں۔ لیکن اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور ایسی جگہ پر جہاں تمہارے اپنے آدمی موجود نہیں اور وہاں موت کا سامنا ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ ہی گواہ بنا لو۔ پھر جب ان کی شہادت کی ضرورت پڑے تو تمہارے جج انہیں صلوٰۃ کے بعد ٹھہرالیں۔ اگر تمہیں شبہ ہو کہ وہ ویسے سچ سچ نہیں کہیں گے تو وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اس گواہی کے عوض کسی سے کچھ نہیں لیا خواہ وہ ہمارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم سچی شہادت کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو مجرم ہوں گے۔

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے سچی گواہی نہیں دی تو جس پارٹی کے خلاف انہوں نے غلط گواہی دی تھی۔

اس پارٹی کے دو گواہ سامنے آئیں اور خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی سابقہ گواہوں کے مقابلہ میں زیادہ سچی ہے۔ ہم حق سے ذرا بھی تجاوز نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم مجرم قرار دیئے جائیں۔

اس ضمن میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا:-

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَآ إِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ
(۲/۱۸۱-۱۸۲) يُبَدِّلُوْنَهُ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ
جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ (۲/۱۸۱-۱۸۲)

وصیت دو عادل گواہوں کے سامنے ہونی چاہیئے (۵/۱۰۶)۔ اگر کوئی شخص وصیت سننے کے بعد اس میں ردوبدل کر دے تو ایسے لوگ (قانون کی نگاہ میں) مجرم ہوں گے۔ (انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بات زبانی ہوئی تھی اس لئے کسے معلوم کہ متوفی نے کیا کہا تھا اور ہم نے کیا بیان دیا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ) اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ وہ کسی طرف بیجا طور پر جھک گیا ہے تو اُسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کرے۔ یہ وصیت بدل دینے کے جرم کے مرادف نہیں ہوگا۔ قانون میں اس قسم کی گنجائش رکھ دینا مغفرت و رحمتِ خداوندی کا تقاضا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف مصالحانہ کوشش ہوگی اور کوشش بھی وصیت کرنے والے کی زندگی میں۔ اس میں قولِ فیصل وصیت کرنے والے ہی کا ہوگا۔

وصیت کے متعلق قانون واضح ہے۔ لیکن ایسے واقعات بھی ہو سکتے ہیں جن میں کسی کو وصیت کرنے کا وقت نہ ملا ہو۔ یا وصیت کرنے کے بعد ترکہ میں کچھ اضافہ ہوا ہو جسے اس کی وصیت (COVER) کرتی ہو تو ایسی صورتوں میں بجائے اس کے کہ ورثاء خود اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے اور یوں باہمی جھگڑوں کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصے خود ہی مقرر کر دیئے۔ وراثت کے متعلق یہ احکام سورۃ نساء کی آیات ۱۲، ۱۱ میں صراحت سے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہر حصہ کے بعد کہا گیا ہے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ۔ (۴/۱۱ ; ۴/۱۲) یعنی یہ تقسیم اس صورت میں ہوگی جب متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ بچے۔ اگر اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط ہے تو تقسیم وصیت کے مطابق ہوگی نہ کہ قانونِ وراثت کے مطابق۔ یہاں بھی دیکھیئے۔ وصیت کو تبدیل کرنے کی اجازت خدا نے بھی نہیں دی۔

(٠)

تصریحاتِ بالا کی رُو سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وصیت کرنے کا حکم کس قدر تاکیدی ہے،

(۱) اس نے اس حکم کے سلسلہ میں پہلے کُتِبَ عَلَيْكُمْ کہا یعنی تمھیں اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور آخر میں کہا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ متقیوں پر ایسا کرنا واجب ہے۔ یہ فریضۂ خداوندی ہے۔

(۲) وصیت کے متعلق کہا کہ یہ پورے کے پورے ترکہ کے لئے کی جائے گی، ہاں اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص وصیت نہ کر پایا ہو یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو، تو پھر اس کی تقسیم قرآنی قانونِ وراثت کی رُو سے ہوگی۔

(۳) وصیت کرنے والے کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں یا غیر رشتہ داروں میں سے جس کے حق میں چاہے' اور جس قدر مال کی چاہے' وصیت کر دے۔

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ قرآنِ کریم کے اس قدر واضح حکم اور اس کی تشریحات کے علی الرغم ہمارے

قانونِ شریعت

ہاں "قانونِ شریعت" یہ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (⅓) ترکہ کے لئے کی جا سکتی ہے اور وہ بھی ان رشتہ داروں کے حق میں نہیں جو وراثت میں حصہ پا سکتے ہیں۔ اور اس حکم کی بنیاد ایک روایت پر رکھی جاتی ہے۔ جب کہا جائے کہ اس باب میں اللہ کا حکم اس قدر واضح ہے اور اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۱۸/۲۷) احکامِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تو خدا کے حکم میں یہ تبدیلی کس طرح جائز قرار پا سکے گی تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس روایت نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں:-

> نبیؐ کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے.... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ۔ (۲/۱۸۰) تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اُسے موت آئے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ لا وصيّة للوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔
>
> (ص۸۵ بحوالہ مقامِ حدیث ص۵)

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

آپ غور فرمائیے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایک طرف خدا کا نہایت واضح، محکم اور غیر متبدل حکم ہے۔ دوسری طرف

ایک روایت ہے جسے رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقعہ رسولؐ اللہ نے ایسا فرمایا تھا۔ اس کی صرف نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ وہ روایت آپ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد لوگوں کی زبانی حدیثوں کے مجموعوں میں درج ہو جاتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور اسی بنا پر یہ عقیدہ وضع کر لیا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ حدیث رسولؐ اللہ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا عمل قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہو سکتا تو اسے منکرِ حدیث قرار دے کر ملحد اور بے دین ٹھہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد ایوب (مرحوم) نے اپنے کتابچہ کا نام ہی "فتنۂ انکارِ حدیث" رکھا تھا۔

یہ عقیدہ کہ رسولؐ اللہ خدا کے حکم کو منسوخ کر دیا کرتے تھے، اس قدر زلزلہ انگیز ہے کہ اس سے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ (۱۹/۹۰)۔ "آسمان پھٹ پڑیں۔ زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔" قرآنِ کریم میں ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ۔ "جب ان مخالفینِ اسلام کے سامنے احکامِ خداوندی پیش کئے جاتے

ایسا عقیدہ ذاتِ رسالتمآب کے خلاف اتہام ہے

ہیں تو یہ لوگ جو خدا کے سامنے جانے کی امید نہیں رکھتے، رسولؐ اللہ سے کہتے ہیں کہ (ہم اس صورت میں تمہارے ہمنوا ہوں گے کہ) یا تو اس قرآن کے بدلے کوئی اور قرآن پیش کرے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس میں کوئی تبدیلی کر دے۔" آپ نے غور فرمایا کہ معاندینِ اسلام کا حضورؐ سے مطالبہ کیا تھا! یہ کہ آپ قرآن کے احکام کو منسوخ کر کے ان کی جگہ اور احکام دے دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں کیا کہا گیا۔ قُلْ ــــ خدا نے رسولؐ اللہ سے کہا کہ تو اس کے جواب میں ان سے کہہ دے کہ: مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ "یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں کوئی تبدیلی کروں۔" اگر یہ کتاب میری تصنیف ہوتی تو میں اس میں ردّ و بدل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ تو خدا کی کتاب ہے۔ میں خدا کی کتاب میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کیسے کر سکتا ہوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ "میں تو خود اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں" میرا فریضہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا ہے۔ اس لئے میں ان میں ... ردّ و بدل کیسے کر سکتا ہوں۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵)۔ اگر میں اس میں کوئی ردّ و بدل کروں تو یہ حکمِ خداوندی کی معصیت ہو گی جس کی پاداش میں مجھے ایسی سخت سزا ملے گی جس کے تصور سے بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔

یہ تھا احکامِ قرآن کے سلسلہ میں حضورؐ کا عقیدہ اور مسلک اور اب اُسی رسولؐ کے نام لیوا بڑے فخر سے کہتے ہیں

کہ حضورؐ احکامِ خداوندی کو منسوخ کر دیا کرتے تھے اور ایسا کہتے وقت انہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے اور وہاں رسول اللہ بھی موجود ہونگے۔ جب حضورؐ پوچھیں گے کہ تم نے میرے خلاف اس قسم کی گستاخی کی جرأت کس طرح کی تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اس قسم کی جرأت کی شعوری یا غیر شعوری طور پر) وہی وجہ ہو سکتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا۔ ایسا کہنے کی وہی لوگ جرأت کر سکتے ہیں جنہیں اس کا خیال ہی نہ ہو کہ انہوں نے ایک دن خدا کے حضور جانا ہے۔ ایسا کہنے میں حافظ محمد ایوب (مرحوم) منفرد نہیں۔ یہ ہمارے ہاں کی مروجہ شریعت کا مسلمہ فیصلہ ہے جو صدیوں سے نافذ العمل چلا آرہا ہے اور آج بھی فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ قوم (یعنی ہم مسلمان) جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)۔ حضور رسالتمآبؐ خدا سے فریاد اور شکایت کریں گے کہ بار الہا! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ اسے چھوڑ دیا تھا۔

اس قسم کے خلافِ قرآن عقائد وضع کرنے اور ان کی بنا پر قرآن کو چھوڑ دینے سے ہمارا جو حشر آخرت میں جا کر ہوگا، وہ تو ایک طرف رہا۔ اس سے جو الجھنیں اس زندگی میں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی کچھ کم الم انگیز نہیں۔ میرے سامنے اس قسم کے واقعات اکثر آتے رہتے ہیں۔ ایک میاں بیوی اچھے خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اولاد کوئی نہیں تھی۔ ایک وسیع مکان تھا جس کے ایک حصے میں وہ خود رہتے تھے اور باقی حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا۔ خاوند کی

روح فرسا واقعات

موت کے بعد اس کی لاوارث بیوہ کا اس مکان کے سوا (معاش کا) کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ خاوند کے بھائی برادر جنہیں عرفِ عام میں شریک کہا جاتا ہے اور جو لفظ دشمن کے مرادف ہے، ان کے سخت دشمن تھے۔ خاوند نے مرتے وقت وصیت کر دی کہ مکان کی واحد مالک اس کی بیوہ ہوگی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی برادر "شریعت" کا فتویٰ لے آئے کہ یہ وصیت ناجائز ہے۔ (بیوہ صرف (¼) حصہ کی مالک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ کیا خدا کا یہی انصاف ہے؟ میں اس مظلومہ کو کس طرح سمجھاتا کہ یہ خدا کا انصاف نہیں۔ ان اربابِ شریعت کا انصاف ہے جن کا شعار یہ ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ حکم خداوندی ہے اور یہ دھندا اس لئے کرتے ہیں کہ: لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ (۲/۷۹)۔ تاکہ اس سے کچھ پیسے کمالیں۔ انہوں نے اسے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارا فتویٰ نہیں۔ یہ رسولؐ اللہ کا فیصلہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ رسولؐ اللہ ایسا فیصلہ کبھی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ تو (قرآنِ کریم کی سند کی رُو سے) خدا سے پناہ مانگتے تھے کہ وہ خدا کے کسی حکم کو تبدیل کرنے کی جرأت کریں۔ یہ روایات یقیناً وضعی ہیں۔

ائمہ کا فیصلہ

پھر یہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ائمہ کرام کا فیصلہ ہے۔ اس کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دل میں ان ائمہ حضرات کا اس قدر احترام ہے کہ ہم اس قسم کے خلافِ حکمِ خداوندی فیصلوں کو ان کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر اس پر بھی ان کا اصرار ہے کہ یہ اُنہی حضرات کا فیصلہ ہے تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ ہے۔ ہم تو احکامِ خداوندی کے خلاف کسی کے قول کو بھی سند اور حجت نہیں مان سکتے۔

سند سے آگے بڑھ کر یہ حضرات اس صریحی خلافِ قرآنِ حکیم کی تائید میں دلائل پر اُتر آتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنے سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سوچیے کہ

حق تلفی

اس اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ (۲/۱۸۰) والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے وصیت فرض قرار دی جاتی ہے، تو اُسے (معاذ اللہ) اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ اس سے دوسرے رشتہ داروں کی حق تلفی ہو جائے گی۔ اس ترمیم نے (پناہ بخدا) خدا کی اس چوک کی تلافی کر دی۔ (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ)

جہاں تک رشتہ داروں کے حق کا تعلق ہے، تو یہ واضح ہے کہ کسی شخص کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہوتا ہی نہیں۔ صاحبِ ملکیت کو اس کے تصرف کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ سو جب اس کی ملکیت میں کسی اور کا حق ہی مسلّم نہیں تو حق تلفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم نے ترکہ کی تقسیم کے جو حصے مقرر کر دیئے ہیں تو اس لئے کہ اگر ترکہ بلا وصیت رہ جائے تو یہ تنازعات کا موجب نہ بن جائے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآنِ کریم (۴/۱۲-۱۱) میں جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر ہے تو ہر حکم کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ ...... یہ تقسیم، وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ اگر وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو ورثاء کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ متوفی کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق حاصل تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے اپنے اس حق کو کماحقہٗ استعمال نہیں کر سکا تو پھر اس کے ترکہ کی تقسیم قرآنی احکام کے مطابق ہوگی۔

یہ حضرات اسے تسلیم کرتے ہیں کہ وہ شخص اپنی زندگی میں اپنی پوری جائیداد جس کے نام چاہے ہبہ کر سکتا ہے اس

ہبہ کرسکتا ہے

سے بھی انہوں نے تسلیم کرلیا کہ اسے اپنی جائیداد کے تصرف میں پورا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں اس کے کسی رشتہ دار کا حق مسلّم نہیں۔ لیکن ہبہ کرنے میں ایک اُلجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس سے یہ شخص اپنی جائیداد سے اپنی زندگی میں محروم ہوجاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ اور زندہ رہنا ہے اور جس کے حق میں جائیداد ہبہ کرا دی گئی ہے اس کا اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوگا۔ چنانچہ ایسے واقعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں کہ اچھا بھلا خوشحال آدمی اپنی جائیداد ہبہ کر دینے کے بعد زندگی کے آخری ایام میں نانِ شبینہ تک کا محتاج ہوگیا۔

اللہ (خبیر و علیم) نے ان تمام مصالح کو سامنے رکھ کر وصیت کا حکم دیا تھا جسے ہمارے اربابِ شریعت نے منسوخ قرار دے کر یہ تمام اُلجھنیں پیدا کر دیں۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ مروجہ قانونِ وصیت میں تبدیلی کر کے اسے قرآنِ کریم کے مطابق بنا دیا جائے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اب پاکستان میں ایک عجیب صورت سامنے آرہی ہے۔ دستورِ پاکستان میں یہ بنیادی شق رکھی گئی ہے کہ مملکت کا کوئی قانون، کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا' اور جو مروّجہ قوانین کتاب و سنت کے خلاف ہیں انہیں ان کے مطابق مرتب کر دیا جائے گا۔ دیکھنا چاہیئے کہ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب کے بھی مطابق ہو اور سنت کے بھی۔ کتاب (قرآن مجید) کا فیصلہ ہے کہ وصیت پورے کے پورے ترکہ میں کی جاسکتی ہے' اور ورثا کے حق میں بھی۔ اس کے برعکس سنت (روایات) کا فیصلہ ہے کہ وصیت صرف (⅓) حصہ میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی غیر ورثاء کے حق میں۔ ورثا کے حق میں نہیں کی جاسکتی۔ آپ سوچئے کہ کیا کوئی ایسا قانون بن سکتا ہے جو کتاب کی شرط کو بھی پورا کرے اور سنت کی شرط کو بھی؟۔ ان سطور کی تسوید[1] کے وقت تک تو حکومت کی طرف سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کہ جب یہ کتاب شائع ہوکر قارئین تک پہنچے اس وقت صورت حال کیا ہو؟ میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ آپ اُس وقت قانون سازی کے فرائض انجام دینے والے حضرات سے دریافت کیجئے گا کہ وصیت کے متعلق ایسا قانون کس طرح مرتب ہوگا جو کتاب اور سنت دونوں کی شرائط پر پورا اترے؛

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیت، ہبہ، ترکہ، وراثت وغیرہ سے متعلق تمام بحثیں اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں، جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام رائج نہ ہو۔ قرآن کے معاشی نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ مال و دولت

---

[1] اکتوبر ۱۹۷۸ء

یا جائیدادیں ہوں گی، نہ ان کی (DISPOSAL) کے متعلق سوالات پیدا ہوں گے۔ اگر کسی کا کوئی ترکہ ہوگا تو وہ ان اشیائے مستعملہ تک محدود ہوگا جنہیں حکومت نے ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہوگی۔

——— (۰) ———

اس کے بعد قرآن کریم کے اگلے حکم کو لیجئے :۔

ہمارے زمانے میں ہر سلطنت میں اپنی اپنی مستقل فوج (STANDING ARMY) ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی نسبتاً متمدن ممالک میں یہی کیفیت ہوتی تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ تصور دیا کہ امت کا ہر فرد قابل مجاہد (سپاہی) ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افرادِ امت مستقل فوج کی طرح چھاؤنیوں میں تو نہیں رہیں گے۔ یہ اپنے اپنے گھروں میں رہیں گے۔ اور مختلف کام کاج کرتے رہیں گے اور جب جنگ کے لئے آواز دی جائے گی تو یہ فوج کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس شکل میں اس کی البتہ ضرورت ہوگی کہ سال میں کچھ عرصہ ایسا رکھا جائے جس میں انہیں سپاہیانہ زندگی ...... کا خوگر بنایا جائے۔ عسکری پابندیوں کی مشق کرائی جائے۔ (جس طرح آجکل ریزرو فوج کے سپاہیوں کو سال میں کچھ وقت کے لئے ٹریننگ کیمپس میں جاکر تربیت حاصل کرنی ہوتی ہے)۔ اس کے لئے ماہ صیام تجویز کیا گیا۔ فرمایا :۔

۲/۱۸۳ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲/۱۸۳)

اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی اقوام کے لئے فرض قرار دیئے گئے تھے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو اور سفرِ زندگی میں خطرات سے محفوظ رہ سکو۔

صوم صیام (مادہ ص۔ و۔ م) کے معنی ہیں رک جانا۔ باز رہنا۔ ٹھہر جانا۔ قرآن کریم نے کھانے پینے کی چند چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی چیزوں کو حلال و طیب کہا (۲/۱۷۳)۔ حرام اشیاء پر تو (بجز اضطراری حالت کے) مطلق پابندی ہے لیکن سپاہیانہ زندگی ایسی ہے جس میں ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں (اور بالعموم ہوتے ہیں) جن میں حلال و طیب چیزوں کے استعمال سے بھی رکنا پڑتا ہے ــــ حالتِ جنگ میں یا تو وہ ملتی ہی نہیں، یا کھانے پینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ سپاہیانہ زندگی کا خوگر ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ حالتِ امن میں ان چیزوں کے استعمال پر کچھ وقت کے لئے خود پابندی عائد کرلی جائے تاکہ قوتِ برداشت بڑھے۔ اس کا نام ہے صوم (جمع صیام)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ "روزہ" کرنے کے بجائے ضبطِ نفس (ڈسپلن) کیا جائے تو وہ قرآنی مفہوم سے زیادہ

قریب ہوگا۔ سورۃ احزاب میں مومن مردوں اور عورتوں کی جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں اَلصَّائِمِیْنَ وَ الصَّائِمَاتِ بھی ہے (۳۳/۳۵)۔ اس کا ترجمہ "روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں" قرآنی مفہوم کو واضح نہیں کریگا۔ اس کا مفہوم ہوگا "ہر اس بات سے رُک جانے والے جس سے رُکنے کے لئے کہا جائے"۔ یعنی اپنے آپ پر ضبط رکھنے والے۔ ڈسپلن کے پابند۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دین شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ اس لئے جہاں تک ابدی احکام کا تعلق ہے وہ بھی ہر رسول کی وساطت سے یکساں دیئے گئے تھے۔ مجاہدانہ زندگی ہر زمانے میں دینِ خداوندی کا تقاضا تھی اس لئے ان رسولوں کی امتوں پر بھی اسی طرح صیام فرض قرار دیئے گئے تھے جس طرح امتِ مسلمہ پر (کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ۔)۔ بنی اسرائیل میں صوم میں کھانے پینے کے علاوہ بات چیت کی بھی ممانعت تھی۔ (دیکھئے ۱۹/۲۶)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ پابندی خدا کی عائدکردہ تھی یا ان کے اربابِ شریعت نے خود اس کا اضافہ کرلیا تھا۔ یہودی شریعت کے احکام جس قدر سخت تھے ان سے نظر آتا ہے کہ وہ ان کے احبار فقہا کے جذبۂ آمریت کے وضع کردہ تھے۔ بہرحال اس باب میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی یا ان کی فقہ کا حکم تھا۔ قرآن کریم میں تذکرۂ حضرتِ زکریا کے متعلق جو کچھ آیا ہے (۳/۴۰) اس سے البتہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد کردہ تھی۔ قرآن کریم نے بہرحال بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں کی۔

صیام سے متعلق آیت (۲/۱۸۳) کے اخیر میں کہا گیا ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ اور دو آیتیں آگے چل کر: لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ اور لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۔ (۲/۱۸۵)۔ ہم ان تینوں غایات کی تشریح آیت (۲/۱۸۵) میں کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآنی احکام کے ساتھ جو (لِ) یا (لَعَلَّکُمْ تاکہ) کے الفاظ آتے ہیں تو یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی اہمیت کا کہ اس سے دین اور مذہب کا فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مذہب میں صرف حکم دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؛ اس سے ہوگا کیا؟ اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے تو اربابِ شریعت کی آنکھوں میں خون اتر آئے گا۔ دہن کف آلود ہوجائے گا۔ غصے سے کانپنے لگ جائیں گے اور چیخ کر کہیں گے کہ نکل جا یہاں سے۔ خدا کے حکم کے بارے میں پوچھتے ہو کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ ایسا پوچھنے والا مرتد ہوجاتا ہے۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

ان کے اس قسم کے ردِّعمل کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کیوں کا جواب ان کے پاس ہوتا نہیں اور وہ بجائے اس کے کہ اپنی کوتاہیٔ فہم کا اعتراف کریں، اسے غصے کے پردے میں چھپاتا اور "حمیت دینی" سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے

برعکس دین میں خدا اپنے ہر حکم کے ساتھ خود یہ بتاتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کا فائدہ کیا ہوگا ــــ دین میں درحقیقت "حکم" نہیں دیا جاتا۔ قانون دیا جاتا ہے اور قانون کہتے ہی اسے ہیں کہ "اگر یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا"؛ اس (تو) کو قانون دینے والے خدا نے خود ہی واضح کر دیا تاکہ انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں نہ رہے۔ اگر (تو) نہ بتایا جائے تو انسان کبھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تعمیل صحیح طور پر نہ ہو رہی ہو، لیکن اس کے پرکھنے (ٹسٹ کرنے) کے معیار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسی طور پر کرتا چلا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ کوئی منفعت بخش نتیجہ برآمد نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ الٹا نقصان ہو (انسان کی سعی و عمل کا رائیگاں چلے جانا بھی تو کچھ کم نقصان دہ نہیں ہوتا)۔ خدا نے احکام (قوانین) دیتے تو ساتھ ہی خود بتا دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا تاکہ انسان ساتھ کے ساتھ ٹسٹ کرتا جائے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے۔ (اس سلسلہ میں جلد اوّل صفحہ ۔ آیت (۲/۳) خدا کے صحیح تصور کا عنوان اور متعدد مقامات پر قانونِ مکافاتِ عمل بھی دیکھیے)۔ یہ ہے کتاب و حکمت کا باہمی تعلق ــــ کتاب کے معنیٰ قانون اور حکمت سے مراد یہ ہے کہ اس قانون کی غرض و غایت کیا ہے۔ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ مفہوم ہے احکام کے ساتھ (لِ) یا (لَعَلَّکُمْ) کا۔

کتاب و حکمت

۲/۱۸۴

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. (۲/۱۸۴)

یہ صیام (روزے) گنتی کے دنوں کے ہیں۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کرے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں لیکن طبعی طور پر اس کی مستقلاً حالت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اس کے لئے دوسرے دنوں میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہیئے کہ روزے کے عوض کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے ....

یہاں کہا کہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں۔ یعنی یہ (REFRESHER COURSE) ایک مدتِ معینہ کے لئے ہوگا۔ اس مدت کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ: فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (۲/۱۸۵)۔ جو کوئی تم میں سے اپنے گھر پر ہو تو وہ مہینے بھر کے روزے رکھے۔ یعنی

احکام کی تفصیل

اس کی مدت ایک ماہ ہے۔

ان دو آیتوں کے ملا لینے سے صیام کے متعلق احکام کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی :-

(۱) یہ مدت ایک ماہ کی ہے۔

(۲) اس مدت میں جو شخص اپنے گھر پر ہو ـــ فَمَنْ شَهِدَ کے یہی معنیٰ ہوتے ہیں۔ وہ مہینہ بھر کے روزے رکھے۔

(۳) اگر وہ بیمار ہے یا حالت سفر میں تو وہ صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آجانے کے بعد یہ مدت پوری کرے۔

اب ایک اور (CATEGORY) باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی ایک شخص گھر پر بھی ہے، بیمار بھی نہیں (سفر میں بھی نہیں)، لیکن وہ خلقی طور پر (CONSTITUTIONALLY) اتنا کمزور ہے کہ وہ بھوک پیاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے شفایاب ہونے کی امید نہیں۔ یا کبر سنی کی وجہ سے نحیف ہوتا چلا جا رہا ہے، یا کوئی اور ایسی معذوری ہے جس کی وجہ سے وہ اس ماہ کے بعد بھی روزے نہیں رکھ سکتا۔ تو وہ کیا کرے؟ اسکے متعلق کہا کہ وہ اس کا فدیہ ادا کر دے تاکہ وہ طبیعی طور پر نہیں تو کم از کم ذہنی طور پر امت کے اس اجتماعی پروگرام میں شریک ہو جائے (واضح رہے کہ ہم نے یہاں روزے رکھنے کے الفاظ مروجہ مفہوم کی رُو سے لکھ دیئے ہیں ورنہ جیساکہ شروع میں کہا گیا ہے، یہ سب اس ٹریننگ کورس کا پروگرام ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ مریض صحت یاب ہونے اور مسافر سفر سے واپسی کے بعد یہ گنتی پوری کرے، تو مملکت کا عسکری نظام ایسے لوگوں کے لئے خصوصی کورس کا انتظام کرے گا۔

یہ جو ایک استثنائی صورت بتائی گئی ہے ـــ یعنی وہ لوگ جو بمشقت روزہ رکھ سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ ایسا شخص خود ہی کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے کہا کہ اگر کوئی کیس بَین بَین (BORDER - LINE) کا ہے۔ یعنی وہ کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تو اس کے لئے کہا کہ وہ قانون کی طرف نہ جائے بلکہ اپنے لئے آپ ہی فیصلہ کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ مشقت تو ضرور ہو گی لیکن بایں ہمہ وہ روزہ نباہ لے گا، تو بہتر یہی ہو گا کہ وہ روزہ رکھ لے کیونکہ جو مقصد روزہ سے حاصل ہو سکتا ہے وہ فدیہ سے نہیں ہو سکتا بشرطیکہ تم روزہ کی حکمت سے واقف ہو۔

بات بالکل واضح ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (۲/۱۸۴) عربی زبان کے ہر مشہور اور مستند کتب لغت، مثل، تاج العروس، محیط، مفردات امام راغب، اقرب الموارد وغیرہ اس

پر متفق ہیں کہ الطَّاقَ اس قوت کو کہتے ہیں جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جا سکے۔ اس سے انہوں نے لکھا ہے کہ

اَلَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ کی تفسیر

قرآن کریم میں جہاں آیا ہے لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا (۲/۲۸۶) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کر سکیں۔ اس آیت (۲/۱۸۴) کی تفسیر میں مصر کی شہرۂ آفاق تفسیر المنار میں (جسے مفتی عبدہ اور ان کے شاگرد مفتی السید رضا نے مرتب کیا تھا) لکھا ہے:۔

> عرب اطاق الشی اس وقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اس کی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے۔ اَلَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ سے مراد ہیں ضعیف۔ بوڑھے۔ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کا پیشہ مشقت انگیز کاموں میں ہو نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا گیا ہو۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں۔
>
> (المنار۔ جلد ۲۔ ص۱۵۶۔ بحوالہ لغات القرآن ص۱۱)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کی تفسیر میں کیا کہتا ہے' اسے بھی دیکھتے جائیے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

> اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ مگر یہ روزے فرض نہیں تھے۔ پھر ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لئے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو' اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔[۱]

ان حضرات کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جو حکم پہلے نازل کیا تھا اس میں کہا کہ:۔

> جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں تو وہ فدیہ دے دیں۔

یعنی جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھیں وہ فدیہ دے دیں۔ بالفاظ دیگر جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت

---

[۱] تفہیم القرآن۔ از ابو الاعلیٰ مودودی صاحب۔ جلد اوّل۔ ص۱۴۱۔ طبع اوّل۔

کے باوجود روزہ نہ رکھیں، وہ تو فدیہ دیں اور جو لوگ اس کی برداشت کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ نہیں دے سکتے" انہیں روزہ رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ) اللہ میاں کو خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہ جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں وہ بے شک روزہ نہ رکھیں، فدیہ دے دیں۔ لیکن جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ بالضرور رکھیں انہیں فدیہ دینے کی اجازت نہیں۔ اسے محسوس کرنے کے بعد اس نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا اور دوسرا حکم یہ دیا کہ وہ پہلی عام رعایت منسوخ سمجھی جائے۔ فدیہ کی اجازت مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لئے ہے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو۔

ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ :-

(۱) قرآن کریم میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ پہلی رعایت والی آیت منسوخ کر دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں تو اس کی کسی آیت کے منسوخ کئے جانے کا ذکر یا اشارہ تک نہیں[1]

(۲) مسافر اور مریض کے لئے فدیہ کی آیت کا ذکر کہاں ہے؟ قرآن مجید نے انہیں یہی کہا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کریں۔

اسی ضمن میں ایک اور مثال بھی دیکھئے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵) "یعنی اس مہینہ میں جو شخص اپنے گھر پر ہو وہ انہی دنوں میں روزے رکھے اور جو سفر پر ہو وہ گھر واپس آکر گنتی پوری کرے" عربی لغت میں شَهِدَ کے معنی گھر پر موجود ہونا اور غاب کے معنی سفر پر چلے جانا ہیں۔ دیکھئے لغات القرآن صفحہ ۹۸۱۔ لیکن اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے[2]

جو شخص اس مہینے کو پائے۔ یعنی جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ روزے رکھے جو اس سے پہلے مر جائے وہ بے شک روزے نہ رکھے!

آپ غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کی اس کتاب عظیم کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں؟ ان ہی جیسوں کے متعلق اقبال ؒ نے باصد سوز و گداز کہا تھا:۔

---

[1] ناسخ و منسوخ کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۲۶۔ آیت (۲/۳) دیکھئے۔

[2] تفہیم القرآن۔ جلد اول صفحہ ۱۴۲۔ طبع اول۔

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(٠)

اگر کوئی مؤرخ ہر قسم کے اثرات سے الگ ہو کر، بحیثیت غیر جانبدارانہ طور پر تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سا واقعہ ہے جسے اس پوری تاریخ میں سب سے بڑا عظیم انقلاب انگیز قرار دیا جا سکتا ہے، تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ واقعہ نزولِ قرآن کا ہے۔ میں یہ بات محض بربنائے عقیدت نہیں کہہ رہا۔ جن (غیر مسلم) مؤرخوں اور مفکروں نے تعصب اور جانبداری سے الگ ہٹ کر، تاریخِ انسانیت پر غور کیا ہے وہ از خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب — معراجِ انسانیت — میں دی ہے۔ یہاں دو ایک شہادات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نزولِ قرآن عظیم ترین انقلابی واقعہ

کارلائل اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ' میں لکھتا ہے:-

اوّلین دورِ جہالت سے گزر کر اب ہم ایک مختلف قسم کے انسانوں اور مذہب کی ایک نرالی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ یعنی عرب میں دینِ محمدی کی اشاعت کی طرف۔ ایک بہت بڑا انقلاب! ایسا انقلاب جس نے نوعِ انسانی کی عام حالت اور ان کے تصورات کی زندگی میں عجیب تبدیلی اور محیر العقول تبدیلی پیدا کر دی۔

تاریخِ تہذیب کا مشہور مؤرخ (DORSY) اپنی تصنیف (CIVILISATION) میں لکھتا ہے کہ:-

عربوں کا ظہور ایک عظیم داستان ہے اور دنیا کی تاریخ میں یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ —..... یہ حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو دورِ حاضرہ کی تہذیب بھی کہیں نہ ہوتی۔ (ص ۲۳۴ ؛ ص ۲۳۹)

گبن جیسا مؤرخ جب ظہورِ اسلام کے مرحلہ پر پہنچتا ہے تو کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ:-

اب ہماری نگاہ اس ناقابلِ فراموش انقلاب پر مرکوز ہے جس نے اقوامِ عالم پر ایک نرالہ لیکن دائمی نقش چھوڑا۔

اور (THE MAKING OF HUMANITY) کا نامور مصنف (BRIFFAULT) کہتا ہے:-

وہ روشنی جس سے تہذیب کی شمع دوبارہ جلائی گئی، یونانی اور رومی ثقافت کی ان چنگاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں سُلگ رہی تھیں۔ نہ ہی باسفورس کے کنارے "زندہ موت" سے۔ یہ روشنی شمال

کی طرف سے نہیں بلکہ جنوب کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب سے اٹھی۔ (P. ۱۸۳)

تاریخ عالم کا مصنف (W. N. WEECH) اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:-

مغرب میں پاپائے روم کلیسا پر اپنے اقتدار کا مدعی تھا۔ مشرق میں قیصر کا یہی دعویٰ تھا جس کا بطلان مصر اور شام کر رہے تھے۔ اس طرح عیسائیت کی صفوں میں مہلک انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن وقت آ چکا تھا کہ ان صفوں کو یکسر معدوم کر دیا جائے کیونکہ اب ایک عظیم روحانی قوت عرب سے نمودار ہونے والی تھی۔ (P. 250)

اور مشہور مفکر (PRINGLE KENNEDY) ان الفاظ میں کہ:-

چند ہی سال کے عرصے میں (فتنہ و فساد کا) یہ نقشہ کس طرح بدل گیا؟ کس طرح ۶۵۰ء تک یہ دنیا اس دنیا سے مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی؟ نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD. P. 18)

قرآنِ کریم یہ انقلاب، اینٹوں اور پتھروں کی دنیا میں نہیں لایا۔ دلوں کی دنیا میں لایا۔ اس نے انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ اس نے اس کا نصب العین حیات بدل دیا۔ اس نے اس کے مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دی۔ اس نے اس کی زندگی کے معیار بدل دیئے۔ خیر و شر کے پرکھنے اور نفع و نقصان کے ماپنے کے نئے پیمانے عطا کر دیئے۔ اس نے انسانوں کی خود ساختہ پرانی اقدار کو جنسِ کاسد اور زرِ کم عیار قرار دے کر نئی اقدار کے سکے رائج کر دیئے۔ اسی لئے اس کے خدا نے کہا کہ اس زمانے میں جب تمام کائنات تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی اس تابندہ سحر کو نئی اقدار کے ساتھ بھیجا۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ[1] (۹۷/۱)۔ دنیا کی تمام قومیں کوئی نہ کوئی تیوہار مناتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ سے بھی ایک تیوہار منانے کے لئے کہا۔ آپ جانتے ہیں وہ تیوہار جس عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے تجویز کیا تھا۔ کون سا تھا؟ نزولِ قرآن کا عدیم النظیر واقعہ۔ فرمایا:-

جشنِ مسرت

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ۔ (۱۰/۵۸-۵۷)

اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشو و نما دینے والے کی جانب سے وہ ضابطۂ حیات آ گیا جس میں ہر اس کشمکش

---

[1] یہاں محض اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ تفصیل اس وقت سامنے آئے گی جب ہم قرآن کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

کا علاج موجود ہے جو تمہارے دلوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے' اور جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطہ زندگی قرار دے
دیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا اور انہیں سامانِ نشو و نما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔
اے رسول ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطہ حیات کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی
اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا تمہیں چاہیئے کہ اس کے ملنے پر تم جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس متاعِ حیات سے
زیادہ گراں بہا ہے جسے تم اپنے لئے جمع کرتے رہتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ قیمتی۔ (۱۰/۵۷-۵۸)

پھر جس طرح وہ واقعہ جس کی یاد میں یہ جشنِ مسرت تجویز کیا گیا' دنیا جہان سے نرالا تھا' اس جشن کے منانے کا طریق بھی منفرد تھا۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں صرف اقدارِ خداوندی کا پابند بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے اُس نے ایک قوم (اُمت) تیار کی جو ہر اُس قوت کا مقابلہ کرے جو انسانیت کو محکوم و مغلوب رکھنا چاہے۔ مجاہدین کی اس جماعت کے تربیتی کورس کے لئے صیام کا پروگرام تجویز کیا گیا اور کہا کہ یہ پروگرام اُن دنوں رُو بہ عمل لایا جائے جب نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ فرمایا۔

۲/۱۸۵ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ. هُدًی لِّلنَّاسِ وَ
بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ...... (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ وہ قرآن جو نوعِ انسان کو اس کی منزلِ مقصود تک
پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو علم و بصیرت پر مبنی ہے اور جو مستقل اقدار کے ایسے پیمانے پیش کرتا ہے جو حق
اور باطل کو الگ الگ کر دیتے ہیں۔

(الفرقان اور الفدر کی تفصیل اپنے مقام پر بیان کی جائے گی)

اس سے واضح ہے کہ اس پروگرام کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں عمل میں لایا گیا۔ اس لئے کہ اس میں اس ضابطہ حیات کے نزول کی ابتدا ہوئی تھی جسے نظامِ زندگی بنانے کے لئے صیام کا تربیتی کورس تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے کہا:-

۲/۱۸۵ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ. وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ. یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ
الْعُسْرَ. وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ...... (۲/۱۸۵)

سو جو شخص اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے چاہیئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو گھر پر تو ہو لیکن

مریض ہو۔ یا جو سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ خدا تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سختی اور تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔

(اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو)۔

اس آیت میں صیام کی غرض و غایت یہ بتائی گئی ہے:-

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۲/۱۸۵)

اور اس سے پہلے ـــ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (۲/۱۸۳)

ان اصطلاحات کی تشریح کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روزوں سے متعلق بقایا احکام کو بھی اسی جگہ بیان کر دیا جائے۔ یہ احکام (۲/۱۸۷) میں یوں دیئے گئے ہیں۔ (درمیان میں جو آیت (۲/۱۸۶) لائی گئی ہے، اسے بھی بعد میں پیش کیا جائے گا)۔

۲/۱۸۷ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (۲/۱۸۷)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی۔ ـــ بیویوں سے جنسی اختلاط "قربِ خداوندی" کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (۵۷/۲۷)۔ لہٰذا، خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے ان سے درگذر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت مشلئے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی

بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہو جائے۔ اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم اس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رکے ہوئے ہو، تاکہ تم الجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سلجھا سکو تو پھر تم ان راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یکسوئی سے معاملات پیشِ نظر پر مرکوز رکھو) بس یہ ہیں وہ حدود جو اس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کر دی ہیں۔ ان کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو نمایاں طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ لوگ ان کی پوری پوری نگہداشت کر سکیں۔

اس میں وَاَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ فِی الۡمَسٰجِدِ ۔ کے الفاظ مزید غور کے متقاضی ہیں۔ مساجد کے متعلق آیت (۱۱۴) میں

اعتکاف کا مفہوم

پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ ان سے مراد وہ مراکز ہیں جن میں اسلامی نظام کے متعلق جملہ امور طے پائے جاتے ہیں اور عٰکِفُوۡنَ کے متعلق کہا جا چکا ہے (زیر آیت (۱۲۵)) کہ اس کا مطلب ہوتا ہے وہ لوگ جو مملکت کے اُلجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لئے یکسوئی کے ساتھ مصروف غور و فکر ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صِیام کے پروگرام میں عام شرکت کرنے والوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ وہ (چاہیں تو) رات کو اپنے اپنے گھر چلے جایا کریں لیکن ایسے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ حل و عقد جن سے خصوصی مشاورت کی ضرورت ہوگی، انہیں عندالضرورت راتوں کو بھی روک لیا جائے گا۔ اسے اعتکاف سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں حدود اللہ کی اصطلاح بھی سامنے آئی ہے۔ یعنی پابندیوں کی لائنیں ـــ مقصود تو یہی ہے کہ ان لائنوں (حدود) سے تجاوز نہ کیا جائے لیکن بربنائے احتیاط کہا یہ گیا۔ فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا ـــ ان سے ذرا فاصلے پر ہی رہو تو اچھا ہے تاکہ تھوڑی سی لغزش سے پاؤں ان کے باہر نہ جا پڑے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم تعمیلِ احکام کے لئے کس قدر حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے!

اس آیت سے صیام سے متعلق احکام مکمل ہو گئے۔ انہیں بغرضِ تجدیدِ یادداشت مختصر الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

(۱) ماہِ رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہیں۔ آیت (۱۸۵) میں فلیصمہ کی (ہ) اس کا تعین کر دیتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ روزے تین دن کے یا نو دن کے ہیں وہ از روئے قرآن صحیح نہیں۔

(۲) ہر وہ شخص جو گھر پر موجود ہو اور تندرست و توانا ہو۔ اس پر روزہ فرض ہے۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو بہ مشقت روزہ نباہ سکیں۔ اس کا فیصلہ خود ان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ ایسا شخص روزے کا فدیہ دے دے جو ایک محتاج کا کھانا ہے۔

(۳) مریض تندرست ہونے کے بعد اور مسافر گھر پر واپسی کے بعد باقی گنتی پوری کرے۔ یعنی اس مہینے میں سے جتنے روزے رہ گئے ہوں۔ ان کی گنتی پوری کرے۔

(۴) جب رات کی تاریکی اور صبح کی روشنی متمیز ہو جائے اس وقت سے لے کر رات تک روزہ دار کے لئے کھانے پینے اور جنسی اختلاط کی ممانعت ہے۔

(۵) یاد رہے کہ دین کے نظام میں ماہِ صیام جہاد کی تیاری کے لئے تربیتی کورس اور ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ اس میں عام مجاہدین کی دن کے وقت کی حاضری ضروری ہوگی لیکن اہل الشوریٰ کو راتوں کو بھی اپنے مراکز میں روک لیا جائے گا۔ اس پروگرام کی بحسن تمام تکمیل کے بعد وہ جشن مسرت منایا جائے گا جسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔

(۰)

لَیلَۃُ القَدر

اس سلسلہ میں بقیہ تفصیلات سے پہلے ایک ضمنی نکتہ کا سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ اس کے نزول کا آغاز ماہِ رمضان کی ایک رات میں ہوا ہے جسے لیلۃ القدر کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہ رات رمضان کے مہینے کی ایک رات ہے۔ قرآن مجید نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ یہ رات کونسی ہے۔

شب بارات

ہم میں آجکل جو تیوہار رائج ہیں ان میں ایک تیوہار شب بارات کا بھی ہے۔ باقی تیوہاروں کے متعلق تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بتایا جاتا ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں لیکن شب بارات (برات) کے متعلق کچھ نہیں بتایا جاتا، بجز اس کے کہ یہ بڑی بابرکت رات ہے اور اس میں آنے والے سال کے انسانی مقدرات کے فیصلے ہوتے ہیں ـــ اور اسی سے اس تیوہار کی لِم کا سراغ مل جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ـ شاہکار رسالت ـــ کے آخری باب میں شرح وبسط سے لکھا ہے، جب اصل ایرانی مسلمان ہوئے تو وہ اپنے سابقہ مذہب، مجوسیت کے عقائد، نظریات حتیٰ کہ رسوم و مناسک تک کو ساتھ لائے۔ اس طرح قرآنی اسلام کی جگہ عجمی اسلام وجود میں آگیا جو اب تک مروج ہے۔ تقدیر کا عقیدہ اور آتش پرستی مجوسی مذہب کے بنیادی ارکان تھے۔ برامکہ اہلِ مجوس کا ایک ممتاز خاندان تھا، مسلمان ہونے پر انہوں نے ایسی عظمت حاصل کی کہ عہدِ عباسیہ میں منصبِ وزارت تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے قدیم مسلک ـــ عقیدۂ تقدیر اور آتش پرستی ـ کے اظہار کے لئے شب بارات کے جشن کی طرح ڈالی (لفظ برات یا بارات کے معنی قسمت کے ہیں۔ ہم اپنے ہاں کہتے کہ ـ یہ میری بارات میں ہی نہ تھا)۔ یہ تھی اس تقریب کی اوریجنل حیثیت۔ لیکن اب یہ مسلمانوں کا ایک اہم تیوہار بن چکی ہے، اور اس رات کی تقدیس

کے لئے کئی ایک روایات وضع کرلی گئی ہیں۔ روایات کی حد تک تو پھر بھی بات قابلِ فہم تھی، لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس کی تائید میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی پیش کر دی جاتی ہے۔ یعنی :-

حٰمٓ ۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۔ (۴۴/۱-۴)

خدائے حمید و مجید کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ ہدایت اپنی صداقت پر آپ شاہد ہے۔ اس کا آغاز ایک ایسی رات میں ہوا جو بڑی ہی مبارک ہے۔ یہ کتاب ہمارے اسی پروگرام کے مطابق نازل ہوئی جس کی رُو سے ہم شروع ہی سے انسانوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسی میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں، غلط امور سے الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

ان آیات کو شبِ برات کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں جو کہا گیا ہے کہ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس رات ہر ایک کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

جب کہا جائے کہ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ نزولِ قرآن کی ابتدا رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی تو وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا کوئی سی بھی ہو، اسے بہرحال رمضان کے مہینے کی ایک رات ہونا چاہیئے۔ اور شبِ بارات شعبان کے مہینے میں آتی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ شعبان کے مہینے کی اس رات کو قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے آسمانِ اوّل پر نازل ہوا اور پھر رمضان میں یہ آسمانِ اول سے دنیا میں نازل کیا گیا۔

یہ ہے نمونہ ان تفسیروں کا جو ہمارے ہاں زیبِ داستاں کے لئے[1] وضع کی گئی ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ :-

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر ۔۔۔ تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند[2]

اس ضمنی نکتہ کے بعد آجائیے صیام کی غرض و غایت کی طرف۔

(۰)

قرآنِ کریم نے صیام کی تین غایات بتائی ہیں۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ اس پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ اس سے ہوگا کیا۔

---

[1] ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے ۔۔۔ بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

[2] پاژند : مجوسیوں کی ایک مقدس کتاب۔

صیام کی غایت

اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس سلسلہ میں اُس نے تین باتیں کہی ہیں: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - (۲/۱۸۳) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۱۸۵) اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵)۔ تقوٰی کا مفہوم جلد اول صفحہ ۲۷ آیت (۲/۲) میں بتایا جا چکا ہے۔ یعنی راستے کے خطرات سے بچ کر چلنا۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ لہٰذا، صیام کے پروگرام کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم خطرات کا مقابلہ کرنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تمہاری قوتِ برداشت بڑھ جائے گی اور تمہارے اندر ڈسپلن پیدا ہو جائے گا۔

اس کا دوسرا نتیجہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہے۔ شکر کا مفہوم جلد دوم صفحہ ۲۶۳ زیرِ آیت (۲/۵۲) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے انسانی کوششوں کا بھرپور نتیجہ برآمد ہونا۔ لہٰذا، کہا یہ گیا ہے کہ صیام کے پروگرام سے تم میں جو برداشت کی قوت اور ڈسپلن کی صلاحیت پیدا ہوگی، اس سے تمہاری کوششیں پوری طرح ثمربار ہو جائیں گی۔

اس سے سوال یہ اُبھرا کہ کوششیں تو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے یہ جانکاہ کوششیں کی جائیں گی اور وہ بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ اس مقصد کو "تُكَبِّرُوا اللّٰهَ" کی نہایت جامع اصطلاح میں سمٹا کر بیان کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ "تکبروا اللہ" دین کی غایت اور جماعتِ مؤمنین (امتِ مسلمہ) کا منتہائے مقصود ہے۔ یہ امت جیتی ہے تو اس کے لئے، اس کی تمام جدوجہد ہوتی ہے تو اسی کے لئے اور مرتی ہے تو اسی کی خاطر۔

تکبروا اللہ سے مراد ہے خدا کی کبریائی قائم کرنا۔ کبریائی سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۳ آیات

خدا کی کبریائی

(۲/۱۱-۱۲) میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن چونکہ زیرِ نظر آیت میں یہ بات پہلی دفعہ سامنے آئی ہے اس لئے مختصر الفاظ میں اس کا دہرا دینا غیر از محل نہ ہوگا۔

کبریائی کے معنیٰ ہیں انتہائی بلندی۔ ایسا غلبہ اور تسلط جس کے اوپر کسی کا غلبہ اور تسلط نہ ہو۔ کلّی اختیارات کا مالک۔ آخری اتھارٹی۔ صاحبِ اقتدارِ مطلق (ABSOLUTE POWER) کا مالک۔ آجکل کی سیاسی اصطلاح میں اسے (SOVEREIGN POWER) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے:-

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ - (۴۵/۳۷)

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کی ہے۔ وہ انتہائی غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ حکمت پہ

مبنی ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کے غلبہ اور اقتدار کے متعلق کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس میں ہر جگہ اس کے مقرر کردہ قوانین کی حکومت ہے، اور ایسی حکومت کہ اس سے بالا کسی کا اقتدار نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے ہم ہی نہیں مغرب کے وہ سائنسدان بھی معترف ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے۔ وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ کائنات میں جن قوانین کی کارفرمائی ہے ان سے بالا کوئی قوانین نہیں۔ وہ ان قوانین کو قوانینِ فطرت کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم انہیں خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت کہتے ہیں۔ ان قوانین کی کبریائی سے انہیں بھی انکار نہیں۔ سو خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی مسلّم ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس کے لئے بھی خدا نے قوانین متعین کر دیئے ہیں لیکن یہاں یہ قوانین از خود نافذ العمل نہیں۔ یہ انسانی ہاتھوں سے نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کو انسانی دنیا میں نافذ کرنا خدا کی کبریائی کو ثبت (ESTABLISH) کرنا کہلائے گا۔ یہ جماعتِ مومنین، امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس کو خدا کی حکومت یا دین کا نظام کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کو منصبِ نبوت پر سرفراز کرنے کے بعد (میرے اندازے کے مطابق) پہلا حکم یہ دیا گیا کہ قُمْ فَأَنذِرْ اٹھ اور لوگوں کو غیر اللہ کے قوانین کی عملداری کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۲-۳) اور اپنے نشو ونما دینے والے کی کبریائی کو مستلط اور ثبت کر۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (۱۷/۱۱۱) "اس کی کبریائی کما حقہٗ ثبت کر" اور اس کا مطلب یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ لَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ۔ (۱۷/۱۱۱) "غلبہ اور اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہ ہو" خدا کی یہی کبریائی ہے جس کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو المتکبّر (۵۹/۲۳) کہا ہے۔

نظامِ خداوندی کا غلبہ

اور کسی جگہ اَلْكَبِيرُ الْمُتَعَالُ۔ (۱۳/۹)۔ متعال کے معنی بھی انتہائی غلبہ اور اقتدار کا مالک ہیں۔ دیگر مقامات میں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ بھی کہا ہے۔ (۲۲/۶۲؛ ۳۱/۳۰؛ ۳۴/۲۳)

سوال یہ سامنے آیا کہ خدا کے اس غلبہ و اقتدار کے ثبت ہونے کا عملاً مفہوم کیا ہے۔ فرمایا کہ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ۔ (۴۰/۱۲)۔ حکومت صرف خدا کی ہو۔ کیونکہ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ۔ وہی ہے۔ اس لئے احکم الحاکمین وہی ہوگا۔ (۹۵/۸)۔

بات یہاں تک بھی نظری اور اعتقادی سی دکھائی دیتی ہے۔ یعنی کیا خدا کو العلی الکبیر یا احکم الحاکمین مان لینے اور کہہ دینے سے مقصد پورا ہو جاتا ہے؟ کہا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰) بالادستی خدا کے قوانین کو حاصل ہو۔ غلبہ و تسلط ان ہی کا ہو۔ حکومت انہی کی ہو۔ اس طرح کی حکومت

کہ لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳)۔ دنیا کے ہر صاحب اقتدار سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن خدا سے ایسا نہیں پوچھا جا سکتا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے چار لفظوں میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ سیاسی اصطلاح میں .... (SOVEREIGNTY) کی تعریف یہ ہے:۔

(ACCOUNTABILITY TO NONE)

جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کا اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہو سکتا ہے اور کسی کو نہیں۔

کلمۃ اللہ کے متعلق کہا کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ - (۶/۱۱۶) یہ قوانینِ خداوندی مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ ان کے مجموعہ کا نام کتاب اللہ ہے (یعنی قرآن مجید) لہٰذا خدا کی حکومت، اس کے غلبہ و تسلط، اس کے اقتدارِ مطلق، اس کی کبریائی سے مراد ہوگا اس کی کتاب کی حکومت۔ لیکن ظاہر ہے کہ انسانی دنیا میں قوانین کی حکومت از خود تو قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ بہرحال انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوگی۔ جو جماعت اس کتاب کی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری لے گی اسے جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اس لئے فرمایا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔(۵/۴۴) (جو کتاب اللہ کی حکومت قائم کرتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے)۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر کہلاتے ہیں۔ جب حکومت اس کتاب کے مطابق قائم ہوگی تو اسے الدّین — یعنی نظامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے گا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اسی دین کا قیام، اور دیگر ادیان (نظامہائے زندگی) پر اس کا غلبہ و استیلا تھا:۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (۹/۳۳)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو حق پر مبنی نظامِ حیات اور ضابطۂ ہدایت دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام' دنیا کے ہر باطل نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ امر ان لوگوں پہ کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی محکومیت پسند نہیں کرتے۔

چونکہ یہی نظام ہے جو منشائے تخلیقِ انسانی کو پورا کر سکتا ہے۔ یعنی اس کے تابع انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے، آخر الامر اسے دیگر نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اس لئے فرمایا:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۔ (۵۸/۲۱) خدا نے اس کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ آخرالامر ایسا ہو کر رہے گا۔ خدا غالب آ کر رہے گا۔ خدا کے غالب آنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ وہ رسول غالب آ کر رہیں گے جن کا مقصد حیات نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہے۔ (تفصیل جلد دوم صفحہ ۳۰۲۔ آیت (۲/۲) میں گزر چکی ہے)۔

لیکن رسول اکیلا تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اس پروگرام کی تکمیل رسول اور اس کے رفقاء کی اجتماعی کوششوں سے ہوگی۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ۔ (۴۸/۲۹)۔ یہ سب مل کر اس فریضہ کو سرانجام دیں گے۔ چنانچہ جس آیت میں کہا: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۔ (۵۸/۲۱) اس سے اگلی آیت میں یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ رسول اور جماعتِ مومنین حزب اللہ (خدا کی پارٹی) ہے اور یاد رکھو: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ

حزب اللہ کا غلبہ

الْغٰلِبُوْنَ ۔ (۵/۵۶)۔ "آخرالامر غلبہ حزب اللہ ہی کو ہوگا"۔ یہی وہ جماعت ہے جس کے متعلق کہا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) چونکہ تم مومن ہو۔ یعنی خدا کی کبریائی کو ثبت کرنے کے ذمہ دار ــــ اس لئے تم سب پر غالب رہو گے۔ جب قانونِ خداوندی کی حکمرانی ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی کبریائی (اپنی حکومت) قائم کرنے کا داعیہ لے کر اٹھیں گے' وہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِىَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ (۷/۱۴۶) "جو لوگ الحق کے بغیر دنیا میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہیں گے انہیں نظامِ خداوندی جھاڑ جھنکار کی طرح راستے سے ہٹا دیگا"۔ یہ ہے ۔لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کا عملی مفہوم۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی کبریائی نے سمٹ سمٹا کر عملی شکل کیا اختیار کی؟ وہ حکومت جس میں اقتدارِ مطلق کتاب اللہ کو حاصل ہو، جن لوگوں کے ہاتھوں یہ حکومت قائم ہو' اس احتیاط کی بنا پر کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ انہیں حقِ کبریائی (حقِ حکومت) حاصل ہو گیا ہے انہیں تاکید کر دی کہ تم ساری دنیا سے پکار کر کہہ دو۔ اعلان کر دو۔ (PROCLAIMATION) کے طور پر براڈ کاسٹ کر دو اور دن رات براڈ کاسٹ کرتے رہو کہ

اَللّٰهُ اَكْبَرُ!

اللہ اکبر کا مفہوم

دنیا میں کسی انسان کو کبریائی حاصل نہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں بھی نہیں۔ کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　　حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

آپ نے غور فرمایا کہ "اللہ اکبر" کس قدر انقلاب آفریں نعرہ ہے۔ کیسی فلک شگاف حقیقت ہے کس قدر "باغیانہ" اعلان ہے۔ — یعنی ہر انسان کے حقِ حکومت کے خلاف نعرۂ بغاوت — وہ جو رسول اللہ کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی ہے (۱۵۷/۷) تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی وسیع اور طویل کیوں نہ ہو، وہ سمٹ کر ان دو لفظوں میں آجاتی ہے کہ — اللہ اکبر!

اور یہ تھا پروگرام صیام کا مقصد۔ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ تم اس قابل ہو سکو کہ خدا کے عطا کردہ (DIRECTIVES) کے مطابق وہ نظام قائم کر دو جس میں تم ساری دنیا میں اعلان کر سکو کہ کبریائی (حقِ حکومت) صرف خدا کو حاصل ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ دین میں صیام سے مفہوم و مقصود کیا تھا؟

اور پھر اس پر بھی غور فرمایا کہ مذہب میں آکر صیام کا مفہوم کیا رہ گیا؟ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ:۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے (اقبالؒ)

(ضمناً) مروجہ روزوں میں کھانے پینے وغیرہ کی پابندی سے توحکم خداوندی کی تعمیل یہ ہی تھی۔ وہ کر لی گئی۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ کا مقصد اپنے آپ کو متقی پرہیزگار کہہ لینے سے حاصل کر لیا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ کے متعلق کہہ لیا کہ جمعۃ الوداع درحقیقت بارگاہِ خداوندی میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے لئے ہے کہ اس نے ہمیں روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا کہ یہ جو نمازِ عید میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں اس سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے! اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد کفار کی حکومت میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی کہا تھا اور پھر تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کا بھی یہی موقف تھا۔

صیام کے پروگرام کے علاوہ، قرآن کریم نے حج کے پروگرام کے متعلق بھی فرمایا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۳۷/۲۲)۔ یعنی اس کی غایت بھی خدا کی کبریائی ثبت کرنے کا عملاً پروگرام ہے۔ اس کی تفصیل حج سے متعلق احکام کے ضمن میں سامنے لائی جائے گی۔ اس وقت ذہن ایک اور نکتہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ وہاں یہ آیت حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کے ضمن میں آئی ہے۔ اور اس سے پہلے کہا ہے۔ سَخَّرَهَا لَكُمْ۔ (۳۷/۲۲)۔ خدا نے ان جانوروں کو تمہارے زیرِ تسخیر کر دیا ہے۔ ذرا اگر تصور کے سامنے لائیے اس نقشہ کو کہ ایک جانور کو آپ نے لٹایا ہوا ہے۔ اس کی گردن کو

ذبح کے وقت اللہ اکبر

پاؤں سے دبا رکھا ہے۔ وہ بالکل بے بس، ہر طرح سے آپ کے قابو میں ہے۔ چھری آپ کے ہاتھ میں ہے جو ابھی اس کی گردن پر چلا دی جائے گی۔ ذرا سوچئے کہ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن سے انسان کے دل میں اپنے بڑا ہونے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ عین اُس وقت کہا کہ چھری چلاتے وقت کہو:۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ!

بڑا میں نہیں، بڑی خدا کی ذات ہے۔ کبریائی اسی کے لئے ہے۔ اسی لئے وضاحت سے کہہ دیا کہ حلال جانور کا گوشت بھی تمہارے لئے حلال اسی صورت میں ہو گا کہ تم چھری چلاتے وقت اس کا اعلان کرو کہ کبریائی میرے لئے نہیں، خدا کے لئے ہے۔

یہ تھا دین کا عطا کردہ تصور۔ اور اب جس طرح جانور ہمارے عام "مذبح خانوں" میں اور خود حج کی تقریب پر ذبح کئے جاتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

(٥)

صیام (روزوں کے احکام) کے بعد بات وہیں نہیں چھوڑ دی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے اس سے صیام کی پابندی کا مقصد اور بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ کہا کہ تم نے کھانے پینے کے معاملہ میں ہمارے حکم کے مطابق کچھ پابندیاں اپنے اوپر عائد کی تھیں۔ جب تم اس طرح پابندیوں کے خوگر ہو گئے ہو تو ایک پابندی کا حکم اور بھی سنو! اور وہ یہ ہے کہ:۔

۲/۱۸۸ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۸۸)

روزے کا مقصد یہ تھا کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہو جائے کہ تم زندگی میں ہر جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکو۔ اور تمہاری خواہشِ نفس یا مفاد پرستی کا تقاضا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرا لو جس سے دوسروں کا مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس طرح حاصل کردہ مال و دولت کا انجام کیا ہوتا ہے؟

روزے میں کیا ہوا تھا؟ دن بھر روٹی اور پانی تمہارے سامنے پڑے تھے۔ تم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہی روٹی اور پانی جب افطار کے بعد تمہارے سامنے آئے تو تم نے انہیں بلا تکلف کھا پی لیا۔ روٹی پانی تو وہی تھے۔ ان میں یہ فرق کیسے پیدا ہو گیا! اس طرح کہ دن میں انہیں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ رات کو یہ پابندی اُٹھا دی تھی۔

مالِ حرام

مال و دولت شکل و صورت کے اعتبار سے ہر جگہ اور ہر ایک کے پاس ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ ناجائز مال (رزقِ حرام) پر خدا کی طرف سے پابندی عائد ہوتی ہے اور جائز مال (رزقِ حلال) پر وہ پابندی نہیں ہوتی۔ تو کیا یہ بات تاسف انگیز نہ ہو گی کہ جس روٹی پر (روزے میں) پابندی ہو، تم اُسے تو نہ کھاؤ لیکن جس مال پر پابندی عائد ہو اسے ہڑپ کر جاؤ۔ مؤمن کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہر پابندی کی یکساں نگہداشت کرتا ہے۔ صیام کے پروگرام کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

(۰)

احکامِ صیام کے درمیان ایک آیت اور تھی جسے ہم نے التوا میں رکھا تھا۔ اُسے اب سامنے لایا جاتا ہے۔ فرمایا:-

۲/۱۸۶ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔(۲/۱۸۶)

جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو۔ سو میں تو قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور یقین لائیں مجھ پر تا کہ نیک راہ پر آئیں۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے اس آیت کا تعلق "دعا مانگنے" سے نہیں لیکن چونکہ آیت کے عام ترجمہ کی رُو سے اسے "دعا مانگنے" کے لئے قرآنی سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دعا کا مفہوم اسی مقام پر ذرا وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ میں نے اسے اپنی کتاب "کتاب التقدیر" میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہیں سے اسے ملخصاً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ بعد میں اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے گا۔ (دعا کے متعلق ضمناً جلد اول صـ۳۹ـ۳۸ پر بھی لکھا جا چکا ہے)۔

ہمارے ہاں "دعا مانگنے" سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے بارگاہِ خداوندی

دعا کا مفہوم

میں التجا کرے۔ اسی کو خدا سے مرادیں مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے اور اعتراضات ابھرتے ہیں، ہم پہلے انہیں سامنے لاتے ہیں۔

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے، اور (قسمت کا لکھا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مرجانا ہے۔ اب اس کے لئے، وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مرجائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے ــــ جو فیصلہ بدل سکتا ہے ــــ خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے ــــ وہ

اس سے پیدا ہونے والے شکوک

اٹل نہیں کہلا سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رُو سے، خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے، اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے اشکال لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہو گی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہو گی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بکر زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر نہیں اور مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہو گا جو حق پر ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی)، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا؟ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے خدا بہرحال، حقدار کا ساتھ دیگا، تو اوّل یہ چیز واقعہ کیخلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ــــ ہیں ــــ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے

پر چڑھا دیئے جاتے ہیں ــ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ حقدار، دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہرحال اس کا ساتھ دے گا۔ اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی نہیں سنے گا۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا، اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد کی رُو سے، دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورۃ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ..... (۲/۱۸۶)

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار (کو سنتا اور اسے) قبول کرتا ہوں۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بےکس و بےبس مصیبت زدہ لوگ گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا، اس امر واقعہ کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا) بڑے دور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوتی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو (مذکورہ بالا جواب کی رُو سے)

اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے۔ اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیئے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف، مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو اُبھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دستِ تظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا للعجب! آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر "حضرت صاحب" کے آستانِ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا، گڑگڑا کر، ہاتھ باندھے، اور اکثر، ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دعا کیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا اور یہ سلسلہ "حضرت صاحب" کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد (جسے وفات نہیں بلکہ وصال کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب ــ خدا ــ سے جا کر مل جانا) ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے سجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتی ہیں، اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ (یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ .... "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔

السُلطان ظلّ اللہ علی الارض کا عقیدہ

ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے

دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی "اصل" آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رُو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہِ حقیقی) بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے — نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا — جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا نواز دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہلِ دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء۔ اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربارِ خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رُو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر، خدا تک دعا پہنچانے کے لئے کسی "حضرت صاحب" کے وسیلہ کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہٖ جس طرح بادشاہوں کے حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی "خدمت" کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر و الحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں، اور دامانِ طریقت سے وابستگان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم "حضرت صاحب" کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا۔ حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (۷/۱۹۴)، وہ تمہارے ہی جیسے انسان (خدا کے بندے) ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں، یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے، ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو، وہ تمہاری بات ہی نہیں سُن سکتے۔ اور اگر (بفرضِ محال) وہ سُن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۳۵/۱۴)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو، وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں۔ (۴۶/۵)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔ (۱۶/۲۱) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

(۰)

اب آئیے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجئے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں یعنی "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔ اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔ (۲/۱۸۶) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی (قوانین) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو، اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو) اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں

سورۂ شوریٰ میں ہے۔ يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۴۲/۲۶)۔ "دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں"۔ یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ لیکن اتنی بات سن رکھو۔ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے (ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی) وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورۂ اعراف میں خدا کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (۷/۵۵)۔ وہ انہیں پسند نہیں کرتا جو حدود سے تجاوز کر جائیں۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں، ان کی دعائیں بے کار ہو جاتی ہیں (۱۳/۱۴) دعاؤں کی مقبولیت کے لئے ایمان شرطِ اوّل ہے اور ایمان کے متعلق بھی سُن رکھو کہ "انہی لوگوں کے متعلق سمجھا جائے گا کہ وہ فی الواقعہ ایمان لائے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کئے جائیں تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیں اور پھر خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری جد و جہد کریں اور کسی حالت میں بھی اطاعتِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کریں۔ وہ لوگ اس جد و جہد میں راتوں کی نیند تک بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳۲/۱۵-۱۶) وہ اس طرح بیم و رجا دونوں حالتوں میں خدا کو پکارتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے، اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں اسی حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم متعلقہ آیات کا مفہوم مفہوم القرآن

سے پیش کرتے ہیں ۔ فرمایا :-

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لیے کائنات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش ہیں، قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں ۔

ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور ارباب فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے ، بیٹھے ، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد، علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے ۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کر دے ۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم، علمی تحقیقات اور عملی تجاربکے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں ۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں ـــ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے ۔ بلکہ نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے ۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقینِ محکم رکھے ۔

لہٰذا، ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ آؤ ! اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ ۔ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا پر ایمان لے آئے ۔

اس کے بعد ان اربابِ علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں (وہ دعائیں مانگتے ہیں) کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری غلطیوں کے اثرات مٹاتے رہنا اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں ۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے، اپنے رسولوں کے ذریعے (وحی کی رُو سے) جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۳/۱۸۹-۱۹۳)

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیئے۔ ارشاد ہوا:-

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ .... (۳/۱۹۴)

خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ (ہم نے تمہاری دعاؤں کو سُن لیا ہے۔ لیکن تم یاد رکھو کہ) ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔

یہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

(۰)

یہ تو تھی عام مؤمنین کی کیفیت۔ اب ذرا حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ کر لیجیے تاکہ بات اور بھی واضح ہو جائے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق کہا کہ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو نَادَانَا اُس نے ہمیں پکارا۔ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ۔ (۳۷/۷۵)۔ تو ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی دعا کا کیا جواب دیا گیا تھا غور سے سُنیے۔ فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (۲۳/۲۷) ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ یعنی حضرت نوحؑ کی دعا کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ انہیں وہ تدبیر بتا دی جس سے وہ اور ان کی جماعت آنے والے سیلاب سے محفوظ رہ سکیں۔

جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ فرعون کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں، تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے، متعدد تائیدی اسباب و ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ اس کے جواب میں کہا۔ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ (۲۰/۳۶) اے موسیٰؑ! جو کچھ تو نے مانگا ہے ہم نے تجھے عطا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی اور تیری مانگ پوری کر دی ہے تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۔ (۲۰/۴۲)۔ "تم دونوں حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی (حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو! جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے۔ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۰/۸۹)۔ "خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے۔ اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو، تم کبھی اُن لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ نے یہ دعا کی کہ ان کی امت کو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں عطا کر دی جائیں تو جواب میں کہا گیا کہ ایسا ہو جائے گا بشرطیکہ "یہ لوگ نبی آخرالزمان کا اتباع کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری رحمت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے وہ انہی کو ملتی ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کریں اور دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کریں۔ (۷/۱۵۶-۱۵۷)

حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے لئے دعا کی تو انہیں اس کی خوشخبری اسی وقت دے دی گئی۔ لیکن یہ دعا پوری اس طرح ہوئی کہ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۔ (۲۱/۸۹-۹۰) ان کی بیوی میں جو نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہو گئی[1]

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا، ان کے سلسلہ میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لئے جن طبیعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگ لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اسی قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ

لب دریا پیاسا

پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا ایسے شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ پیاس اس کی بجھے گی جو آگے بڑھ کر پانی سے چلّو بھرے اور اسے پی لے۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دُور نہیں ہو سکتی۔ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۔ (۱۳/۱۴)۔ جو لوگ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' ان کی دعائیں رائیگاں جاتی ہیں۔

(۰)

[1] حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کے سلسلہ میں مزید تصریحات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گی۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں! ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں۔ ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی ہیں اور قبول بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا طریق کچھ اور ہے۔ وہ طریق کیا ہے، اسے غور سے سنیئے:۔

مظلوموں کی دعائیں کیسے سنی جاتی ہیں

برسہا برس کی محنت شاقہ اور تگ و تازِ پیہم کے بعد مدینہ میں جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکہ میں محصور تھے، قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ "بار الٰہا! ہماری مدد کر اور ہمارے لئے ان ظالمین کے جور و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔" انہوں نے خدا سے دعا کی، اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے مدینہ کی جماعت مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اے جماعتِ مومنین! انہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے مظلوم و مقہور، بےکس و بےبس، کمزور و ناتواں، مرد، عورتیں، بچے کس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں کہ بار الٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو نہیں سن رہے؟ اور اگر سن رہے ہو تو پھر کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم ان کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں۔ تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس الحاح وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا۔ (۴/۷۵) وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی یار و مددگار پیدا کر۔ کوئی حامی و ناصر بھیج۔

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت، اس حکومت، اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر، اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا، کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکت سنتی ہے

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعتِ مومنین جو اب مدینہ میں تھی، تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی! لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لئے وجود میں آیا ہو، اس لئے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم ہمت و استقلال سے کام لے کر، اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ "کہو! کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے"! وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے۔ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷/۶۲)۔ "وہ تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے"۔ یہ ہے طریقِ خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ یہ ان کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۴/۵۵)

دوسرے مقام پر اسی جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں اپنے امورِ مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زیست انہیں خدا نے دے رکھا ہو، اسے رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی (مشاورتِ باہمی) سے اشارہ اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو، قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی تھی۔ سورۂ قصص میں ہے کہ۔

> فرعون اپنی مملکت میں دھاندلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس طرح ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کئے چلا جاتا تھا (کہ وہ ابھرنے نہ پائیں) اس کے لئے وہ کرتا یہ تھا کہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی دکھائی دیتے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا، اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ ان میں

ناہمواریاں پیدا کئے چلا جاتا۔

اس سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک میں سرداری اور سروری عطا کر دی جائے اور انہیں ایک ایسے خطّہ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ (۲۸/۴-۶)

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت پیش آتی ہے اس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو۔ ہر جگہ

دعا مانگنے کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

دھاندلی ہو رہی ہو۔ کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں اس شخص کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے۔ جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے۔ جہاں افرا تفری اور نفسا نفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اُسے روندتے چلے جائیں، کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے۔ جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھُوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں مفلس مریض اس لئے بِن آئی موت مر جائے کہ اس کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں تھا، اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھُلی جا رہی ہو کہ اسے گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کہنے والے نے کہا ہے کہ :؎

جو نہیں آشنا مصیبت کا　　درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا　　جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا

وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے؟
اسے معلوم کیا خُدا کیا ہے؟

جب معاشرہ صحیح خطوط پر (مستقل اقدارِ خداوندی پر) متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردّد کے ملتا ہے۔ نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لئے اس میں نہ کوئی محتاج

ہوتا ہے نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرہ میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لئے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جب بھی اس پر غور کیا جائے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا تھا کہ لوگو! سُن رکھو:-

مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں، اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتسابِ خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورتمند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

مومنین کی سب دُعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ خود ان دعاؤں سے لگ سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مومنین کی چند ایک دعائیں:-

(۱) اے رب العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے سحابِ کرم کی بارش ہوئی تھی۔ (۱/۵-۷)

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنات (۲/۲۰۱)

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرما تاکہ ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اگر ہم سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے۔ اور ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲/۲۵۰) و (۳/۱۴۶-۱۴۷)

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و نسیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اس بوجھ تلے نہ دب جائیں جن کے نیچے اقوامِ سابقہ دب گئی تھیں۔ ہمیں اتنی قوت عطا فرما دے جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غلبہ و نصرت عطا کر دے جو تیرے نظام کے مخالف ہیں۔ (۲/۲۸۶) نیز (۳/۱۵)۔

(۵) اے ہمارے رب! ایسا نہ ہو کہ صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے قدم پھر غلط راستے کی طرف اُٹھ جائیں۔ تو ہمیں سامانِ نشوونما عطا فرماتا رہ۔ (۳/۷)۔

(۶) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی وساطت سے ہم سے کئے ہیں انہیں پورا کر دے۔ (۳/۱۹۲-۱۹۳)

(۷) ہمارا شمار صالحین کے زمرے میں ہو۔ (۵/۸۳)۔ ظالمین کے زمرے میں نہ ہو۔ (۷/۴۷)۔

(۸) ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ (۷/۸۹)۔ [یہ حضرت شعیبؑ اور ان کے متبعین کی دعا تھی۔ انبیاءؑ اور ان کی جماعتیں، مخالفین کے ساتھ تصادمات میں اسی قسم کی دعائیں مانگا کرتی تھیں]۔

(۹) متبعینِ حضرت موسیٰؑ کی دعا کہ بار الٰہا! ہمیں ظالمین کا تختۂ مشق نہ بننا پڑے۔ (۱۰/۸۵)۔ یہی دعا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں کی تھی۔ (۶۰/۵) ۔ (۱۰) عذاب جہنم سے محفوظ رہنے کی دعائیں۔ (۲۵/۶۵)

(۱۱) بیوی بچے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنیں (گھر کی زندگی سکون و اطمینان کی ہو) اور ہم متقین کے امام قرار پائیں۔ (۲۵/۷۴)

(۱۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ایسا کر دے کہ ہمارے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے کدورت نہ رہے۔ (۵۹/۱۰)

(۱۳) جنت میں مومنین کی دعائیں کہ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (۶۶/۸)

یہ ہوتا ہے انداز مومنین کی دعاؤں کا۔ ان کی ساری دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں جن سے پورے معاشرہ، جماعت، نظام کی خبرسگالی کے جذبات جھلک کر باہر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں اجتماعی ہی سہی، ان سے ہوتا کیا ہے؟ ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ سوال

اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل، اس لئے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔

(۰)

کوئی کام کرنا ہو، اس کے لئے سب سے پہلے، ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے جس

دُعا سے کیا ہوتا ہے؟

قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا۔ اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لئے ایک نظم لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدرسہ کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ :

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری   زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

اس شعر کے مصرعہ اوّل میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ دیوں تو بچوں کے لئے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی عمیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے، تو اُسے دعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا اتنی ہی مخلص دعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پُر کیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر جس قسم کی وہ آرزو، اسی قسم کی نفسیاتی

نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے

تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :

اَیکہ منزل رانمی دانی ز راہ   قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

بہرحال، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدتِ آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے، اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو عشق کی اک جست قصہ تمام کر دیتی ہے[1]، وہ شدتِ آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم "زمانہ جاہلیت" کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے

---

[1] عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام   اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں   (اقبالؒ)

کہ تمدّن و تہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ و منطق سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود، ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا — یعنی ان کی زبان۔ لسان عربی مبین — وہ (بادیہ نشین) جب اپنے مویشیوں کا دودھ دوہتے تو تھوڑا سا دودھ تھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ، اس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے اس مویشی نے اوپر چڑھا لیا تھا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ اَلدَّاعِیَۃ کہتے۔ اس سے دُعا کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو اُبھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے، جس سے اس کی مضمر توانائیاں (چھپا ہوا دُودھ)، مشہود ہو کر باہر نکل آئیں — شدّتِ آرزو سے، جس کا دوسرا نام دعا ہے، یہ ہوتا ہے۔

آرزو کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو ہے کس قسم کی۔ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے، مومن کے سامنے "صحیح آرزو" کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ (۸۱/۲۹)۔ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ تم اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو۔ جس بات کو خدا بُرا سمجھتا ہے، تم بھی اُسے بُرا سمجھو۔ جسے وہ اچھا سمجھتا ہے تم بھی اُسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ — قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا — یہ تمھیں وہ کچھ بنا دے گا جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم بنو۔ لہٰذا، سب سے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ ویسی نہ ہو تو اُسے تبدیل کر کے مستقل قدر سے ہم آہنگ کر لینا چاہیئے۔

اگلا قدم یہ ہے کہ اس آرزو، اس مقصد، اس معیار کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ قرآنِ کریم نے مومنین کا جو شعار بنایا ہے وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں: — یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (۳/۱۹۱) "جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں"۔ اس سے ان کی آرزوؤں میں پختگی بھی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس کی پاکیزگی بھی ملوّث نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے سورہ حٰمٓ میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ "وہ لوگ جو دل کے کامل یقین و اطمینان سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اس دعوٰی پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہیں"۔ اس میں ذرا سا بھی تزلزل نہیں آنے دیتے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ۔

ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان سے کہتے ہیں کہ تم مت خوف کھاؤ۔ مت غمگین ہو۔ اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور مددگار رہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی ــــ اس کے بعد ہے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ: (۴۱/۳۰ - ۳۱)۔ اس میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اس میں تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر دعا قبول ہوگی۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ ۔ بہت بڑا وعدہ ہے ــــ جو کچھ تم چاہو گے وہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان تصریحات کے مطابق جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، مومن، چاہے گا ہی وہی جو مستقل اقدارِ خداوندی (مشیتِ ایزدی) کے مطابق ہوگا، اس لئے وہ کسی غلط بات کو چاہے گا ہی نہیں۔ اور وہ مانگے گا ہی وہی جس کے دینے کا خدا نے مومنین سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یعنی ہر قسم کی خوشگواریاں، سرفرازیاں، رزقِ کریم، غلبہ و تسلط، قوت و اقتدار، یعنی قرآنی معاشرہ کی تمام برکات۔

آپ نے غور فرمایا کہ مومنین کی دعائیں کیسی ہوتی ہیں اور وہ پوری کس طرح سے ہوتی ہیں۔ یہ دعائیں اس جماعت کی ہوتی ہیں جو دنیا میں خدا کے نظام کی تشکیل و استحکام کے لئے اٹھے اور سفرِ حیات، وحی خداوندی کی روشنی میں طے کرتی جاتے۔ سینے میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ دل میں حصولِ مقصد کی تڑپ: نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین۔ بازوؤں میں قوت اور قدموں میں استقامت۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی ذات، (علیٰ حدِ البشریت) صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مومن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کے خیالات، ارادے، مقاصد، مطامح، زاویہ ہائے نگاہ اور منتہائے نظر، سب مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی حقیقت کو میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں ان الفاظ کے پیرہن میں پیش کیا تھا:۔

> دعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمۂ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دلکش رعنائیوں سے یکرنگی کی مچلتی ہوئی آرزو۔ چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی کہکشاں گیر و فلک پیما والہانہ امنگ۔ قلبِ پروانہ میں شمعِ فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز و رقص آفریں جوش و خروش۔ یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت (حیاتِ جاوداں) میں بدل لینے کا بیتابانہ ولولہ اور اسی ولولہ کی تسکین کے لئے قطرۂ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوئے شاہیں کی طلب۔
> بغور دیکھئے تو ایمان، دعا، اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس

حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا، اس ہم آہنگی و یک رنگی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوشش پیہم۔

یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو مستجاب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے — وہ نظام، جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام "ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے" وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دعا (مانگ) بابِ خداوندی سے ٹکرانے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لِیَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔ (۸/۱۰) اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ۔ (۸/۱۱)۔ اور سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دُعا سے ہوتا ہے یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؒ نے، اتنی بڑی رفیع و منیع اور عمیق و دقیق حقیقت کو، دو مصرعوں میں وا نشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بلیغ اور دلکش انداز، تصور میں نہیں آسکتا — آپ بھی سنیئے اور وجد میں آ جائیے۔ کہا ہے کہ :-

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (قضا سے یہاں مراد قانونِ خداوندی ہے)۔

(۰)

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں، اسے اخلاقی تائید (MORAL - SUPPORT) کہا جاتا ہے۔ اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں۔ جس محبوبِ جاں نواز کے دیکھنے سے (غالبؔ کے الفاظ میں) مریض کے منہ پہ رونق آجائے، اس سے چار کلماتِ تسلی یا دو الفاظِ تحسین

ایک دوسرے کیلئے دعائیں کرنا

سُننے سے جو قلبی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی حیثیت، مُردہ کے لئے دعائے خیر کی ہے۔ اس سے مُردہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کے پسماندگان کے غم واندوہ میں کمی واقعہ ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرتی روابط کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس نہیں کرتا اور سخت سے سخت جانکاہ مصیبت میں بھی اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جب اپنے عطیات تیرے پاس لائیں تو انہیں قبول کرنے کے بعد صَلِّ عَلَيْهِمْ "انہیں شاباش دیا کر"۔ ان کے اس عمل کو (APPRECIATE) کیا کر۔ انہیں دعا دیا کر۔ اس لئے کہ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹/۱۰۳)۔ "تیری دعا ان کے لئے بڑی موجبِ تسکین ہوتی ہے۔"

(٠)

قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کی بعض انفرادی دعاؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا، اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا (۲۱/۸۳-۸۴)۔ حضرت یونسؑ نے اپنے غم والم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی (۲۱/۸۷-۸۸)۔ سو اوّل تو قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دور کرنے کے لئے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوت ایک ایسا مقام ہے جس کی کنہ و ماہیت کا سمجھنا کسی غیر از نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا نبی سے کس طرح ہمکلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہٰذا، جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے، اس کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل!

(٠)

اس کے بعد آیئے آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۸۶) کی طرف۔ روزہ میں کھانے پینے اور جنسی اختلاط سے احتراز کیا جاتا ہے۔ تصوف کے پیدا کردہ نظریہ کی رُو سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا تھا کہ ترکِ لذائذ اور مادی اشیاء کے پرہیز سے انسان خدا کا مقرب بن جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ ہمارے ہاں متقی کا ترجمہ کیا جاتا ہے "پرہیز گار"۔ یہ اسی (تصوف کے پیدا کردہ) تصور کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ ان لذائذ وحظائظ سے مجتنب رہنے اور مشقتیں برداشت کرنے سے خدا کا قرب حاصل نہیں ہو جاتا۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ۔ (۲/۱۸۶)۔ "اے رسول! جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ کہ میں ہر وقت

ان کے قریب ہوں"۔

قُرب (نزدیکی) ایک تو فاصلہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ دو مادی چیزوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا کے قرب سے مراد فاصلہ کے اعتبار سے نزدیکی نہیں۔ وہ کسی مقام میں متمکن نہیں کہ انسان آگے بڑھ کر اس کے قریب ہو جاتا ہے۔

معراجِ نبویؐ

ضمناً، معراجِ نبویؐ کا عام تصور یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ مکہ سے سفر کر کے آسمانوں کو طے کرتے ہوئے عرشِ الٰہی تک پہنچے اور وہاں خدا سے ملاقی ہوئے۔ اس نظریہ کے خلاف بنیادی اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا کسی خاص مقام پر متمکن ہے جہاں جا کر اس سے ملا جاتا ہے[1]۔ یہ نظریہ خدا کے اس تصور کے خلاف ہے جو قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ میں (IMMINANCE اور (TRANSCENDANCE OF GOD) کی فلسفیانہ بحثوں میں الجھے بغیر اتنی وضاحت پر اکتفا کروں گا کہ قرآنِ کریم نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ۔ (۵۷/۴)۔ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ - (۵۰/۱۶)۔ ہم انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ - (۵۶/۸۵) لیکن تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا آیت (۲/۱۸۶) میں " إِنِّي قَرِيبٌ " سے مراد خدا کا مکان (SPACE) کے اعتبار سے نزدیک ہونا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ہمارے ہاں خدا کا تصور بادشاہوں کو سامنے رکھ کر تراشا گیا ہے۔ بادشاہوں کے مقربین فاصلہ کے اعتبار سے بھی اس کے نزدیک بیٹھتے تھے جو سب سے زیادہ مقرب ہوتا تھا اس کی نشست بادشاہ کے قریب تر ہوتی تھی۔ اب بھی حکومتوں میں (بادشاہ نہ ہونے کے باوجود) سفراء۔ وزراء۔ حکام۔ عمال وغیرہ کے لئے WARRANT OF PRECEDENCE (یعنی نشستوں کی ترتیب) مقرر ہوتی ہے اور اسے بڑی اہمیت

مقربینِ بارگہِ خداوندی

دی جاتی ہے۔ دربارِ خداوندی کا کچھ اس قسم کا تصور ہمارے ذہنوں میں بھی منقوش ہے اور اولیاء اللہ (یعنی مقربینِ بارگاہِ خداوندی) اپنے معتقدین سے بیان کرتے رہتے ہیں کہ فلاں محفلِ خداوندی میں کون کس جگہ تشریف فرما تھا۔ اس قسم کے تمام تصورات غیر قرآنی اور دوسروں کے

---

[1] قرآنِ کریم میں حضورؐ کے عرشِ معلیٰ پر جانے کا ذکر نہیں۔ معراجِ نبویؐ حضورؐ کے کمالاتِ نبوتؐ کی معراج ہے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

ہاں سے مستعار لیتے ہوتے ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ "ذاتِ خداوندی انسانوں کے پیدا کردہ اس قسم کے تصورات سے بلند و بالا ہے"۔ خدا کا وہی تصوّر صحیح ہے جسے خود خدا نے اپنے متعلق قرآنِ کریم میں دیا ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے قربِ خداوندی سے مراد ہوگی اطاعتِ خداوندی کی رُو سے حاصل شدہ مدارج۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶/۱۹) "خدا کی اطاعت کر اور اس طرح اس کا قرب (مدارجِ عالیہ) حاصل کرے"۔ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) خدا کے ہاں ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں۔ جو اعمالِ حسنہ میں سب سے آگے وہی سب سے زیادہ مقرب۔ السَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۵۶/۱۰-۱۲)؛ (۵۶/۸۸) دوسری جگہ انہیں الْمُتَنَافِسُوْنَ کہا ہے یعنی دوسروں سے سبقت لے جانے والے، جو حیاتِ جاوید کے سرچشمہ سے سیراب ہوں گے۔ (۸۳/۲۶-۲۸)

سورۃ توبہ میں ہے کہ نظامِ خداوندی کے استحکام کے سلسلہ میں مالی امداد رسول اللہ کی طرف سے تحسین و آفرین (صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ۔) اور قُرُبٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ـــ (۹/۹۹) کا موجب ہوتی ہے۔ یہاں قربت کے ساتھ عِنْدَ اللّٰهِ (خدا کے ہاں) نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کے ہاں بلند مدارج ہیں۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ وہی مال وجہ تقربِ خداوندی ہے جسے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ محض مالدار ہونے سے انسان خدا کا مقرب نہیں بن سکتا۔ اعمالِ صالح کی رُو سے مقرب بن سکتا ہے۔ (۳۴/۳۷)۔ نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو خدا کا مقرب بنا سکتا ہے۔ یہ تو خدا کی اطاعت ہے جس سے یہ تقرب حاصل ہوتا ہے[1]۔ (۳۹/۲-۳)

(٠)

لیکن آیت زیرِ نظر (۲/۱۸۶) میں "قربِ خداوندی" کا مفہوم کچھ اور ہے۔ آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ وہ اس طرح کہ جب بھی کوئی اپنی راہنمائی کے لئے مجھے آواز دیتا ہے تو میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کی پکار کا جواب دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔

متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ کتاب اللہ کا مقصد اور منصب یہ ہے کہ جب انسان نے زندگی میں

---

[1] تصوف کے متعلق تفصیلی بحث جلد دوم صفحہ ۱۸۶ آیت (۲/۱۰۲) کے تحت ہو چکی ہے۔

کسی دوراہے پر پہنچے اور اسے یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے جس سے وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو قرآن کریم اس کی راہنمائی اس راستے کی طرف کر دیتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کو محاکاتی انداز میں بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا

یہ جواب قرآن سے ملتا ہے

ہے۔ ایک مسافر دوراہے پر کھڑا ہے اور اسے صحیح راستے کا یقینی طور پر علم نہیں۔ اسے دُور کوئی شخص دکھائی دیتا ہے۔ وہ اسے پکار کر آواز دیتا ہے اور راستے کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسافر دوراہے پر کھڑا ہو اور وہاں کوئی آدمی ایسا نہ ہو جس سے وہ راستے کی بابت دریافت کر سکے، یا جس سے وہ پوچھے وہ اس کی آواز کا جواب ہی نہ دے۔ یا جواب دے تو یہ کہ مجھے راستے کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ سفرِ زندگی میں ہم انسان کی یہ حالت نہیں ہونے دیں گے۔ وہ کسی دوراہے پر راستے کے متعلق پوچھے، ہم اُسے جواب دینے کے لئے وہاں موجود ملیں گے اور اس سے کہہ دیں گے کہ یہ (GUIDE BOOK) ہے اس میں فلاں صفحہ الٹو تمہیں راستے کا پتہ نشان مل جائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کسی مسافر کے سوال کا جواب اس کتاب سے نہ ملے۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸)۔ کوئی جواب طلب بات ایسی نہیں جسے اس کتاب میں بغیر جواب کے چھوڑ دیا گیا ہو۔

آیت (۲/۱۸۵) میں کہا گیا تھا کہ رمضان کے مہینے میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی۔ یعنی اس کتاب کی ابتدا جو غلط اور صحیح راستوں کو الگ الگ کر کے بتا دیتی ہے۔ اور اس سے اگلی آیت (۲/۱۸۶) میں کہا کہ پوچھنے والوں سے کہو کہ تم اس کتاب سے اپنے سوال کا جواب مانگو۔ پھر دیکھو کہ اس سے کس طرح اس کا واضح جواب ملتا ہے کہ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۔ (۱۱/۶۱)۔ اس سے تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ تمہارا خدا کس طرح تم سے قریب بھی ہے اور تمہارے ہر سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت قرآنِ کریم کی اس خصوصیت کی وضاحت کرتی ہے۔

ضمناً، یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کا ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ ہمیں جو کچھ خدا سے پوچھنا ہو اس کی کتاب سے پوچھنا چاہیئے۔ یہ کتاب ہمارے ہر سوال کا جواب دیگی (خود ستائی کے طور پر نہیں بلکہ حقیقتِ نفس الامری بلکہ بطور تحدیثِ نعمت عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ خدا کے اس حقیر بندے نے جو سوال بھی اس کتاب سے پوچھا اس کا اسے کافی اور وافی جواب اس سے مل گیا۔ یہ سائل اس کی بارگاہ سے کبھی محروم نہیں لوٹا۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ (ہم ہر سائل کے سوال کا جواب

دیتے ہیں) اس ہیمپرز کا ذاتی تجربہ ہے ـــ ہم تو دیتے ہیں کوئی مانگنے والا ہی نہیں. ایک عظیم حقیقت ہے۔ اس سے مانگو تو سہی. پھر دیکھو کہ وہ کس طرح ـــ شعلہ شعلہ بہ بخشد، شرر شرر نہ دہد ـــ اس کے بعد ایک ایسی بات کہی گئی ہے جس سے نگہ تصور میں پھول کھلنے اور بہاریں مسکرانے لگ جاتی ہیں. انداز وہی محاکاتی ہے. کہا کہ تم نے ہم سے کچھ مانگا اور ہم نے جھولیاں بھر بھر کر دیا. فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي (۲/۱۸۶) ہم بھی تم سے کچھ مانگتے ہیں. سوال کرتے ہیں. کیا تم ہمارے سوال کا جواب نہیں دو گے؟ ہماری مانگ پوری نہیں کرو گے؟ سبحان اللہ! یہ انداز جس قدر شانِ محبوبیت لئے ہے اُسے بس محسوس ہی کیا جا سکتا ہے. الفاظ کے پیکر میں مقید نہیں کیا جا سکتا.

خدا کی مانگ پوری کرو

خدا کی وہ مانگ کیا ہے؟ وَلْيُؤْمِنُوا بِي. (۲/۱۸۶) یہ کہ تمھیں جو جواب ہمارے ہاں سے (یعنی کتاب سے) ملا ہے اس کی صداقت پر یقین کرو. سوال یہ ہے کہ کیا اس سے خدا کا کچھ سنور جائے گا. اس کا کوئی بگڑا ہوا کام بن جائے گا. کیا اس نے یہ سوال کسی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا. کہا کہ نہیں! اس سے تمہیں کچھ اور بنانا مقصود تھا. تم نے پوچھا تھا کہ صحیح راستہ کون سا ہے. ہم نے اس کا پتہ نشان بتا دیا. تمہیں اس کا علم ہو گیا. لیکن تمہیں معلوم ہے کہ صحیح راستہ معلوم ہو جانے کے بعد ضروری نہیں ہوتا کہ وہ شخص اس راستے کو اختیار بھی کر لے اور اس پر چل بھی پڑے. دنیا میں کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز مجھے نقصان پہنچاتی ہے اور فلاں فائدہ دیتی ہے. لیکن اس کے باوجود وہ نہ نقصان رساں چیز کو چھوڑتے ہیں نہ نفع بخش کو اختیار کرتے ہیں. سقراط کا یہ قول عملی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کہ (KNOWLEDGE IS VIRTUE) "علم ہی اصل نیکی ہے" اس کے برعکس غالبؔ نے جو بات کہی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے. وہ کہتا ہے کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد ـــ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

قرآن کہتا ہے کہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم صرف جانتے ہو کہ فلاں چیز مضرت رساں ہے. تمھیں اس کا یقین نہیں کہ اس سے تمہارا واقعی نقصان ہو جائے گا. کسی بات کا محض علم ہونے اور اس کی مضرت رسانی پر یقین ہونے میں بڑا فرق ہے.

قرآنِ کریم نے کہا کہ تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ صحیح راستہ کون سا ہے لیکن تم اس راستے پر گامزن اسی صورت میں ہو گے جب تمہیں اس امر کا یقین ہو کہ صرف وہی راستہ ایسا ہے جس سے تم بخیر و عافیت منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے. اس کے سوا کوئی راستہ ایسا نہیں. وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ. (۲/۱۸۶) اے رسول!

ان سے کہو کہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے راستے کے صحیح ہونے پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھیں۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۔ تاکہ یہ اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر سکیں۔ اس پر جم کر گامزن ہوسکیں۔ رُشد کے معنی ہیں صحیح بات کے معلوم ہو جانے پر اسے جم کر، محکم طور پر اختیار کر لینا۔ قرآن کریم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غلط اور صحیح راستے کو نمایاں طور پر واضح کر دیتا ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲۵۶/۲)۔ اور پھر ایسا تغیرِ نفس پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان اس راستے کو محکم طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ "پھر طبیعت ادھر آجاتی ہے۔" چونکہ یہ راستہ قرآن اور صرف قرآن سے ملتا ہے اس لئے مرشد خدا کی ذات ہے۔ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۔ (۱۷/۱۸)۔ جو اس کے راستے کو چھوڑ دیتا ہے اس کا کوئی حامی و مددگار اور مرشد نہیں ہو سکتا۔

رُشد کے معنی

(۰)

جن روزوں (صیام) کو فرض قرار دیا گیا ہے ان کا ذکر تو انہی آیات میں ہے۔ ان کے علاوہ قرآنِ مجید میں بعض روزوں کا بطور کفارہ بھی ذکر آیا ہے اور وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مناسکِ حج میں کچھ کمی رہ جانے کے سلسلہ میں (۳ + ۷) دس روزوں کا حکم (۱۹۶/۲)

(۲) قتلِ خطا میں دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۹۲/۴)

(۳) قسم توڑنے کے کفارہ کے طور پر تین دن کے روزوں کا حکم۔ (۸۹/۵)

(۴) "ظہار" کے کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزوں کا حکم۔ (۵۸/۴)

(۵) حالتِ احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کے طور پر روزوں کا حکم (۹۵/۵)

(۰)

واضح رہے کہ یہودی شریعت میں روزے میں بات چیت کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ (۲۶/۱۹)

چھٹا باب

حجّ - جہاد - ہجرت

آیات — ۲/۱۸۹ تا ۲/۲۱۸

(۱) حج کا اجتماع —— آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔
(۲) مرضات اللہ کا مفہوم۔
(۳) قتال (جنگ) کے مقاصد اور ہدایات۔
(۴) قرآن اور مذہبی آزادی۔
(۵) ارتداد کا غلط تصور۔
(۶) قوّت اور حکمت کا امتزاج۔
(۷) اسلام کا منتہٰی —— وحدتِ انسانیت
(۸) حصولِ جنّت کی آسان راہیں۔
(۹) جہاد کی اہمیت۔
(۱۰) ہجرت کا مفہوم۔
(۱۱) جہاد کے خلاف سازش۔
(۱۲) انسانیت کی نجات صرف قرآنی نظام میں ہے۔

چھٹا باب

حج کا عالمگیر اجتماع اور اُس کی غایت

حضورؐ نبی اکرم سے دریافت کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ جب جہاد (بمعنی قتال فی سبیل اللہ ــ خدا کی راہ میں جنگ) ہو رہا ہو تو اس میں شامل ہو اور جب وہ نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ مسلمان کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین ہوتا ہے ــ یعنی دینِ (نظامِ) خداوندی کو تمام باطل نظاموں پر غالب کرنا ــ اور اس کی ساری زندگی اس نصب العین کے حصول (یعنی اس نظام کے قیام اور اس کے بعد اس کے تحفظ، استحکام اور بقا) کے لئے وقفِ جدوجہد ہوتی ہے جنھیں عام الفاظ میں "عبادات" کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اسی پروگرام کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں۔ صیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں آچکا ہے۔ مہینہ بھر کے اس تربیتی کورس کی تکمیل کے بعد جشنِ مسرت (عید الفطر) منایا تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا آغاز ہو گیا۔ یہ کڑی ہے۔ حج کا اجتماع۔

حج کا اجتماع

کعبہ کی اہمیت اور حج کا عمومی تعارف، دوسرے باب میں کرایا جا چکا ہے۔ وہاں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حج درحقیقت نمائندگانِ امت کی سالانہ عالمگیر کانفرنس ہے جس میں اسلامی نظام سے متعلق مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، دلائل و براہین کی رُو سے تمام امورِ مملکت پر بحث و تمحیص ہوتی ہے اور آئندہ سال کے لئے پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ نمائندگانِ امت کے علاوہ، دوسرے لوگوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ آکر دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں حج کا اجتماع ہوتا تھا۔ قریش جو کعبہ کے متولی تھے۔ وہ اس کا اہتمام کرتے تھے اور دور و نزدیک کے لوگ جوق در جوق اس میں شریک ہوتے تھے۔ کعبہ بتکدہ تھا جس میں مختلف قبیلوں کے بُت نصب تھے۔ یہ قبائل اپنے اپنے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کے استھانوں (آستانوں) پر جانور ذبح کرتے

اوہام پرستی کے عجیب و غریب مظاہرے ہوتے اور اس طرح یہ سب اس میلے میں شریک ہوجاتے۔ میلہ، تجارتی مرکز کا بھی کام دیتا۔ عرب، حج کے بین القبائل اجتماع کا اہتمام تو ذی الحجہ کے مہینے میں کرتے لیکن رجب کے مہینے میں چھوٹے پیمانے پر بھی ایک اجتماع ہوتا جسے وہ عُمرہ سے تعبیر کرتے۔

عُمرہ

عرب کا علاقہ بالعموم بے برگ و گیاہ ریگستان پر مشتمل تھا (اور اب بھی ویسا ہی ہے) اس لئے وہاں کے رہنے والوں کی معیشت کا دار و مدار، زیادہ تر لوٹ مار پر تھا۔ یہ لوٹ مار، رہزنی اور قزاقی (قافلے لوٹنے) کی شکل میں بھی ہوتی اور جنگ میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کی صورت میں بھی۔ اس لئے اس ملک میں سفر کرنا بڑے خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ لیکن حج کے اجتماع کی اہمیت کے پیشِ نظر انہوں نے ایک بین القبائلی معاہدہ کر رکھا تھا (جسے آج کی اصطلاح میں CONVENTION کہہ لیجئے) یہ اس معاہدہ کی رُو سے حج سے پہلے (ذی قعدہ)، حج کی تقریب پر (ذی الحجہ) اور حج کے بعد (محرم) کے تین مہینے، اور اُدھر عمرہ کے سلسلہ میں رجب کا مہینہ، شہر الحرام تسلیم کئے جاتے تھے۔ یعنی ایسے مہینے جن میں ہر قسم کی لوٹ مار اور جنگ و جدال حرام ہوگی۔ کعبہ کے متولیوں (مذہبی پیشواؤں) نے اسے بھی کس طرح کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ان کی اس روشِ کہن یا عادتِ مستمرہ کے مطابق، اسلام میں بھی حج کے اجتماع کے لئے ذی الحجہ کا مہینہ رہنے دیا گیا اور حرمات کے چار مہینوں[1] میں جنگ پر پابندی کو بھی قائم رکھا لیکن اس اجتماع کے مقصد اور اس کی روح کو یکسر بدل دیا۔

نظامِ خداوندی کے مخالفین، اس نظام کی راہ میں شروع سے روڑے اٹکاتے چلے آرہے تھے۔ لیکن حج کے اجتماع کے ضمن میں ان کی یہ مخالفت شدید ترین شکل اختیار کرلیتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے بین القبائلی معاہدہ کو بھی بالائے طاق رکھ کر، ان مہینوں میں بھی جنگ پر اُتر آتے تھے۔ زیرِ نظر باب کا مرکزی موضوع تو حج کے متعلق تفاصیل ہے لیکن مخالفین کی اس روش کے پیشِ نظر جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے، اس میں جنگ کے متعلق بھی چند ایک ہدایات آگئی ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان دونوں عنوانات کو الگ الگ کر لیا جاتے۔ کیونکہ دونوں یکساں اہم بھی ہیں اور تفصیل طلب بھی۔ ہم پہلے حج کو لیتے ہیں۔ فرمایا:-

۲/۱۸۹ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ۔
وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

---

[1] قرآنِ کریم میں ان مہینوں کے نام نہیں دیئے گئے۔ یعنی انہیں متعین طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ صرف تعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۹/۳۶)

مَنِ اتَّقٰی ۔ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۲/۱۸۹)

مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ "ہم نے شہرِ رمضان (رمضان کے مہینے) کے متعلق کہا ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی اور اس لئے اسے صیام کے پروگرام کے لئے متعین کیا گیا۔ اس سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض نحس۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ماہ و سال، زمان کی گردشِ دولابی کے مظہر ہیں۔ ان میں سعد و نحس کا کوئی سوال نہیں۔ ان کا مقصد تو محض مختلف کاموں، بالخصوص حج کے لئے وقت کا تعین ہے اور بس۔" (آیت کے باقیماندہ حصہ کا مفہوم آگے چل کر بیان ہوگا)۔

اِهلَال کے معنی ہیں آواز بلند کرنا۔ چونکہ عربوں کے ہاں مہینے کی ابتداء چاند کی پہلی تاریخ سے ہوتی تھی، اس لئے جو شخص سب سے پہلے چاند دیکھ لیتا وہ اونچی اونچی آواز سے لوگوں کو اس سے مطلع کرتا۔ (عید کے چاند کے سلسلہ میں ہمارے ہاں اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے)۔ اس سے نئے چاند کو ھلال کہنے لگے۔ عربوں جیسی صحرانشین قوم میں جہاں حساب کتاب رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، مہینوں اور دنوں کا حساب چاند ہی کی رُو سے ہو سکتا تھا اس لئے ان کے ہاں قمری مہینے اور قمری سال کا رواج تھا۔ لیکن قرآنِ کریم نے کہا کہ ماہ و سال کے حساب کے لئے چاند کی کوئی تخصیص نہیں۔ شمسی اور قمری دونوں قسم کے سال رکھے جا سکتے ہیں۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۔ (۶/۹۶) "سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جا سکتا ہے۔" دوسری جگہ ہے۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵/۵)۔ سورج اور چاند دونوں، مقررہ حساب اور قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اس لئے دونوں سے گنتی شمار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ حساب رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نہ ہو (مثلاً کیلنڈر اور جنتریاں) تو چاند کی رو سے حساب رکھنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۔ (۱۰/۵) اس کی مقرر منازل (اس کے بڑھنے گھٹنے کی شکلیں) حساب میں آسانی پیدا کر سکتی ہیں۔ دوسری طرف کہا کہ رات اور دن کی گردش سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے۔ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۔ (۱۷/۱۲)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کا اختلاف، سورج کی رُو سے رونما ہوتا ہے۔

قمری اور شمسی کیلنڈر

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، تقویم (کیلنڈر) شمسی بھی ہو سکتی ہے، قمری بھی۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے، عربوں جیسی بادیہ نشین قوم کے لئے قمری تقویم زیادہ آسان تھی (ہمارے ہاں اب بھی دیہات میں چاند کے مطابق تاریخوں کا حساب رکھنے میں آسانی سمجھی جاتی ہے)، لیکن زرعی نظام میں اس میں ایک دقت پیش آ جاتی ہے۔ زراعت کا پروگرام موسموں کے دامن سے وابستہ ہوتا ہے اور موسموں کا تغیر سورج کے حساب سے ہوتا ہے نہ کہ چاند کے

حساب سے۔ رمضان کا مہینہ کبھی سردی میں آجاتا ہے کبھی گرمی میں۔ لیکن گندم کی کٹائی کے لئے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی سردی کے مہینے میں ہو کبھی گرمی کے۔ اس لئے زرعی نظام، سورج ہی سے وابستہ رہ سکتا ہے۔ ویسے بھی سورج کی رُو سے۔ زمین، سورج کے گرد (تقریباً) ۳۶۵ دنوں میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے (جسے سال کہا جاتا ہے) اور اس طرح ہر مہینہ ہمیشہ اسی موسم میں آتا ہے۔ زمین کے اس چکر کو پورا کرنے میں جو تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے، اسے ہر چار سال کے بعد، فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر کے پورا کر لیا جاتا ہے۔ اسے (LEAP YEAR) کہا جاتا ہے۔ لیکن قمری سال تو شمسی سال سے دس دن کم ہوتا ہے جس کے معنی، ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا فرق، اور ہر چھتیس سال کے بعد ایک سال کے فرق کے ہیں۔ زرعی معیشت میں اگر قمری سال رائج ہو تو انہیں ہر تین سال کے بعد، ایک ماہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ قمری سال موسموں کے لحاظ سے شمسی کے برابر ہو جائے۔ یہودیوں کے ہاں ایسا ہی ہوتا تھا اور عرب جاہلیہ میں بھی ایسا ہی۔ (ہندوؤں کے ہاں ابھی تک یہی سسٹم جاری ہے۔ ان کے ہاں ہر تین سال کے بعد، قمری سال بارہ کی بجائے تیرہ ماہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسے لوند کا سال کہا جاتا ہے)۔

لیکن عربوں کے ہاں (زراعت کے علاوہ) مہینوں کا تعین ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی اہم، بلکہ اہم ترین تھا۔ وہ یہ کہ ان کے ہاں سال میں چار مہینے حرام (واجب الاحترام) تھے جن میں جنگ وجدل بھی بند تھی اور لوٹ مار بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے متعین بھی ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم بھی۔ دو سال تک تو یہ مہینے متعین اور معلوم تھے لیکن تیسرے سال جب ایک مہینے کا اضافہ ہوتا (جس کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا) تو مذہبی پیشواؤں کے لئے "کاروبار" کا بڑا عمدہ موقعہ ہاتھ آجاتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان تیرہ مہینوں میں کون کون سے چار مہینے حرام سمجھے جائیں۔ یہ انتظام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں "نَسَاۃ" کہتے تھے۔ "نَسَاءٌ یا نَسِیٌّ" کے

نسی کا عملی مفہوم

معنی ہیں کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا، مؤخر کر دینا۔ چونکہ ان مہینوں میں تغیر و تبدل کا اثر بڑے بڑے سرداروں اور تاجروں پر پڑتا تھا اس لئے ان کے مفاد کی خاطر "نساء" کرتے یہ کہ کسی سال کسی مہینے کو حرام قرار دے دیتے، کسی سال کسی مہینے کو۔ اس سے معاشرہ میں بڑی گڑبڑ مچتی۔ قرآنِ مجید کے الفاظ میں یہ لوگ کرتے یہ کہ يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ (۹/۳۷)۔ یعنی یہ لوگ ایک ہی مہینے کو ایک سال جنگ کے لئے جائز قرار دے دیتے اور دوسرے سال اسے ناجائز ٹھہرا دیتے۔ اس طرح ان چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر دیتے جن میں جنگ کو حرام قرار دیا گیا تھا لیکن مہینوں کو اِدھر اُدھر کر دیتے۔ یعنی

عملاً خدا کے حرام کئے ہوئے کو حلال ٹھہرا دیتے اور سمجھتے یہ کہ ہم کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ جب اسلامی نظام قائم ہوا تو اس نے مذہبی پیشواؤں کی دیگر چالبازیوں اور دسیسہ کاریوں کے ساتھ اس تغیر و تبدل کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا .... (۹/۳۷)۔ یاد رکھو! مہینوں میں اس طرح تقدم و تاخر کر دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ تو ان معاہدات کا عملی انکار ہے جو تم نے باہمی کر رکھے ہیں۔

بارہ مہینے کا سال

اس سے قانون شکن لوگ بڑی غلط راہوں پر چل نکلتے ہیں۔ لہٰذا، اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ :-

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْھَآ اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ..... (۹/۳۶)

نظامِ خداوندی کی رُو سے، سال کے بارہ مہینے ہوں گے۔ تیرہ کبھی نہیں ہوں گے۔ یہ گنتی خدا کے اس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جو اس نے تخلیقِ ارض و سما کے وقت مقرر کیا تھا۔ ان میں چار مہینے حرام (واجب الاحترام) ہیں۔ یاد رکھو! اب سے یہی محکم قانون رائج رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان، حج کے عظیم اجتماع میں، نظامِ خداوندی کے نمائندہ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے کیا گیا۔ اور اس نے نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر رکھ دی۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہی ہونے چاہئیں۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ زمین، سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے۔ اسی مدت کو بارہ پر تقسیم کر دینے سے کیلنڈر فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد شمسی کیلنڈر کی رُو سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے شمسی کیلنڈر تجویز کیا تھا جس سے موسموں کا تعین بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور حرمات کے مہینوں کا بھی۔

لیکن ہمارے ہاں ہوا یہ کہ سال کے مہینے تو بارہ مقرر کر لئے گئے لیکن کیلنڈر قمری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سابقہ قمری کیلنڈر میں ہر تیسرے سال ایک ماہ کے اضافہ سے، شمسی اور قمری سالوں میں جو ہم آہنگی ہو جاتی تھی، وہ بھی باقی نہ رہی اور شمسی حساب سے بارہ مہینوں کے سال سے جو فوائد حاصل ہونے تھے وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ ہمارے ہاں یہ سلسلہ اب تک رائج ہے۔ میں نے یہ تحقیق کرنے کی بڑی کوشش کی کہ یہ معلوم ہو سکے کہ قرآنِ کریم کے اس اعلان کے بعد، جس سے (میری بصیرت کے مطابق) شمسی تقویم ہی ثابت ہوتی ہے، بارہ مہینوں والا قمری سال کس طرح رائج رہا یا رائج ہو گیا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ سنِ ہجری، حضرت عمرؓ کے زمانہ

میں اختیار کیا گیا تھا، لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہو سکا کہ بارہ مہینوں والا قمری سال کیسے رائج ہوا۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جو روش جتنی پرانی ہوجائے وہ اتنی ہی مقدس ہوجاتی ہے اور اسے کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ اس بنا پر ہمارے ہاں قمری کیلنڈر کے متعلق یہ عقیدہ قائم ہوگیا ہے کہ یہ اسلامی کیلنڈر ہے اور شمسی کیلنڈر غیر اسلامی ہے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے ہاں مذہبی تقاریب کے لئے قمری کیلنڈر رائج ہے اور "دنیاوی امور" کے لئے شمسی کیلنڈر۔ ظاہر ہے کہ یہ تضاد دور ہونا چاہیئے۔ لیکن مجھے یا کسی فرد یا کسی فرقہ کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کے اجتماعی معاملات میں کوئی تغیر و تبدل کرسکے۔ اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوگیا تو اسے اِس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ ایسے معاملات پر نظر ثانی کرے اور قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے قوانین وضع اور اختیار کرے جو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

(٠)

اب آیئے آیہ زیرِ نظر کے بقایا حصہ کی طرف۔ پوری آیت یوں ہے۔

۱۸۹/۲ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۱۸۹/۲)

ہم نے اوپر کہا ہے کہ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ بعض مہینے مبارک ہوتے ہیں اور بعض منحوس، اس لئے انہوں نے، اے رسول! تم سے اِس کی بابت دریافت کیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ مہینوں (یا دنوں) میں سعد و نحس کا خیال توہم پرستی ہے۔ اِن کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان سے اوقات کا تعین ہوجاتا ہے — اور اس کے فوائد ظاہر ہیں — اسی طرح یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ حج کب ہوگا۔

ان سے واضح طور پر کہہ دو کہ دین میں توہم پرستی کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً یہ جو تم سمجھتے ہو کہ حج کے دوران، مکانوں میں سامنے کے دروازے سے نہیں آنا چاہیئے، پچھواڑے سے آنا چاہیئے (تو یہ محض توہم پرستی ہے) سعادت اور کشادگی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ کشادگی راہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ تم کس حد تک قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو، اور تم میں کیریکٹر کی کتنی

بلندی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا، تم اِن جہالت آمیز باتوں کو چھوڑ دو، اور جس طرح' اور دنوں' گھروں میں دروازوں کے راستے آتے ہو اسی طرح حج کے دنوں میں بھی آؤ جاؤ۔

قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔

توہم پرستی کیخلاف

اوہام پرستی جہالت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں بھی ہوتی ہے جو اپنی نسبت کسی معروف مذہب کیطرف نہ کرتے ہوں۔ مثلاً افریقہ کے وحشی اور جنگلی قبائل — اوران لوگوں میں بھی جو کسی مذہب کی طرف منسوب ہوں، جیسے (مثلاً) ہم آجکل کے مسلمان۔ اسلام، علم وبصیرت پر مبنی دین ہے۔ وہ اپنے ہر حکم کے متعلق بتاتا ہے کہ ایسا کیوں کہا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اس لئے وہ ہر قسم کی جہالت کو دور کرتا اور توہم پرستی کو مٹا دیتا ہے۔ یاد رکھئے! جہالت اور دین، یکجا نہیں رہ سکتے۔ زمانہ جاہلیت ہیں عربوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ حج کے دوران اگر انہیں کسی ضرورت کے لئے گھر آنا پڑتا تو باہر کے دروازے سے گھر میں داخل نہ ہوتے، گھر کے پیچھے... کوئی دروازہ ہوتا تو اس سے اندر آتے اور یا پھر دیوار پھاندکر۔ یہی عرب جب اسلام لے آئے تو ان سے کہا کہ اب پرانی اوہام پرستی کو چھوڑ دو۔ کشادکی راہیں اس قسم کی توہم پرستانہ رسوم سے وابستہ نہیں۔ کشادکی راہ یہ ہے کہ تم کس قدر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہو۔ اور یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔

اس سے پہلے یہی الفاظ (لیس البر) اس نظریہ کی تردید میں کہے گئے تھے کہ دین کے احکام، میکانکی طور پر بجا لانے سے ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ (۲/۱۷۷) قرآنِ کریم کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح زمانہ جاہلیت کی رسمیں توہم پرستی ہیں' اسی طرح دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان واحکام بھی توہم پرستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ قرآنِ کریم اپنے ہر حکم کے ساتھ (لعلکم) کہتا ہے۔ یعنی ایسا کرنے سے یہ ہوگا۔ جہالت کی توہم پرستی یا مذہبی رسوم واعمال، اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟ یعنی اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، دین کے احکام پر بھی محسوس شکلوں میں عمل پیرا ہوا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر بھی ہوتے ہیں جنھیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دین کے شعائر کی نگہداشت، اور مذہب کے اوہام کی میکانکی طور پر ادائیگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دین کے شعائر ورسوم' اس کے نظام کی مختلف کڑیاں اور اس کے بلند وبالا نصب العین کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں۔ مذہب میں یہ ارکان مقصود بالذات سمجھے جاتے ہیں۔ اسی کو "توہم پرستی" کہتے ہیں۔ یعنی ان کی اہمیت انسان کے ذہن اور قیاس (یا اندھے عقائد) پر مبنی ہوتی ہے۔ علم وبصیرت اور دلائل وبراہین پر نہیں۔ یاد رکھئے! ہر وہ عمل جو "کیوں" کا معقول

جواب نہ دے سکے، تو ہم پرستی کے زمرے میں آجاتا ہے۔

اس کے بعد حج کی جزئیات کی طرف آئیے۔

حج کا اجتماع اسلامی نظام کا رکن رکین ہے اس لئے اس کا انتظام و انصرام امتِ مسلمہ کے ذمہ ہوگا اور یہ اساسی طور پر مختص ہوگا اس امت کے نمائندگان کے لئے، لیکن قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ سے جو کہا تھا کہ عالمِ انسانیت کو اس کی دعوت دو، تو اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی جا سکے گی کہ وہ مبصرین کی حیثیت سے اس میں شریک ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ سورۃ حج میں ہے:۔

حج اور غیر مسلم

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ..... (۲۲/۲۷-۲۸)

(ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ) وہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی تقریب پر یہاں آئیں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔ وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوعِ انسان) کی منفعت عامہ کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ
عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۳/۹۶)

سو جو لوگ بھی اس مقام تک پہنچنے کی راہ پائیں، وہ یہاں جمع ہوں بشرطیکہ ان کا یہاں جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، گروہ بندانہ مصلحتوں کے لئے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے اس قسم کے اجتماعات کی افادیت سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے لئے شرطِ اوّلین یہ ہے کہ اس سے مقصد پیشِ نظر انسانیت کی بہبود ہو۔ کسی کی مخالفت اور تخریب نہ ہو۔ (لِلّٰہ سے یہی مراد ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے)۔ دوسری جگہ اس کی تصریح اس طرح کر دی کہ

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ

مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (۲۲/۲۵)
ہم نے اس مقام اور اس اجتماع کو، یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔
لیکن جو شخص، گروہ یا قوم یہاں یہ ارادہ لئے ہوئے آئے کہ ایسا جتھہ قائم کیا جائے جس میں کمزور اقوام پر ظلم اور
زیادتی کی جائے۔ تو وہ اس اجتماع کے مقصدِ عظیم سے دور ہٹ جائے گا۔ اور اسے اس کی سخت سزا دی
جائے گی۔

یہ شرائط، اس اجتماعِ عظیم کے سلسلہ میں بھی نافذ ہوں گی اور ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات کے لئے بھی جو عند الضرورت منعقد کئے جائیں۔ انہیں عمرہ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اسی اجتماع کی ذیلی کمیٹیاں ہوں یا دوسرے اوقات میں منعقد ہونے والی کمیٹیاں۔ (۲/۱۹۶)

یہاں شرطِ اولین یہ عائد کی گئی ہے کہ اس میں شامل ہونے والے اس کے مقصد پر متفق ہوں اور کسی پر ظلم و زیادتی کے لئے جمع نہ ہوں۔ چونکہ قریشِ مکہ (جنہیں مشرکین کہہ کر پکارا گیا ہے) اس نظام اور اس کے مقاصد کی شروع سے مخالفت کرتے چلے آرہے تھے، اس لئے اعلان کر دیا گیا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہو سکیں گے (۹/۳؛ ۹/۲۸)۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعلان اُسی وقت کیا جا سکتا تھا جب مکہ، اسلامی نظام کی تحویل میں آگیا ہو۔ اس سے پہلے تو حالت یہ تھی کہ یہی مشرکین (قریشِ مکہ) خود مسلمانوں کو کعبہ کے قریب نہیں آنے دیتے تھے (۴۸/۲۵)۔ چنانچہ یہ اعلان فتح مکہ کے بعد، پہلے اجتماعِ عظیم میں کیا گیا۔ اسی لئے اسے قرآنِ کریم میں یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ (۹/۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کا مقصد

آپ نے غور فرمایا کہ اس اجتماع (حج) کا حقیقی مفہوم کیا تھا۔ آج اقوامِ عالم جن مقاصد کی تلاش، لیگ آف نیشنز (آنجہانی) اور اقوامِ متحدہ (U.N.O.) جیسے اداروں میں کر رہی ہیں، قرآنِ کریم نے اس کا تصور آج سے چودہ سو سال پہلے پیش کر دیا تھا، اس فرق کے ساتھ کہ اس نے (اقبالؒ کے الفاظ میں) جمعیتِ اقوام کی جگہ "جمعیتِ آدم" کا تصور دیا تھا۔ جمعیتِ اقوام، کمزور قوموں کے خلاف ظلم اور زیادتی کے لئے وجود میں لائی جاتی ہے۔ حج نوعِ انسان کی منفعت کے لئے۔ اسی لئے یہ واضح کر دیا کہ اس میں جو قوم، ظلم اور زیادتی کی نیت سے شامل ہو گی، نہ صرف یہ کہ اسے اس سے نکال دیا جائے گا بلکہ اس کی الم انگیز سزا بھی دی جائے گی۔

یہ ہے نوعِ انسان کے عالمگیر اجتماع کا وہ نقشہ جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔

آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے خور و نوش کا (اُس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر) کیا انتظام تجویز کیا گیا تھا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس میں شامل ہونے والوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ فالتو جانور لائیں جو ان کے کھانے پینے کے کام آئیں۔ اور جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں، وہ اپنے تحائف، ان لوگوں کے ہاتھ بھیج دیں۔

اب آیئے ان رسوم اور شعائر کی طرف جن کا اس اجتماع کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ چونکہ آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵ کا تعلق حج سے نہیں اس لئے انہیں یہاں پیش نہیں کیا جا رہا۔ انہیں بعد میں سامنے لایا جائے گا۔ فرمایا:۔

۲/۱۹۶ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۔ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۔ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ (۲/۱۹۶)

تم نے دیکھا کہ نظامِ عدل و مساوات کے قیام اور استحکام کے لئے کس قدر جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً تمہارے اجتماعات ہوتے رہیں جن میں باہمی مشاورت سے اس عظیم پروگرام کی تکمیل کے طریقے سوچے جائیں ــ انہی اجتماعات کا نام حج اور عمرہ ہے۔

ان اجتماعات کا مقام، تمہارے نظام کا مرکز، یعنی کعبہ ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ تم وہاں پہنچنے سے روک دیئے جاؤ، تو تم سے جو کچھ آسانی سے ہو سکے، تحفتہً وہاں بھیج دو (تاکہ وہ ان لوگوں کے کام آئے جو اس مقصد کے لئے وہاں جمع ہوئے ہیں)۔ جب تک یہ تحائف اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں، تم بھی (اُن لوگوں کے ساتھ قلبی ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے) حجامت نہ بنواؤ۔ جب وہ وہاں پہنچ جائیں تو پھر تم (اُن لوگوں کی مطابقت کرتے ہوئے) اپنے سر کے بال منڈواؤ۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی مریض ہو، یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، تو وہ اس کے بدلے میں روزے رکھ لے یا کوئی عطیہ دیدے یا کوئی اور عملِ خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔ پھر جب تم حالتِ امن میں ہو، (اور ان اجتماعات میں خود شریک ہو سکو)، تو تم میں سے جو شخص حج اور عمرہ دونوں سے

مستفید ہونا چاہیے، لو جو تحفہ میسر آئے ساتھ لے جائے۔ جسے کوئی تحفہ نہ مل سکے تو وہ، حج کے دوران میں تین دن کے اور واپسی پر سات دن کے، روزے رکھ لے، اور یوں دس دن کے روزے پورے کر لے۔ یہ اس کے لئے ہے جس کے اہل و عیال اس کے ساتھ کعبہ میں موجود نہ ہوں۔

یاد رکھو! ان اجتماعات سے اصل مقصد تو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا ہے، لیکن اِن تقریبات پر بعض رسوم بطور ملّی شعائر اختیار کر لی جاتی ہیں۔ ان سے مقصود، باہمی یک رنگی اور ہم آہنگی ہوتا ہے جس کا مظاہرہ محسوس شکلوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ سو تم اپنی نگاہ اصل مقصود پر رکھو۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی نگہداشت پر۔ اگر ایسا نہ کرو گے (اور محض رسومات ہی کو اصل مقصود سمجھنے لگ جاؤ گے) تو اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوگا۔

اس سے پہلے (۲/۱۸۹ میں) بتایا جا چکا ہے کہ تقویم (کیلنڈر) کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس سے اجتماعِ حج کی تاریخوں کا تعین ہو سکے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حج کا اجتماع تو ذی الحجہ کے مہینے میں مقرر ہوا تھا لیکن اس سے ایک ماہ قبل اور ایک ماہ بعد بھی حرمات کے مہینے مقرر کر دیئے گئے تھے تاکہ لوگ امن و عافیت سے آنے جانے کا سفر کر سکیں۔ اور نسیٓء کی رسمِ قدیم کو ختم کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ ان مہینوں میں تغیر و تبدل نہ کیا جا سکے۔ اسی لئے اگلی آیت میں کہا:

۲/۱۹۷ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲/۱۹۷﴾

حج کے اجتماعات کے مہینے معلوم و متعین ہونے چاہئیں۔ پھر جو شخص اس فریضہ کو اپنے ذمے لے، تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اِس کی تمام شرائط پوری کرے۔ از آں جملہ، یہ بھی کہ اس اجتماع میں کوئی بات پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی نہیں ہونی چاہیے ـــــ نہ فحش کلامی یا دیگر جنسی میلانات کی باتیں۔ نہ درشت کلامی یا کوئی اور معیوب حرکت۔ نہ باہمی مشاورت میں، دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے یونہی باتیں بڑھاتے جانا اور مناظرانہ جنگ و جدل پر اُتر آنا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہونی چاہیے۔ مختصراً یوں سمجھو کہ یہ اجتماعات نوعِ انسان کی منفعت بخشیوں کی تجاویز سوچنے کے لئے ہیں (۲۲/۲۸)۔ سو ان میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو تمہیں اِس مقصد سے دور لے جائے۔ یاد رکھو! تمہارا ہر عمل خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہ میں ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اِس سفر کے لئے تمہارے پاس زادِ راہ بھی ہو۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں

بھیک مانگنے کی ذلت سے محفوظ رہو گے۔

نیز ان اجتماعات میں شریک انہی کو ہونا چاہیئے جو عقل و بصیرت کی رُو سے سوچ سکیں کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کس طرح کی جاسکتی ہے' (اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی صورتیں کیا ہیں)۔

یہ مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک نکتہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (۲/۱۹۷) یہاں تقوٰے کے لئے صاحب عقل و بصیرت ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عقلِ جہاں بیں

عربی لغت میں' اَللُّبُّ۔ ایسی تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کی جمع الباب ہے۔ لہٰذا' اولی الالباب ان صاحبانِ عقل و بصیرت کو کہیں گے جو جذبات سے الگ ہٹ کر' معاملات پر عقلِ خالص کی رُو سے غور و فکر کریں۔ علامہ اقبالؒ نے عقل کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں۔ عقلِ خود بیں وہ جو انسان کو صرف اس کے ذاتی اور انفرادی مفاد کے حصول کی تدابیر بتاتی ہے' اور عقلِ جہاں بیں وہ جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ پر آمادہ کرتی ہے۔ جب انسانی عقل' قرآنِ کریم کی روشنی میں روبعمل ہو تو وہ عقلِ جہاں بیں بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم مومنین کو اولی الالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ مثلاً سورۃ الطلاق میں ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۛ۟ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا ۔ (۶۵/۱۰) "اے اربابِ عقل و بصیرت! یعنی وہ گروہ جو ایمان لائے ہو' قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس مقصد کے لئے خدا نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ ہدایت بھیجا ہے۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' ایمان کے لئے عقل و بصیرت کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی عقل کی جو وحیٔ خداوندی کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرے۔ انسانی عقل اور وحی کی روشنی کی مثال' انسان کی آنکھ اور سورج کی سی ہے۔ سورج کی روشنی نوع عالمگیر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو بینا ہو اور اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ دوسری طرف' انسانی آنکھ روشنی کے بغیر بے کار ہے۔ وہ کبھی صحیح راستہ متعین نہیں کرسکتی۔ [اس ضمن میں جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے۔ دیکھئے صہ۵۵ آیت (۱/۱)؛ صہ۱۱۵۔ آیت (۲/۲)؛ صہ۲۵۸-۲۶۱۔ آیت (۲/۱۷)]

(۰)

تقریب حج کے سلسلہ میں ضروری ہدایات دیتے ہوئے۔ درمیان میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرادی جب کہا کہ

۲/۱۹۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ..... (۲/۱۹۸)

اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ یہ اجتماعات کوئی "یاترا" کی قسم کی چیز نہیں کہ وہاں دنیاوی معاملات کی کوئی بات نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ان اجتماعات میں، ملت کے لئے سامانِ نشو ونما اور معاشی وسائل کے طلب واخذ کے لئے جد وجہد کرو۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان اجتماعات کا مقصد محض اعتقاداً اور رسماً ایک فریضہ ادا کرنا، یا "گناہ بخشوانا" نہیں۔ یہ تو (اقبالؒ کے الفاظ میں) از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولنے کا نظام ہے۔ اس لئے اس اجتماع میں اپنے اقتصادی اور معاشی مسائل کو بھی پیشِ نظر رکھو۔ (مثلاً) اپنی مصنوعات کی نمائش لگاؤ۔ دوسری قوموں کے نمائندوں کے ساتھ معاشی اور تجارتی معاہدات کرو۔ چنانچہ (۲۲/۳۳) میں کہا گیا ہے کہ جو زائد از ضرورت جانور اپنے ساتھ لاؤ، ان سے سفر میں بھی فائدے اٹھاؤ۔ یعنی ان پر مالِ تجارت اور مصنوعات وغیرہ لاد کر لاؤ۔ (اس اہم نکتہ کو دوہی آیات آگے چل کر (۲/۲۰۰) میں نہایت حسن وخوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے لئے آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں)۔

آیت (۲/۱۹۸) کا باقی حصہ یہ ہے:-

۲/۱۹۸ فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ۔ (۲/۱۹۸)

جب تم ان مسائل کے طے کر لینے کے بعد عرفات کے میدان سے واپس آجاؤ تو مشعر الحرام کے قریب آکر پھر جمع ہو اور جو ہدایات تمہیں وہاں دی گئی ہیں، عقل وشعور کی روشنی میں ان پر غور وفکر کرو۔ تم اس سے پہلے خیال کرتے تھے کہ حج محض ایک یاترا ہے۔ یہ تمہاری غلط نگہی تھی۔ یہ نظامِ خداوندی کا اہم گوشہ ہے جس کا بنیادی تعلق تمہاری تمدنی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے۔

حج کی پوری غرض وغایت اس آیت کے اندر مرکوز ہے، باقی تمام رسوم ومناسک اس کے لوازمات ہیں۔ اس میں عرفات اور مشعر الحرام کی اصطلاحات انتہائی غور وفکر کی متقاضی ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے بات ذرا پیچھے سے شروع کی جائے گی۔

رمضان کے مہینے میں، اسلامی نظام کے قیام واستحکام کے لئے تربیتی کورس کا اہتمام ہوا۔ اس میں سپاہیانہ زندگی کے خوگر ہونے کے علاوہ، خصوصی نشستوں میں (جنہیں اعتکاف فی المساجد کہا گیا ہے (۲/۱۸۷)) اپنے اپنے مقامی

مسائل پر غور و فکر کیا گیا۔ جشنِ نزولِ قرآن (عید الفطر) کے اجتماع میں ان نمائندگان کو چنا گیا جو ملت کے آئندہ اجتماعِ عظیم (حج) میں شرکت کریں گے۔ یہ نمائندگان (اور ان کے علاوہ اپنے طور پر مبصرین) عازمِ حج ہوئے۔ ابتدائی کاروائی کے بعد، کانفرنس کا اصلی سیشن ایک وسیع و عریض میدان میں ہونا طے پایا۔ وہاں سب سے پہلے مختلف ممالک (کرۂ ارض) کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے نمائندگان کا باہمی تعارف ہوا۔ اسی باہمی تعارف کی نسبت سے

عرفات

اسے عرفات کا میدان کہہ کر پکارا گیا۔ (عرفات۔ عرف۔ تعارف)۔ اس تعارف کے بعد سیشن کے صدر نے، جو مرکزی مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ یا اس کا نمائندہ ہوگا، خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس میں اس نے مملکت کی سالِ گزشتہ کی کاروائی پر روشنی ڈالی اور آئندہ سال کے پروگرام کے بنیادی خط و خال کی وضاحت کی۔ اس پروگرام کو اپنے ساتھ لیکر، یہ نمائندگان "مشعر الحرام" میں جمع ہوئے۔ مشعر کے معنی ہیں وہ مقام جہاں عقل و

مشعر الحرام

شعور کی رُو سے معاملات پر بحث و تمحیص کی جائے۔ اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہوگا، اس لئے اسے حرام — یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا — یہاں یہ نمائندگان حسبِ ضرورت دو یا تین دن تک قیام کریں گے۔ اس پروگرام کی عملی جزئیات اور ان کے سلسلہ میں باہمی تعاون و تناصر کے سلسلے میں بحث و تمحیص بھی ہوگی، اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی — آج دوپہر کا کھانا، نمائندگانِ پاکستان کی طرف سے رات کا کھانا اہلِ افغانستان کی طرف سے (وقس علیٰ ذالک)۔ ان ضیافتوں کے لئے وہ جانور ذبح ہوں گے جنہیں یہ لوگ اس مقصد کے لئے ساتھ لائے تھے یا جو دوسرے لوگوں نے تحفۃً بھیجے تھے — (جانور ہی نہیں، کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی بطور ہدیہ — تحفہ)۔ اس قسم کے تفصیلی تبادلۂ خیالات کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں کی طرف واپس چلے جائیں گے اور یوں حج کے اجتماع کی تکمیل ہوجائے گی۔

مشعر الحرام (منیٰ) میں چند دنوں تک قیام رہے گا۔ فرمایا:-

۲/۲۰۳ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۔ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ (۲/۲۰۳)

اس مقام پر گنتی کے دنوں تک قیام رہنا چاہیئے۔ جن لوگوں کو واپسی کی عجلت ہو وہ دو دن کے بعد وہاں سے رخصت ہوجائیں۔ جو زیادہ دیر ٹھہر سکیں وہ واپسی میں تاخیر کر دیں۔ نہ ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات ہے نہ ویسا کرنے میں۔ مقصد تو پروگرام کی تکمیل ہے جتنے وقت میں ہوجائے۔ اس تمام دوران میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ تمہارا

ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو جس کے حصول کے لئے تم یہاں اکٹھے ہوئے ہو۔

سورۂ حج میں ہے کہ مشعر الحرام کے قیام کے دوران' یہ لوگ کھائیں پئیں بھی۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (۲۲/۲۹)

اور باہمی مشاورت سے ایسی تدابیر بھی سوچیں جن سے ان کی ملی زندگی کی کثافتیں دور ہو جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں جنہیں انہوں نے نوعِ انسان کی بہبود کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھا ہے، اور اس طرح یہ ملت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت واقتدارِ خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں شرفِ اوّلیت اور سبقت حاصل ہے۔

اس میں ایک لفظ تفث آیا ہے۔ اس کے معنی میل کچیل (کثافت) دور کرنے کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے، کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا مطلب ناخن کتروانا، بغل اور زیرِ ناف کے بال صاف کرنا، سر کے بالوں کی میل کچیل دور کرنا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حج کے سلسلہ میں اتنے دنوں تک دن رات کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اس میں

ملی کثافت کو دُور کریں

نہانے دھونے کا مفہوم بھی ہو، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مشعر الحرام میں خطبۂ عرفات میں دیئے گئے پروگرام کی جزئیات پر جو بحث و تمحیص ہو گی تو اس ضمن میں تفث کے معنی ملت کی کثافتیں دور کرنے کی تدابیر سوچنا ہوں گے۔ حج کا اجتماع ہی ملی مسائل کا حل سوچنے کے لئے ہوتا ہے۔

اس آیت (نیز ۲۲/۳۳) میں کعبہ کو بیت العتیق کہا گیا ہے۔ العتیق عربی لغت میں بڑا جامع لفظ ہے۔ جس کے معنی حریت۔ آزادی۔ شرافت۔ نجابت۔ عزت۔ حسن و جمال کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے کعبہ کے بیت العتیق ہونے

بیت العتیق

کے معنی ہوں گے اُس نظام کا مرکز جو نوعِ انسان کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہو۔ وہ نظام جو عالمگیر انسانیت کو ان خصائص کبریٰ کی ضمانت دے۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں ایسی ذی جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہ ہو۔ اس کے معنی خود قوت بھی آتے ہیں۔ چونکہ سبقت، یعنی سب سے آگے ہونا، بجائے خویش ایک اعلیٰ خصوصیت ہے، اس لئے اس کے معنی سبقت' یا قدیم ہونے کے بھی آتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کا ضامن نظامِ خداوندی ہے۔

بیت المعمور

کعبہ کو بیت المعمور بھی کہا گیا ہے (۵۲/۴)۔ یعنی خدا کا آباد گھر۔ یا برکات و سعادات سے معمور گھر۔ بیت الحرام بھی (۵/۲)۔ یعنی واجب الاحترام گھر — اسی کو متعدد مقامات پر مسجد الحرام کہہ

بھی پکارا گیا ہے۔ (مثلاً ۲/۱۴۹۔ و دیگر مقامات)۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیتی (میرا گھر) کہا ہے۔ اسی نسبت سے اس نے اپنے آپ کو رب البیت کہا ہے (۱۰۶/۳)۔ یعنی اس گھر کا مالک۔ (کعبہ کے متعلق دیگر تصریحات پہلے گزر چکی ہیں)۔

(۰)

شعائر اللہ

حج کے ضمن میں، بعض چیزوں کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شعائر کی معنوی بحث جلد اول صفحہ ۱۲۲ زیر آیت (۲/۱۵۸) میں گزر چکی ہے۔ اور صفا اور مروہ کے شعائر اللہ ہونے کا ذکر اسی جلد میں آیت (۲/۱۵۸) کے تحت آچکا ہے۔ اس کے علاوہ، سورۃ مائدہ میں ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ ...... (۵/۲)

اے جماعتِ مومنین! جن چیزوں کو اس نظام کی محسوس علامات قرار دیا جائے، ان کی بے حرمتی مت کرو۔ اس لئے کہ ان کی بے حرمتی اس امر کی دلیل ہوگی کہ تمہارے دل میں نظامِ خداوندی کا احترام نہیں۔ نیز جن مہینوں میں جنگ کا سلسلہ ملتوی کیا جاتا ہے، ان کی بھی بے حرمتی مت کرو۔ ان کا احترام ملحوظ رکھو۔ جو جانور یا تحائف حج کی تقریب کے سلسلہ میں بھیجے جائیں، وہ بھی شعائر.... میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ یا جو لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جائیں تاکہ وہاں ملت کے معاشی مفاد اور زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کریں، ان کا بھی احترام کرو۔

بیت الحرام، شہر الحرام اور ان تحفوں اور جانوروں کے احترام کا ذکر (۵/۹۷) میں بھی آیا ہے۔ ان جانوروں کے شعائر اللہ ہونے کے متعلق (۲۲/۳۶) میں بھی کہا گیا ہے۔ آیت (۲۲/۳۲) میں کہا گیا ہے کہ جو شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ) کا جذبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ شعائر اللہ اپنی ذات میں مقدس یا محترم نہیں ہوتے۔ ان کا احترام اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں قوانینِ خداوندی کے احترام کا جذبہ موجزن ہے۔ ان شعائر کی تعظیم اسی جذبہ کا مظہر ہوتی ہے۔ (۲۲/۳۲)

(۰)

احرام

حج کے اجتماع میں احرام باندھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ البتہ سورہ مائدہ میں ہے کہ شکار کرنے کی ممانعت ہے وَاَنْتُمْ حُرُمٌ۔ (۵/۹۵) جب تک تم حالتِ احرام میں ہو۔ یعنی اس اجتماع

میں شریک ہو۔ ضمناً حالتِ احرام میں شکار کرنے پر یہ پابندی خشکی کے جانوروں تک محدود ہے (۵/۹۶)۔ اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں خشکی کے جانور کا شکار بالارادہ کرے تو اسے اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا جس کی تفصیل (۵/۹۵) میں دی گئی ہے۔

(۰)

حج کی تقریبات ختم ہو جانے کے بعد کہا کہ

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۔ (۲/۱۹۹) ۲/۱۹۹

ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد، تم عام لوگوں کی طرح اپنے اپنے ہاں واپس آجاؤ (یہ نہ سمجھ لو کہ تم ان سے الگ کچھ اور بن گئے ہو) اور جو پروگرام وہاں طے ہوا ہے اُس کے مطابق، اپنی حفاظت کے سامان کی طلب و جستجو میں سرگرمِ عمل رہو۔ یقیناً اس طرح اللہ کا قانون تمہاری حفاظت کا سامان بھی کرے گا اور پوری پوری نشوونما کا بھی۔

(۰)

قربانی

حج کے احکام تو مکمل ہو گئے لیکن ابھی ایک ایسی چیز کا تذکرہ باقی ہے جسے اس ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جس کے متعلق قرآنی احکام معلوم کرنے کے آپ بھی منتظر ہوں گے۔ یعنی قربانی۔

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے کچھ نذرانہ پیش کرنے کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ چنانچہ اس نے سورہ مائدہ میں تمثیلاً ایک قصہ یوں بیان کیا ہے۔

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَـقِّ ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقۡتُلَـنَّكَ‌ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ ۔ (۵/۲۷)

اے رسول! ان سے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک بیان کرو (قصہ تو یہ تورات میں بھی مذکور ہے لیکن اس میں بہت سی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اس لئے اسے ٹھیک ٹھیک بیان کیا جاتا ہے)۔ ان دونوں بھائیوں نے (اپنے خیال اور عقیدہ کے مطابق) خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے (ان کے عقیدہ کے مطابق) ایک کی "قربانی" قبول ہو گئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس پر اسے غصہ آگیا اور وہ اپنے

بھائی سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا کہ اللہ متقیوں کی پیش کش قبول کیا کرتا ہے۔

اس میں لفظ قُرْبَانًا آیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے مراد کسی جانور کا ذبح کرنا ہو۔ اس کا ترجمہ "پیش کش" زیادہ موزوں ہوگا۔ جس طرح بتوں کے استھانوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، اسی قسم کی کوئی یہ چیز بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال قُرْبَانًا کا لفظ یہاں آیا ہے۔

یہودیوں کے ہاں البتہ "سوختنی قربانی" کا رواج تھا۔ معتقدین اپنی اپنی پیش کش ہیکل میں لاتے تھے۔ یہ مختلف قسموں کے پکوان بھی ہوتے تھے۔ پھل پھلواڑی اور سبزی ترکاری بھی۔ اور بعض اوقات ذبیحہ کے لئے جانور بھی۔ انہیں نذر یا قربانی کہا جاتا تھا۔ کاہن اس میں سے کچھ حصہ آگ میں جلاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس کی خوشبو سے خدا خوش ہوتا ہے۔ (دیکھئے عہدنامہ عتیق۔ کتاب احبار۔ باب ۲-۳)۔ اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں تھا۔ یہودیوں کا اسلام کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر یہ وہی دین ہے جسے حضرت موسےٰ نے پیش کیا تھا تو اس میں سوختنی قربانیوں کا حکم کیوں نہیں؟ سورۂ آلِ عمران میں ہے، اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ . . . . (۳/۱۸۲)۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم اس رسول پر ایمان نہ لاؤ جب تک یہ ایسی قربانی (کا حکم) نہ لاتے جسے آگ کھا جائے۔" قرآنِ کریم میں قُرْبَانًا کا لفظ انہی دو مقامات پر آیا ہے۔ مسلمانوں کے سلسلہ میں قربانی کا لفظ کہیں نہیں آیا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ کعبہ وادئ حجاز میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (وادی غیر ذی زرع۔ ۱۴/۳۷)۔ اسی مقام پر ہزاروں، لاکھوں افراد پر مشتمل حج کا اجتماع ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ، جنہیں خود بھی کھانے کو بمشکل ملتا تھا، اتنے کثیر اجتماع کے خورد و نوش کا انتظام کیا کر سکتے تھے؟ اس کے لئے، ان آنے والوں کو اپنا انتظام آپ ہی کرنا تھا۔ اُس زمانے میں کھانے پینے کا بہترین اور ممکن العمل انتظام یہی ہوسکتا تھا کہ یہ لوگ فالتو جانور (یعنی اپنی سواریوں سے زائد جانور) ساتھ لائیں۔ انہیں عندالضرورت یہاں ذبح کریں۔ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ قرآنِ کریم میں تقریبِ حج جانور ذبح کرنے کا یہی مقصد بتایا گیا ہے۔ ان فالتو جانوروں کو ساتھ لانے کے سلسلہ میں کہا:-

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (۲۲/۳۳)۔

ان جانوروں کے متعلق یہ تصور نہ کر لینا کہ یہ (ان سانڈوں کی طرح ہیں جنہیں یہ لوگ اپنے بتوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں) مقدس بن گئے ہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ عام جانوروں کی طرح ہیں جن سے تم دورانِ سفر، سواری یا باربرداری کے سلسلہ میں مختلف کام لیتے ہو۔ ان سے بھی اسی قسم کے کام لو تا آنکہ یہ تمہاری منزلِ مقصود، کعبہ تک پہنچ جائیں۔

اس کے بعد،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۔ (۲۲/۲۸)

انہیں، حج کے دنوں میں، اللہ کا نام لے کر ذبح کرو۔ ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور اگر وہاں کوئی مصیبت زدہ محتاج ہو، تو اسے بھی کھلاؤ۔

ذرا آگے چل کر کہا :۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۔ (۲۲/۳۶)

وہ اونٹ (جنہیں تم ساتھ لاتے ہو) شعائر اللہ میں تو شامل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح یہ تمہارے لئے مقدس بن جاتے ہیں۔ یہ تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ انہیں اللہ کا نام لے کر قطار در قطار ذبح کرو اور جب وہ ذبح ہو کر کسی پہلو پر گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور دوسرے مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلاؤ ہم نے ان مویشیوں کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے تاکہ تم (کھانے پینے کی طرف سے بے فکر ہو کر، اپنے بلند مقصد کے حصول کے لئے) ایسی کوشش کر سکو جو بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

ان اونٹوں اور دیگر مویشیوں کو شعائر اللہ (واجب الاحترام) اس لئے قرار دیا گیا کہ اُس زمانے میں مویشیوں کی لوٹ مار عام تھی۔ (غنیمت کے لفظ کا مادہ ہی غنم ہے جس کے معنی بھیڑ بکریاں ہیں)۔ حجاج کے ان قافلوں میں یہ مویشی کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ انہیں لوٹ مار کرنے والوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ شعائر اللہ ہیں، کوئی ان کی طرف نگہ بد سے نہ دیکھے۔ انہیں بخیر و عافیت ان کی منزل گاہ — کعبہ — تک پہنچنے دیں۔ اسی لئے ان کے گلے میں نشان کے طور پر پٹہ (قلادہ) بھی ڈال دیتے تھے کہ یہ پہچانے جا سکیں۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) جو لوگ خود حج کے لئے نہیں جاتے تھے وہ اپنی طرف سے کچھ تحائف حاجیوں کے ساتھ کر دیتے تھے۔ ان تحائف میں جانور بھی ہوتے تھے، اور کھانے پینے کی بعض دوسری اشیاء بھی۔ انہیں ھدیۃ (تحفہ) کہا جاتا تھا۔ ان ھدایا کو بھی کعبہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ یعنی یہ وہیں پر کام آنے کے لئے ہوتے تھے۔ آیات (۱۹۶/۲) اور (۹۵/۵ ؛ ۹۷/۵) میں بھی انہی ھدایا اور قلائد کا ذکر ہے۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی کہ حج کے لئے جانے والوں کا کوئی قافلہ کعبہ تک نہ پہنچ سکے، تو ان ھدایا کو وہاں

بھیج دیا جائے (۲۲/۴۵)۔ کیونکہ یہ حجاج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا مقصد خورد ونوش کی ضروریات پورا کرنا ہے۔ چونکہ "قربانیوں" کے متعلق زمانۂ قدیم سے یہ خیال ذہنوں میں راسخ چلا آرہا تھا کہ ان کا خون، گوشت پوست معبودوں تک پہنچتا ہے۔ اس لئے، اس خیال سے کہ مسلمانوں کے تحت الشعور میں بھی اسی قسم کا کوئی عقیدہ کروٹیں نہ لے رہا ہو، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :-

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۔ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۔ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۲۲/۳۷)

(اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لئے ہیں۔ یہی ان کے اس موقعہ پر ذبح کرنے سے مقصود ہے)۔ اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اُس کے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے، کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو۔ اس نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم (اپنی طبیعی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو کر) خدا کے اس ضابطۂ قوانین کو، جس سے اس نے تمہاری راہنمائی کی ہے، دنیا کے تمام قوانین وضوابط پر غالب کر سکو (۲/۱۸۵)۔ جو لوگ اس طرح، قوانینِ خداوندی کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں گے، ان کے لئے نہایت خوشگوار نتائج کی بشارتیں ہیں۔

حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے کا ذکر انہی آیات میں آیا ہے۔ اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ جس طرح آج کل حج کے موقعہ پر لاکھوں کی تعداد میں جانور ذبح کر کے پھینکتے چلے جاتے ہیں اور اسے حکمِ خداوندی کی تعمیل تصور کیا جاتا ہے، یا عیدالاضحیٰ کی تقریب پر جس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ مروجہ مذہب میں ان قربانیوں کی سند میں کچھ روایات پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ میرے پیشِ نظر صرف قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے اس لئے ان روایات کے متعلق بحث کرنا میرے مقصد سے خارج ہے۔ ویسے بھی روایات کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنِ کریم ہے۔ ان قربانیوں کی تائید میں البتہ قرآن مجید کی دو آیات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان میں پہلی آیت، سورۃ الانعام کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۶/۱۶۳)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ

ان سے کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

اس میں لفظ نسك کے معنی قربانی کئے جاتے ہیں۔ لغت میں اس مادہ (ن۔ س۔ ك) کے معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔

نُسُك

نَسَكَ الثَّوْبَ۔ اس نے کپڑے کو دھوکر پاک اور صاف کرلیا۔ اَرْضٌ نَاسِكَةٌ۔ سرسبز و شاداب زمین جس پر حال ہی میں بارش ہوئی ہو۔ ان بنیادی معانی کی رُو سے اس سے مفہوم کسی معاملہ کی درست اور ٹھیک کرلینا ہوتا ہے۔ نَسَكَ السَّبِخَةَ کے معنی ہیں اس نے زمینِ شور کو درست کیا۔ اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا۔ نَسَكَ اِلٰى طَرِيْقَةٍ جَمِيْلَةٍ اس نے اچھا طریقہ اختیار کرلیا اور پھر اس پر مداومت کی۔ راستہ اختیار کرلینے کی جہت سے کلامِ عرب میں مَنْسَكٌ۔ ہر اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر آمدورفت جاری ہو۔ یہیں سے اس کے معنی روش اور رسم کے ہوگئے۔ اور امور و مراسمِ حج کو بھی مناسکِ حج کہنے لگے۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کے معنی "عبادات" کرتے ہیں۔ اور (مولانا) ابوالکلام آزاد "عبادت کے سچے طور طریقے"، "خالص اور سچے طور طریقے" اس کا صحیح مفہوم ہے۔ ان معانی کی رُو سے آیۂ زیرِ نظر کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی :-

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرے تمام فرائضِ زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریق، مختصراً میری ساری زندگی حتیٰ کہ میری موت بھی خدا کے تجویز کردہ پروگرام کے لئے وقف ہے۔

مروجہ قربانی کی تائید میں سورۃ الکوثر کی آیت ـــ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ـــ بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کا

وَانْحَرْ

ترجمہ کیا جاتا ہے ـــ "نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر"۔ "قربانی کر" ترجمہ کیا جاتا ہے وَانْحَرْ کا۔

لُغت کی رو سے نَحْر سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے۔ صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وَانْحَرْ کے متعدد معانی لکھے ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا ہوکر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔ (۲) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا۔ (۳) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا۔ (۴) نماز میں نَحْر تک ہاتھ اٹھانا۔ (۵) اپنے سینے کو قبلہ رُخ کرکے کھڑے ہونا۔ (۶) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔

اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے کھڑے، اس کے نَحْر (سینے کے اوپر کے حصے) کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ مارتے ہیں۔ اس سے نَحَرَ الْبَعِيْرَ۔ کے معنی آتے ہیں' اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا۔

لیکن لغت میں اَلنَّحْرُ و اَلنِّحْرِيْرُ کے معنی ہیں ماہر، عقل مند، تجربہ کار، ہر بات کو سمجھ کر سوچ کر اختیار کرنے والا، اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَرْتُ الشَّيْءَ عِلْمًا۔ میں علم کی رُو سے اس معاملہ

پر حاوی ہو گیا۔

ان معانی کی رُو سے، سورۃ الکوثر کا مفہوم یہ ہو گا کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ- اے رسول! ہم نے تجھے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جو سرچشمہ ہے دنیا بھر کی برکات و سعادات کا۔ اس میں حکمت اور بھلائی کی لامنتاہی باتیں ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اس خیر کثیر میں کبھی کمی واقع نہیں ہو گی۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ- اب تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اپنے ربّ کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن ادا کرے۔ جملہ معاملات پر علم و عقل اور تجربہ و مشاہدہ سے پوری طرح حاوی ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنی جماعت کے لوگوں کے کھانے پینے کا بھی انتظام کرے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ- (۳:۱۰۸) اس وقت تو حالت یہ ہے کہ تیری جماعت کمزور سی ہے اور مخالفین بڑی قوت اور کثرت کے مالک ہیں لیکن آخر الامر تو دیکھے گا کہ جو لوگ تیرے نظام کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور یہی نظام جو نوعِ انسان کے لئے خیرِ کثیر کا سرچشمہ ہے، آگے چلے گا۔

یہ ہے ہماری بصیرت کی رُو سے اس سورۃ میں وَانْحَرْ کا مفہوم۔ اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا بعید از کار سی بات ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں وانحر سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔ قرآنِ کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں "اونٹ ذبح کرو" یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں "کوشر" حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ اَلْكَوْثَرَ (۱:۱۰۸) اسی سے معرب ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱:۱۰۸) کے معنی ہوں گے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا"۔ لیکن ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی]۔

اور اگر وانحر سے مراد بالضرور "قربانی" لینا ہے تو قرآنِ کریم کی رُو سے اِن شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہو گا۔

ایک تو یہ کہ نحر صرف اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، کسی اور جانور کے ذبح کرنے کو نہیں۔ اس لئے "قربانی" صرف اونٹوں کی دی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ آیات میں بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام کعبہ قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ "قربانی" صرف حج کے مقام پر کی جائے گی اور تیسرے یہ کہ قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ لہٰذا صرف اتنے اونٹ ذبح کئے جائیں گے جن کا گوشت کھانے کے کام آسکے۔ بنا بریں جس طرح آجکل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور تمام دنیا میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔

(۰)

سنّتِ ابراہیمی

قربانی کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنّتِ ابراہیمیؑ کا اتباع ہے اور "ذبحِ عظیم" کے واقعہ سے اس کی سند لائی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ یوں مذکور ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں کبرسنی میں ایک لڑکا (حضرت اسمٰعیلؑ) پیدا ہوا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ۔ (۳۷/۱۰۲)۔ جب وہ بیٹا باپ کے ساتھ کام کاج (بھاگنے دوڑنے) کے قابل ہوا تو آپ نے، اپنے ایک خواب کی رُو سے سمجھا کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ اس بیٹے کو (اللہ کی راہ میں) قربان کر دیا جائے۔ آپ نے بیٹے سے کہا کہ

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ ۔ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ (۳۷/۱۰۲)

اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے۔

بیٹے نے جواب میں عرض کیا:-

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۔ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۳۷/۱۰۲)

ابا جان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے، آپ (اسے اگر حکمِ خداوندی سمجھتے ہیں تو) بلا تامل کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا، چھری ہاتھ میں لی — فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۔ (۳۷/۱۰۳) تو نَادَيْنٰهُ ہم نے اسے آواز دی اور کہا۔ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اے ابراہیمؑ! (۳۷/۱۰۴)

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۔ (۳۷/۱۰۵-۱۰۶)

تو نے اپنے خواب کو حقیقت سمجھ کر اپنے بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے لئے لٹا دیا۔ (یہ ہمارا حکم نہیں تھا۔ یونہی تمہارا خواب تھا) اس لئے ہم نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اس نقصان سے بچا لیا) اس لئے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں ہم انہیں اس قسم کے نقصانات سے بچا لیا کرتے ہیں۔

یہ خدا کی طرف سے ایک واضح انعام تھا جو ابراہیمؑ پر کیا گیا۔

باقی رہا وہ بیٹا جو پیکرِ تسلیم و رضا تھا۔

ذبحِ عظیم

وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ (۳۷/۱۰۷)

ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچا لیا۔

اس طرح جان دے دینے کی قربانی تو ایک ثانیہ سے ختم ہو جاتی تھی۔ ہم نے اس سے ایک بہت بڑی قربانی لی۔ وہ قربانی یہ تھی کہ ملک شام کی سرداری کے بجائے ہم اپنے اس گھر کی پاسبانی کی خدمت اس کے سپرد کرنے والے تھے جو عرب کی بے برگ و گیاہ وادی میں واقع تھا اور جسے قیامت تک دنیا بھر کے توحید پرستوں کا مرکز بننا تھا۔ (۱۴/۳۷)

پھر جو قربانی (حضرت) ابراہیمؑ دینا چاہتا تھا وہ اس کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ تک محدود رہتی۔ لیکن جس قربانی کے لئے ہم نے اسے زندہ رکھا اس کا سلسلہ اس کی نسل میں بھی جاری رہنا تھا جسے (حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد) اس گھر کا پاسبان بننا تھا۔ وَ تَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۳۷/۱۰۸) ذریتِ حضرت اسحٰقؑ اور اولادِ حضرت اسمٰعیلؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اول الذکر کے مقابلہ میں حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کی یہ قربانی کس قدر عظیم تھی۔

قرآنِ مجید میں تو یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے لیکن تورات میں ہے کہ

ابرہام نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔ اس وقت خدا کے فرشتے نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام! اے ابرہام! وہ بولا میں حاضر ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر مت بڑھا اور اسے کچھ مت کر کہ اب میں نے جانا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے۔ ہاں! اپنے اکلوتے کو مجھ سے دریغ نہ کیا۔ تب ابرہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے لئے چڑھایا۔

(کتاب پیدائش۔ ۲۲/۱۰-۱۳)

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو قربانیاں حج اور عید الاضحیٰ کی تقریب پر دی جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے انہیں کس طرح سنّتِ ابراہیمیؑ کا اتباع کہا جا سکتا ہے؟

حج کے سلسلہ میں حجرِ اسود کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اکثر واعظ کہا کرتے ہیں کہ اس مقدس پتھر کو حضرت حوّا اپنے ساتھ جنت سے لائی تھیں۔ یہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) محض "زیبِ داستان" ہے بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک (دوسرے رنگ کا) پتھر دیوارِ کعبہ کے ایک کونے میں اس لئے لگا دیا تھا کہ اس سے طواف کے وقت، چکّروں کے شمار میں آسانی رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہے کہ سامی اقوام میں رواج تھا کہ جب کسی معاہدہ کو محکم طور پر استوار کرنا ہوتا تو فریقین ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ حج کی تقریب پر، حاجی خدا سے اپنا عہد استوار کرنے کے لئے قدیمی رواج کے مطابق، اپنا ہاتھ اس پتھر پر مار کر اطمینان کر لیتے کہ ہم نے خدا سے اپنا عہد استوار کر لیا ہے۔ یہ ہر دو توجیہات قرینِ قیاس ہیں۔ ایک تحقیق یہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ایک عرب تاجر، بسلسلۂ تجارت فلسطین گیا اور وہاں، حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب قبر سے ایک پتھر تبرکاً اٹھا لایا اور اسے دیوارِ کعبہ میں نصب کر دیا۔ پہلے تو اس کی صرف تعظیم ہوتی رہی اور پھر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ پتھر کی پرستش شروع ہوئی تھی کہ مختلف قبائل نے اپنے اپنے بت کعبہ اور اس کے حطیم میں نصب کر دیئے۔ اور یوں خدا کا گھر بُت کدہ بن گیا۔

حجرِ اسود

ان میں سے کوئی توجیہہ بھی صحیح ہو، قرآنِ کریم میں بہرحال حجرِ اسود کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی اس نے اسے شعائر اللہ میں شمار کیا ہے۔

تین شیطانوں کو پتھر مارنا

اور سب سے آخر میں وہ رسم جس کے بغیر کہا جاتا ہے کہ فریضۂ حج کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یعنی رمی الجمار" یعنی تین شیطانوں کو پتھر مارنا"۔ جو لوگ حج کے لئے نہیں جاتے تھے، وہ پہلے تو اس "فریضہ کی ادائیگی" کی بابت سنا ہی کرتے تھے لیکن اب ٹی۔ وی (ٹیلی وژن) کی بدولت اسے ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے اور . . . . .

اس رسم کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں کہیں نہیں۔ واعظوں کی زبانی یہ روایت سنائی دیتی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے کر چلے تو راستے میں شیطان نے انہیں ورغلانا چاہا۔ وہ اس مقصد کے لئے قریب آتا تھا، اور حضرت ابراہیمؑ اسے پتھر مار کر بھگا دیتے تھے۔ سات مرتبہ ایسا ہوا تا آنکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس سنّتِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں ہر حاجی، ان شیاطین کو (جو پتھروں کی شکل میں وہاں نصب ہیں) سات سات کنکریاں مارتے ہیں ـــ اس روایت کا وضعی ہونا بدیہی ہے۔

قرآنِ کریم میں سورۃ الفیل دیکھئے۔ یمن کے عیسائی گورنر، ابرہہ، نے ارادہ کیا کہ کعبہ کو مسمار کر دیا جائے۔ اس مقصد

کے لئے وہ ایک لشکرِ جرار لے کر جس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے [جن کی نسبت سے اس لشکر کو اصحاب الفیل کہہ کر پکارا گیا ہے (۱:۱۰۵)] جانب مکہ روانہ ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ یمن سے مکہ کا کھلا راستہ (امام مبین) اختیار کرتا، اس نے خفیہ راستہ اختیار کیا جو پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے مکہ تک پہنچ جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ مکہ کے تین غداروں نے اسے اس راستہ کا پتہ نشان بتایا تھا۔ اس نے یہ خفیہ تدبیر تو اختیار کر لی لیکن فطرت کے غمازوں نے اس کی پردہ دری کر دی۔ چیلوں اور کرگسوں (گدھوں) کے جھنڈ، فضائے آسماوی میں اس لشکر کے اوپر اڑتے چلے آتے۔ اس قسم کے جانوروں کی فطری ذکاوت انہیں بتا دیتی ہے کہ آگے چل کر میدانِ جنگ میں انہیں بافراط سامانِ خورا ک میسر آئے گا۔ اس لئے وہ لشکروں کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں۔ اہلِ مکہ نے ان پرندوں کے ہجوم سے بھانپ لیا کہ پہاڑیوں کے پیچھے کوئی جمعیت آ رہی ہے۔ وہ پہاڑیوں کے اوپر چڑھ گئے اور وہاں سے اس لشکر پر اس شدت سے پتھراؤ کیا کہ لشکر اور اس کے ہاتھیوں کا بھرکس نکل گیا۔ یہ واقعہ نبی اکرمؐ کے سنِ پیدائش کا ہے (یعنی نبوت سے چالیس سال پہلے کا)۔ عربوں کی تاریخ میں یہ واقعہ ایسی اہمیت کا حامل تھا کہ انہوں نے اس کی یادگار قائم کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے لئے انہوں نے کیا یہ کہ ان پہاڑیوں کے دامن میں جہاں سے انہوں نے پتھراؤ کیا تھا، مناسب مقامات پر نشانات نصب کر دیئے۔ حج کے موقع پر لوگ جمع ہوتے تو اس اہم قومی پتھراؤ کی یاد میں، ان نشانات کو کنکریوں کا ہدف بناتے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان نشانات سے مطلوب وہ تین غدار تھے جنھوں نے ابرہہ کو اس خفیہ راستے کا پتہ نشان بتایا تھا اور قوم نے انہیں اس سازش کی پاداش میں سنگسار کر دیا تھا۔ انہوں نے بعد میں آنے والی نسلوں کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ غداروں کا حشر کیا ہوتا ہے، ان نشانات پر پتھراؤ کی رسم جاری کی۔ علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمتہ) نے اپنے سفرنامہ حج میں لکھا ہے کہ ابرہہ کے رہبر' ابو رغال ثقفی کی قبر مکہ اور طائف کے درمیان، مقام مغمس پر واقع ہے۔ ہر عرب جو وہاں سے گزرتا ہے، اس پر رجم کرتا ہے[۱]۔ ہو سکتا ہے کہ رغال ثقفی' ان تین غداروں کا سرغنہ ہو جن کے نشانات پر حج میں رجم کیا جاتا تھا۔

ہاتھیوں والے کا لشکر

یہ توجیہ جی کو لگتی ہے اور عرب جاہلیہ کی حمیتِ قومی کی آئینہ دار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس رجم نے بعد میں موجودہ شکل اختیار کر لی ہو۔ عرب جاہلیہ کے رجم میں "کیوں" کا جواب بہرحال موجود تھا لیکن اب جو اس نے مذہبی رسم کی شکل اختیار کر رکھی ہے، اس میں "کیوں" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال' قرآنِ کریم میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

(۰)

[۱] نوادرات۔ صفحہ ۳۴۱

یہ ہیں حج سے متعلق احکام جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ جس مقصد کے لئے انہیں مقرر کیا گیا تھا، یعنی حج کی غرض و غایت کو سامنے رکھئے، اور اس کے بعد موجودہ حج کی تقریب اور اس سے متعلقہ رسوم و مناسک کو، اور پھر سوچئے کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے ارکان کیا انداز اختیار کر لیتے ہیں؟ اقبالؒ نے انہی اجتماعات کے متعلق آہِ سرد کھینچ کر کہا تھا کہ

عیدِ آزاداں، شکوہِ ملک و دیں   عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

اور اس "شکوہِ ملک و دیں" کی طرف قرآنِ کریم نے اگلی متعلقہ آیت میں اس طرح اشارہ کیا ہے۔ پہلے کہا:۔

۲/۲۰۰ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ...... (۲/۲۰۰)

حج سے واپسی کے بعد تم یہ نہ سمجھ لو کہ جو فریضہ تم پر واجب تھا وہ ادا ہو گیا۔ اب تم پر کوئی مزید ذمہ داری باقی نہیں رہی! وہاں سے واپسی پر بھی تم قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھو۔ اسی طرح جیسے تم اس سے پہلے اپنے اسلاف کے مسلک کو اپنے سامنے رکھا کرتے تھے — بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ۔

اس سے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تم اپنے نسلی امتیازات کو فخریہ بیان کیا کرتے تھے۔ اب اس کی جگہ اس کا ذکر کرو کہ تم قوانینِ خداوندی کی کس حد تک پابندی کرتے ہو کہ وجہ عزت و تکریم یہی ہے۔ (۴۹/۱۳)

تقاریب، اجتماعات، کانفرنسیں، مختلف قوموں (اور ان کی مملکتوں کی طرف سے) منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں اکثر سیکولر سٹیٹ ہوتی ہیں جن کے پیشِ نظر صرف اپنے دنیاوی مفادات ہوتے ہیں۔

۲/۲۰۰ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ (۲/۲۰۰)

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پیشِ نظر صرف دنیاوی مفاد ہوتے ہیں۔ انہیں یہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

ان کے برعکس

۲/۲۰۱ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۲/۲۰۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی طلب و آرزو یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور

اُخروی زندگی کی مسرتیں بھی اور وہ ہر قسم کی تباہیوں سے محفوظ رہیں۔

دُنیا اور آخرت کی خوشگواریاں

یہ ہیں نظامِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے جس کے استحکام کی خاطر یہ اس قسم کے اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ (۲/۲۰۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال کے مطابق دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریوں میں حصہ مل جاتا ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ وہ ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کے نتائج کی نمود اور اظہار اپنے موقع پر ہوتا ہے۔

ان ہر دو گروہوں کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۴۹-۱۵۰۔ آیت (۴/۲) ص ۲۵۳۔ آیت (۲/۱۴) اور ص ۲۷۔ آیت (۲/۶) میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

یہاں قرآنِ کریم نے ان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے جن کے اعمال (کاموں) کے نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ سیکولر نظریۂ حیات کے حامل، اور دینِ خداوندی پر ایمان رکھنے والے۔ دیگر مقامات پر اس نے ایک تیسرے گروہ کا ذکر بھی کیا ہے جن کے متعلق کہا ہے کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔ (۱۸/۱۰۵) ان کے تمام اعمال رائیگاں جاتے ہیں حتیٰ کہ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔ بے نتیجہ اعمال کے وزن کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر اس گروہ کی مختلف خصوصیات اور علامات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن جس ضمن (CONTEXT) میں ہم اس آیت کو یہاں لائے ہیں، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں خود ہمارا ہی ذکر ہے۔ آپ سوچئے کہ ایک سال کے حج کے اجتماع میں دنیا بھر کے مسلمان کس قدر صعوبات اور تکالیف برداشت کر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس پر کس قدر روپیہ اور وقت صرف ہوتا ہے، کتنی اموات بھی ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد حاصل کیا ہوتا ہے؟ نہ دنیاوی مفاد نہ دینی (نظامِ خداوندی کی) کامیابیاں: اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۔ یہ سب کیا کرایا رائیگاں جاتا ہے۔ لیکن وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۔ اس اجتماعِ عظیم میں شرکت کرنے والے اپنے جی میں سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ خوش عقیدگی ہے جو ہر سال لوگوں کو کشاں کشاں وہاں لے جاتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے قرآنی معیار ہوتا تو یہی حج ساری دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کا موجب بن جاتا اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں نصیب ہو جاتیں۔

(۰)

بات ہو رہی تھی ان دو گروہوں کی۔ ان میں سے ایک گروہ سیکولرز کا ہوتا ہے۔ یعنی وہ جو کھلے بندوں خدا۔ وحی، مستقل اقدار اور حیاتِ آخرت کا انکار کرتا ہے۔ وہ نہ خود دھوکے میں رہتا ہے، نہ دوسروں کو دھوکا دیتا ہے لیکن سیکولرازم کے حامیوں کا ایک اور گروہ ہوتا ہے جو (مسلمان کہلاتا ہے)۔ خدا۔ وحی اور آخرت پر ایمان کا مدعی ہوتا ہے۔ لیکن دل سے ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کے پیشِ نظر مقصد دنیاوی مفاد ہی ہوتا ہے۔ اس غرض سے کہ کہیں عوام بدک نہ جائیں، وہ مذہب کے ظاہر کا شدت سے پرچار کرتا رہتا اور اس سلسلہ میں اپنی "اسلامی خدمات" کا ڈھول بجاتا رہتا ہے لیکن دین کی اصل دغایت کی صداقت اس کے قلب میں قطعاً نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ گروہ جس کے متعلق فرمایا:۔

۲/۲۰۴ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ. (۲/۲۰۴)

جب یہ لوگ دنیاوی معاملات، اور امورِ مملکت کے متعلق گفتگو کریں گے تو وہ اپنی ملمع ساز باتوں سے تمہیں

ملمع ساز مسلمان

ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے۔ وہ اپنے دعاوی میں سچا ہونے کے ثبوت میں قدم قدم پر خدا کو گواہ ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ ان کے دل (نظامِ خداوندی کی طرف سے) دشمنی اور خصومت کے جذبات سے لبریز ہوں گے (کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے قیام میں ان کی فنا ہے)۔

یہ اپنے آپ کو پکے اور سچے مسلمان ظاہر کرنے والے۔ بات بات پر خدا کی قسمیں کھانے والے، ایسا کیوں کرتے ہیں؟ محض اس لئے کہ لوگ اقتدار کی چابیاں ان کے ہاتھ میں دے دیں۔ یہ لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو یہ عوام کی بہبود کے لئے یہ کریں گے۔ اسلام کی خدمت کے لئے وہ کریں گے۔ وہ اس طرح عوام کو دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے ہیں۔ اور

۲/۲۰۵ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ. وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ. (۲/۲۰۵)

جب حکومت ان کے ہاتھ آجاتی ہے تو ان کی ساری کوشش اس لئے ہوتی ہے کہ ملک کا امن و نظام درہم برہم ہو جائے۔ فصلیں تباہ ہو جائیں۔ نسلِ انسانی ہلاک ہو جائے۔ نہ معاشی نظام مستحکم رہے نہ عمرانی۔ انہیں صرف اپنے مفادات کا خیال ہوتا ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ ملک اور قوم کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ حالانکہ جس خدا کی یہ بار بار قسمیں کھاتے اور اسے گواہ بنا کر پیش کرتے تھے، انہیں علم ہے کہ وہ کبھی اسے پسند نہیں کرتا کہ ملک میں

تباہی اور ویرانی پھیل جاتے۔

فساد اور اصلاح کا قرآنی مفہوم، جلد اول ص۲۲۹۔ آیت (۲/۱۱-۱۲) میں واضح طور پر پیش کیا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے دعاوی کی تائید میں خدا کو بطور گواہ پیش کیا کرتے تھے، لوگ، ان کی فساد انگیزیوں سے تنگ آکر، اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ انہیں خدا کی یاد دلائیں۔

۲/۲۰۶ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۔ (۲/۲۰۶)

جب ان سے کہا جائے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں تو نشۂ حکومت کی بدمستیاں اور جھوٹی عزت کا خیال، اصلاح کے بجائے، انہیں اور خرابیوں کے لئے اُکساتا ہے۔ ان کا مقام تباہی اور بربادی کا جہنم ہے جہاں انسانیت ذبح ہوتی ہے ___ اُف! کتنا بُرا ہے یہ انجام۔

اس آیت میں قرآنِ کریم نے، آئین و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر، حکومت کرنے والے مستبد، سرکش، عناں تاب، اربابِ قوت کی سائیکالوجی کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کے ذہن میں قوت کے سوا کسی تدبیر کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کی اندھا دھند بدعنوانیوں سے ملک تباہ ہو رہا ہے، تو ان کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ہم سے قوت کے استعمال میں کچھ کمی رہ گئی ہے اس لئے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کی اصلاح یا ازالہ کے لئے وہ اور سختی برتتے ہیں۔ زیادہ شدت سے قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ خرابیاں اور بڑھتی جاتی ہیں، حتیٰ کہ یہ اپنی قوم کو اپنے ساتھ لے کر تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھی تباہ ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی قوم بھی۔ اسی لئے تو قرآنِ کریم، قوم کو متنبہ کر دیتا ہے کہ اگر ملک میں خرابیاں عام ہو رہی ہیں تو تم اس خیال سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھے رہو کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار ہم تھوڑے ہیں۔ جب تباہ ہوں گے تو وہی لوگ ہوں گے جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہیں۔ (قرآن نے کہا کہ) اس خود فریبی میں مبتلا مت رہو۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۔ (۸/۲۵)۔ اس تباہی سے بچنے کا اجتماعی طور پر انتظام کرو۔ کیونکہ جب وہ آتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ یہ ابتلا ساری قوم کے لئے ہوتا ہے۔

مستبد حکمران

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ ۔ (۲/۲۰۶) جلد دوم ص۲۵۶۔ آیت (۵/۳) میں بتایا جا چکا ہے کہ اِثْم کے معنی ایسے کام ہیں جو انسان میں اضمحلال پیدا کر دیں، جن سے قوتوں میں کمی واقع ہو جائے۔

اِثْم کا مفہوم جن سے افسردگی اور واماندگی پیدا ہو جاتے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ مستبد اور سرکش حکام، قوت کے غلط استعمال سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا کر دیتے ہیں تو اس سے معاشرتی ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کا ازالہ اصلاحِ احوال سے نہیں کرتے، اور زیادہ قوت کے استعمال سے کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں اور زیادہ اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ (جب ہم خمر، شراب کی ممانعت سے متعلق آیت پر آئیں گے تو وہاں اثم کا مفہوم نکھر کر سامنے آجائے گا)۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ شراب پینے سے (بظاہر) انسان کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد، خمار یہ بتاتا ہے کہ اس کی قوت کس قدر کم ہو گئی ہے۔ اسے اثم کہا جاتا ہے۔ شراب کا عادی، اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے شراب کا اور زیادہ استعمال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کا اثم (کمزوری، ضعف، اضمحلال) اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ وہ اسے ایک دن ہلاکت کے جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔ مستبد نظامِ حکومت کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کے "ازالہ" کے لئے اور زیادہ شدت سے قوت کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے مملکت میں مزید اضمحلال (اثم) پیدا ہو جاتا ہے۔ غلط کوشی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تا آنکہ وہ حکومت اور اس کے ساتھ وہ قوم، تباہی کے جہنم تک جا پہنچتی ہے۔ اس میں اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ (ہر قوت، اضمحلال بڑھاتی ہے۔

یہ تو ہے غلط بین و غلط کوش مستبد حکمران۔ ان کے برعکس:-

۲/۲۰۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ (۲/۲۰۷)

آیات (۲/۲۰۱-۲۰۲) میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک گروہ کا تفصیلی تعارف سابقہ صفحات میں کرایا جا چکا ہے۔ مذکورہ صدر آیت میں دوسرے گروہ کا ذکر آتا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ "ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو رضا جوئی باری تعالیٰ یا خدا کی خوشنودی کی خاطر بیچ دیتے ہیں۔ اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے"۔ قبل اس کے کہ ہم "مرضات" کا صحیح مفہوم پیش کریں، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے آیت (۲/۲۰۷) کے تحت بتایا تھا کہ قرآنی نظام میں مملکت کا نظریہ میثاق کا ہے۔ یعنی اس میں خدا اور انسان کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی رُو سے انسان اپنی جان اور مال "خدا کے ہاتھ" بیچ دیتا ہے، اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ آیۃ زیرِ نظر میں بھی اسی بیع و شریٰ کا ذکر ہے۔ (ضمناً لفظ شریٰ کے معنی بیچنے اور خریدنے، دونوں کے آتے ہیں۔ آیت (۹/۱۱۱) ہیں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ... تھا۔ یعنی خدا

مومنین سے خرید لیتا ہے۔ اور آیۃ زیرِ نظر میں " مَن یَّشرِی " آیا ہے۔ یعنی جو شخص اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد آیت کے مفہوم کی طرف آئیے۔ اس میں تشریح طلب لفظ مرضات ہے جس کا عمومی ترجمہ رضا جوئی یا خوشنودیِ باری تعالیٰ کیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے آپ نے "متقی پرہیزگار" لوگوں کی زبان سے اکثر اس قسم کے الفاظ سنے ہوں گے کہ "اللہ اس سے خوش ہوتا ہے" یا "عبادت سے مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے"۔ دوسری طرف ایسے الفاظ کہ "اس قسم کی باتوں سے خدا ناراض ہو جاتا ہے"۔ "اللہ کی ناراضگی سے ڈرو" وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ سے خدا کے متعلق بڑا غلط.... تصور پیدا ہوتا ہے۔ خوشی یا ناراضگی وغیرہ انسانی جذبات ہیں، اور ذاتِ خداوندی اس قسم کے جذبات سے منزہ اور ماوراء ہے۔ خدا کے صحیح تصور کے متعلق جلد اول صفحہ۱۔ آیت (۱/۲) ز صفحہ۵۴۔ آیت (۱/۲)، نیز صفحہ۸۵ آیت (۲/۵) میں مختصر الفاظ میں بات ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں جلد اول میں تقدیر کا عنوان بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ (صفحہ۱۶۳ ز صفحہ۱۸۱ ز صفحہ۲۷۲)۔ نیز جلد دوم میں نفس سے متعلق بحث بھی۔ اور جلد اول میں قانونِ مکافاتِ عمل صفحہ۱۴۶-۱۵۲ بھی۔ بایں ہمہ، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اہم نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔

مرضاتِ اللہ

جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا، یا خدا کا تصور ایسا ہی قائم کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی، بادشاہ کی طرح، ایک تخت پر بٹھایا۔ اس کے اردگرد، مقربین کو جمع کیا۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے حاجب و دربان بھی مقرر کئے۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اس کے حضور پیش کرنی ہو تو ضروری ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرے اور پھر اس درخواست کو اس کے مقربین کی وساطت سے اس تک پہنچائے تاکہ وہ درخواست دہندہ کی سفارش بھی کریں۔ ان درخواستوں کے فیصلے، یا خدا کے دیگر احکام، کسی قاعدے یا قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار "بادشاہ" کے مزاج پر ہوتا ہے۔ وہ خوش ہو گیا تو جاگیر کے طور پر گاؤں بخش دیا۔ ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ سعدی کے الفاظ میں، مزاجِ شاہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند"۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام و اکرام کی بارش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا، بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی کر لیں۔ اسے خوش رکھیں۔ ایشور کی بھگتی، ڈنڈوت، پوجا پاٹ، اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں

خوشنودیِ باری تعالیٰ

دینا۔سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور، پرماتما یا دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھگتوں سے راضی رہیں۔

قرآنِ کریم نے خدا کے متعلق یہ باطل تصور مٹایا اور اس کی جگہ یہ تصور پیش کیا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس نظم و ضبط کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہیں تقدیراتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں اس موضوع پر، مختلف مقامات میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے۔ ان مجلدات کی فہرست سے ان مقامات کو دیکھ لیا جائے۔

رَضِیَ - یَرضیٰ - رِضْوَانًا و رِضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی کے ساتھ دل کی پوری رضامندی سے متفق ہو جانا۔ ہم آہنگ ہو جانا۔ مطابقت پیدا کر لینا۔ بیع و شریٰ کے معاملہ میں یہ ہم آہنگی یا باہم متفق ہو جانا، مشہود طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ معاملہ طے ہی اس وقت ہوتا ہے جب فریقین باہمدگر متفق ہو جائیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی تصور کی رُو سے، خدا اور مومنین کا معاملہ، بیع و شریٰ کا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں باہمدگر متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ (۹/۱۰۰۔ و دیگر مقامات) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر متبدل قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ یہ اس لئے اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے کہ اشیائے کائنات کو ان قوانین کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی زندگی کے لئے بھی مقرر کئے ہیں۔ لیکن انسان کو اس نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلے۔ جب انسان ان قوانین کی متابعت یا مطابقت (ہم آہنگی) کی زندگی بسر کرتا ہے تو اسے اِتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰہِ۔ (۳/۱۶۱)۔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس نے قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر لی اور جب وہ ان قوانین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو ان کی رُو سے حاصل ہونے والی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ

یہی معنی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کے ہیں۔ یہ قوانین، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں، اس لئے اتباعِ رضوان اللہ کے معنی اتباعِ قرآنِ کریم کے ہوں گے۔ سورہ محمدؐ میں اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کفار کے متعلق پہلے کہا۔ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ (۴۷/۹) وہ ما انزل اللہ (قرآنِ مجید) سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ (۴۷/۲۸)۔ وہ "رضوان اللہ" سے نفرت کرتے ہیں۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ تخلیقِ کائنات (جس میں انسان بھی شامل ہے)، خدا کے ایک عظیم پروگرام کی

کرلی ہے۔ انسان کے سوا، دیگر اشیائے کائنات مناسب پرورش سے خود بخود وہ کچھ بن جاتی ہیں جو کچھ انہیں بنانا مقصود ہے۔ مثال کے طور پر، بکری کے بچہ کی مناسب پرورش کی جائے تو وہ خود بخود بکری بن جاتا ہے۔ اسے کچھ اور بننے کا اختیار ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یوں کہیں گے کہ کائنات کی ہر شے خود بخود منشائے خداوندی کے مطابق بن جاتی ہے۔ جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کا تعلق ہے، انسانی بچہ بھی (بکری کے بچہ کی طرح) مناسب پرورش سے، انسانی پیکر اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن صرف یہ پیکرؑ انسانؑ کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ حیوان، صرف اتنے سے انسان نہیں بن جاتا، اسے اپنی کوشش سے انسان بننا ہوتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں، "آدمی کو انسان" بننا پڑتا ہے۔ اور وہ انسان بن سکتا ہے ان قوانین کے اتباع سے جنہیں خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو آدمی سے انسان بن جائے اور جی چاہے تو آدمی کا آدمی رہتے ہوئے، دیگر حیوانات کی سی زندگی جئے اور حیوانات کی سی موت مر جائے۔ خدا کے پروگرام میں وہ اسی صورت میں فِٹ آسکے گا جب وہ آدمی سے انسان بن جائے۔ قرآنِ کریم اسے ایسا بنا دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن کرتا یہ ہے کہ:

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

جب آدمی انسان بن جاتا ہے تو اس وقت کہا جاسکتا ہے کہ وہ منشاء خداوندی کے مطابق بن گیا۔ اسی منزل میں پہنچنے والوں کے متعلق کہا جائے گا کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ۔

اس مقام پر پہنچکر کہا جاسکتا ہے کہ اگر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا منتہیٰ ومقصود یہی ہے کہ ہم ایسی مخلوق بن جائیں جو منشاء خداوندی کو پوری کرے جو اس کے معیار پر پوری اترے، تو یہ وہی بات ہوگئی کہ اس تمام تگ وتاز کا منتہیٰ، خدا کے کسی مقصد کی تکمیل ہے۔ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اس کے کسی مقصد کے لئے اس قدر جانکاہ مشقتیں برداشت کریں۔ ہم کیوں آدمی سے انسان بنیں؟ ہم آدمی پیدا ہوئے آدمی کی زندگی بسر کرکے، آدمی ہی مرجانا چاہتے ہیں۔ انسان بننے میں ہمارا فائدہ کیا ہے؟

انسان بننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ خدا کا نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی سے انسان بن جانے والا خدا کی ایک اسکیم میں بھی فِٹ بیٹھ جاتا ہے اس لئے خدا اسے اس کے لئے منتخب کرلیتا ہے۔ سمجھنے کے لئے اس کی مثال لیں۔ سمجھئے کہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر آپ سے کہتا ہے کہ اگر آپ فلاں بیرونی ڈگری (FOREIGN DEGREE) حاصل کر آئیں تو آپ کو یونیورسٹی کے فلاں شعبہ کا سربراہ مقرر کردیا جائے گا۔ آپ دن رات کی محنتِ شاقہ سے وہ ڈگری حاصل کرلیتے ہیں اور آپ کو حسبِ وعدہ، اس شعبہ کا سربراہ مقرر کردیا جاتا ہے۔ آپنے اس ڈگری کے حاصل کرنے سے اس یونیورسٹی

پرکوئی احسان نہیں کیا۔ اس کا کوئی بگڑا ہوا کام نہیں سنوارا۔ آپ نے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا اور اس معیار پر پورے اترے جو اس شعبہ کی سربراہی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح اس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ یوں آپ اس یونیورسٹی کے پروگرام میں بھی فٹ بیٹھ گئے۔

یہی مثال قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، آپ کے، آدمی سے انسان بن جانے کی ہے۔ اس سے آپ ہی کا کچھ سنورتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے قدم قدم پر کہہ دیا کہ مَنِ اھْتَدٰی فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ۔ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا۔ (۱۷/۱۵) جو شخص صحیح راستہ اختیار کرتا ہے وہ خود اپنے فائدے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ جو غلط راستے پر چلتا ہے وہ اس سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۲۹/۶)۔ خدا جملہ کائنات سے مستغنی ہے۔ نہ تمہارے انسان بننے سے اس کا کچھ سنورتا ہے، نہ تمہارے حیوان کے حیوان رہنے سے اس کا کچھ بگڑتا۔ بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا۔ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۴۹/۱۷)۔ "اے رسول! یہ لوگ

اس سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے

تجھ پر احسان دھرتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت دھرو۔ یہ تو بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ دکھا دی۔ لہٰذا، اگر تم واقعی اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خدا کے ممنونِ احسان ہو، نہ یہ کہ اپنے اسلام لانے کا احسان دھرو۔"

مرضات کا لفظ دو تین اور مقامات پر بھی آیا ہے۔ سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ۔ . . . (۲/۲۶۵)۔ "جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جاتے"۔ یہ تو مرضات اللہ کا مفہوم ہوگیا۔ اگلے دو لفظوں نے بات بالکل واضح کر دی کہ قوانینِ خداوندی سے مطابقت (مرضات اللہ) کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ۔ "اس سے تمہاری ذات کو استحکام حاصل ہو جائے گا"۔ آپ نے دیکھ لیا کہ جو کچھ "لِمَرْضَاتِ اللّٰہِ" کیا جاتا ہے اس سے انسان کا اپنا ہی کچھ سنورتا ہے۔

سورۃ النساء میں ہے کہ منافقین تخریب کے لئے خفیہ مشورے کرتے ہیں۔ ان کے برعکس مومنین، نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں کے لئے باہمی مشورے کرتے ہیں۔ ان مشوروں کے متعلق کہا کہ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ (۴/۱۱۴)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے مطابقت کی خاطر ایسا

کریں گے انہیں اس کا بہت بڑا اجر ملیگا۔

سورۃ الممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ نظامِ خداوندی کے دشمن ہیں ان سے دوستداری کے تعلقات وابستہ نہ کرو۔ اس کے بعد ہے کہ ذرا سوچو کہ اس قسم کی متضاد باتیں کبھی یکجا ہو سکتی ہیں؟ اس قسم کی باتیں کہ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۔۔۔۔ (۶۰/۱) تم ہماری راہ میں ہمارے قوانین کا اتباع کرتے ہوئے، جہاد کے لئے نکلو، اور اس کے ساتھ خفیہ طور پر ان دشمنانِ دینِ خداوندی سے دوستی کے تعلقات بھی وابستہ کرلو؟ یہ ناممکن ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان مقامات سے "مرضات اللہ" کا مفہوم کس طرح واضح ہو جاتا ہے؟ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق۔ ان قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "رضائے باریتعالیٰ" کا مفہوم کیا ہے۔ اور اسی سے زیرِ نظر آیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۔ (۲/۲۰۷)

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو پورا کرنے کے لئے، اپنے آپ کو (یعنی اپنی جانوں تک کو) اس کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کی ذات کی، نہایت لطیف انداز سے نشو و نما ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

"اپنی جانوں کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینے" کے مرحلہ پر ہم ان آیات کی طرف آجاتے ہیں جن میں قتال کا حکم آیا ہے اور جن کی تشریح کو ہم نے ملتوی کر دیا تھا۔ یعنی آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۱۹۵۔

(جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کی رُو سے نظامِ حیات یہ ہے کہ

(۱) ہر فرد، اپنی خداداد صلاحیت و قابلیت، اور اپنی محنت و کاوش سے پیدا کر دہ متاعِ زندگی کو حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے صرف کرے۔ اس سے اس کی سیرت میں پاکیزگی اور کیریکٹر میں بلندی پیدا ہو جائے گی۔

(۲) اس قسم کے افراد جب ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کا ارادہ کریں گے تو اس سے ایک ایسی امت (قوم) وجود میں آجائے گی جو اس نظامِ خداوندی کو عملاً قائم کریگی جو عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔

(۳) مفاد پرست قوتیں اس نظام کے قیام کے راستے میں ہر قسم کی مزاحمت کریں گی۔ ان کی اس مزاحمت کا مقابلہ

کرنا اس امت کا فریضہ ہوگا۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جہدِ مسلسل۔ سعیِ پیہم۔ مومن کی ساری زندگی اسی (جہاد) کی عملی تعبیر ہے۔

(۴) اس جہدِ مسلسل میں ایک مرحلہ وہ بھی آجاتا ہے جہاں ان مخالف قوتوں کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں اترنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اسے قتال (یعنی جنگ) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قتال، جہاد کی آخری منزل ہے لیکن ہر مقام پر جہاد کے معنی قتال نہیں۔ یعنی بعض مقامات پر جہاد اور قتال مرادف معانی کے لئے آئیں گے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مقام پر جہاد سے مراد قتال ہو۔

قتال کے مقاصد اور ھدایات

(۵) چونکہ اسلام نام ہی جہاد (اور اس کی آخری منزل، قتال) کا ہے — یعنی قرآنِ کریم کے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کے لئے جہدِ مسلسل، اور عندالضرورت، جان تک دے دینے کا — اس لئے سارا قرآن، ان سے متعلق ہدایات و تصریحات سے بھرا پڑا ہے۔ بنا بریں، ان تمام مقامات کا ایک جگہ احصار مشکل ہے۔ یہاں ہم قرآنِ کریم کی رُو سے جنگ کے مقاصد، شرائط اور اصولی ہدایات پر اکتفا کرتے ہوئے ان آیات کی طرف آجائیں گے جو سورۃ بقرہ کے متعلقہ حصہ میں آئی ہیں۔

اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان آیات میں جہاں مشرکین، کفار، منافقین، اہلِ کتاب کا ذکر ہے، اس سے اوّلاً مراد زمانہ نزولِ قرآن کے مخالفین ہیں جن کے ساتھ صدرِ اول کے مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی تھی۔ ہر زمانہ کے غیر مسلم مراد نہیں۔ ان آیات سے البتہ وہ اصول مستنبط کئے جائیں گے جن کے مطابق، ہمارے زمانے (اور ہر زمانے) کے، نظامِ خداوندی کے مخالفین کے خلاف، عندالضرورت جنگ کرنی پڑے گی۔ سورۃ بقرہ میں ہے:-

۲/۱۹۰ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ (۲/۱۹۰)

جنگ کے سلسلہ میں اس، سب سے پہلے اصول کو یاد رکھو کہ تم انہی سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف جنگ پر اتر آئیں اور اس طرح تمہارے لئے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے (۲۲/۳۹)۔ یہ جنگ "خدا کی راہ" میں ہوگی۔ یعنی نظامِ خداوندی کے تحفظ کی خاطر۔ اس میں بھی قانون کی حدود سے آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ (اور اس قانون کی وضاحت قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پر کر دی گئی ہے)۔ قانون سے تجاوز کرنا، خدا کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ بات ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:-

۲/۱۹۱ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۔ فَإِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۲/۱۹۱)

جب تم ان حالات میں جنگ کے لئے مجبور کر دیئے جاؤ تو پھر پوری قوت کے ساتھ جنگ کرو اور دشمن کو جہاں پاؤ، اس کا مقابلہ کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، تم بھی انہیں وہاں سے نکال دو۔ جنگ فی ذاتہٖ کوئی قابلِ ستائش چیز نہیں لیکن ظلم اور فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہیوں اور خرابیوں کا موجب ہے، اس لئے ظلم اور فساد کی روک تھام کے لئے جنگ جیسے حربہ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جنگ میں اس بات کا خیال رکھو کہ ہم نے کعبہ کو امن کا مقام قرار دیا ہے (۲/۱۲۵) اس لئے تم دشمن کے ساتھ کعبہ کے قرب و جوار میں جنگ نہ کرو۔ لیکن اگر دشمن وہاں بھی جنگ سے باز نہ آئے تو پھر تم بھی ان سے جنگ کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ اس قسم کے بین الاقوامی معاہدات کا احترام نہ کریں تو ان کا علاج اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے حملے کا جواب دیا جائے۔

لیکن :-

۲/۱۹۲ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۲/۱۹۲)

اگر وہ وہاں جنگ سے رُک جائیں تو تم بھی رُک جاؤ۔ (روزوں کی ٹریننگ سے مقصود ہی یہ تھا کہ تم میں ایسا ڈسپلن پیدا ہو جائے کہ جہاں بڑھنے کا حکم دیا جائے، بڑھ جاؤ۔ جہاں رُکنے کا حکم دیا جائے، رُک جاؤ۔ خواہ آگے بڑھنے میں کتنا ہی فائدہ کیوں نہ دکھائی دے۔ اگر تم اس طرح قوانینِ خداوندی کی متابعت کرتے گئے تو) وہ تمہاری حفاظت کے اسباب بھی پیدا کر دیگا اور سامانِ نشو و نما بھی بے حد و شمار بہم پہنچائے گا۔

اس کے بعد ہے :-

۲/۱۹۳ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ..... (۲/۱۹۳)

ان حدود و شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے تم ان کے خلاف جنگ کرو۔ تا آنکہ جو فتنہ انہوں نے ابھار رکھا ہے وہ فرو ہو جائے اور ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ دین کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو (۲/۲۵۶ ز ۲۲/۴۰)۔ جو چاہے اسے خالصۃً للہ اختیار کر سکے۔

ہم نے اس آیت کا صرف اتنا حصہ دانستہ درج کیا اور بقایا کو ملتوی رکھا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کے غلط مفہوم نے اسلام کے متعلق بڑی سنگین قسم کی غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

ان سے جنگ کرو۔ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ اس آیت کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرتے رہیں۔ تا آنکہ وہ، اسلام قبول کرلیں اور اس طرح خدا کا دین ساری دنیا میں پھیل جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مسلمان جہاں جاتے تھے، غیر مسلموں سے کہتے تھے کہ "اسلام یا تلوار"۔ اگر وہ چپکے سے اسلام قبول کر لیتے تو فبہا، ورنہ ان سے بزورِ شمشیر اسلام منوایا جاتا۔

اسلام یا تلوار؟

اس غلط (اور یکسر خلافِ اسلام) نظریہ کے عام کئے جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے۔ قتل و غارت گری، بربادی اور تباہی، ہلاکت و خون ریزی، جور و ستم، ظلم و استبداد کے خونیں مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ بے پناہ کی طرح بڑھتے چلے آرہے ہیں، جن کے جلو میں، سبعیت و بربریت کے مجسمے، ہولناک جنّات و عفاریت کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ امنڈے چلے آرہے ہیں۔ اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا کے سامنے تہذیب و تمدن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذاہب و مسالک کے پھولوں اور پھلوں کے درخت ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کی ہزار ہا سال کی محنت و کاوش نے جو متاعِ علم و دانش جمع کی تھی، وہ سب راکھ کا ڈھیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ناکام و نامراد واپس آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب قتل و غارت گری تو اسی خدا کا بول بالا کرنے کے لئے کی جاتی تھی۔ جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں، ان کی للکار ایک ہی ہے — یعنی اسلام یا تلوار — اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں اور کسی جگہ زنار کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امان ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے کوئی گوشۂ عافیت۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے مامون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے۔ جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے، وحشی سپرداروں کے کوڑے کھاتے، نخاس (منڈیوں) کی طرف گھسٹتے چلے جاتے ہیں کہ وہاں احترامِ انسانیت کو دو ٹکوں کے عوض نیلام کر دیا جائے اور یہ عفت مآب خواتین لونڈیاں بن کر ان کی ہوسِ جنس پرستی کی تسکین کا سامان مہیا کریں۔

یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کا نام آتے ہی آنکھوں کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ حقارت و نفرت کے بخارات، قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں، اور اس ننگِ انسانیت

بہبہانہ مذہب کو دنیا سے مٹانے کی مختلف تدابیر کو ذہن کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یہ ساری بھیانک تصویر، پیدا کردہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کی غلط تفسیر و تعبیر کی کہ تم کافروں کے ساتھ جنگ کرو تا آنکہ اسلام ساری دنیا میں پھیل جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تصویر کو بھیانک سے بھیانک تر بنانے اور اس کو دنیا میں عام کرنے میں، یورپ کے متعصب مورخین، مفکرین اور ارباب کلیسا کے پراپیگنڈے کا بڑا دخل ہے لیکن اس کا رنگ و روغن تو خود ہمارے ہاں کی تفاسیر اور تاریخ کا مہیا کردہ ہے۔ اور اس کی بنیاد ہے اس (اور اسی قسم کی دیگر) آیات کی غلط تفسیروں، اور ہماری افسانوی تاریخ پر جو اسلام کا نقاب اوڑھے معاندین اسلام کی وضع کردہ ہے۔ اس سلسلہ میں، ہم متقدمین کی تفاسیر و کتب تاریخ سے بکثرت مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن ہم سمجھتے

مودودی صاحب کی تفسیر

ہیں کہ یہ زیادہ مناسب اور مفید ہوگا کہ اس ضمن میں عصر حاضر کے ایک ایسے مفسر کی "تحقیقات" پیش کر دی جائیں جو ماڈرن کہلاتے اور بڑے روشن خیال سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری مراد، ابو الاعلیٰ مودودی صاحب سے ہے جن کے قلم کا شہرہ عام ہے۔ وہ پہلے سورۃ انفال کی حسب ذیل آیت مع ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۔ (۸/۳۹)

اور تم ان سے لڑتے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اس آیت میں دین اسلام کے پیرؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک کہ فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے نہ مٹ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے۔ اور پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص نہ ہو جائے۔
>
> (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ پہلا ایڈیشن ص۹۶-۹۵)

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک "پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص" صرف اسلام کی رُو سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے مودودی صاحب کی اس تشریح کا مطلب واضح ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ساری دنیا (تمام غیر مسلموں) سے لڑتے جائیں تا آنکہ اسلام کا غلبہ ہو جائے۔

انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات (حصہ اول) میں "جہاد فی سبیل اللہ" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اس میں وہ پہلے اصولاً لکھتے ہیں:۔

اس بحث سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی جہاد کا مقصود، غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ (محرم ۱۳۵۹ھ ایڈیشن ص ۷۹)

پھر اس اجمال کی تفصیل میں لکھتے ہیں:-

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوتی تھی، سب سے پہلے اس کو اسلامی حکومت کے زیرنگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرت ؐ کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور پھر حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ (ص ۸۱-۸۰) - (نیز رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ پہلا ایڈیشن۔ ص ۱۹۰)

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ عہدِ رسالت مآب ؐ اور خلافتِ راشدہ کی جنگوں کی غرض و غایت کیا تھی میں نے ان کے متعلق اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" (یعنی سیرتِ حضور نبی اکرم ؐ) اور "شاہکارِ رسالت" - عمر فاروق ؓ میں شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ خود ہمارے مفسرین اور مؤرخین، اسلام کا کس قسم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق، حضور نبی اکرم ؐ کو جونہی قوت حاصل ہوئی، آپ نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ آپ کی طرف سے بھیجی ہوئی دعوتِ اسلام قبول کی جاتی ہے یا نہیں) رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا اور حضورؐ کے بعد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ نے گرد و پیش کی غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ ان جنگوں میں گرفتار شدہ قیدی عورتوں کو کس طرح لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا کہ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا قیدِ تعداد اپنے "استعمال میں لائیں" اور جب جی چاہے انہیں فروخت کر دیں، اس کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات مطالب الفرقان، جلد دوم ص ۵۹-۳۵۸۔ زیر آیت (۲/۵) پیش کی جا چکی ہیں۔

مودودی صاحب نے، اپنی کتاب "خطبات" میں بھی جہاد کے موضوع پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ اسلام پہلے اپنی ایک پارٹی تیار کرتا ہے۔

اور جب وہ اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا، آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی

کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات۔ ۱۳۵۹ھ۔ ایڈیشن ص۲۳۵)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلا؟" مودودی صاحب نے اپنی کتاب " الجہاد فی الاسلام" میں (جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا ان کی جماعت کی طرف سے بڑا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے) لکھتے ہیں۔

رسول اللہ تیرہ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا، اسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے۔ واضح حجتیں پیش کیں۔ فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول معجزے دکھلائے۔ اپنے اخلاق اور پاکیزہ زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق ان کے سامنے خود ظاہر ہو چکا تھا۔ انہوں نے برأی العین دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا ہادی انہیں بلا رہا ہے وہ سیدھی راہ ہے۔ اس کے باوجود صرف یہ چیز انہیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کا چھوڑنا انہیں گوارا نہ تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور آلا۔ کل ماثرۃ او دم اومال یدعی فھو تحت قدمی ھاتین۔ کا اعلان کر کے تمام موروثی امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔ عزت و افتخار کے تمام رسمی بتوں کو توڑ دیا۔ ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی۔ اخلاقی قوانین کو بزور نافذ کر کے اس بدکاری اور گناہگاری کی آزادی کو سلب کر لیا جس کی لذتیں ان کو مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور وہ پرامن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی فضائل اور انسانی محاسن کے نشوونما کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتی ہے، تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی اور شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں اور یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردے ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت باقی نہ رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت کے ساتھ قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے ..... پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے۔ (الجہاد فی الاسلام۔ ۱۹۴۷ء۔ ایڈیشن ص۱۷۵-۱۷۳)

اس اقتباس کے آخر میں کہا گیا ہے کہ "اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس میں "تبلیغ" کا لفظ محض برائے وزنِ بیت شامل کر دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے، مودودی صاحب لکھ چکے ہیں کہ تبلیغ اسلام کے لئے حضور نبی اکرمؐ تیرہ سال تک مسلسل کوششیں فرماتے رہے (یعنی اپنی عمرِ نبوت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ اس میں صرف کر دیا)۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، مؤثر سے مؤثر طریق استعمال کر دیکھے۔ حتیٰ کہ خدا نے معجزات تک دکھلا دیئے لیکن وعظ و تلقین کی یہ تمام کوششیں (معاذ اللہ) ناکام رہ گئیں۔ اس کے بعد آپ تلوار لے کر اٹھے تو چند دنوں میں اسلام سارے ملک میں پھیل گیا۔

یہ ہے اسلام کا وہ نقشہ جو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

(۰)

مرتد کی سزا قتل

یہ تو رہا غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کا سوال۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی مسلمان، اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہے تو کیا اسے اس کی اجازت ہوگی؟ مودودی صاحب کا اس باب میں ارشاد یہ ہے کہ اسے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ وہ مرتد کہلائے گا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ یعنی ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے، "مرتد کی سزا — اسلامی قانون میں"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

> یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ (اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن صـ۷)

وہ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں، تاریخ سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً) وہ لکھتے ہیں:-

> حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا، پھر عیسائی ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقتِ حال دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی تھے۔ پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں۔ ہم نے اسلام اختیار کر لیا۔ مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے سابق دین سے افضل کوئی دین نہیں۔ لہٰذا اب ہم عیسائی ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیئے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لئے گئے۔ (صـ۲۱-۲۰)

ایک اور مثال!

> حضرت علیؓ رحبہ کے مقام پر تھے کہ آپ کو ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں

ایک بت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علی رضؓ نے اس گھر میں آگ لگا دی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (ص ۳۲)

یہ ہے خدا کے ارشاد' لا اکراہ فی الدّین (دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں) پر زبان سے ایمان رکھنے والوں کا "عملی اسلام"! ظاہر ہے کہ یہ تمام روایات اور واقعات جنہیں مودودی صاحب اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کر رہے ہیں، وضعی ہیں۔ لیکن ان کا ارشاد ہے کہ:-

اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دورِ آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا[1] (ص ۔)

واضح رہے کہ ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے مرتد وہی نہیں جو اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے۔ ان کے فیصلہ کی رُو سے جس شخص کے متعلق یہ حضرات فتویٰ دے دیں کہ اس کے عقائد "اسلام" کے مطابق نہیں (یعنی ان کے تصور کے اسلام کے مطابق نہیں) اسے بھی مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔ اس تکفیر سازی اور ارتداد بازی نے بے گناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق کی کس طرح ندیاں بہا دیں، اس کے تذکرہ سے ہماری تاریخ کے صفحات لالہ زار ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عقیدہ" خلقِ قرآن" کو لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس عقیدہ کے حامیوں اور مخالفوں کا کس قدر خون بے محابا بہایا گیا حالانکہ دونوں مسلمان تھے اور ان میں بعض بڑی بڑی ممتاز ہستیاں بھی تھیں۔

بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل ہے) جو اسلام کے قرآنی تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے، ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے۔ بادشاہ اپنے جس مخالف کو ختم کرنا چاہتا، بجائے اس کے کہ اسے اپنے حکم سے قتل کر کے کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاتا، وہ "علماء حضرات" کو اشارہ کر دیتا کہ اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیں۔ اس فتویٰ کی رُو سے وہ مرتد قرار پا جاتا اور پھر "شریعت حقہ" کی رُو سے اسے قتل کر کے حکومت محافظ دینِ متین قرار پا جاتی۔ بادشاہوں سے نیچے اتر کر، خود علماء حضرات بھی باہمی آتشِ حسد و رقابت کو فرو کرنے کے لئے یہی "مقدس حربہ" استعمال کرتے۔

آپ کہیں گے کہ یہ ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ عہدِ کہن کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اب انہیں کوئی نہیں مانتا لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ یہ تاریک دور کی باتیں نہیں، آپ کے اس روشن ترین دور میں بھی اسی شریعت کے احیاء کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنے مذکورہ صدر کتابچہ (مرتد کی سزا ۔۔۔ اسلامی قانون میں) کے آخر میں، موجودہ مسلمانوں کے متعلق بھی بحث کی ہے جنھیں وہ پیدائشی مسلمان کہہ کر پکارتے

[1] سرسیدؒ کی تحریک کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس خلافِ اسلام نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :-

اس سلسلے میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتلِ مرتد" کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا، پھر اس نے باختیارِ خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا، اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ (صـ۷۲)

یہ تو رہا مسئلہ، اب اس مسئلہ (PROBLEM) کا حل ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

پس جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بہر حال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے ان کے لئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرینِ علمِ شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں[1]۔ البتہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جس میں مجھے کچھ پیچیدگی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مدتِ دراز سے ہمارا اجتماعی نظام نہایت ڈھیلا اور سست رہا۔ ہمارے ہاں کئی نسلیں ایسی گزر چکی ہیں کہ ہر نسل نے بعد کی نسل کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ خصوصاً پچھلے دورِ غلامی میں تو ہماری قومی بے شعوری اس حد کو پہنچ گئی کہ ہمارے لاکھوں افراد نے بے پرواہی کے ساتھ، اور ہزاروں نے جان بوجھ کر اپنی اولاد کو کافرانہ تعلیم و تربیت کے حوالے کر دیا[2]۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں اسلام سے بغاوت و انحراف کے میلانات رکھنے والوں کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آگے چل کر

---

[1] فقہا اور ماہرینِ علمِ شریعت کو بطور سند پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کو نہیں۔

[2] خود مودودی صاحب نے بھی اپنی اولاد کو یہی تعلیم دلوائی ہے۔

کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہوا اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب کو بزورِ اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا۔ جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں، تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ "جو لوگ اسلام سے اعتقادًا و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں"۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے، فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا، اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔　　(صفحہ ۷۶-۷۴)

"جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا" سے مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں گے کہ اس کے عقائد اسلام کے مطابق نہیں رہے، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔[1]

—— (۰) ——

بات یہاں سے چلی تھی کہ قرآنِ کریم نے کن حالات میں، اور کن مقاصد کے لئے جنگ کرنے کی اجازت یا حکم دیا ہے۔ اس طویل تمہیدی سفر کے بعد آپ متعلقہ آیات کی طرف آیئے۔ یعنی آیات ۱۹۰-۱۹۳/۲ کی طرف۔ ان میں دو تین بنیادی نکات سامنے آتے ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ یعنی

(۱) قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۱۹۰/۲)

---

[1] اس مسئلہ پر، ادارہ، طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ "قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۲) اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ (۲/۱۹۱)

(۳) وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ (۲/۱۹۳)

۲/۱۹۳ سورۂ انفال میں ہے۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸/۳۹)

فی سبیل اللہ کا مفہوم

"فی سبیل اللہ" قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور بیشمار مقامات میں آتی ہے جن کا یہاں استقصا ضروری نہیں مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہیں "خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی خاطر" یا "نظامِ خداوندی کے قیام اور استحکام کی خاطر"۔ "ان مقاصد کے حصول کی خاطر جو جماعتِ مومنین کے لئے خدا کی طرف سے متعین کئے گئے ہیں"۔ آپ نے دیکھا کہ ان مفاہیم میں الفاظ اگرچہ کچھ مختلف ہیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ اس کے برعکس "طاغوت" کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانے والا۔ سرکشی اختیار کرنے والا۔ "طُغیانی" اسی سے ہے۔ اصطلاحی طور پر اس سے مراد ہر وہ نظریہ، نظام یا قوت ہے جو حدود و قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتے۔ قرآن کریم نے جنگ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ .... (۴/۷۶)۔ "مومن" فی سبیل اللہ" جنگ کرتے ہیں، اور کفار" فی سبیل الطاغوت"۔ یہاں سے ہر دو جماعتوں کے جنگ کے مقاصد کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ ان دونوں میں کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش کیا ہے اور کیوں ہے؟

طاغوت سے مراد

اللہ پر ایمان لانے والے اپنے ہاں ایسا معاشرہ (یا نظام) قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ آزادانہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ غیر مسلموں (کفار) کے مسلک و مشرب سے کوئی تعرض نہیں کرتے صرف اپنے ہاں اپنے مسلک کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن طاغوتی قوتیں ان کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ وہ انہیں اس کی اجازت نہیں دیتیں اور ویسے کام نہ چلے، تو قوت کے بل بوتے پر ان کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے جب مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قریش اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص دھاندلی ہے۔ جب میں تمہارے منہاج و مسلک میں دخل نہیں دیتا تو تم میرے راستے میں کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۵)؛ "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور دنیا دیکھ لے گی کہ ظلم اور دھاندلی پر مبنی نظام کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن یہ جو آخر میں کہا گیا تھا کہ "نتائج خود

بتادیں گے کہ کون سا نظام کیسا ہے"۔ یہی خدشہ تو انہیں کھائے جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر رسول اللہ کا پروگرام کامیاب ہو گیا تو اس کے درخشندہ، انسانیت ساز نتائج دیکھ کر، ساری دنیا لپک کر ان کے نظام کی طرف آجائے گی۔ یہ وجہ تھی جو وہ اس کے راستے میں آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو رہے تھے۔ حضورؐ ان سے کہتے کہ اس باب میں دھونس اور دھاندلی کا سوال ہی نہیں۔ میں بھی عقل و بصیرت، دلائل و براہین کی رُو سے بات کرتا ہوں، تم بھی اسی طرح دلائل و بصیرت کی رُو سے بات کرو۔ (REASONABLE) بنو۔ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۲/۱۱۱)۔ لیکن وہ جواب میں کہتے کہ کہاں کی دلیل اور کیسی برہان۔ یہاں فیصلہ قوت سے ہو گا اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ قوت کس کے پاس زیادہ ہے۔ اس کے جواب میں ان سے فقط اتنا کہا جاتا کہ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ عقل و بصیرت کے بجائے، دھونس اور دھاندلی (قوت) کے زور سے بات منوانے والوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۔ (۳۵/۴۴) وہ قومیں قوت اور زور میں ان سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ لیکن وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے۔ انہوں نے کوئی معقول بات نہ سنی اور ان لوگوں کا بدستور راستہ روکتے رہے جو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق، قوانینِ خداوندی کے تابع نہج زندگی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ قرآن کریم میں دیکھیے۔ اس نے ان کے خلاف یہ فردِ جرم عاید نہیں کی کہ انہوں نے اس نئی دعوت (دینِ خداوندی) کو قبول کیوں نہیں کیا۔ جرم یہ عاید کیا ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی مزاحمت کرتے تھے۔ انہیں اپنے لئے آزادانہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسے قرآن کریم نے "يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ لوگوں کو اُدھر جانے سے روکنا۔

ان کی (اور دنیا میں ہر دھاندلی کرنے والے کی) اس ذہنیت اور روش کو قرآن کریم نے "فتنہ" کہہ کر پکارا ہے۔

فتنہ کے معنی

اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں "آگ میں تپانا۔ اذیت پہنچانا۔ لیکن استعمال کے لحاظ سے یہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کسی پر زبردستی کی جائے۔ جب کوئی دوسرے کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ اسے اس کے راستے سے ہٹا دے خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ...... (۵/۴۹)۔" اس بات سے محتاط رہنا کہ یہ لوگ کہیں تمہیں وحی کے بتائے ہوئے راستے سے نہ ہٹا دیں"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ..... (۱۷/۷۳)۔" انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ یہ تمہیں وحی کے راستے سے ہٹا دیں"۔ ایک اور مقام پر ان مخالفین سے کہا گیا کہ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۔ (۳۷/۱۶۲)۔" تم کسی کو خدا کی طرف سے بہکا، ہٹا کر نہیں لے جا سکتے"۔

ان آیات میں دیکھیے، فتنہ کا لفظ، کسی کو خدا کی راہ سے بہکا... ہٹا کر لے جانے کے لئے بولا گیا ہے۔ یہی "صَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" ہے۔ خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا ہے۔

قریش نے اپنی مزاحمت جاری رکھی تا آنکہ نبی اکرمؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں منتقل ہو جانے کے بعد، قریش سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہ رہا، اس لئے انہیں اپنی مزاحمت ختم کر دینی چاہیئے تھی لیکن وہ اس میں اور بھی زیادہ متشدد ہو گئے۔ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سورہ انفال میں ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۸/۳۶)۔ "یہ مخالفین خدا کا راستہ روکنے کے لئے مال و دولت خرچ کر رہے ہیں۔" اور جب ان کی یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو انہوں نے ۲ھ میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ (۲۲/۳۹-۴۰)

ان لوگوں کو جن پر مسلسل مظالم کئے گئے جنہیں ان کے گھر بار سے نکال دیا گیا۔ اور جو وہاں سے نکل کر، اتنی دور، آ کر بسے، تو ان کے خلاف لشکر جرار لے کر، حملہ کرنے کو آ گئے۔ انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کریں۔ ان لوگوں کا، جن کے خلاف دشمن یہ کچھ کر رہے ہیں، بالآخر جرم کیا تھا؟ — جرم بس یہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ مخالفین کہتے تھے کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ تم اللہ کو اپنا رب تسلیم کر لو۔

دوسری جگہ ہے۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (۸۵/۸)۔ "یہ ان سے بس اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ یہ خدا پر ایمان کیوں لے آتے ہیں"۔ اسے قرآن نے پھر "فتنہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (۸۵/۱۰) اور "صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔ یعنی خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانا۔ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۸/۴۷)۔ یہ لوگ اس طمطراق سے حملہ کرنے کے لئے گھروں سے نکلے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم نے کس مقصد کے لئے یہ لشکر کشی کی ہے۔ "يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے لئے۔ خدا کا راستہ روکنے کے لئے۔ اس مقام پر اِن بے گھر، بے در قلیل التعداد مہاجرین کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ :-

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ .... (۸/۳۹)

ہاں! اب تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ ان سے جنگ کرو حتیٰ کہ وہ فتنہ مٹ جائے جس کے لئے یہ ان اقدامات تک اتر آئے ہیں۔ یعنی دین کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کی زبردستی نہ کر سکے۔ دین کا معاملہ خالصتہً اللہ کیلئے ہو جائے جس کا جی چاہے، برضا و رغبت، لوجہ اللہ، دین اختیار کرے۔

دوسری جگہ اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ۔ اے رسولؐ! یہ، تمہارے رفقا، تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں جواب جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو یہ بھی بتا دیجئے کہ جن مہینوں میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے، اس کی بابت ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ ان مہینوں میں جنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے نظام کے خلاف سرکشی برتنا مسجد حرام تک میں جنگ سے باز نہ رہنا اور لوگوں کو اس مامن سے بھی نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ تو کھلی ہوئی دھاندلی ہے۔ یہ فتنہ ہے۔ اور فتنہ، جنگ سے بھی زیادہ تباہی اور فساد کا موجب ہوتا ہے اس لئے فتنہ کو مٹانے کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے ــــ تم حیران ہو گے کہ جب تم ان کا کچھ بگاڑتے نہیں۔ ان کی کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ ان کے مسلک و منہاج میں دخل تک نہیں دیتے۔ ان کا ملک چھوڑ کر، وہاں سے دور، اس دیس میں آبسے ہو۔ تو پھر یہ تمہاری جان کے لاگو کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ اس لئے کہ یہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ تم یہ نیا دین اختیار کر لو۔ اس لئے یاد رکھو: لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا۔ (۲/۲۱۷)۔ جب تک ان میں قوت و استطاعت رہے گی، یہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے تا آنکہ تمہیں اس دین سے ہٹا کر، پھر اپنے مسلک کی طرف نہ لوٹا لیں۔

اور اس کے بعد، اس سلسلہ میں وہ بلند و بالا اور غیر متبدل اصول بیان کیا جسے، ہمارے خیال میں، دنیا کی

مذہبی آزادی کی خاطر جنگ

ہر مملکت کے ایوان حکومت کی پیشانی پر سنہری حروف میں کندہ کرا دینا چاہیئے۔ فرمایا کہ اگر دھاندلی کے مسلک کو بلا روک ٹوک یوں ہی چلنے دیا جائے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جائے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ (۲۲/۴۰)۔

اگر اس قسم کا انتظام نہ کیا جائے کہ بدلگام اور سرکش لوگوں کی مدافعت کے لئے امن پسند لوگ اٹھیں، تو کسی قوم کی عبادت گاہ تک دنیا میں محفوظ نہ رہے۔ زاویہ نشین راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے ہیکل، مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، سب ڈھا دی جائیں۔ ان پرستش گاہوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرکش قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی جماعت موجود رہے۔

معابد (پرستش گاہیں) علامات ہوتی ہیں متعلقہ مذاہب کی۔ لہٰذا، معابد کی حفاظت سے مراد خود ان مذاہب کی حفاظت ہے غور کیجئے۔ اسلام، ان تمام مذاہب و مسالک کو باطل قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود کہتا یہ ہے کہ اگر کوئی قوت کسی مذہب کو زبردستی مٹانا چاہے تو امتِ مسلمہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس مستبد قوت کا مقابلہ کرکے اس مذہب کی مدافعت اور محافظت کرے۔ سوچئے کہ کیا ایسا دین جو دوسروں کے مذہب کی حفاظت کے لئے اپنے پیروؤں کو سینہ سپر میدانِ جنگ میں نکل آنے کا حکم دے، اس کی تلقین کریگا (یا اسے روا رکھے گا) کہ غیر مسلموں کو بزورِ شمشیر مسلمان بنایا جائے۔؟

آیاتِ بالا کے تسلسل میں اس نے کہا ہے کہ جو قوم، ان مذاہب کی مدافعت کے لئے اٹھے گی، اللہ کی نصرت اسکے شاملِ حال ہوگی۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ جو لوگ اس مقصد کے لئے سینہ سپر، میدانِ جنگ میں نکلیں گے، یوں کہیئے کہ وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے اٹھیں گے۔ اور جب وہ خدا کی مدد کرنے کے لئے باہر نکلیں گے تو خدا پر بھی لازم ہوگا کہ وہ ان کی مدد کرے۔ اللہ ان کی مدد ضرور کریگا۔ وہ بہ نصرتِ خداوندی، ان سرکش قوتوں کو مغلوب کریں اور اس طرح اس قانونِ خداوندی کو دنیا میں ثبت کردیں کہ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (۲/۲۵۶) دین کے معاملے میں کوئی کسی پر جبر نہیں کرسکتا۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح راستہ نکھر اور اُبھر کر لوگوں کے سامنے آچکا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔۔۔۔۔ (۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲/۲۵۶)۔ جس نے طاغوت کی راہ اختیار کرنے سے انکار کردیا اور اللہ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرلیا، تو اس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں۔

دین میں کوئی اکراہ نہیں

حضور نبی اکرمؐ کا قلبِ دردآگیں اس احساس سے مضطرب و بیقرار رہتا تھا کہ یہ لوگ اپنی غلط روش پر اڑے رہ کر تباہی کیوں مول لے رہے ہیں۔ یہ اسلام کیوں نہیں قبول کرلیتے۔ اس پر ارشادِ باریتعالیٰ ہوا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۹۹) کیا تو انہیں جبراً مومن بنانا چاہتا ہے؟ اگر انسانوں کو جبراً مومن بنانا

مقصودِ مشیت ہوتا تو خدا انہیں پیدا ہی اس طرح کرتا کہ یہ سب مومن ہوتے۔ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۰/۹۹)۔ تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے حیوانات کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ایک نوع کے حیوان، ایک ہی روش پر چلنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو انسانوں کو بھی ایسا ہی پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اسے، اُس نے دونوں راستے دکھا دیتے ہیں اور پھر اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ (۷۶/۳)۔ "ہم نے اسے صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کر لے۔ جی چاہے اُس سے منہ موڑ لے"۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ (۹۰/۱۰)۔ ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیتے ہیں جو بڑے واضح ہیں اور اسے اس کا اختیار دیا ہے کہ یہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ مذہب کے معاملہ میں جور و اکراہ، زبردستی سے کام لینے کے معنی ہیں؛ انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا۔ یہ تو خدا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ یعنی خدا اسے اختیار و ارادہ کا مالک بناتا ہے اور تم اس کا اختیار و ارادہ سلب کر لینا چاہتے ہو۔ یہ بدترین قسم کا استبداد ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اس نے فرعون کو استبداد اور فتنہ و فساد کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ خود اپنی قوم کو بھی مذہبی آزادی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ جب اس کے دربار کے ساحرین (مذہبی پیشواؤں) نے حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، ربِ موسیٰؑ پر ایمان لانے کا اعلان کیا تو وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کہا کہ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۲۰/۷۱) ہیں! تم نے میری اجازت کے بغیر اس کا دین قبول کر لیا ہے؟ تم دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میں تمہارے اُلٹے

دربارِ فرعون کے ساحرین

ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا۔ تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہیں اس سے بھی زیادہ شدید عذاب دوں گا۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ جہاں ایک طرف ایمان کی حقیقت کو سورج کی طرح روشن کر دیتا ہے۔ دوسری طرف اس جراُت و بسالت کی بھی زندہ شہادت بن جاتا ہے جو قلبِ مومن میں ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ ...... ایک طرف تمہارا یہ دبدبہ و طنطنہ ہے جو سراسر استبداد اور دھاندلی پر مبنی ہے۔ دوسری طرف وہ صداقت ہے جو دلائل و براہین کی روشنی میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ ہم تمہاری دھاندلی کو اس بصیرت افروز حقیقت پر کیسے ترجیح دے دیں؟ تمہاری عقوبت کے ڈر سے ایسا کرنا انتہائی بزدلی ہوگا۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔ تو جو کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (۲۰/۷۲)۔ تیرا دائرۂ اختیار ہے ہی کتنا؟ وہ صرف اس دنیا کی زندگانی تک محدود ہے، اور زندگی کے میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ ان تک تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے مذہبی آزادی کے بارے میں قرآنِ کریم کا مؤقف اور اس کی تعلیم۔ اس کی رُو سے ایمان نام ہے دل و دماغ کی کامل رضامندی اور اطمینان سے صداقت قبول کر لینے کا۔ جو شخص اسلام کی پیش کردہ صداقت کو اس طرح قبول کر لے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر کسی وقت، کسی وجہ سے، اس کا یہ اطمینان باقی نہیں رہتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ایمان ہی باقی نہیں رہا۔ جس کا ایمان باقی نہ رہے، اس کے دائرۂ اسلام کے اندر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، وہ بلاخوف و خطر اسلام کو چھوڑ سکتا ہے۔ اگر اس کے بعد وہ اسلامی مملکت میں رہنا چاہتا ہے تو دوسرے غیر مسلموں (ذمیوں) کی طرح وہیں رہے۔ اگر کسی اور جگہ چلا جانا چاہتا ہے تو بخوشی چلا جائے۔ یہ کہنا کہ غیر مسلم، اسلام کے دروازے میں داخل تو اپنی مرضی سے ہو سکتا ہے لیکن اس سے باہر اپنی مرضی سے نہیں نکل سکتا، اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس کا بنیادی اصول، حق و صداقت کے رد و قبول کے معاملہ میں انسان کو کامل آزادی عطا کرنا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کی رُو سے جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ لوگوں سے بجبر اسلام منوایا جائے، یا اس لئے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی کسی پر کسی قسم کا جبر نہ کر سکے، اور جونسا مذہب جس کا جی چاہے، اختیار کرے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اور اس کی تشریح جلد اول ص ۲۷ زیر آیت (۲/۳) میں بھی کی جا چکی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان کے معنی ہیں کسی صداقت کو دل و دماغ کے پورے اطمینان اور رضامندی سے صحیح تسلیم کرنا۔ قرآن، اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا جس میں کسی قسم کی زبردستی کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ بزورِ شمشیر تو ایک طرف، اگر کسی کی عقل و فکر کو معطل یا مفلوج کر کے، اس سے اسلام کا اقرار لے لیا جائے تو دینِ خداوندی اسے بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ مومن انہیں کہا جاتا ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ـ (۲۵/۷۳) "اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھکتے"۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ قرآن کسی کو، اس کی مرضی کے خلاف، زبردستی، اسلام کے دائرے کے اندر باندھ کر رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ "مرتد کی سزا قتل" دینِ خداوندی کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ مذہب کی کامل آزادی منشورِ خداوندی کا اولین اعلامیہ ہے۔

ان تشریحات کے بعد، ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھ لینا آسان ہوگا جن کے سلسلہ میں ان وضاحتوں کو ضروری سمجھا گیا تھا۔ یعنی آیات (۲/۱۹۰–۱۹۳) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن جنگ کے سلسلہ میں ایک پابندی کا ذکر آگے

آیت میں آتا ہے۔ فرمایا:۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (۱۹۴/۲)

۱۹۴/۲

یہ پہلے (اسی باب کے شروع میں) بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے سال میں چار مہینے ایسے رکھے گئے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار پاتی ہے۔ انہیں حرمات کے مہینے کہا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جنگ دو فریقوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے اس قسم کی شرائط یا پابندیاں یک طرفہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ فریقین میں معاہدہ کی رُو سے طے پاتی ہیں۔

حرمات کے مہینے

اور اس وقت تک قائم رہ سکتی ہیں جب تک فریقین ان پر کاربند رہیں۔ اگر ایک فریق ان کی خلاف ورزی کرے تو فریقِ ثانی ان سے خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ:۔

حرمات کے مہینوں کی پابندی تو ادلے بدلے کے طریق پر ہی ممکن ہے۔ اگر فریقِ ثانی اس کا احترام نہ کرے اور زیادتی پر اُتر آئے تو تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرو جیسا وہ تمہارے ساتھ کرتا ہے۔ (یعنی اس کا مقابلہ کرو اور حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہو) مختصراً یہ کہ ان تمام امور میں تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ان حدود کی نگہداشت کرتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کی کس قدر تاکید کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس قسم کے احکام نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہوں۔

اس کے بعد آگے بڑھیے۔ جنگ کی صورت میں، غیر متوقع اخراجات کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ جنہیں بہرحال اس امت (قوم) ہی کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا:۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۱۹۵/۲)

۱۹۵/۲

نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر اپنی فاضلہ دولت کو بند کر کے نہ رکھو۔ کھلا رکھو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہاری پوری کی پوری قوم تباہ ہو جائے گی اور جب قوم تباہ ہو جائے تو تمہارا مال و دولت کہاں باقی رہے گا؟ اصل یہ ہے کہ

جنگ میں معاشرہ کی اقتصادیات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس توازن کو قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔
واضح رہے کہ یہ حکم اُس زمانے سے متعلق معلوم ہوتا ہے جب ہنوز قرآن کا معاشی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد، فاضلہ دولت، انفرادی طور پر، کسی کے پاس نہیں رہی تھی۔ وہ مملکت کی تحویل میں آگئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عام حالات میں جس قدر کوئی فرد اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لئے اپنے پاس رکھے، جنگ کی حالت (EMERGENCY) میں، اس میں بھی کچھ کم کرنا پڑے۔ زیرِ نظر اس قسم کے احکام ایسی صورتوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔

(۰)

حج کے احکامات کے ضمن میں دو گروہوں کا ذکر ہمارے سامنے آیا تھا۔ ایک وہ جن کے پیشِ نظر صرف اس دنیا کے مفاد ہوتے ہیں اور دوسرا وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے مفادات اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو خدا کے ساتھ جان و مال کی فروخت کا معاملہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قتال سے متعلق آیات کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔ اس طرح جب نظامِ خداوندی کا ایک خاکہ سامنے آگیا تو فرمایا کہ :-

۲/۲۰۸ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۲۰۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس نظامِ خداوندی میں، جو امن و سلامتی کا ضامن ہے، اجتماعی طور پر، پورے کے پورے، داخل ہو جاؤ اور چند قدم چل کر رُک نہ جاؤ۔ اسے تکمیل تک پہنچاؤ۔ نیز اس میں کسی قسم کی پیوند سازی نہ کرو اور اپنے پست جذبات کے پیچھے نہ لگ جاؤ۔ یہ روش شرفِ انسانیت کی کھلی ہوئی حریف ہے۔

اس آیت میں سِلْم اور کافّة کے الفاظ غور طلب ہیں۔ سِلْم تو اسلام ہی ہے لیکن چونکہ یہ لفظ ہمارے سامنے پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے اس کی اور اس کے ساتھ "کافّة" کی وضاحت ضروری ہے۔

کافّة، جس کا مادہ (ک-ف-ف) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ (۱) کسی معاملہ کی آخری حد تک پہنچ جانا۔ تھوڑا سا چل کر رُک نہ جانا۔ اسے تکمیل تک پہنچانا اور (۲) تمام کا تمام۔ جمع۔ اجتماع۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ

(۱) اسلام ایک کلّی نظام کا نام ہے جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ گزشتہ صفحات میں صبغة اللہ کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے [دیکھئے دوسرا باب۔ آیت (۲/۱۳۸)] کہ انسان کو پوری کی پوری سیرت یا شخصیت کا اس

رنگ میں رنگے جانا ضروری ہے۔ ایمان کی بنیاد، انسان کے نفسیاتی تغیر پر ہے، اور نفسیاتی تغیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ فرد

کلّی تغیّر

میں قلبِ ماہیت ہو جائے۔ وہ خَلۡقًا اٰخَرَ (ایک نئی مخلوق) بن جائے (۲۳/۱۴)۔ وہ غالبؔ کے الفاظ میں آدمی سے انسان بن جائے۔ یہ تبدیلی جزئی نہیں ہوتی، کلّی ہوتی ہے۔ وہ سیرت اور کردار کے اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ کیریکٹر جزئیات میں نہیں دیکھا جاتا، بہ ہیئت مجموعی (MAN AS A WHOLE) میں نمودار ہوتا ہے۔ اسی کو کافّۃ کہا جائے گا۔

کافّۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام، انفرادی مذہب نہیں، اجتماعی دین، یعنی نظامِ زندگی ہے۔ اس کی وضاحت جلد دوم، ص ۱۹۔۲۱۱ زیرِ آیت (۲/۱۰۳) کی جا چکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

اور کافّۃ کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اسے قبول اور اختیار کیا جائے گا تو بالکلیہ اور رد کیا جائے گا تو بالکلیہ۔ پیوند سازی سے اسلام باقی ہی نہیں رہتا۔ اسلام میں جب پیوند سازی شروع ہوئی تو رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہوگئی کہ اصلی (ORIGINAL) اسلام کا اس میں کوئی ٹکڑا تک نہ رہا۔ سارا اسلام انہی پیوندوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس لئے اگر اب اس (موجودہ) اسلام کو حقیقی اسلام میں تبدیل کرنا ہوگا، تو اس پیوندوں پر مشتمل گدڑی کو یکسر اتار پھینکنا ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کو لازمی شرط قرار دیا ہے (۲/۲۵۶)۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ تبدیلی ہوگی تدریجاً۔ لیکن ہوگی بالکلیہ۔ اس سلسلہ میں جلد دوم۔ زیرِ آیت (۲/۸۵) صفحہ ۳۶۰ ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ انسان اپنے جذبات کو حدود اللہ کے ساحلوں کے اندر محصور رکھے۔ ان سے اقدارِ خداوندی کے تابع کام لے۔ اس سے وہ تغیر پیدا ہوگا جو اس میں قلبِ ماہیت پیدا کر دیگا۔

۲/۲۰۹ فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۔ (۲/۲۰۹)

ان واضح دلائل آجانے کے بعد اگر تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی، تو تم بھی تباہیوں کے جہنم میں جا گروگے۔ یاد رکھو! ہمارا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس کی گرفت بڑی شدید ہے۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔

اس آیت میں دو ایک نکات بڑے اہم ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا کے ہاں "قوت اور حکمت" دونوں کا امتزاج ہے۔

حکمت اور قوت

(وہ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے)۔ جب قوت اور حکمت دونوں یکجا ہوں تو اسے قانون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قوت کے ساتھ اگر حکمت (REASON) نہ ہو، تو وہ دھاندلی بن

جاتی ہے۔ اور اگر حکمت کے ساتھ قوت نہ ہو تو وہ وعظ یا فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے۔

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں　　　　قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

(اقبالؒ۔ پس چہ باید کرد)

دوسرے یہ کہ اگر ایک قوم ایک دفعہ صحیح نظام کی پابند ہو جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے بعد وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، اس نظام کے خوشگوار نتائج سے وہ متمتع ہوتی چلی جائے گی۔ بالکل نہیں۔ اسے نظام کے استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ۔ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ۔ (۴۱/۳۰-۳۲)

جو لوگ اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا 'اللہ' ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ (۳۳/۴۳)۔ اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (۳/۱۲۴-۱۲۵ ؛ ۸/۱۰-۱۲ ؛ ۴۶/۱۳)۔

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی)۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا، اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے، ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)۔

اور یہ سب کچھ ایسی عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان، اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے۔ اس میں خدا کی طرف سے، زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہوگا اور سامانِ نشو و نما بھی۔

اس میں "قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ" کے ساتھ "استقامت" شرط رکھی گئی ہے۔ استقامت، اس جدوجہد کے تسلسل (CONTINUITY) کا نام ہے جہاں اس تسلسل میں انقطاع آیا، اس نظام کا نقشہ بگڑ گیا اور وہ قوم اس کے انسانیت ساز ثمرات سے

محروم ہوگئی۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا۔ (۱۳/۳۵)۔ "اس (جنتی معاشرہ) کے ثمرات اور سائے دائم رہیں گے"۔ کے یہ معنیٰ نہیں کہ قوم جو جی میں آئے کرتی رہے، وہ باغات انہیں بدستور پھل دیتے چلے جائیں گے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب تک وہ قوم اپنی جدوجہد جاری رکھے گی، ان ثمرات سے متمتع ہوتی رہے گی جب اس کے پاؤں میں لغزش آجائے گی، وہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ سورۃ ابراہیم میں اسی حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

استقامت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (۱۴/۲۴-۲۵)

غور کرو کہ خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے بات واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریۂ حیات کی مثال ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے سماوی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں (مسلسل و متواتر) پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں سمجھ سکیں۔

یعنی وہ درخت تو ایسا ہے جس میں ہر زمانے میں بارآوری کی صلاحیت ہے لیکن لوگوں کو اس کا پھل قانونِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے۔ اور قانونِ خداوندی ہے: "قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا"۔ اس نظریۂ زندگی کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے مطابق جدوجہد میں استقامت۔ آیت (۲/۲۰۹) "زَلَلْتُمْ"، استقامت کی ضد ہے۔ جب کوئی قوم اس جدوجہد کو ترک کر دیتی ہے، تو وہ اس شجرِ طیب کے خوشگوار پھلوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس درخت میں پھل لانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسری قوم اس مسلک کو اختیار کر لیتی ہے، تو وہ اس کے ثمرات سے متمتع ہو جاتی ہے۔ اسے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسے جلد اول صفحہ ۱۹۲ زیرِ آیت (۲/۱) بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں جو آیات درج کی گئی ہیں۔ (یعنی ۹/۳۹؛ ۴۷/۳۸) ان میں استبدالِ قومی کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں اسے "ارتدادِ قومی" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فرمایا۔

استبدال و استخلافِ قومی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ

لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔ (۵۴/۵)۔

اے ایمان والو! جو تم میں سے، نظامِ خداوندی سے پھر جائے (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا) اللہ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شے کے مقابلہ میں، نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے، اور ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی انہیں عزیز رکھے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے ریشم کی طرح نرم، اور شاخِ ثمردار کی طرح خمیدہ ہوں گے، لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (۲۹/۴۸)۔ وہ اس کے نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی کی طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے۔ یہ نوازشاتِ خداوندی کسی خاص گروہ کیساتھ مخصوص نہیں۔ جو قوم بھی انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہے اسے حاصل ہوسکتی ہیں۔ خدا کے ہاں نہ تو گروہ بندانہ تنگ نظری ہے اور نہ ہی انعامات کی اندھا دھند تقسیم۔

واضح رہے کہ اس استبدال و استخلاف سے مراد یہ نہیں کہ جونہی کوئی قوم نظامِ خداوندی سے منہ موڑ لے گی، وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی اور اس کی جگہ دوسری قوم آن کھڑی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ "منہ موڑنے والی" قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دوسری قوم اس نظام کے استوار کرنے کے لئے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ ان نعماء سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سابقہ (زوال آشنا لیکن ہنوز زندہ) قوم اپنی غلطیوں کا احساس کرکے صحیح راستے پر واپس آجائے اور اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالے۔ سورۃ آل عمران میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ۔ ذرا سوچو کہ جو بدنصیب قوم صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ درآنحالیکہ اس نظام کے درخشندہ نتائج نے یہ حقیقت مشہود کر دی تھی کہ جو کچھ ان کے رسول نے کہا تھا وہ مبنی برحقیقت تھا۔ اس قوم پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کس طرح کشادہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۸۵/۳) ایسے ظالمین پر سعادت و کامرانی کی راہیں کبھی وا نہیں ہوسکتیں۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ (۸۶/۳)۔ اس قسم کی قوم کا حشر اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کے خوشگوار ثمرات سے بھی محروم رہے۔ کائناتی قوتوں کی برکات بھی اس کے حصے میں نہ آئیں اور اقوامِ عالم بھی اسے ذلیل و خوار سمجھ کر دھتکار دیں۔ یوں ان پر ہر طرف سے محرومی اور نامرادی کی پھٹکار

پڑے۔

قبل اس کے کہ ہم اگلی آیات کی طرف بڑھیں، ذرا رُک کر دیکھ تو لیں کہ یہ کونسی بدنصیب، سوختہ بخت قوم کا ذکر ہو رہا ہے؟ کیا یہ ہمارا ہی ذکر تو نہیں؟

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!

اس کے بعد آگے بڑھیے: خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۳/۸۷)۔ ذلت و خواری کا یہ عذاب ان پر مسلط رہیگا اور (خدا و رسول کا زبانی اقرار) ان کی سزا میں ذرا سی تخفیف بھی نہیں کر سکے گا۔ اور نہ ہی ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور میں تھوڑی سی بھی تاخیر کی جائے گی۔ وہ اسی دنیا میں ان کے سامنے آجائیں گے (اور وہ قوم اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرے گی)۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے لئے اس ذلت و خواری کے عذاب سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہوگی یا وہ ابدی طور پر محروم و مردود ہو جائے گی! کہا کہ ان کے بچ نکلنے کا امکان ہوگا؟ فرمایا:-

بازآفرینی کا امکان

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۸۹)۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ جس دوراہے پر ان کے قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گئے تھے، یہ پلٹ کر وہیں جائیں۔ وہاں سے سیدھا راستہ اختیار کریں اور خدا کے عطا کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر پھر سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اس طرح یہ ابدی ہلاکت سے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور انہیں سامانِ نشوونما بھی میسر آجائے گا۔ یعنی انہوں نے دینِ خداوندی (قرآنی تعلیم) میں جو آمیزشیں کر رکھی تھیں انہیں یکسر علیحدہ کر کے، پھر سے خالصتہً قرآنی نظامِ زندگی اختیار کر لیں، تو ان کے بچاؤ کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مُشتِ پرے داری
بیا، من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

لیکن ــ اور یہ "لیکن" بڑا کپکپا دینے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ (۳/۸۹)۔ لیکن یہ اگر ایسا نہ کریں، اور زبان سے "یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ" کہتے اور عملاً اُسی غلط راستے پر چلتے رہیں، اور اس میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں، تو پھر یہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا۔ تو مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ مذہب میں ہر عقیدے اور مسلک کی سند یہ ہوتی ہے کہ یہ اسلاف سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ اب

ظاہر ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، "اسلاف" کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے اس "تواتر" کی سند مزید مستحکم ہوتی جائے گی۔ اسی روش پر چلتے رہنے سے بازآفرینی کی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ ایسی قوم کا انجام ابدی ہلاکت ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (۳/۹۰)۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس بازآفرینی کا امکان اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد اگر یہ چاہیں کہ (حیاتِ اُخروی میں) زندگی کی سرفرازیاں نصیب ہو جائیں تو ایسا ہونا ناممکن ہوگا" خواہ یہ اس کے بدلے میں دنیا بھر کی دولت بھی کیوں نہ دینا چاہیں۔ ان کے لئے الم انگیز عذاب کی زندگی ہوگی اور کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس حالت میں ان کی مدد کر سکے"۔

ان تصریحات کی روشنی میں، آیت (۲/۲۰۹) کا مفہوم واضح ہو جائے گا — یعنی اگر واضح دلائل سامنے آجانے اور صحیح راستہ اختیار کر لینے کے بعد تمہارے پاؤں میں لغزش آگئی تو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے تم بچ نہیں سکو گے۔ (قوموں کے عروج و زوال کے متعلق۔ جلد دوم صـ۱۵۵۔ زیرِ آیت (۲/۴) میں بھی بحث ہو چکی ہے)۔

یہ تنبیہ تو ان لوگوں کو کی گئی جو اسلام کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ باقی رہے وہ جو اس دعوت کی مسلسل مخالفت کئے جا رہے تھے تو ان کے متعلق کہا کہ :-

۲/۲۱۰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ (۲/۲۱۰)

یہ لوگ ابھی تک انہی خیالات میں مگن ہیں جو ان کی توہم پرستیوں نے پیدا کر دیئے ہیں (مثلاً یہ کہ) قوموں کی تباہی کے لئے خدا خود بادلوں کے رتھ میں بیٹھ کر فرشتوں کے جلو میں آیا کرتا ہے اور یوں آخری فیصلہ ہوا کرتا ہے)۔

اے رسول! ان سے کہو کہ قوموں کی تباہی اس طرح نہیں ہوا کرتی۔ وہ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا تمہاری طرف نہیں آیا کرتا بلکہ تمہارا ہر عمل تمہیں اس کی عدالت کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ تم اس کے اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ تباہی اور بربادی اس طرح آیا کرتی ہے۔

ان سے کہو کہ اس کی شہادت چاہتے ہو تو :-

۲/۲۱۱ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ ۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ

نِعۡمَةَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۔ (۲/۲۱۱)

ان یہودیوں (بنی اسرائیل) سے پوچھو جو تمہارے گرد و پیش بھی رہتے ہیں۔ انہیں، قوموں کی موت اور حیات سے متعلق واضح قوانین دیئے گئے تھے۔ انہوں نے ان قوانین کا اتباع کیا تو ان پر خدا کی نعمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ان سے اعراض برتا تو وہ نعمتیں، ذلتوں اور خواریوں میں بدل گئیں۔ اور یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوا جس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

زندگی کی نعمتیں کیا ہوتی ہیں اور وہ چھنتی کس طرح سے ہیں، ان کے متعلق جلد اول صفحہ ۴۳ زیرِ آیت (۲/۱) گفتگو ہو چکی ہے۔ ان نعمتوں کے چھن جانے میں قوم کے لیڈر کیا کرتے ہیں؛ اس کی بابت (۲/۱۴۸) دیکھئے۔

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال دل میں ابھرتا ہے کہ جب کوئی قوم، زندگی کی اس قدر سرفرازیوں اور خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو، تو پھر وہ کیا کرتی ہے جس سے یہ تمام نعمتیں اُس سے چھن جاتی ہیں؟ فرمایا:-

زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَيَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ‎ وَالَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۔ (۲/۲۱۲)

۲/۲۱۲

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کی بلند انسانی سطح سے انکار کر کے، حیوانی زندگی کو اصلِ حیات سمجھ لیتے ہیں اور اسی زندگی کی عیش سامانیاں ان کا مقصدِ حیات بن جاتی ہیں۔ اور یہ چیزیں انہیں بڑی جاذب، پُرکشش اور حسین بن کر دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی پر اقدار کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔ اقدار تو انسانی سطحِ زندگی پر سامنے آتی ہیں ۔۔۔ یہ لوگ بلند اقدارِ حیات فراموش کر دیتے ہیں اور جو لوگ ان اقدار پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں (کہ ان کی مت ماری گئی ہے جو زندگی کے سہل الحصول عیش و طرب کے مقابلہ میں محض نظری اقدار کو ترجیح دیتے ہیں) یہ لوگ ان اقدار پرست مومنین کی ہنسی اس لئے بھی اڑاتے ہیں کہ اس پروگرام کے ابتدائی دور میں یہ اُن کے مقابلہ میں، کمزور و ناتواں سے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ یہ حصولِ قوت وجاہ کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جب آخر الامر معاشرہ میں آسمانی انقلاب نمودار ہو جاتا ہے تو ساری دنیا دیکھ لیتی ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کی نگہداشت کرتے تھے وہ ان لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں جو محض دنیاوی مفاد کو مقصدِ حیات سمجھتے تھے اور اس کے حصول میں کسی اصول و اقدار کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو قوم قانونِ خداوندی

کے مطابق سامانِ زیست حاصل کرنا چاہتی ہے اُسے کس طرح خود اس کے اپنے اندازوں سے بھی زیادہ، بلا حد وحساب رزق کی فراخیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

یہ حقائق قوم بنی اسرائیل ہی سے مخصوص نہیں. نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔ انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جب وہ، بعد میں پیدا ہونے والی تمدنی زندگی سے ناآشنا تھا. قدرتی پیداوار پر اس کا گزارہ تھا اور وہ ہر ایک کو با فراط مل جاتی تھی کیونکہ ہنوز "میری اور تیری" کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا. سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔

وحدتِ انسانیت

یہ تھی "آدم" کی وہ جنتی زندگی جس کی تفصیل جلد دوم کے دوسرے باب (بہ عنوان سرگزشتِ آدم) میں گزر چکی ہے۔ اس کے بعد "میری اور تیری" کا سوال پیدا ہو گیا تو ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ شروع ہو گیا. اس طرح ان میں اختلافات پیدا ہو گئے (۱۰/۱۹)۔ ان اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل اس کے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے. دوسروں کا مفاد اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ وحی شروع کیا. اس نے حضرات انبیاء کرام کو بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی اختلافی زندگی کے تباہ کن نتائج وعواقب سے متنبہ کریں اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی نوید جانفزا سنائیں۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا مبنی برحقیقت ضابطہ (الکتاب) لاتا تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ
۲/۲۱۳ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ - (۲/۲۱۳)

تمام انسان ایک امتِ واحدہ کی طرح رہتے تھے. پھر ان میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے (۱۰/۱۹) تو خدا نے انبیاء کرام کو بھیجنا شروع کیا جو انہیں اختلافات کی ہلاکت آفرینیوں اور وحدتِ امت کی نشاط انگیزیوں سے مطلع کرتے۔ ان انبیاء کے ساتھ ضابطۂ حیات بھی نازل ہوتا جس کے مطابق وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، ان میں وحدت پیدا کرتے۔

اس آیۂ جلیلہ میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) نوعِ انسان، شروع میں امتِ واحدہ تھی. پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرام آتے۔ وہ ان کے اختلافات کو اس کتاب کے ذریعے مٹاتے تھے جو انہیں خدا کی طرف سے ملتی

تھی۔ اس سلسلۂ رشد و ہدایت خداوندی کا منتہیٰ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ یہ شکل قرآنِ کریم کے اتباع سے پیدا ہو سکے گی۔

(۲) ہر نبی اور ہر رسول کو خدا کی طرف سے کتاب ملی تھی۔ تفصیل اس کی جلد دوم صـ۲۶۵ـ۔ زیرِ آیت (۲/۵۵) گزر چکی ہے۔ اس لئے نبی یا رسول بلا کتاب کا عقیدہ قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

(۳) اختلافات اور تفرقہ کفر اور شرک ہے۔ قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کے متعلق پہلی اور دوسری جلد دونوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (مثلاً جلد اول صـ۱۷۲ـ آیت (۱/۵)؛ صـ۱۹۳ـ۔ آیت (۲/۶)؛ صـ۲۱۵ـ۔ آیت (۲/۹)۔ جلد دوم صـ۲۵۹ـ۔ آیت (۲/۵۲)؛ و دیگر مقامات جنھیں ان جلدوں کی فہرست میں دیکھ لینا چاہیئے۔

(۴) جس قوم میں اختلافات اور فرقے ہوں، وہ وحیٔ خداوندی کی متبع نہیں ہو سکتی۔ وحیٔ خداوندی کی پیرو قوم کی پہلی اور بنیادی نشانی، اس میں وحدت ہے۔

(۵) مسلمانوں میں یہ وحدت پیدا ہو نہیں سکتی جب تک وہ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کو اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔ (۴۲/۱۰؛ ۱۶/۶۴)۔

آیت (۲/۲۱۳) کا بقایا حصہ حسبِ ذیل ہے:-

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۔ (۲/۲۱۳) ۲/۲۱۳

ہر نبی اس کتاب کی رو سے جو اُسے دی جاتی، وحدت پیدا کر کے چلا جاتا، لیکن اس کے بعد وہ لوگ جنھیں وہ کتاب دے جاتا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں، ایسی تعلیم کے باوجود، باہمی ضد اور رقابت۔ یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ سے۔ پھر اختلافات شروع کر دیتے (۱۶/۹۲؛ ۲/۵۷؛ ۱۰/۳)۔ لیکن ان میں سے جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے، انہیں خدا اپنے قانون کے مطابق، اختلافات سے بچنے کی راہ دکھا دیتا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے اللہ ہر اُس قوم کی، جو اختلافات سے بچنا چاہتی ہے، زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔

یہ طریق شروع سے چلا آرہا ہے۔ نبی آتا۔ کتابِ خداوندی کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ جو لوگ اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آتے، ان کے سابقہ اختلافات مٹ جاتے۔ وہ امتِ واحدہ بن جاتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو اس کے نام لیوا

اس کی کتاب میں تحریف کر کے امت میں تفرقہ پیدا کر دیتے۔ یہ تفرقہ، مذہبی پیشواؤں کی باہمی رقابت اور جتھہ بازیوں کی بنا پر پیدا ہوتا۔ اس کے بعد پھر ایک اور رسول آجاتا۔ وہ خدا کی طرف سے غیر محرف ضابطۂ ہدایت لے کر آتا اور اس کی رُو سے پھر ایک امتِ واحدہ پیدا کر جاتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ خدا نے اس سلسلہ کے آخر میں ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کی رُو سے، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک امتِ واحدہ متشکل فرمائی۔ وہ اس امت کو اس کتاب کا وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد مذہبی پیشواؤں نے پھر سر ابھارا۔ وہ اس کتاب میں توڑ ردّ و بدل کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا عقیدہ وضع کر دیا کہ خدا کی وحی تمام تر اس کتاب (قرآنِ مجید) کے اندر نہیں۔ وحی کا بہت بڑا حصہ اس کے باہر بھی ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈالا اور اس خارج از کتاب حصہ کو وحی کا درجہ دے کر، امت میں فرقے پیدا کر دیئے۔ ان فرقوں کو مٹانے کے لئے اب کوئی مامور من اللہ تو آئے گا نہیں کیونکہ مامورین من اللہ (انبیاء کرامؑ) کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی مامور من اللہ کے آنے کی اب ضرورت بھی نہیں کہ مامور من اللہ خدا کی کتاب لے کر ہی آیا کرتے تھے۔ کتاب اللہ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جب بھی ہم نے اپنے اختلافی معاملات کے صحیح اور غلط ہونے کے لئے اس کتاب کو حکم مان لیا، ہمارے اختلافات مٹ جائیں گے۔ اور ہم پھر سے امتِ واحدہ بن جائیں گے۔ اور جب ہم خود امتِ واحدہ بن جائیں گے تو باقی دنیا کو امتِ واحدہ بنانے کا پروگرام مرتب کر کے اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہو جائیں گے۔

ہمارے اختلافات

ہم نے سابقہ صفحات میں "اختلافات" کا ذکر کیا ہے تو اس سے لمحۂ اولین میں نگاہ، شیعہ سُنّی اور حنفی وہابی (وغیرہ) کے اختلافات کی طرف اٹھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امتِ واحدہ میں اس قسم کے اختلافات بھی راہ نہیں پا سکتے لیکن قرآنِ کریم کے پیشِ نظر اختلافات کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ آپ ایک بار پھر آیت (۲/۲۱۳) مع آیت (۱۰/۱۹) پر نگاہ ڈالئے۔ ان میں کہا یہ گیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۔ نوعِ انسان امتِ واحدہ تھی۔ اس کے بعد اس میں اختلافات پیدا ہو گئے جنہیں مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ وہ اختلافات تھے (اور ہیں) جن سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اختلافات کیا تھے اور کس طرح رونما ہوئے تھے۔

علمائے علم الانسان والسنۃ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی آبادی کا اولین سرچشمہ جھیل کیسپئین (CASPIAN SEA) کے اطراف و جوانب کا علاقہ ہے۔ وہاں کی آبادی ایک نوع کی شکل میں تھی جس میں کسی قسم کی تفریق نہیں

تھی۔اس کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ نوع مختلف قبائل میں بٹ گئی۔ یہ تفریق کیسے اور کن تقاضوں کے ماتحت رونما ہوئی، کہا

نوعِ انسان کے اختلافات

نہیں جاسکتا۔ ہم جلد دوم، سرگذشتِ آدم کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ سحر پھونکا تھا کہ تم حیاتِ جاوید اپنی اولاد کے ذریعے حاصل کرسکتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی اولاد کے ذریعے جداگانہ تشخص نے آگے چل کر مختلف قبائل کی شکل اختیار کرلی۔ یہ وحدتِ انسانی میں پہلی تفریق تھی۔ اسی سے آگے چل کر نسلوں کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم عمل میں آگئی۔ اس معیار کی رُو سے نوعِ انسان کو تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) آریائی (ایرین)۔ مثلاً ہندی۔ ایرانی۔ فرنگستانی اقوام

(۲) تورانی (منگولین)۔ مثلاً ترکستانی۔ چینی اقوام

اور (۳) اسامی (سیمٹیک)، مثلاً عرب۔ آرامی۔ عبرانی۔ سریانی۔ کلدانی وغیرہ اقوام۔

بعض علمائے انساب، نوعِ انسانی کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بنا پر کرتے ہیں۔ مثلاً سفید فام۔ سیاہ فام یا سُرخ فام۔ اور زرد فام۔ ان کے برعکس، تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی، حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث۔ حام اور سام سے آگے چلی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پہلی تفریق، قبیلوں کی شکل میں رونما ہوئی جن کی بنیاد نسل پر تھی۔ لہٰذا، نسلی امتیاز وحدتِ انسانیت کے راستے میں پہلی روک ہے۔

جب آبادی بڑھی تو مختلف قبیلوں نے نقلِ مکانی کرکے کسی دوسری سرزمین کو اپنا مستقر یا وطن قرار دے لیا۔ اس طرح جغرافیائی حدود یا وطنی امتیازات وحدتِ انسانی میں تفریق کا باعث قرار پائے۔ (اسی (وطنی) تفریق سے زبانوں کا اختلاف بھی رونما ہوا۔

ایک قبیلہ (یا آگے بڑھ کر ایک قوم) میں تقسیمِ کار کے تقاضوں کی رُو سے مختلف گروہوں نے مختلف کام اپنے ذمے لئے۔ اس سے پیشے وجۂ اختلاف بن گئے۔ یعنی جو تفریق معاشرہ میں تقسیمِ عمل کی ضرورت کے ماتحت وجود میں آئی تھی، اس نے آگے چل کر ذاتوں اور برادریوں کی شکل اختیار کرلی۔ حتیٰ کہ ہندو دھرم نے انسانوں کو پیدائشی طور پر چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم کردیا، اور اس تفریق کو، برہما (خدا) کی متعین کردہ کہہ کر اٹمٹ قرار دے دیا۔

پیشوں کی تفریق، یا مختلف افراد میں کمانے کی صلاحیت کے اختلاف سے، کمائی میں فرق پیدا ہوا تو اس

سے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات وجود میں آ گئے۔ اور جب زیادہ طاقتور یا دولتمند طبقہ نے ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیا تو اس طبقاتی تفریق کی گرہیں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

یہ تھیں وہ تفریقات جنہوں نے وحدتِ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ اس تفریق و تقسیم کو مٹا کر پھر سے وحدتِ انسانیہ کا پیغام لے کر آتے اور اپنے دائرہ کار کے اندر اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے۔ انبیاء کرامؑ کے اس مقصد کی وحدت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ یہ حضرات ایک ہی دین لے کر آتے تھے۔ . . . .

. . . ــــ اور اس دین کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیت تھا ــــ لیکن فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہی دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو انہی انبیاءؑ کے نام لیوا باہمدگر ایسی تفریق اور عداوت پیدا کر لیتے تھے کہ وہ باقی تمام تفریقات سے زیادہ شدید اور محکم ہو جاتی تھی ــــ اس کے بعد، ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جاتے تھے، اور ان کی بین الفرق جنگ و جدل مستقل عداوت پر منتج ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، حضرات انبیاء کرامؑ، انسانوں کے اس تفرقہ کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے آتے تھے ــــ اور تاریخ عالم اور قرآنِ کریم اس پر شاہد ہیں کہ ان کے اس انسانیت ساز مشن کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس لئے کہ مفاد پرست اور استحصال پسند گروہوں کا مفاد اسی میں تھا کہ انسانوں میں یہ تفریق باقی رہے۔ یہ ہے دینِ خداوندی اور دنیاوی مفاد پرست گروہوں میں کشمکش کی اصل و بنیاد، جسے اقبالؒ نے ان دو جامع ابیات میں محصور کر دیا ہے۔ وہ دینِ خداوندی (یا وحی) کو عقلِ جہاں بیں، اور گروہ بندانہ مفاد پرستیوں کو عقلِ خود بیں سے تعبیر کرتے ہیں[1] اور کہتے ہیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

قرآنِ کریم اس دینِ خداوندی (عقلِ جہاں بیں) کو اپنی مکمل شکل میں آخری بار لے کر آیا اور حضور نبی اکرمؐ نے اس

امتِ مسلمہ کی تشکیل

کی روشنی میں ایک ایسی امت کی تشکیل فرما دی جو نسل، رنگ، زبان، وطن قومیت، مذہب کے تمام اختلافات و تفریقات کو مٹا کر وحدتِ انسانیت کا ماڈل بنی۔ اس طرح حضورؐ نے اقوامِ عالم کو سمجھا اور دکھا دیا کہ یہ ہے دنیا سے اس فساد کو مٹانے کا طریق جس نے

---

[1] عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است　　(پیامِ مشرق۔ باب نقشِ فرنگ)

انسان کی اس جنتِ ارضی کو جہنم بنا رکھا ہے۔

حضورؐ نے اس دعوت کو پیش کیا، اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا تھا، مفاد پرست گروہ ہجوم کر کے اس دعوت کی مخالفت کے لئے اُمنڈ آئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک خطۂ ارض میں بھی قائم ہو گیا

اس کی مخالفت

تو ان کے سلب و نہب کے دمدموں (TANKS) سے لیس اور کچلی ہوئی انسانیت جوق درجوق اس کی طرف آ جائے گی اور انہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

اور یہ تھا وہ مقام جہاں اس امت سے — جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اٹھی تھی — کہا گیا کہ تم سوچ لو کہ تمہاری منزل کس قدر کٹھن اور تمہارے راستے کس قدر دشوار گزار ہیں۔ ان راستوں کا منتہیٰ تو بیشک زندگی کی بہار آفریں جنت ہے، لیکن یہ جن صبر آزما تزاحمات اور ہمت شکن تصادمات سے پٹے پڑے ہیں انہیں سامنے رکھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ جب انصارِ مدینہ کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں یہ دعوت لے کر آیا کہ آپ مدینہ تشریف لے چلیئے اور وہاں سے اس دعوت کا عملی آغاز کیجئے، تو حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ تم اس کا عہد دو کہ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ وہ اس عہد کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے کہ ان کے سربراہ نے ان سے کہا کہ تم نے سوچ سمجھ لیا ہے کہ اس عہد اور اس بیعت کا عملی مفہوم کیا ہے؟ سن رکھو کہ

یہ عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف ہے۔

اور عرب و عجم کے خلاف اسی اعلانِ جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے کہا تھا کہ ۔

۲/۲۱۴ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔ (۲/۲۱۴)

تم یہ سمجھ بیٹھے کہ تم اس نظام کو آسانی سے قائم کر لو گے اور مفت میں جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو گا۔ تمہیں بھی ان جاں گداز مراحل سے گزرنا ہو گا جن سے وہ لوگ گزر رہے ہیں جنہوں نے

جنت ویسے ہی نہیں مل جائے گی

اس سے پہلے اس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ صعوبات اور مشکلات کا ہجوم انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا قائد (رسول)

پکار اٹھتے کہ بارالہا! ہماری کوششوں کے بارآور ہونے کا وقت کب آئے گا!

ایسے ایسے ہمت شکن اور روح فرسا مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور نصرتِ خداوندی ان کی سعی و عمل کو بارآور کرتی۔

تمہیں بھی انہی مراحل سے گزرنا ہوگا۔

حصولِ جنت کی راہ میں ان تصادمات کے متعلق جلد اول صفحہ ۳۳۵-۳۳۷ زیر آیت (۲/۲۵) میں لکھا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ آلِ عمران میں ہے:-

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ۔ (۳/۱۴۱)

کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ جنت یونہی بیٹھے بٹھائے مل جائے گی۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ اس حقیقت کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنے کردار سے بتانا ہوگا کہ تم میں سے کون مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور باطل کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔

سورۃ التوبہ میں ہے:-

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۔ (۹/۱۶)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا تو اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال خام ہے۔ دعوائے ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کیلئے مصروف جدوجہد رہتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعتِ مومنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور رازدار نہیں بناتا۔ یعنی زمانہ قبل از ایمان کے اس قسم کے روابط کو منقطع کر لیتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ دعوئ ایمان کے الفاظ پر نہیں ہوتی۔

ایمان کیساتھ عمل

اسی تنبیہ کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا گیا ... کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ ۔ (۲۹/۲)۔ "کیا یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ اب جو جی میں آئے کرو۔ تم نے مطالبہ پورا کر دیا ہے اور اب تم سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے! ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ ابھی تو تمہیں صعوبات و مشکلات کی جانگسل بھٹیوں میں سے گزرنا ہوگا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کو جن جانگداز مراحل سے گزرنا پڑا تھا ان میں سے ایک (جنگِ احزاب) کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان ہولناک الفاظ میں کھینچا ہے :۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ (۳۳/۱۰-۱۱)

وہ ایسا سختی کا وقت تھا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آگئے تھے۔ مقابلہ کی شدت کے تصور سے

جنگِ احزاب میں ہولناک نقشہ

تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور دہشت سے تمہارے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آ پہنچیں گے۔ جو ذرا کمزور دل واقع ہوتے تھے ان کے دل میں خدا کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایسے لرزا دینے والے تصادم کے وقت مومنین کا جذبۂ صادقہ ابھر کر سامنے آگیا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامردی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ تھا حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد۔ یہ تھی دین کی غرض وغایت۔ یہ تھا اس نظام کی مخالف قوتوں کی مزاحمت کی شدت کا عالم اور یہ تھا دین کی حامی جماعتوں کا فریضۂ حیات۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

چو می گویم مسلمانم بلرزم　　　کہ دانم مشکلاتِ لَآ اِلٰہ را

رسول اللہ نے وحدتِ انسانیہ کو ایک امت کی شکل میں زندہ حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اس امت کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو سابقہ امتوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے بھی دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا اور وحدتِ انسانیہ کے فریضہ کو پورا کرنا تو ایک طرف، خود رنگ، نسل، زبان، وطن، قومیت کے دورِ جاہلیت کے بتوں کی پرستار بن کر، قوموں، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ آپ سوچئے کہ کہاں امت کا یہ مقصد کہ تمام اقوامِ عالم کے اختلافات مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے اور کہاں اسی امت کی اپنی یہ حالت کہ دو مسلمان خانۂ خدا میں رُو بہ قبلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے! کیا یہ قوم دین کی اس غایت کو پورا کر سکتی ہے؟ اور اس کی واحد ذمہ دار ہے مذہبی پیشوائیت، جو مروجہ مذہب کو دینِ خداوندی بتا کر امت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔

مسلمان کا منتہیٰ حصولِ جنت ہے ناں؟ دین نے حصولِ جنت کے لئے جو کچھ کہا تھا وہ آپ کے سامنے آچکا لیکن

حصولِ جنت کے آسان طریقے

مذہبی پیشوائیت نے حصولِ جنت کو کس قدر آسان بنا رکھا ہے اس کا اندازہ ان (وضعی) روایات سے لگ سکتا ہے جنہیں یہ حضرات بہ اصرار و تکرار، جھوم جھوم کر، محراب و منبر سے سناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

ابو داؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپکتا ہے۔ مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے۔ "اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد ان محمد عبدہٗ ورسولہٗ" تو ایسے شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ (مسلم)

ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے تمہاری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول بہا ہیں۔ ایک ہمیشہ باوضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کس قدر آسانی سے مل جاتی ہے۔ یعنی وضو کیا تو تمام گناہ پانی میں بہہ گئے اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل پڑھ لئے تو خود رسول اللہ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص مؤذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے۔ لیکن حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کے جواب میں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ کہتا ہے تو یہ شخص جنت میں جائیگا۔ طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو۔ لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے۔ پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ

نہیں لکھا جاتا۔ یہاں تک کہ نیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دیگی)۔

ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرتا ہے اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ ادا ہوئی، اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

بخاری اور امام مالکؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تو صرف گناہ بخشنے کا ذکر تھا، مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے' اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کے لئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ابو داؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا اور خاموش بیٹھ کر خطبہ سنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

"وظائف" عجمی اسلام کا امتیازِ خصوصی ہیں۔ دین اور دنیا کا کوئی معاملہ پیش آجائے، اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجیے' مطلب حل ہو جائے گا۔ انہی وظائف سے جنت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً نسائی کی ..... حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ۔ (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دیدے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے، وہ جنت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹتے وقت کہا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، وہ گناہ خواہ دریاؤں کے جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر، ریگ کے ذروں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایامِ دنیا کی مثل ہو' یعنی ابتدائے آفرینش

سے قیامت تک جتنے دن ہوں، ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائینگے۔
مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَر۔ کہہ لیا کرو جس نے یہ وظیفہ پڑھا اُس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔
ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سوبار قُلْ هُوَ اللّٰهُ۔ پڑھنے کا ورد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مٹ گئے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے کیونکہ میں بہت بڑھیا ہو گئی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ سوبار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کر دیئے، اور وہ بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے۔ سوبار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لگام سمیت مجاہدین کو دے دیئے۔ سوبار اَللّٰهُ اَكْبَر۔ کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ مع نکیل وغیرہ اللہ کے راستے میں دیئے۔ اور سوبار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔
حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

شہادت

پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مرگیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔
قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو "مقتولین فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہہ کر پکارا ہے۔ انہیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مخالفین کے ساتھ "اللہ کی راہ میں لڑنے والوں" سے بڑھ کر سخت مقابلہ (جہاد) کرنے والا اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنھوں نے باطل کی قوتوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دینے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان کو جہاد اور قتال فی سبیل اللہ سے بیگانہ کر دیا جائے۔ اب دیکھیئے کہ اس کے لئے ہماری کتب احادیث میں کس قسم کی روایات داخل کر دی گئیں۔
مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ خدا کی راہ

میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید، جو طاعون سے مر گیا وہ شہید، جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مر گیا وہ شہید، جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید، جو مکان گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید' (اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید، جو آگ میں جل کر مر جائے وہ شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔

اس کے بعد یہ دیکھیئے کہ ان "شہدا" کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے لیکن روایات کی رُو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ اپنے ساتھ بہت سے اقربا کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

ان (اور ان جیسی دیگر روایات) میں آپ کو قدم قدم پر یہ الفاظ ملیں گے کہ "خدا گناہ بخش دیتا ہے" اور اس طرح گنہگار جنت میں چلا جاتا ہے۔ "خدا کی بخشش" کا عقیدہ اس قدر عام اور ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے کہ ہم ہر آن خدا سے "بخشش" کی دعا مانگتے رہتے ہیں حتیٰ کہ مرنے والے کے متعلق بھی ہماری یہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ اسے بخش دے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے "مغفرت[1]" کا ترجمہ ہی "بخشش" کر رکھا ہے۔ یہیں سے ہمارے ہاں "بخشش" کا لفظ رائج ہوا۔ اور "بخشش" کے معنی تو آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب مسلمان خدا سے جنت بھی "بخشش" کے طور پر مانگتا ہے ــ وہی جنت، جس کے حصول کے متعلق چند ایک ارشادات خداوندی آپ کی نظروں سے ابھی ابھی گزرے ہیں۔ یہی تھی ہماری وہ عبرت آموز اور تاسف انگیز ذہنیت جس پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے، اقبالؒ نے اپنے مخصوص نشترانہ انداز میں کہا تھا کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است　　　بہشتے بہرِ اربابِ کرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش!　　　بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است　　　(ارمغانِ حجاز)

آپ اپنی (یعنی ہم مسلمانوں کی) موجودہ حالت پر غور کیجیے اور پھر سوچئے کہ کیا دین کی غایت ــ وحدتِ انسانیہ ــ اس قوم کے ہاتھوں وجود میں آسکتی ہے؟

---

[1] مغفرت کا قرآنی مفہوم جلد دوم صـ۲۸۷ ـ زیرآیت (۲/۲۶۸) بیان کیا جا چکا ہے۔

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ آپ ان آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اس دین سے اعراض برتو گے تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جو اس کے مقصد کو پورا کرے گی اور قرآن کریم کی اس "پیشگوئی" کے کچھ کچھ آثار ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ آپ جلد اول صفحہ ۲۳۹۔ آیت (۲/۱۱۱) میں پیش کردہ حقائق کو ایک بار پھر سامنے لائیں اور دیکھیں کہ یورپ کے مفکر کس طرح اپنے (یعنی اقوام عالم) موجودہ نظریاتِ زندگی سے تنگ آکر ایک ایسی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو وحدتِ انسانیت کے زریں اصول کے مطابق بسائی جائے۔ ان کی یہ تڑپ، 'ہنوز' جنین کی شکل میں، ان کے سینوں میں پرورش پا رہی ہے۔ انہیں ایسی دنیا کی تلاش تو ہے لیکن انہیں وہ بنیاد نہیں مل رہی جس پر ایسی آسماں بوس عمارت استوار کی جاسکے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد قرآنی اقدار کے سوا کہیں سے نہیں مل سکے گا۔

مایوسی کی کوئی بات نہیں

یہ نظام ضرور قائم ہوگا

اقبالؒ نے اسی حقیقت کو، جاویدنامہ میں" توسِ قزح کے رنگ میں بیان کیا ہے ـــ "قوس و قزح" کے رنگ میں اس طرح کہ اس میں اس نے اپنی ملت کی حالت پر جو آنسو بہائے ہیں وہ امید کی قرآنی کرنوں میں سے گزر کر، افقِ عالم پر حسین اور رنگین دھنک کی صورت میں نمودار ہو رہے ہیں[1]۔ کہتے ہیں۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　ساز قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی　　از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است　　احتیاج روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیشِ ما بر داردش　　پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(۰)

---

[1] جب سورج کی کرنیں بادلوں میں سے گزرتی ہیں تو ان سے قوس و قزح وجود میں آتی ہے۔ اس استعارہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ آیت (۲/۲۱۳) میں کہا گیا تھا کہ دین کا مقصد وحدتِ انسانیہ کی عملی تشکیل ہے۔ اور مفاد پرست قومیں اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ پھر ایک امت اٹھتی ہے اور اسی وحدت کے احیاء کے لئے سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔ اس امت کا ان مفاد پرست گروہوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ (۲/۲۱۴)۔ اس کے بعد بتایا کہ اس ٹکراؤ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ امت کیا کیا تقاضے پورے کرتی ہے۔

پہلا مرحلہ۔ انفاق

آیت (۲/۲۱۱) میں ان تقاضوں کو دو شقوں میں پیش کیا گیا ہے یعنی مال کا انفاق اور جان کی قربانی۔ یہی دو تقاضے یا مطالبے اگلی آیتوں میں سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان آیات کا تعلق اُس دور سے ہے جب قرآنی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی جا رہی تھی اور وہ ہنوز متشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس دور میں انفاقِ مال کے متعلق فرمایا۔

۲/۲۱۵ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۱۵)

اس کے لئے، سب سے پہلا مرحلہ، مالی قربانی کا ہے۔ اے رسول! تمہارے ساتھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اس کے لئے کس قدر مال کی ضرورت ہوگی اور اُسے کہاں خرچ کرنا ہوگا۔ ان سے کہو کہ اس پروگرام کی ابتداء معاشرہ کے محدود دائروں سے کی جائے گی۔ اس لئے، سردست تم یہ دیکھو کہ ان دائروں میں وہ کون کون سے افراد ہیں جو دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے، اپنے گھروں میں اپنے والدین کو دیکھو۔ پھر اور آگے بڑھو تو انہیں دیکھو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ نیز انہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے۔ پھر اس سلسلہ کو اپنی بستی سے آگے بڑھاؤ، اور باہر سے آنے والوں کے متعلق دیکھو کہ انہیں تمہاری مدد کی کس قدر ضرورت ہے۔ (اس کی آخری حد وہ ہے جسے (۲/۲۱۹) میں بیان کیا گیا ہے)

تم ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کرو، اور اس پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی تم دوسروں کی بھلائی کے لئے کرو گے، وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا۔ اس میں سے ایک ذرہ برابر بھی بے نتیجہ نہیں رہنے پائے گا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انفاق کی یہ شکل، اسلامی نظام کے عبوری دور سے متعلق ہے۔ اس کے آخری مرحلہ میں اسکی کیا شکل ہوگی، اسے جلد اول صفحہ ۱۰۵، آیت (۲/۳)۔ اور صفحہ ۲۹۴ آیت (۲/۲۴) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کی بنیادی آیت (۲/۲۱۹) چار آیات کے بعد سامنے آئے گی۔

اب آیئے دوسرے مطالبہ (یعنی جان کی قربانی) کی طرف۔ فرمایا:۔

۲/۲۱۶ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ (۲/۲۱۶)

مال کے بعد، جانوں کی قربانی کا مرحلہ آئے گا۔ یعنی تمہیں مخالفین سے جنگ بھی کرنی پڑے گی۔ یہ مرحلہ تم پر گراں گزرے گا۔

جان کی قربانی

کیونکہ تم لوٹ مار کی خاطر جنگ کرنے کے عادی ہو۔ انسانیت کی بہبود کے لئے، جس میں ایثار ہی ایثار ہو، ذاتی منفعت کوئی نہ ہو، جنگ کرنا کارے دارد۔ لیکن ان معاملات میں تم اپنی انفرادی عقل اور جذبات سے فیصلہ نہ کراؤ۔ اس لئے کہ یہ عین ممکن ہے کہ عقل خود بین تمہیں ایک بات کو سخت ناپسندیدہ بنا کر دکھائے لیکن وہ (تمہاری ذات کی بہبود کے نقطۂ نگاہ سے) تمہارے لئے بڑی خیر و برکت کی موجب ہو۔ اس کے برعکس، عقل و جذبات کے سطحی تقاضے کسی چیز کو بڑا خوش آیند بنا کر دکھائیں لیکن وہ درحقیقت (تمہاری ذات کی نشوونما کے لئے) بڑی مضرت رساں ہو۔ اس لئے ان امور کا فیصلہ وحی کی روشنی میں کرو، کیونکہ وحی کی نگہ دوررس، حقیقت کو دیکھتی ہے، اور تمہاری جذبات کے تابع چلنے والی عقل کی نگاہ محدود ہوتی ہے۔ وہ حقیقت کو نہیں جان سکتی۔

جنگ کے متعلق آیات پہلے درج کی جاچکی ہیں اس لئے یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مذہب میں آکر، قرآنی احکام کی اہمیت کیا شکل اختیار کرلیتی ہے۔

اسی (سورۂ بقرہ کی) آیت (۲/۱۸۳) میں کہا گیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں"؛ اور اس سے ذرا آگے (زیرِ نظر آیت میں) کہا گیا ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ تم پر جنگ (قتال) فرض کیا گیا ہے۔ دونوں آیتوں کے مخاطب مؤمنین (مسلمان) ہیں۔ اور دونوں کے الفاظ بھی ایک جیسے (كُتِبَ عَلَيْكُمْ)۔ صیام (روزوں) کی فرضیت کا ذکر تو قرآنِ مجید میں اسی ایک مقام پر آیا ہے لیکن جہاد یا قتال کی فرضیت اور اہمیت سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں روزوں کی فرضیت اور اہمیت کے متعلق اس قدر تاکید اور تلقین کی جاتی ہے۔ ان کے "ثواب" کے متعلق اتنے دلکش وعظ کہے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق مسائل پر اس قدر

قتال کی فرضیت

کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ افطار اور سحری کے اوقات کے تعین اور ان کے اعلانات کے سلسلہ میں اتنے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن آپ نے کبھی کسی محراب اور منبر سے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ (جنگ کی فرضیت) کے متعلق کچھ سنا ہے؟ اپنی تقریروں

زورِ خطابت پیدا کرنے کے لئے تو جہاد کے متعلق آیات اور اشعار خوب چسپاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ محض "شاعری" ہوتی ہے۔ اس کی فرضیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آجکل جنگ نے انتہائی ٹیکنیکل سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے لئے قائمہ فوج (STANDING ARMY) ناگزیر ہو گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم تو تمام مومنین (مسلمانوں) کو مجاہد (سپاہی) بنانا چاہتا ہے۔ انہی میں سے مستقل قائمہ فوج بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے یہ فریضہ (نمازِ جنازہ کی طرح) فرضِ کفایہ[1] تو نہیں بن جاتا؟ اس فریضہ کی اہمیت کو اس لئے اجاگر نہیں کیا جاتا کہ اگر "علماء" حضرات اسے تمام امت کے لئے فرضِ عین کی حیثیت سے پیش کریں اور روزوں کی طرح اس کی اہمیت پر زور دیں تو انہیں خود بھی (اور سب سے پہلے) میدانِ جنگ میں جانا پڑے گا۔ لہذا وہ روزوں کی فضیلت پر زور دیتے رہیں گے اور فریضۂ قتال کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت دشمن کے خلاف جنگ چھڑ جائے تو وہ حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے اپنی فوج کی فتح کے لئے دعائیں مانگنے پر زور دیں گے خود میدانِ جنگ کی طرف رُخ تک نہیں کریں گے۔

امت کے لئے فریضۂ قتال کی اہمیت پہلے ہی کم ہو رہی تھی کہ (وہ جو کہتے ہیں "مرے کو مارے شاہ مدار") اس تصور کو مسلمانوں کے دل و دماغ سے ہمیشہ کے لئے محو کر دینے کے لئے ایک "مامور من اللہ" تشریف لے آئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ :-

مرزا غلام احمد اور جہاد

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے فرما دیا کہ مسیحِ موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا۔ (اربعین ۴ - مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی ص ۱۵)

اور اس کے بعد "مسیح موعود" صاحب نے اس نثر کی مزید وضاحت نظم میں یوں فرما دی کہ ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال ‌ ‌ ‌ دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

---

[1] فقہ کی رُو سے فرضِ کفایہ ایسے فریضہ کو کہتے ہیں کہ اگر معاشرہ میں سے کچھ لوگ بھی اسے ادا کر دیں تو اسے پورے معاشرہ کی طرف سے ادا کردہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے — دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی۔
مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد پنجم۔ صفحہ ۴۹)

میں نے اس تمام تفصیل کو اپنی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "مسیح موعود" صاحب پر وحی کون سے "آسمان" سے نازل ہوا کرتی تھی اور وہ اس قسم کے اعلانات کے لئے کس کی طرف سے "مامور" تھے۔

اب ضمنی نکتہ کے بعد پھر آیۂ زیرِ نظر (۲۱۶/۲) کی طرف آجائیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک کام تمہیں ناگوار گزرے لیکن وہ درحقیقت تمہارے لئے موجبِ خیر ہو۔ اور ایک بات تمہیں بہت مرغوب ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لیے شر کا موجب ہو۔ خیر و شر کی تفصیلی بحث جلد اول صفحات ۲۵۰ ؛ ۲۶۵ میں زیرِ آیت (۱۹ از ۱۶/۲) نیز جلد دوم میں (صفحہ ۲۷ ؛ ۳۸ پر) بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" بنیادی حقیقت ہے۔ انسانی ذات کے لئے کون سے امور موجبِ خیر اور کون سے باعثِ شر ہیں، یہ وحیِ خداوندی ہی بتا سکتی ہے؛ "عقلِ خود بیں" اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے عقل کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے۔

اس آیت (۲۱۶/۲) میں کہا گیا ہے کہ جنگ کی وجہ سے بیشک تمہیں انفرادی طور پر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر دشمن تم پر غالب آجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ان دشمنوں کے عزائم کے متعلق اگلی آیت میں کہا۔

۲۱۷/۲ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۔ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۚ وَصَدٌّ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ
اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ
حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ
عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲/۲۱۷)

لیکن صلح ہو یا جنگ، قانونِ خداوندی کی پاسداری ہر حالت میں لازمی ہے۔ مثلاً جس مہینے میں تمہیں جنگ سے روکا گیا ہے، اس میں جنگ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ دوسری طرف، اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھو کہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکنا۔ اس کے قوانین کی صداقت سے انکار و سرکشی برتنا مسجد حرام تک میں جنگ کرنے سے باز نہ رہنا اور جو لوگ اس میں پناہ لے چکے ہوں انہیں وہاں سے نکال باہر کرنا۔ یہ جرائم بہت زیادہ سنگین ہیں۔ یہ فتنہ پردازی ہے اور فتنہ پردازی قتل سے بھی زیادہ ہلاکت انگیز نتائج کا موجب ہوتی ہے۔

اسے بھی یاد رکھو کہ یہ لوگ جو تم سے برسرپیکار ہیں، کبھی جنگ سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے جب تک — اگر ان میں اس کی استطاعت ہو — تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں۔ (جنگ سے ان کا مقصد ہی یہ ہے)۔ لیکن اسے سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اور حالتِ کفر میں اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ وہ لوگ ہوں گے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ (۲۵۰ ﷺ)۔ یہ بات کہ یہ کسی وقت دین کے صحیح راستے پر چلتے، انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکے گی۔

ارتداد۔ انفرادی اور قومی

جنگ کے سلسلہ میں مقاصد، شرائط اور ہدایات، آیات (۲/۱۹۴-۱۹۳) میں گزر چکی ہیں۔ ان میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حرمات کے مہینے کون کون سے تھے اور ان مہینوں میں حرمِ کعبہ کے گردوپیش جنگ کی کیا صورت تھی۔ ان امور کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ یہاں دو قسم کے ارتداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ارتداد قومی یعنی پوری کی پوری قوم کا دین (نظامِ خداوندی) سے برگشتہ ہو جانا، خواہ وہ دشمن کی طرف سے جبریہ ہو اور خواہ اسے وہ قوم از خود چھوڑ دے۔ اس کا انجام کیا ہوگا، اس کے متعلق سابقہ صفحات میں، استبدال و استخلافِ قومی، کے موضوع کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ ایسی قوم انعاماتِ خداوندی سے محروم رہ جاتی ہے۔

آیت (۲/۲۱۷) کے دوسرے حصے میں، انفرادی ارتداد کا ذکر ہے یعنی کوئی ایک فرد اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلے۔ اس کے متعلق بھی گزشتہ صفحات میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر آیت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اگر وہ شخص دوبارہ اسلام کی طرف نہ آجائے اور حالتِ کفر ہی میں اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے۔ یعنی اس نے جو اعمالِ حسنہ اس زمانے میں کئے تھے جب وہ اسلام کا پابند تھا، تو ارتداد کی صورت میں وہ ان کے ثمرات سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ

اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (۲/۱۳۲ و ۳/۱۰۱) ۔ اس کی تشریح سابقہ صفحات میں زیر آیت (۲/۱۳۲) گزر چکی ہے۔ اگر ارتداد کی سزا قتل کر دینا ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ ۔ فَیَمُتْ وَ ھُوَ کَافِرٌ ۔ بہرحال جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

—— (۰) ——

جنگ کے متعلق ضروری ہدایات کے بعد کہا۔

۲/۲۱۸ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ (۲/۲۱۸)

جو لوگ نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے قیام کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس سے اپنا دامن چھڑا کر آگے بڑھ جائیں۔ حتیٰ کہ اس کے لئے اگر وطن تک بھی چھوڑنا پڑے تو اُسے بھی چھوڑ دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں اور مرتے دم تک اسی روش پر قائم رہیں (۳/۱۰۱) تو یہی لوگ ہیں جو رحمتِ خداوندی کے صحیح معنوں میں امیدوار اور مستحق ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے مضرت رساں اثرات سے ان کی حفاظت کر دیتا ہے۔ اور ان کی نشو ونما کا پورا پورا سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اس آیت میں "اَلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔ جہاد کے متعلق گزشتہ صفحات میں قتال (جنگ) کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ مؤمن کی زندگی، قیام و استحکام نظامِ خداوندی کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہنا ہے۔ اس جدوجہد میں آخری مقام وہ آجاتا ہے جہاں اسے نظامِ خداوندی کی حفاظت کے لئے سربکف اور شمشیر بدست میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا ایک گوشہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کی خاطر اُسے جو کچھ چھوڑنا پڑے، بلا تأمل و توقف اسے چھوڑنا چلا جاتا ہے۔ اسے ہجرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا آخری مقام وہ ہے جہاں اسے وطن تک بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ چونکہ (قتال کی طرح) ہجرت کے متعلق بھی بڑے غلط تأثرات قائم کئے گئے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔

ہجرت

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ (معاذ اللہ) مکہ سے جان بچا کر مدینہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس لئے اسے (ESCAPISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہجرت کی یہ تعبیر غلط تأثرات کا نتیجہ ہے۔ یہ درحقیقت نظامِ خداوندی کے قیام کے پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کا وقوع نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں نہیں ہوا۔ قریب قریب ہر رسول کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا تھا۔

جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے، رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہوتا ہے جس میں احکاماتِ خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں اس کی سرتوڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعیٔ انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عائد ہوتا تھا میں نے اُسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد، ان پیشِ نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچاتا ہی اس لئے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ممکن نہیں تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لئے مساعد ہو۔ وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں،

وطن کا مفہوم رسولؐ کی نگاہوں میں

اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک وطن وہ ہے جس کی زمین اس ... نظامِ خداوندی کے لئے سازگار اور بارآور ہو۔ للٰہذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام، رسول کی زبان میں، "ذھاب الی اللّٰہ" یا "ھجرت الی اللّٰہ" ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ ہر اس تعلق کو جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، بلاتامل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام، مال کی محبت، اولاد سے وابستگی، رشتہ داروں سے تعلقات، دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو "کانٹا" کبھی دامنگیر ہو، اسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے۔ اس لئے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پابگِل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں

کے لئے وجہِ جامعیت اور باعثِ اتحاد و اتفاق بنی۔ اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کرلی کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پاگیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اسی کی طرف اٹھتا ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رُخ اس بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ کس طرح ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار یہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستے میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عناں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردّد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاعِ گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے۔ لیکن جن کی نگاہیں طبعی زندگی کی چاردیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہرِ خودی، شرفِ انسانیت، کلمۃ الحق، یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلاب بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آرہا ہے اور اس میں اُس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں تو کہیے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردّد و تأمل، وطن کی خاردار جھاڑی کو اپنے راستہ سے الگ پھینک دے گا، اور کسی ایسے مقام کی طرف رُخ کر لے گا جہاں اس کی یہ متاعِ بے بہا محفوظ ہو جائے۔ (اور اس کی حفاظت صرف اس نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے) اس کا نام **ھجرت** ہے۔ حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک بھی دینی پڑ جائے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہٰذا، ہجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ھجرت سے مفہوم

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　　این زاسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است　　　ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآن کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ۔

(۲۹/۵۶)

اے میرے بندو جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطۂ زمین میں ممکن نہیں تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجیے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ھُوَ الْمُرَاد۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ ـــ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا؛ یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھیے! سورۂ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىھُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۔ (۴/۹۷)

جو لوگ غیر خداوندی ماحول میں رہ کر اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے؟" یعنی دین کے

اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟)۔ وہ جواب میں کہتے ہیں "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے" (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے) اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟" غرضیکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور (جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو) کیا ہی بُری جگہ ہے!

معذورین معذرت صرف ان لوگوں کی قابلِ قبول ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں[1]۔

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا۔ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا۔ (۴/۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری کو دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے، اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو :-

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۴/۱۰۰)۔

---

[1] ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جد و جہد کریں نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھربار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور وہ وہاں (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی) اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سرزمین نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار ہو، اور پھر اُسے (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی موت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا)۔ اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشو ونما دینے والا ہے۔

قرآن کریم نے صدرِ اوّل کے مؤمنین کا دو زمروں میں تعارف کرایا ہے۔ مہاجرین اور انصار۔ مہاجرین وہ جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ اور انصارِ مدینہ کے وہ مؤمن جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔ جہاں تک مجاہدین کا تعلق ہے ان میں انصار اور مہاجرین دونوں شامل ہیں۔ مہاجرین میں ایک تو وہ تھے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی اور دوسرے وہ جنھوں نے اس کے بعد ہجرت کی۔ قرآنِ کریم نے ان سب کو مؤمنِ حقاً قرار دیا اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے بلند ترین اعزاز سے مشرف فرمایا ہے۔ تفصیل ان امور کی جلد اول صـ۲۲۵ زیر آیت (۹/۵۲) اور صـ۳۱۳۔ آیت (۲/۲۱۸) میں گذر چکی ہے۔ (صحابہ کبارؓ کے متعلق مزید تفصیل کے لئے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" دیکھیئے)۔

اس مقام پر اتنا مزید سمجھ لینا ضروری ہے کہ مہاجرین اور انصار دو الگ الگ "پارٹیاں" نہیں تھیں۔ وہ ایک ہی امت کے افراد اور ایک ہی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے لئے یہ دو اصطلاحیں ان کی منفرد خصوصیات کی بنا پر استعمال کی گئی تھیں جس طرح امتِ مسلمہ کے افراد کے لئے مسلمین، مؤمنین، متقین وغیرہ اصطلاحات، قرآن میں آئی ہیں۔ اُمت میں الگ الگ پارٹیوں کا تصور خلافِ اسلام اور شرک ہے۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

(۰)

اس آیت (۲/۲۱۸) میں (۱) ایمان (۲) ہجرت (۳) جہاد کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان کے

لئے ضروری ہے کہ انسان کے ہوش و حواس قائم ہوں اور وہ عقل و فکر سے پوری طرح کام لے سکے۔ اور ہجرت اور جہاد کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ محنت کا عادی اور مشقتیں برداشت کرنے کا خوگر ہو۔ اور ان سب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے گھر کی زندگی امن و سکون کی ہو۔ کیونکہ جس شخص کی گھر کی زندگی (HOME LIFE) خوشگوار نہ ہو، وہ باہر کی زندگی میں دلجمعی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیات میں انہی موضوعات سے بحث کی ہے جنھیں ہم آئندہ باب میں سامنے لائیں گے۔

ساتواں باب

درونِ خانہ

عائلی قوانین

آیات ــــ ۲۱۹ تا ۲۵۷

۱۔ شراب۔ میسرہ۔ ازلام۔ انصاب۔ ممانعت
۲۔ قل العفو کی بحث۔
(قرآن کے معاشی نظام کی اساس)
۳۔ یتیموں کی پرورش۔ حفاظت۔ عزت
۴۔ عائلی زندگی سے متعلق قوانین
۵۔ نکاح۔ نکاح کے لئے عمر
۶۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح
۷۔ تعدد ازواج ــ رسول اللہؐ کی ازواج مطہراتؓ
۸۔ طلاق۔ حلالہ
۹۔ مہر۔ جہیز
۱۰۔ عورتوں اور مردوں میں مساوات
۱۱۔ جنسی اختلاط سے مقصد۔ متعہ کی بحث
۱۲۔ النّساء حرث لکم کی بحث۔
۱۳۔ عدت۔ رضاعت۔ حضانت
۱۴۔ کماندار کے انتخاب کا معیار
۱۵۔ وحی۔ خدا سے ہمکلامی
۱۶۔ صفاتِ خداوندی۔ آیۃ الکرسی
۱۷۔ اولیاء اللہ

ساتواں باب

درونِ خانہ

عائلی قوانین

سابقہ باب کے آخر میں کہا گیا ہے کہ دین کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان عقل و ہوش سے کام لے۔ آیت زیرِ نظر میں ان چیزوں سے اجتناب کا ذکر ہے جس سے عقل و ہوش ماؤف ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:-

۲/۲۱۹ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۔ (۲/۲۱۹)

اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا:-

اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے خمر اور میسرہ کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہو کہ ان دونوں میں بہت زیادہ اثم بھی ہے اور نفع بھی۔ لیکن ان کا اثم ان کے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ (آیت کا باقی حصہ آگے چل کر لکھا جائے گا)۔

اس میں خمر، میسرہ اور آثم کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ آثم کے متعلق جلد دوم صفحہ ۳۵۶ زیرِ آیت (۵/۸۵) میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی اضمحلال، افسردگی اور تکان کے ہوتے ہیں۔ عرب، اَلْآثِمَةُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تکان کی وجہ سے ایسی مضمحل ہو جائے کہ قطار میں دوسرے اونٹوں کے ساتھ قدم بقدم چلنے کے قابل نہ رہے۔ ان سے پیچھے رہ جائے۔ خود یہ لفظ بتا رہا ہے کہ خمر اور میسرہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ یعنی جو فرد ان کا عادی ہو جائے وہ دیگر افرادِ معاشرہ کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اور جو قوم ان کی عادی ہو جائے وہ سفرِ حیات میں دیگر اقوامِ عالم کے ہمدوش چلنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ وہ اپنی توانائیاں کھو کر مضمحل، فلہٰذا آمادہ بہ زوال ہو جاتی ہے۔ پہلے خمر کو لیجیے۔ خمر کے بنیادی

خمر معنیٰ ہیں کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔ چھپا دینا۔ خمار ان اوڑھنیوں کو کہتے ہیں جن سے عورتیں اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیتی ہیں (اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ دیکھئے ۲۴/۳۱) ان بنیادی معانی کی جہت سے اَلْخَمْرُ ہر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ۔ (لغات القرآن) یعنی خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ عرب عام طور پر فشردہ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خمر کہتے تھے۔ اسے ہمارے ہاں شراب کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ خمر کے لئے شراب کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ہر اس شے کو جو پی جاتے شراب کہا جاتا ہے۔ (یعنی مشروب)

خمر (الکحل) کے متعلق دورِ حاضرہ میں اس قدر ریسرچ ہو چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ محققین متفقہ طور پر اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ عارضی طور پر شراب دورانِ خون میں تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے ایسی بیماریوں میں جن کے علاج کے لئے دورانِ خون میں تیزی پیدا کرنا مقصود ہو، دوائی کے طور پر اسکا استعمال فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے عادۃً استعمال سے دورانِ خون کی رفتار میں جو تیزی اور اس کے بعد سستی واقع ہوتی ہے اس کا بہ حیثیتِ مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے قوائے عملیہ مضمحل اور آخر الامر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ شرابی کی عقل و ہوش کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا مشاہدہ ہر روز کیا جا سکتا ہے۔

قبل از اسلام عربوں کی حالت یہ تھی کہ (بقول مولانا حالیؒ) — شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی — جو قوم صدیوں سے اس کی عادی چلی آ رہی ہو، اس سے یہ دفعتاً چھڑائی نہیں جا سکتی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اس سے **تدریجی احکام** متعلق احکام تدریجاً آئے ہیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی قطعی ممانعت کے احکام قریب چار پانچ سن ہجری میں نازل ہوئے۔ یعنی مکی زندگی کے تیرہ سال اور مدنی زندگی میں سے چار یا پانچ سال (مجموعی طور پر) سترہ اٹھارہ سال میں جا کر کہیں اسے کلیتہً بند کیا گیا۔ اس ضمن میں پہلا حکم وہی نظر آتا ہے[ل] جس میں کہا گیا ہے کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ دوسرا حکم وہ معلوم ہوتا[ل] ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

[ل] ہم نے "نظر آتا ہے" اور "معلوم ہوتا ہے" اس لئے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں مختلف آیات کے زمانۂ نزول کا ذکر نہیں آیا اور روایات میں جس انداز سے اس کا ذکر آتا ہے اس سے بات واضح ہونے کے بجائے اُلٹی الجھ جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں قرآنی احکام کے تقدم و تاخر کا تعین ان کے مفہوم کی رُو سے کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ خمر کے معاملہ میں کیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (۴/۴۳)

اے جماعتِ مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب بھی نہ جاؤ۔ تاآنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کہہ کیا رہے ہو؟

(حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ کی تشریحی بحث تو آگے چل کر آئے گی، یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ) قرآن نے کہا ہے کہ تم حالتِ سُکر میں صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ۔ اَلسُّكْرُ کے بنیادی معنی کسی چیز کو روک دینے یا بند کر دینے کے ہیں۔ اس سے یہ لفظ ہر اس کیفیت کے لئے بولا جانے لگا جس میں انسان کی عقل و ہوش کے دروازے بند ہو جائیں۔ لیکن عام طور پر اس سے مراد نشہ کی حالت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر نشہ آور چیز آجائے گی۔ اب دیکھئے کہ مندرجہ بالا آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک ہونا تو ایک طرف ان کے قریب بھی نہ آؤ۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ تو دین (اسلامی نظام) کے پروگرام کی بنیاد ہے۔ ستون ہے۔ انہیں جب (حالتِ نشہ میں) ان میں شرکت سے روکا گیا تو اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ جن لوگوں کی ضبطِ خویش کی صلاحیت قوی ہوگی انہوں نے از خود خمر یا دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال سے اجتناب کر لیا ہوگا۔ صلوٰۃ جیسے اہم اجتماعات میں شرکت سے محرومی کو کون بآسانی برداشت کر سکتا تھا؟ اس سے ایسا نفسیاتی تغیر رونما ہوا ہوگا جس سے اس قسم کی دیرینہ طبیعی عادات کے چھوڑنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہوگی۔ اس قسم کے تدریجی مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر ان سے کہا گیا کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (۵/۹۰-۹۱)

(سابقہ آیت میں قسموں پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قسموں پر قائم رہنا اس امر کی شہادت ہے کہ تمہارا عزم و ارادہ محکم ہے۔ تمہاری قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ بہت مضبوط ہے۔ اس سے سیرت میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام جس سے عقل و فکر ماؤف، حوصلہ اور ہمت پست، اور عزم و ارادہ کمزور ہو جائے اس قابل ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے) مثلاً، خمر۔ میسرہ۔ انصاب۔ ازلام (جن کا ذکر ۲/۲۱۹ میں آچکا ہے) ایسے کام ہیں جن سے معاشرہ میں تخریب پیدا ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ

کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں (۹۰)۔ لہٰذا تم ان سے اجتناب کرو تاکہ یہ تمہاری کامیابی کے راستے میں روڑا بن کر نہ اٹک جائیں۔

اگر تم اپنے پست جذبات کی تسکین کے لئے خمر اور میسرہ جیسی عادات پر اُتر آئے تو یہ چیزیں (انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ) تم میں باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گی اور قوانینِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنے اور نظامِ صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گی۔ کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہو گے۔

(انصاب اور ازلام کے متعلق گفتگو بعد میں کی جائے گی۔ یہاں اتنا دیکھئے کہ) خمر اور میسرہ کو رجس کہا ہے اور عَمَلِ الشَّیْطٰن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رِجْسٌ کے معنی ہوتے ہیں شک، تردد، التباس اور معاملات کا اس طرح گڈمڈ ہو جانا کہ صحیح بات سامنے نہ آسکے۔ الجھاؤ (CONFUSION) پیدا ہو جانا۔ اس قسم کے شکوک و التباس کا فطری نتیجہ اضطرابِ قلب ہوتا ہے۔ اس لئے رجسٌ میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے معانی خود واضح کر دیئے ہیں جہاں کہا ہے کہ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر (CONFUSION) طاری رہتی ہے۔ ان کے سامنے معاملات گڈمڈ رہتے ہیں۔ کوئی بات صاف اور نکھری ہوئی نہیں ہوتی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے خمر کے استعمال کا نتیجہ جو رجس بتایا ہے تو اس سے کیسی عمیق حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

پھر اسے "عمل الشیطان" بتایا ہے۔ اس سے تو قرآن نے شرابی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ شیطنت کے معنی شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔ شدت پیدا ہو جانا۔ سرکش ہو جانا۔ انانیت کا مجسمہ بن جانا وغیرہ ہوتے ہیں۔ شراب کے نشہ کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ شراب کے نشہ میں دُھت انسان اپنے آپ کو "میں" نہیں کہتا "ہم" کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس کا (EGO) کس قدر دیو ہیکل اور جناتی ہو جاتا ہے۔ وہ شخص ہمہ تن الیغو بن جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ انانیت اور سرکشی ہوتا ہے۔ یعنی وہ عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے اور ہمہ تن شعلہ صفت انانیت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ باہمی بغض و عداوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ پھر کہاں کا ذکر اللہ اور کہاں کی صلوٰۃ۔

یہ سب کچھ گنانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ بتاؤ کیا تم اس کے بعد بھی اس بدعادت کو نہیں چھوڑو گے؟ ان میں سے کون ہو گا جو اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کرے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جماعتِ مومنین سے اس

کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

ہمارے ہاں کے بعض کٹ حجتیئے (یعنی جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور وہ دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔) اکثر کہا کرتے ہیں کہ شراب کو خدا نے "حرام" قرار نہیں دیا اس لئے اس کا پینا کچھ ایسا سنگین جرم نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے حلال اور حرام کو (علاوہ اخلاقی خبائث کے) کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رکھا ہے (لحم خنزیر۔ مردار۔ دم مسفوح۔ غیر اللہ کی طرف منسوب اشیاء)۔ شراب (خمر) چونکہ کھانے پینے کی اشیاء (غذا یا خوراک) میں داخل نہیں اسی لئے اسے اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ باقی رہی اس کی ممانعت تو جس چیز کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہو کہ وہ

(۱) رجس ہے۔

(۲) شیطانی فعل (عمل الشیطان) ہے۔

(۳) اس سے باہمی بغض اور عداوت پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔

(۵) اس سے قوائے عملیہ اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مضمحل ہو جاتی ہیں۔

اور اس کے بعد کہا کہ اس سے اجتناب کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم فلاح نہیں پا سکو گے۔ اور آخر میں کہا کہ بتاؤ! تم اسے چھوڑنے ہو یا نہیں ـــ هل انتم منتهون؟

فرمائیے کہ اس کے خلاف اسلام قرار دیئے جانے کے لئے اور کون سے الفاظ کی ضرورت تھی؟ لفظ حرام میں کون سا بم پوشیدہ ہے جس سے ڈر کر شراب کے رسیا اسے چھوڑ دیتے۔ قرآن کریم نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔ (۳۳/۷) ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کے بعد بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں؟ سو سوال الفاظ کا نہیں سوال ایمان کا ہے۔ جس شخص کا اس پر ایمان ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے۔ وہ انہیں چھوڑ دے گا، خواہ اس کے الفاظ کوئی سے بھی کیوں نہ آئے ہوں۔

ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ قرآن کریم نے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے جس میں ہر نشہ آور شے آجاتی ہے۔ اسلامی مملکت جب اسے قانوناً ممنوع اور اس کے استعمال کو جرم قرار دے گی تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ اسے (DEFINE) کرے کہ خمر سے مراد کیا ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ اصولاً جب بھی کسی شے یا عمل کو قانونی حیثیت دی جائے تو اس کا (DEFINE) کرنا قانونی تقاضا ہوتا ہے۔ مجھے

اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ حال ہی (۱۹۷۷ء) میں حکومتِ پاکستان نے شراب کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس کے استعمال کو مستوجب سزا وجرم ٹھہرایا ہے لیکن انہوں نے اسے (DEFINE) نہیں کیا کہ شراب سے مراد کون سی شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اس قانون کی خلاف ورزی کے احکامات عدالت کے سامنے آئیں گے تو وہاں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ہے کیا؟ محض شراب کہہ دینے سے تو قانونی تقاضا پورا نہیں ہو سکے گا۔ قرآنِ کریم نے جن امور کی تفصیل خود بیان نہیں کی، ان کی تفاصیل کا تعین اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

یہ تو رہی اس کی قانونی حیثیت۔ جہاں تک اس کی معنویت کا تعلق ہے اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ خمر وہ ہے جس سے انسان کی عقل وفکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مسلوب یا مضمحل ہو جائے۔ آپ سوچئے کہ اس میں کیا کیا باتیں نہیں آجاتیں۔ سب سے پہلے تو "مذہب" ہے جس میں سوچنے سمجھنے کو گناہ اور ابلیس کی روش قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں ہر عقیدہ کو بلا سوچے سمجھے ماننا اور اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہوتا ہے۔ کیا یہ چیز خمر کی معنویت میں شامل نہیں ہو جاتی؟ —— بلکہ اس سے بھی شدید تر شکل میں! نشہ کی حالت میں عقل وفکر عارضی طور پر معطل ہوتی ہے لیکن "مذہبیت" میں یہ صلاحیتیں مستقلاً مفلوج ہو جاتی ہیں۔

مذہب سے آگے بڑھیئے تو کیا دولت کا نشہ، حکومت اور اقتدار کا نشہ، لیڈرشپ کا نشہ —— انسانوں کو بدمست اور مدہوش نہیں کر دیتا؟

قرآنِ کریم نے ان تمام نشوں کو خلافِ شرفِ انسانیت فلہٰذا عمل الشیطان قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں

جنّت کی شراب

نعمائے جنت کے ضمن میں شراب کا لفظ بھی آیا ہے اور ایک جگہ خمر کا بھی۔ عربی زبان میں شراب ہر پینے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔ یعنی مشروب۔ قرآنِ مجید نے اس کے لئے طہور کے لفظ کا اضافہ کر کے بتا دیا کہ یہ مشروبات بھی پاکیزہ ہوں گے (۷۶/۲۱؛ ۳۸/۵۱)۔ سورہ محمد میں: اَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ آیا ہے۔ (۴۷/۱۵)۔ لیکن وہاں بات ہی یوں شروع کی گئی ہے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ۔ ۔ ۔ (۴۷/۱۵)۔ "جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو ۔ ۔ ۔ ۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب بیان تمثیلی ہے، حقیقی نہیں۔ اس لئے ان الفاظ کے معنی مجازی لینے چاہئیں نہ کہ حقیقی۔ اس تمثیلی بیان کی وضاحت بھی یہ کہہ کر کر دی کہ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَأْثِيْمٌ۔ (۵۲/۲۳)۔ ان مشروبات سے نہ تو کوئی لغویات ظہور میں آئے گی اور نہ ہی اضمحلال پیدا ہوگا۔ دنیاوی شراب (خمر) کا نتیجہ تو اثم بتایا تھا (۲/۲۱۹)؛

جنت کے مشروبات کے متعلق یہ کہہ کر کہ ان کا نتیجہ اثم نہیں ہوگا انہیں دنیاوی مشروبات سے متمیز کر دیا۔ (جنت کے تمثیلی بیان کے متعلق جلد اول صـ۳۳۲ زیر آیت (۲/۲۵) بحث ہو چکی ہے)

(۰)

اور آخر میں وہ نکتہ جسے ہم نے شروع میں منتظر وضاحت رکھا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (۴/۴۳)

اے جماعتِ مومنین! تم حالتِ نشہ میں صلوٰۃ کے قریب تک نہ جاؤ۔ تاآنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

اس کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اس لئے وہ نشہ کی حالت میں اذکارِ صلوٰۃ کے الفاظ تو (اپنی زبان میں) بولتے تھے لیکن (نشہ کی وجہ سے) ان الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا، اس حکم کا مفہوم یہ ہوا کہ جس شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ نماز میں جو الفاظ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے، اس کا نماز پڑھنا بے معنی ہے۔ اسے اس سے روک دیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ہمارے ہاں جو نمازیں (عام طور پر) پڑھی جاتی ہیں ان میں نمازی کو معلوم ہی نہیں ہوتا جو الفاظ وہ بول رہا ہے ان کا مفہوم کیا ہے۔ کیا وہ بھی اس ذیل میں نہیں آتیں؟ ان الفاظ کا دہراتے رہنا جن کا مفہوم اور مطلب انسان نہیں سمجھتا، کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اس کا اطلاق بلا سمجھے قرآن مجید کی تلاوت پر بھی ہوگا۔ اس کے متعلق جلد دوم صـ۳۳۹ زیر آیت (۲/۱۲۱) بات ہو چکی ہے۔ محض الفاظ کے (بلا سمجھے) دہرانے میں کوئی تاثیر مضمر سمجھنا (خواہ اس کا نام ثواب ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) سحر کی بنیاد ہے۔ اس کے متعلق جلد دوم زیر آیت (۲/۱۰۲) صـ۳۰۴ پر بڑی تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

بلا سمجھے نماز

مقصود اس تنبیہ سے یہ ہے کہ قرآن کریم اُسی فریضہ کی ادائیگی کو قابلِ قبول اور نتائج خیز قرار دیتا ہے جس میں "تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" کی شرط پوری ہوتی ہو۔ یعنی جو کیا جائے اس کا مطلب سمجھ میں آرہا ہو۔

(۰)

آیت زیرِ نظر (۲/۲۱۹) میں کہا گیا تھا کہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ۔ خمر کی بات ہو چکی۔ اب میسرہ کی طرف آئیے۔ اس کا مادہ (ی۔ س۔ ر) ہے جس کے معنی سہولت یا آسانی کے ہیں۔ یہیں سے لفظ یَسَار ہے جس کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ ہمارے ہاں جو کہتے ہیں کہ"

مَيْسِرَه

یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ اس سے میسرۃ کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی وہ دولت جو محنت ومشقت کے بغیر آسانی سے ہاتھ آجائے۔ اس میں سارا نظامِ سرمایہ داری آجاتا ہے جس میں محنت اور مشقت کوئی اور کرتا ہے، اور سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ کے بل پر بلا محنت ومشقت اس کے ماحصل کو سمیٹ کرلے جاتا ہے۔ اس قسم کی تمام دولت" میسرہ" کے ضمن میں آجاتی ہے۔ قرآن اُس یُسر کو جائز قرار دیتا ہے جو عُسر (محنت مشقت) کے بعد حاصل ہو۔ (۹۴/۵-۶) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل ہی کا حقدار ہے۔

لیکن عرب اس لفظ (میسرہ) کو جوئے (قمار بازی) کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں یعنی عقل وفکر کا ماؤف ہو جانا اور بلا محنت ومشقت دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ جوئے میں عقل وفکر کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے (GAME OF CHANCE) کہتے ہیں۔ (CHANCE) کے معنی ہوتے ہیں وہ جس میں انسانی تدبیر یا عقل وفکر کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ محض اتفاقیہ ہاتھ آجائے۔ اس سے خمر کا تعلق واضح ہے۔ یہ تو خمر کے نشہ سے کہیں بڑھ کر مدہوش کن ہو جاتا ہے۔ یہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے عرب اسے قمار[1] کہتے تھے۔ یعنی جنون۔ قمار باز کا جنون دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ اور اس کا جذبہ؟ بلا محنت و مشقت دوسرے کی دولت حاصل کر لینا۔۔۔ قرآن کریم نے سود خوار کے متعلق کہا ہے کہ اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ مخبوط الحواسی کے عالم میں مضطرب وبیقرار ہو (كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ ۲/۲۷۵) یہی حالت جوارئیے کی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کا مال چھیننے کی ہوس میں پاگل ہو رہا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے خمر اور میسرہ دونوں کو ایک زمرہ (CATEGORY) میں رکھا ہے۔ اس ضمن میں آیات (۵/۹۰-۹۱) دیکھیے جو خمر کے ضمن میں پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ ان سے انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ یہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ہیں۔ ان سے باہمی بغض وعداوت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ کے راستے میں روک بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔

انصاب

آیات (۵/۹۰-۹۱) میں خمر اور میسرہ کے علاوہ انصاب اور ازلام کا بھی ذکر آیا ہے۔ انصاب کی تو قرآن کریم نے یہ کہہ کر وضاحت کر دی مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ۔ (۵/۳) جو کچھ غیر اللہ کے استھانوں پر

---

[1] قمار قمر سے ہے جس کے معنی چاند کے ہیں۔ قمر (چاند) کے ساتھ جنون کا تعلق بڑا قدیمی ہے۔ انگریزی زبان میں LUNATIC کا لفظ اسی پر شاہد ہے۔

چڑھاوا چڑھانے کے لئے ذبح کیا جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر اللہ کی طرف نسبت سے یہ شرک ہوگا۔ لیکن آپ ذرا گہرائی میں جاکر دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ چڑھاوے چڑھانے میں عقل و فکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اندھی عقیدت کارفرما ہوتی ہے اور چڑھاوے بیشتر اس مقصد کے لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ آپ کی مراد محنت و مشقت کے بغیر پوری ہوجائے۔ چڑھاوا بھی قمار باز کا پھینکا ہوا پانسہ ہوتا ہے کہ یا تو جو کچھ ہاتھ سے دیا ہے وہ بھی جاتا رہا اور یا وہ گوہر مراد ساتھ لے کر واپس آیا۔ قرآن کریم نے اسے بھی ممنوع قرار دیا ہے۔

ازلام

ازلام وہ تیر تھے جن سے عرب قرعے ڈالتے، فالیں لیتے اور چڑھاوے کا گوشت تقسیم کرتے تھے۔ فالیں لینے اور قرعے ڈالنے میں بھی خمر اور میسرہ کا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینا، اور محض اتفاقات (CHANCES) کی رُو سے فیصلے کرنا۔ قرآن کریم کا پیش کردہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جو معاملہ در پیش ہو انسان اس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔ عقل و فکر کی رُو سے اس کے ہر پہلو پر غور کرے اور اس کے بعد قرآن کریم کی روشنی میں اس کے متعلق فیصلہ کرے۔ قرآن کریم نے عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنم کے کندے اور حیوانات سے بدتر قرار دیا ہے (۷/۱۷۹)۔ لیکن قرآن کو سر آنکھوں پر رکھنے اور ایک ایک رات میں اسے دہرانے والی قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے فیصلوں کے لئے قرعے ڈالتی، لاٹریاں نکالتی، فالیں لیتی اور استخارے کرتی ہے۔ خمر اور میسرہ کو تو سخت معیوب اور مذموم سمجھا جاتا ہے لیکن فالیں لینے اور استخارے کرنے کو نہایت مقدس قرار دیا جاتا اور جن کی طرف ان مقاصد کے لئے رجوع کیا جاتا ہے، انہیں روحانیت کے مقام بلند پر فائز خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد کمیشن بٹھائے جاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں ؟ کیا قرآن مجید نے ان تمام امور کا نتیجہ اثم قرار دے کر قوموں کے زوال کے بنیادی سبب کی پردہ کشائی نہیں کر دی ؟ یعنی یہ تمام امور ایسے ہیں جن سے قوائے فکریہ اور عملیہ مفلوج اور مسلوب ہو جاتے ہیں۔

میسرہ، ازلام، قرعے، فالیں اور استخارے تو پھر بھی کبھی کبھی کرائے جاتے ہیں۔ عقل و فکر کو ماؤف کرنے کا ان سب سے بڑھ کر ایک اور عقیدہ ہے اور وہ ہے عقیدۂ تقدیر جس کی رو سے نہ انسان کی عقل و فکر کچھ کام دے سکتی ہے نہ محنت و مشقت کچھ فائدہ۔ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے از خود مل جائے گا اور جو کچھ تقدیر میں ہے خود بخود ہوتا جائیگا۔ ہمارا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

کیا اس عقیدہ کا فطری نتیجہ شدید ترین قسم کا اثم (اضمحلال) نہیں — عقل و فکر کے لئے بھی اثم اور سعی و عمل کے لیے بھی اثم۔

لیکن خمر اور میسرہ گناہِ عظیم اور قابلِ تعزیر جرم، اور تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان[1]۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادہ — کہ افتاد است از بامِ بلندے

—— (۰) ——

اس کے بعد آیت (۲/۲۱۹) کا باقی حصہ لیجیے۔ پوری آیت یوں ہے۔

۲/۲۱۹ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (۲/۲۱۹)

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام کی راہ میں کون کون سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی اصولی بات یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کی عقل و خرد کو ماؤف کر کے اس کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر دے، وہ اس نظام کی راہ میں موانعات میں سے ہے — ہر نشہ آور چیز اور وہ دولت جو بلا محنت و مشقت مل جائے (جس میں قمار بازی بھی شامل ہے) اس کی تین مثالیں ہیں۔ ان میں اضافی طور پر منافع بھی ہے۔ لیکن ان سے انسانی ذات میں ایسی افسردگی، سہل انگاری، سستی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔ یہ نقصان ان چیزوں کے عارضی نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہلاکت انگیز ہے۔

لہٰذا، مفت میں ہاتھ آجانے والی دولت کے پیچھے نہ پڑو۔ اپنی محنت سے کماؤ (۵۳/۳۹)۔ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لئے رکھو، اور جس قدر ان سے زائد ہو، سب کا سب، نوعِ انسان کی پرورش کے لئے، کھلا رکھو (تاکہ نظامِ خداوندی اُسے ضروری مصرف میں لا سکے)

---

[1] عقیدہ تقدیر کے متعلق جلد اول میں بڑی تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۵۴؛ ۱۸۰-۱۸۴؛ ۲۷۴۔ میری کتاب "کتاب التقدیر" تو ہے ہی اس موضوع پر۔

اس طرح خدا اپنے احکام و قوانین کو تمہارے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو، اور سوچو کہ تمہارا حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) دونوں کس طرح روشن ہو سکتے ہیں۔

سطح بین نگاہوں کو اس آیت کے مختلف احکام میں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا۔ یہی نہیں کہ انہیں کوئی ربط دکھائی نہیں دے گا' وہ یہ بھی کہہ دیں گے کہ اس میں بڑی اَن جوڑ باتیں ہیں۔ خمر اور میسرہ اور ان کے ساتھ العفو (انفاق) ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے اس قسم کے اعتراضات سطح بینی پر مبنی ہیں۔ سطح سے ذرا نیچے اتر دیکھا جائے تو سارا قرآن مربوط نظر آئے گا۔ اس کی محسوس شہادت خود مطالب الفرقان آپ کے سامنے ہے۔ جلد اول میں قرآن کا معاشی نظام بڑی وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ (دیکھیے ۲/۱ صفحہ ۱۰۵ ؛ ۲/۲۲ صفحہ ۲۹۴) اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظام کی آخری شکل یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ (جماعتِ مومنین کے افراد) پوری پوری تندہی سے محنت کرتے

العفو کا مفہوم

اور اس کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی سب بطیبِ خاطر دوسرے ضرورت مندوں کے لئے نظامِ معاشرہ کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ العفو کے یہی معنیٰ ہیں۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد جتنا ہے وہ سب کا سب۔ زیرِ نظر آیت کے پہلے حصہ میں خمر اور میسرہ سے روکا گیا ہے۔ خمر کا نتیجہ عقل و ہوش کا سلب کر لینا ہے اور میسرہ اس ہوسِ زر کا مظہر جس کی رُو سے انسان چاہتا ہے کہ محنت مشقت کیے بغیر دوسروں کی دولت کو ہتھیا لیا جائے۔ قرآنِ کریم اس کے برعکس انسان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ اور ایسا کچھ پاگلوں کی طرح نہیں، بلکہ بقائمی ہوش و حواس، عقل و بصیرت کی رُو سے دل و دماغ کی کامل رضامندی کے ساتھ کرے۔ آپ نے دیکھا کہ العفو کی نفسیات کس طرح خمر اور میسرہ کی کیفیت کی ضد ہے۔ خمر اور میسرہ سے اجتناب، انسانی کردار کا منفیانہ پہلو ہے۔ یعنی اس قسم کی ذہنیت پیدا نہ ہونے دینا اور العفو اس کا مثبت پہلو ہے یعنی ایسی ذہنیت پیدا کرنا۔ پہلا گوشہ حصۂ لَا ہے اور دوسرا گوشہ حصۂ اِلَّا۔ جب تک اوّل الذکر ذہنیت کو چھوڑا نہیں جائے گا ثانی الذکر (مثبت) ذہنیت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ یہ کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ (۲/۲۵۶) کے عملی مظاہرے ہیں۔ جب تک مفت دولت ہاتھ آجانے کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں آئے گی' اپنی محنت کی کمائی کو بطیبِ خاطر دوسروں کو دے دینے کی ذہنیت پیدا نہیں ہو گی۔ یہ وجہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اور اسلام یک جا نہیں رہ سکتے۔

(٠)

دوسروں کے مال و دولت کو بلا کھٹکے ہضم کر لینے کی آسان ترین شکل ان یتیموں کا سرپرست بن جانا ہے جو

صاحبِ جائیداد یا مال دار ہوں۔ ان کا سرپرست بننے میں دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ معاشرہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ شخص یتیموں، لاوارثوں کی پرورش کرتا ہے اس لئے مستحق تعریف وتوصیف ہے اور وہ ان لاوارثوں کا مال اس طرح خورد برد کرتا رہتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں اسی سوال کو لیا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال تک آئیں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے عقل و فکر پر جس قدر زور دیا ہے اور غور و تدبر کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غور و فکر کا دائرہ دنیاوی امور تک محدود ہے۔ مابعد الطبیعاتی مسائل (MATAPHYSICS) اس کی حدود سے ماوراء ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مابعد الطبیعاتی امور محسوسات کے دائرے میں نہیں آتے، اس لئے مادی اشیاء کی طرح ان کا حواس (SENSES) کے ذریعے احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کے متعلق بھی غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔ آیت (۲/۲۱۹) میں خمر۔ میسرہ۔ انفاق جیسے امور زیر بحث آتے ہیں جن کا

امورِ آخرت میں غور و فکر

تعلق (نظر بظاہر) صرف مادی دنیا سے ہے۔ اس لئے ان کے متعلق مادی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان کا تعلق انسان کی اُخروی زندگی سے بھی ہے۔ اس لئے کہ ان سے مقصد انسانی ذات کی نشوونما سے ہے اور انسانی ذات کا دائرہ اسی دنیا تک محدود نہیں۔ اس سے آگے بھی جاتا ہے جسے حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں۔ آیت (۲/۲۱۹) کے آخری الفاظ اور آیت (۲/۲۲۰) کے ابتدائی الفاظ کو ملا کر پڑھیے تو بات یوں سامنے آئے گی کہ ...

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۔

اس طرح اللہ اپنے احکام کو نہایت وضاحت سے نکھار کر اور ابھار کر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو۔

مذہب، بنیادی امور میں بھی غور و فکر کو ممنوع قرار دیتا ہے اور دین (قرآنِ کریم) دنیاوی امور ہی میں نہیں، اُخروی امور تک میں غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔

(٠)

اس کے بعد آئیے اگلی آیت کی طرف۔

۲/۲۲۰ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ـ (۲/۲۲۰)

یہ نظام ہر ضرورتمند کی دستگیری کرے گا۔ ان میں خصوصیت سے وہ لوگ سامنے آتے ہیں جو دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائیں ـــ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جن کے ماں باپ مرجائیں ـــ ان کے معاملات کو سلجھانا موجبِ خیر ہے۔ اگر تم ان سے مل جل کر رہتے ہو یا ان کے معاملات میں شرکت کرتے ہو تو ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ یاد رکھو! ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے کون اصلاح چاہتا ہے اور کس کی نیت میں فتور ہے۔ تمہیں یہ واضح ہدایات اس لئے دی گئی ہیں کہ تمہارے لئے اصلاح کا راستہ آسان ہو جائے۔ اگر اس کا قانونِ مشیت ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہیں اس قسم کی ہدایات نہ دیتا اور اس سے تم مشکل میں پھنس جاتے۔ لیکن خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے۔ (۲/۱۸۵)

لیکن آسانیوں کے یہ معنی نہیں کہ تم جو چاہو کرو۔ تم پر کسی کا کنٹرول ہی نہ ہو۔ خدا کا قانونِ مکافات، ہر بات پر پورا غلبہ رکھتا ہے اگرچہ اس کا یہ غلبہ عین حکمت پر مبنی ہے۔

لفظ یتیم کے متعلق جلد دوم صفحہ ۳۴۹ زیر آیت (۲/۸۳) میں بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں یتیم صرف ان بچوں کو کہتے ہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ اس میں یتیم ہر اس فرد کو کہتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ اس تنہائی کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی لق و دق صحرا میں اکیلا ہو۔ قرآنِ کریم کی رو سے وہ یتیم ہے جو بھرے معاشرہ میں، سینکڑوں، ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں،

یتیموں کے متعلق احکام

اپنے آپ کو تنہا پائے۔ نہ کوئی اس کا پرسانِ حال ہو نہ یار و مددگار۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے بڑی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) یعنی وہ جو اتنے لوگوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو یتیم (تنہا) پائے۔ آپ قرآن کریم کی اس نادر اصطلاح پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہمارے (اور دنیا بھر کے) موجود (غلط) معاشرے میں کس طرح ہر شخص اپنے آپ کو بھرے معاشرہ میں یتیم محسوس کرتا ہے!

یتیمی کا درد وہی محسوس کرسکتا ہے جس پر خود یہ بیتی ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے متعلق ہدایات اور احکام دینے سے پہلے حضور نبی اکرمؐ سے کہا کہ آپ تو جانتے ہیں کہ یتیم کیا ہوتا ہے اور یتیمی کا درد کسے کہتے ہیں کیونکہ

آپ پر خود یہ دور گزر چکا ہے۔ فرمایا: اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ۔ (۹۳) "کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے تجھے یتیم پایا، تو حفاظت اور پناہ کا سامان مہیا کر دیا؟" اس میں دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو

رسول اللہ کی یتیمی

یہ کہ (تاریخ کی رو سے) حضور کے والدین ابتدائی عمر میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ عرفِ عام میں یتیم ہو گئے تھے۔ دوسرے اس میں حضور کے زمانہ قبل از ہجرت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے جب آپ کے لئے مکہ میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔" فَاٰوٰى" (خدا نے تمہارے لئے حفاظت اور پناہ کا سامان فراہم کر دیا) سے مدینہ کی" پناہ گاہ "کی طرف اشارہ بھی ہوسکتا ہے۔ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے لئے جو کچھ کیا تھا اُسے اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا (۸/۷۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہر حال صورت کوئی بھی ہو، حضور سے کہا گیا ہے کہ آپ تو خود یتیمی کی منزل سے گزر چکے ہیں اس لئے: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳/۹)۔ یتیموں پر کسی قسم کی سختی نہیں کرنی چاہیئے۔

زیرِ نظر موضوع میں دونوں قسموں کے یتیموں کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یعنی ان بچوں کے متعلق بھی جن کے ماں باپ مر چکے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو (بلا لحاظِ عمر) اپنے آپ کو معاشرے میں بے یار و مددگار تنہا پائیں۔ پہلے اول الذکر کو لیجیے۔

سورۃ انعام میں ہے :۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۔

(۶/۱۵۳ نیز ۱۷/۳۴)

یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، اِلّا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر کو نہ پہنچیں۔ (۶/۱۵۳ ؛ ۱۷/۳۴)

یہاں "اَشُدَّهٗ" کہا (یعنی جوانی کی عمر)۔ دوسری جگہ اسے "نکاح کی عمر — بلوغت" سے تعبیر کیا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۔[1] (۴/۶)

(لہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۰ پر)

اور یتیموں کی بھی صحیح تربیت کرو۔ اور ان کی جانچ پڑتال کرتے رہو کہ ان کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (سنِ بلوغت ۶/۱۵۲؛ ۱۷/۳۴؛ ۲۲/۵) تک پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں عقل کی پختگی نظر آئے تو ان کا مال انہیں واپس دے دو (اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر ۴/۵ کے مطابق کرو) اور اس خیال سے کہ وہ اب سنِ بلوغت کو جلد پہنچ جائیں گے اور ان کا مال انہیں واپس دینا ہوگا۔ فضول خرچی کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔ باقی رہا ان کے مال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا معاوضہ، سو تم میں سے جو ضرورتمند نہ ہو، اسے کچھ نہیں لینا چاہیئے لیکن جو ضرورتمند ہو (یعنی ان کی جائیداد کے انتظام کے لئے اسے جو وقت صرف کرنا پڑے، اس سے اس کی اپنی آمدنی پر اثر پڑتا ہو اور اس طرح وہ تنگ دست ہو جاتے) تو وہ قاعدے اور قانون کیمطابق حق الخدمت لے لیا کرے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے سپرد کرنے لگو تو اس پر گواہ لے لیا کرو۔ اور حساب فہمی کے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ تم یہ حساب خدا کو دے رہے ہو جو ظاہر اور پوشیدہ ہر بات سے واقف ہے، اس لئے ٹھیک ٹھیک حساب لینے والا ہے۔

اس سے ذرا پہلے ہے :-

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا - (۴/۲)

یتیموں کا مال و اسباب بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی اچھی چیزیں اپنی نکمی چیزوں سے بدل لو۔ ان کا مال الگ رکھو، اپنا مال الگ۔ ان کے مال میں خُرد بُرد کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے (اور جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے) ان کا مال انہیں بحفاظت لوٹا دو۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل احکام کی شدت ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے کہا کہ تقسیمِ وراثت کے وقت اگر کوئی ایسے یتیم بچے سامنے آجائیں جن کا ترکہ میں کوئی حصہ نہ ہو تو ازرہِ تلطف انہیں بھی کچھ دے دو اور نرمی سے سمجھا دو کہ اصل پوزیشن کیا ہے :-

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ

لہ (فٹ نوٹ ۳۲۹) ان آیات میں "بلغوا النکاح" اور "اشدہ" کے الفاظ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کیونکہ (آگے چل کر) عائلی قوانین کے سلسلہ میں ان سے بڑا اہم نکتہ مستنبط ہوگا۔

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ (۴/۸)

اگر تقسیمِ وراثت کے وقت ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوں جن کا ترکہ میں حصہ نہ ہو یا دوسرے یتیم اور مساکین، تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور مناسب طور پر سمجھا دو کہ ترکہ کی تقسیم قانون اور قاعدے کے مطابق ہوگی جس کی رُو سے انہیں بطورِ حق کچھ نہیں مل سکتا۔ جو کچھ انہیں دیا گیا ہے، محض ان کی دلجوئی کی خاطر ہے۔

اس کے بعد ہے:-

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا۔ (۴/۹)

ترکہ کی تقسیم صحیح قاعدے کے مطابق کرنی چاہیئے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر تم بھی اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاؤ تو تم کبھی نہیں چاہو گے کہ ان سے بے انصافی ہو۔ لہٰذا تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ان معاملات میں ایسی بات کرو جو بالکل صاف، سیدھی اور محکم ہو۔

اور پھر وہ وعید جس کی رُو سے کہا کہ

اِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔ (۴/۱۰)

یاد رکھو! جو لوگ ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذباتِ حرص و ہوس اور بھڑک اُٹھتے ہیں۔ ان کی نیت نہیں بھرتی اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کی انسانی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم نے جہاں احسان کا حکم دیا ہے ــــ یعنی دوسروں کی کمی پوری کرنے کا۔ اس میں یتیموں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينِ (۲/۸۳؛ ۴/۳۶) "والدین، ذی القربیٰ۔ یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو"۔ دوسری جگہ کہا کہ اصل کشاد کی راہ یہ ہے کہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى (۲/۱۷۷؛ ۲/۲۱۵) "مال کی محبت کے علی الرغم اسے یتامیٰ وغیرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیا جائے"۔ حتیٰ کہ مالِ غنیمت[1] کے خمس (پانچویں حصہ) کے متعلق کہا کہ

[1] ان امور کی تفصیل متعلقہ مقامات پر آئے گی۔

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنَ السَّبِيْلِ - (۸/۴۱ ; ۵۹/۷)

یاد رکھو! میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ "خدا اور رسول" ــ یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لئے رکھ کر باقی ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا ــ مثلاً (میدانِ جنگ میں جانے والوں، اور کام آجانے والوں کے) اقرباء کے لئے یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے۔ ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔

———— (٠) ————

بے یار و مددگار

اب یتیمی کی دوسری صورت کی طرف آئیے۔ یعنی معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے۔ اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کرنے والے۔ دیکھیے، اس باب میں قرآنِ مجید کن کن گوشوں سے حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے کہ انسان بڑا عجلت پسند اور تلوّن مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ - (۸۹/۱۵) جب اس کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی دین ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت و آسائش عطا کر دیتا ہے "۔ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ - (۸۹/۱۶) جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق، بلاوجہ، ذلیل و خوار کر دیا "۔ یعنی بلا استحقاق آسائشیں حاصل ہو جائیں تو اسے قابلِ اعتراض نہیں سمجھتا لیکن اگر (بزعمِ خویش) بلاسبب تنگی آجائے تو اس پر چیخنے لگ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور غلط ہے۔ اس کے ہاں تمام فیصلے قاعدے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہاں سے نہ کسی کو بلا استحقاق کچھ ملتا ہے[1]، نہ بلاسبب چھینا جاتا ہے۔ لہٰذا، تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے

---

[1] نبوت اس سے مستثنیٰ تھی۔ یعنی وہ کسی کو حق کے طور پر نہیں ملتی تھی۔ وہ خدا کی موہبت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

کر تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا، جس میں ان لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا، ان کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا، جو تنہا رہ جائیں۔ كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ۔ (۸۹/۱۷)

غور کیجیے کہ یہاں قرآن کریم نے دو لفظوں میں کس قدر عظیم حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ عہد قدیم کا وحشی ابن آدم ہو یا دور حاضرہ کا مہذب انسان۔ اس کے ہاں معیار یہ چلا آرہا ہے کہ عزت اس کی ہوتی ہے جس کا جتھہ بڑا ہو۔ جس کی پارٹی مضبوط ہو۔ عزت تو ایک طرف۔ عہد حاضر کے نظام جمہوریت میں حق و باطل تک کا معیار اکثریت اور اقلیت قرار پاتا ہے۔ جس پارٹی کی اکثریت ہو اقتدار بھی اس کا حق اور فیصلے بھی اس کے مبنی بر عدل و صداقت۔ اقلیت کو اس کے تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔ جب معاشرہ میں اقلیت کی یہ کیفیت ہو تو ظاہر ہے کہ جو شخص تنہا رہ جائے، جس کے دست و بازو نہ رہیں۔ اسے کون پوچھے گا؟ ایسے شخص کو قرآن نے "یتیم" کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ جس معاشرہ میں یتیم کی عزت نہ ہوتی ہو وہ آخر الامر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سورۃ البلد میں اس نے اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دین کے نظام میں

قرآن کا معاشی نظام

بے شک قوم کو سرفرازیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان سرفرازیوں کے لئے ایک تو بڑی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے ان تک بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ اس نے اسی لئے اسے العقبۃ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ اس کے بعد کہا کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ (۹۰/۱۲) تم خود نہیں سمجھ سکتے کہ "العقبۃ" کیا ہے۔ آؤ تمہیں ہم سمجھائیں کہ العقبۃ کیا ہے۔ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ (۹۰/۱۳) دنیا سے غلامی اور محکومی کی لعنت کو ختم کرنا۔ ہر محکوم اور غلام کی گردن میں پڑی ہوئی زنجیر کو کاٹ پھینکنا۔ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ۔ (۹۰/۱۴)۔ جس زمانے میں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور اس طرح غریبوں اور محتاجوں پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں۔ ایسی حالت میں سامان زیست مہیا کرنا۔ کس کے لئے مہیا کرنا؟ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ (۹۰/۱۵) ان کے لئے جو ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو "یتیم" محسوس کریں أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۰/۱۶) یا ان محنت کشوں کے لئے جو محض روٹی کے ٹکڑے کی خاطر مٹی میں رلتے رہیں۔ یہ ہے "العقبۃ" دین کی گھاٹی پر چڑھنا۔!

تکذیب دین کرنے والے

یہ ہے الدین ۔۔۔ دوسری طرف وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو دین کا انکار تو نہیں کرتے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی زبان سے اپنے

مؤمن اور مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اس انداز کی زندگی بسر کرتے ہیں جو ان کے اس دعویٰ ایمان کی قدم قدم پر تکذیب کرتی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو سورۃ الماعون میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے ضروری سمجھا... کہ اسے پورے کا پورا درج کر دیا جائے۔ جہاں تک یتامیٰ کا تعلق ہے اس میں کہا گیا ہے:۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ - فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ - وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ - فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ - الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ - الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ - وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ - (۱۰۷/۱-۷)

کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دین داری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔

(دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے اسے محسوس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بےکس ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔ لیکن) اس دیندار کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، یہ اُسے دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کی مدد نہ خود کرتا ہے۔ نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ (۱۰۷/۲-۳)

کام تو ایسے کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو "دیندار" ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی، پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں۔ اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچایا جائے۔ یہ صلوٰۃ کی اس غرض و غایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے۔ (۱۰۷/۴-۵)

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف رزق کے ان سرچشموں پر جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہیئے، بند لگا کر ان پر اپنا

قبضہ جمالیتے ہیں اور اس طرح ضرورتمندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ (یوں یہ تکذیبِ دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔

ان کے برعکس، ان لوگوں کی زندگی ہے جو جنت کے مستحق ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔ (۷۶/۸) جو لوگ حرکت سے معذور ہو جائیں، یا جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں، وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائیں۔

(۰)

یہ ہیں وہ احکام و ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے یتامیٰ کے متعلق نازل فرمائی ہیں۔ ان سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم ان کے لئے اسبابِ حفاظت اور سامانِ رزق ہی کی تاکید نہیں کرتا بلکہ ایسا معاشرہ متشکل کرنے کی تاکید کرتا ہے جس میں ان کی برابر کی عزت و تکریم ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے آیۂ زیرِ نظر (۲/۲۲۰) کے ایک گوشہ پر دوبارہ نگاہ ڈالئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ، عام طور پر اس کا مفہوم "کاروبار میں شرکت" لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ یتیم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کہا کہ اسے اپنے ساتھ ملا لو۔ اسے معاشرہ کا جزو بنا لو۔ وہ تمہارے اندر گھل مل جائے۔ اس انداز سے گھل مل جائے کہ اس کی حیثیت تمہارے بھائیوں کی سی ہو جائے۔ تم اسے اپنا بھائی سمجھو وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھے۔ اس طرح اس کی تنہائی کا احساس مٹ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا تو یہ معاشرہ میں فساد کی حالت تھی۔ جب وہ تم میں سے ہو جائے گا تو یہ معاشرہ کی اصلاح یافتہ شکل ہو جائے گی۔

یہ تھی اصلاح کی وہ شکل جو قرآنِ کریم نے تجویز کی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ہماری کیا حالت ہے، اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ ہمارے ہاں جو سوختہ بخت تنہا اور کمزور رہ جائے اسے کس بُری طرح کچلا جاتا ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ باقی رہے یتیم بچے، سو انہیں یتیم خانوں میں داخل کر کے ان کے جوہرِ انسانیت کی جس طرح تذلیل کی جاتی ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ انہیں مستقلاً احتیاج، گداگری اور نفرت و حقارت کے ماحول میں رکھ کر بیسیوں قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کی آماجگاہ بنا دیا جاتا ہے وہ جن کی عزت کرنے کا قرآن نے حکم دیا تھا، معاشرہ کی ذلیل ترین مخلوق بن جاتی ہے۔

یاد رکھیئے! جس معاشرہ میں کسی ایک فرد کی بھی عزتِ نفس پر حرف آجائے وہ معاشرہ اسلامی نہیں رہتا۔ اس کا دعویٰ اسلام، دین کی تکذیب ہوتا ہے۔

(۰)

اور یہاں سے ہم اس معاشرتی (عائلی) زندگی کی طرف آتے ہیں جسے اگر قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے تو قرآن کے

عائلی زندگی

الفاظ میں وہ جنت بداماں بن جاتی ہے۔ عائلی زندگی سے متعلق احکام و ہدایات مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ انہیں اسی مقام پر یکجا سامنے لے آیا جائے ان میں نکاح، مہر، طلاق، عدت، تعدد ازواج وغیرہ سب آجائیں گے۔ اس کی ابتدا تو آیت (۲/۲۲۱) سے ہوگی لیکن ظاہر ہے کہ باقی آیات تسلسل کے ساتھ درج نہیں ہوں گی۔ موضوع کے اعتبار سے درج کی جائیں گی۔

(۰)

گھر کی زندگی (HOME LIFE) کی ابتدا "میاں بیوی" سے ہوتی ہے جو نکاح کے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔

نکاح

(۱) نکاح کو قرآن مجید نے میاں بیوی کا باہمی معاہدہ قرار دیا ہے۔ آیت (۲/۲۳۷) میں اس کے لئے عقد کا لفظ آیا ہے اور سورۃ النساء میں میثاق کا لفظ (۴/۲۱) دونوں کے معنی معاہدہ کے ہیں۔

(۲) نکاح کے لئے قرآن مجید نے عمر کا تعین خود نہیں کیا، لیکن اس نے اس باب میں جو کچھ ضمناً کہا ہے اس میں نکاح کے لئے بلوغت کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ..... (۴/۶) تم یتیم بچوں کی جانچ پڑتال کرتے رہو تا آنکہ وہ "نکاح کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ دوسری جگہ ہے۔ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ ۔ (۶/۱۵۳) "تا آنکہ وہ اپنی اشد تک پہنچ جائیں"۔ اشد بھرپور جوانی کو کہتے ہیں۔ اس نے اس کی خود وضاحت کر دی ہے جب کہا: ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا۔ (۴۰/۶۷) "تم پیدا ہوتے ہو تو بچے ہوتے ہو، پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو، پھر تم بوڑھے ہو جاتے ہو"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اشد بچپن اور بڑھاپے کا درمیانی عرصہ ہے۔ اور وہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ لہٰذا نکاح کی عمر بلوغت یا جوانی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کریم نے بلوغت کی عمر کا خود تعین نہیں کیا کیونکہ یہ آب و ہوا (اور دیگر عناصر) کی رو سے مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اس عمر کا تعین اسلامی مملکت کرے گی۔ لیکن یہ تو واضح ہے کہ نابالغ لڑکے یا لڑکی کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جب قرآن مجید نے اسے باہمی معاہدہ قرار دیا ہے تو معاہدہ کے لئے فریقین کا عاقل، بالغ، اور با اختیار ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے عورت کی مرضی کے خلاف اس کا مالک بن بیٹھنے کو حلال ہی

قرار نہیں دیا۔ سورۃ النساء میں ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا - (۴/۱۹)۔
اے جماعتِ مومنین! یہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے خلاف ان کے مالک بن جاؤ" اور ظاہر ہے کہ رضامندی کا سوال بالغ کی صورت ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی طرف سے ولی یا ولی کی اجازت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بالغ لڑکی بطیبِ خاطر خود کسی کو اپنا مختار مقرر کر دے لیکن قانون کی رُو سے اس قسم کا مختار نامہ بھی تحریری ہونا چاہیئے۔

ساردا ایکٹ

لیکن ہماری مروجہ شریعت میں نکاح کے لئے بلوغت کی شرط ہی نہیں، یہاں چھ چھ مہینے کی لڑکیوں کا نکاح ان کا ولی کر دیتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ایک ہندو ممبر (مسٹر ساردا) نے ایک بل پیش کیا جس کی رُو سے نابالغ لڑکے لڑکی کی شادی کو ممنوع قرار دیئے جانے کی تجویز تھی۔ اس کے خلاف ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ لیکن سب سے شدید مخالفت ہمارے "علمائے کرام" کی طرف سے ہوئی۔ اس درجہ شدید کہ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک کا مرکز دہلی میں قرول باغ کا علاقہ تھا۔ وہاں طے یہ ہوا کہ علماء کا ایک وفد وائسرائے کے حضور پیش ہو اور اسے بتائے کہ اگر اس قانون کا اطلاق مسلمانوں پر کیا گیا تو یہ ان کے نزدیک مداخلت فی الدین ہوگا اور اس کے خلاف ملک میں کہرام مچ جائے گا۔ مجھے وہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا جب یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں وائسریگل لاج جا رہے تھے۔ اس میں قریب قریب تمام فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے۔ میں استاذ المکرم علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمتہ) کے پاس بیٹھا تھا۔ جب یہ وفد ان کے مکان کے سامنے سے گزرا، انہوں نے فرمایا کہ یہ ہماری تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے نمائندوں کا جب بھی اتفاق ہوا ہے باطل پر ہوا ہے۔ وائسرائے نے (غالباً) ان کی درخواست کو مسترد کر دیا تو اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ چنانچہ لوگ چھ چھ ماہ کے بچوں کو گود میں اٹھائے لئے آتے تھے اور مولوی صاحبان ان کے نکاح پڑھاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تحریک کی مرکزی شخصیت کون سی تھی؟ کامریڈ کے مدیر، آکسفورڈ کے تعلیمیافتہ (مولانا) محمد علی جوہر (مرحوم)!

یہ تو پرانی بات ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں نکاح کے لئے بلوغت کی عمر شرط قرار دی گئی تھی۔ اس کے خلاف بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ ان قوانین کے منسوخ کرنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔ اور اس میں پیش پیش جماعت اسلامی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے بانی، ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا فتوٰے

ہے کہ:۔

نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفسیر تفہیم القرآن - جلد پنجم - صفحہ ۵۷۱ - طبع اوّل

نیز ماہنامہ ترجمان القرآن - بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)

وہ جنت کی حوروں کے متعلق کہتے ہیں کہ:۔

کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پاگئی ہوں گی انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۲۸۷ ؛ جلد پنجم صفحہ ۲۷۱

نیز ہفتہ وار ایشیا۔ مورخہ ۱۴ر جون ۱۹۶۹ء)

حضرت عائشہ رضؓ کی عمر

اور آپ کو معلوم ہے کہ (نابالغ لڑکیوں کے ساتھ نکاح اور خلوت کی) سند کیا ہے؟ سند ہیں وہ (وضعی) روایات جن کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہ رضؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور نو سال کی عمر میں رخصتی ہوگئی تھی۔ ان روایات نے معاندینِ اسلام کو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف ایسے اعتراضات کا موقع بہم پہنچایا ہے جن کا ہم سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ مجھے یہ روایات شروع ہی سے کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر تحقیق کی تو یہ عجیب حقیقت منکشف ہوئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ (میں نے اس پوری تفصیل کو اپنی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کے آخری باب میں درج کر دیا ہے)۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس تحقیق پر ہماری مذہبی پیشوائیت خدا کے حضور سجدۂ شکرانہ بجا لاتی کہ اس سے معاندینِ اسلام کے وہ اعتراضات باطل قرار پاگئے جن کا کوئی جواب ہم سے بن نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے الٹا مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ یہ کس جرم کی پاداش میں؟ اس جرم کی ...... کہ میری اس تحقیق کی رو سے بخاری کی حدیث غلط قرار پاجاتی ہے۔ یعنی ان حضرات کی حمیّتِ دینی اور جذبۂ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدسؐ پر اس قسم کا جگر فگار طعن پڑتا ہے تو پڑے، لیکن بخاری کی ایک روایت غلط قرار نہ پائے! امام بخاریؒ نے خود بیان کیا ہے کہ انہیں قریب چھ لاکھ احادیث ملیں جن میں سے انہوں نے پانچ لاکھ ستانوے ہزار کو مسترد

کر دیا اور صرف تین ہزار کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ اب روایت پسند حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تین ہزار میں سے کسی ایک روایت کا انکار بھی مسلمان کو کافر بنا دیتا ہے۔ یعنی وہ روایات جنھیں امام بخاری نے اپنی بصیرت کی رو سے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا، وحی منزل من اللہ کی حیثیت اختیار کر گئیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ دین میں یہی غلو ہے جس سے انسانوں کو خدا بنا لیا جاتا ہے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے ان کے بالغ ہونے کے بعد (سترہ یا انیس سال کی عمر میں) شادی کی تھی اور یہ قرآن مجید کے ارشاد کے عین مطابق تھا۔ قرآن کریم کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی۔

(۰)

(۲) ازدواجی رشتہ سے میاں بیوی کی زندگی کی ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے جس کی مدت بڑی طویل ہوتی ہے۔ جس جوڑے نے مدت العمر تک اس طرح زندگی بسر کرنی ہو ان میں باہمی پسندیدگی لاینفک شرط ہوگی۔ عورت

انتخاب

کی پسندیدگی کے متعلق تو اوپر آیت گذر چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس کی رضامندی کے بغیر تم اس کے مالک بن ہی نہیں سکتے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے اس نے کہا ہے فانکحوا ماطاب لکم من النساء۔ (۴/۳) تم ان عورتوں سے شادی کرو جو تمھیں پسند ہوں۔

قرآن کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیا ہے (ہمارے ہاں تو زوج یا زوجہ بیوی کو کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے)۔ یعنی بیوی میاں کی زوج۔ میاں بیوی کا زوج۔ (خود قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ دیکھیے (۴/۵۸) جہاں خاوند کو عورت کا زوج کہا گیا ہے)۔ لغت کی رُو سے زوج ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جیسے گاڑی کے دو پہیے کہ اگر ان میں سے ایک دوسرے سے ذرا بھی مختلف ہو تو گاڑی چل ہی نہیں سکتی قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۳۰/۲۱)

جامد مٹی سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ (LIFE CELL) کی شکل میں تھی وہ جوش نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ترا س کا ایک حصہ نر بن گیا دوسرا مادہ ــــ اس طرح تم ــــ مرد اور عورت

ـــ ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکونِ قلب حاصل کرو۔ اس نے تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری (مرد اور عورت دونوں کی) صلاحیتوں کی نشو ونما کا موجب بن گیا۔

زندگی کے اس نقشے میں بھی ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، قانونِ خداوندی کی حکمیت اور حیات بخشی کی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی میں یہ نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے جب شریفین میں کامل ہم آہنگی ہو ــــ ہم آہنگی

ہم آہنگی

طبیعت اور مزاج کی، فکر و نظر کی، ذوق و جذبات کی، نظریات اور تصورات کی، مقاصدِ حیات کی، نصب العین زندگی کی، مسلک و مشرب کی، اور سب سے مقدم ہم آہنگی عقائد کی۔ قرآن کریم نے اس کو بنیاد قرار دے کر ایک (EXTREME) مثال سے اس کی وضاحت کی ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۲۱ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ - (۲/۲۲۱)

تم جس جنتی معاشرہ کے قیام کی فکر میں ہو، اس کی ابتدا تمہاری گھر کی زندگی سے ہوتی ہے۔ للہذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ تم اپنے گھر کو جنت بناؤ۔ اس کے لئے بنیادی سوال یہ ہے کہ میاں بیوی کا انتخاب کس معیار کے مطابق ہونا چاہیئے؟ اسی معیار کے مطابق جس کی رُو سے تمہاری امت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر۔ تمہاری آئیڈیالوجی یہ ہے کہ اطاعت صرف ایک خدا کے قوانین کی ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میاں بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی میں متفق ہوں۔

بنا بریں، تم کسی مشرک عورت سے شادی نہ کرو تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئے۔ مشرک آزاد عورت سے مومن لونڈی[1] بہتر ہوتی ہے خواہ اول الذکر تمہیں کتنی ہی جاذبِ نگاہ کیوں نہ دکھائی دے۔ اسیطرح مومن عورتیں مشرک مردوں سے شادی نہ کریں تا وقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مشرک آزاد مرد سے مومن غلام بہتر ہے خواہ

---

[1] (دیکھئے نوٹ صفحہ ۳۴۲ پر ملاحظہ ہو)

اول الذکر کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔ یہ اس لئے کہ متضاد آئیڈیالوجی رکھنے والوں کا یک جا جمع کر دینا جہنم پیدا کر دے گا۔ اس لئے خدا کا قانون تمہیں اس سے روکتا ہے۔ وہ تمہارے گھر کی زندگی کو جنت کی آسودگیاں عطا کرنا اور تمہیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

خدا اس طرح اپنے احکام کو لوگوں کے لئے واضح کر دیتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے ایک ہی آیت میں کتنے اہم امور کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم آہنگیٔ فکر ونظر کو لیتے ہیں۔ مسلمان مرد کے مشرکہ عورت اور مسلمان عورت کے مشرک مرد سے نکاح کو حرام قرار دینا محض ایک قانونی (فقہی) مسئلہ نہیں۔ یہ ازدواجی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا بنیادی سوال ہے۔ قلب ونگاہ میں عدم موافقت سے ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے اور ان کی ہم آہنگی سے جنت۔

پھر قرآن نے لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اور لَوْ اَعْجَبَكُمْ کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ بنیادی معیارِ انتخاب حسن وجمال کی فریفتگی اور کشش نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ثانوی چیز ہے۔ اس کے بعد عبد اور امۃ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ مال ودولت اور حسب ونسب بھی معیارِ انتخاب نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تمام چیزیں اضافی ہیں۔ حقیقی معیارِ انتخاب قلب ودماغ کی ہم آہنگی اور فکر ونگاہ کی یک رنگی ہے۔ اس قسم کی مطابقت سے ازدواجی زندگی جنت بداماں بن جائے گی۔ اور اگر اس قسم کی ہم آہنگی نہیں ہوگی تو حسن وجمال، مال ودولت، خاندان اور قبیلہ، حسب ونسب کے باوجود گھر، جہنم بنا رہیگا۔

(۳) بعض رشتے ابدی طور پر حرام ہیں۔ یعنی پسندیدگی وغیرہ کے باوجود، ان سے کسی مسلمان (مرد یا عورت) کا نکاح جائز ہی نہیں۔

(ا) مشرک مرد اور عورت کے متعلق اوپر یہ آیت آ چکی ہے (۲۲۱/۲)۔ دوسری جگہ اَلْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کہہ کر واضح کر دیا کہ عورتوں کا مومن ہونا ضروری ہے۔ اس کی استثناء ذیلی شق (ب) میں دی گئی ہے۔

لہ (فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۰)۔ یہ اسلام کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے جس میں ہنوز زمانہ جاہلیت کی لونڈیاں اور غلام مسلمانوں کے ہاں موجود تھے۔ اسلام نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو آہستہ آہستہ اپنے معاشرہ کا جزو بنا لیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (تفصیل غلام اور لونڈیوں کے عنوان میں ملے گی)

(ب) مسلمان مرد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن مسلمان عورتیں اہل کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کر سکتیں۔ سورہ المائدہ میں ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (۵/۵)

تم نے غور کیا کہ حلت و حرمت کے قرآنی احکام نے انسانی زندگی میں کیا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ اس سے پہلے انسانوں کی خود ساختہ شریعتوں نے اس باب میں ہزار قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس سے انسانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ قرآنی دور میں چند چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی تمام خوشگوار چیزیں حلال قرار دے دی گئیں۔ اس سے کس قدر میدان وسیع ہو گیا؛ نیز اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ (اس میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو تمہارے ہاں حرام ہے اور)

وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے جائز سمجھیں۔

کھانے پینے سے آگے بڑھ کر ازدواجی زندگی کی طرف آؤ تو تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی عقدِ نکاح میں لانے کے لئے جائز ہیں۔

واضح رہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی صرف اجازت ہے حکم نہیں۔ اسلامی مملکت بعض مصالح کی بنا پر اس اجازت پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔ جیسا کہ (تاریخ بتاتی ہے کہ) حضرت عمرؓ نے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر ان سے شادی پر پابندی لگا دی تھی۔ اس مقام پر اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت قرآن کے حلال کردہ پر وقتی پابندی لگا سکتی ہے۔ اسے ابدی طور پر حرام قرار نہیں دے سکتی۔ نہ ہی اس کے حرام کردہ کو حلال قرار دے سکتی ہے۔

محرمات

(ج) قرآن کریم نے محرمات کی تفصیل خود بیان کر دی ہے۔ آیت (۴/۲۲) میں ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے شادی کی ہو ان سے نکاح مت کرو۔ اس سے پہلے تم جو کچھ کر چکے ہو کر چکے۔ اب ایسا نہ کرنا۔ یعنی سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہے۔ اسی کے بعد ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (۴/۲۳)

علاوہ ازیں تم پر حسب ذیل رشتوں کی عورتیں بھی نکاح کے لئے حرام قرار دی گئی ہیں۔ تمہاری ---(۱) مائیں (۲) بیٹیاں۔ (۳) بہنیں۔ (۴) پھوپھیاں، (۵) خالائیں، (۶) بھتیجیاں۔ (۷) بھانجیاں۔ (۸) وہ عورتیں جن کا تم نے دودھ پیا ہو۔ وہ بمنزلہ ماؤں کے ہیں۔ (۹) تمہاری دودھ شریک بہنیں۔ (۱۰) تمہاری بیویوں کی مائیں (۱۱) تمہاری بیویوں کی (سابقہ شوہر سے) لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں پرورش پاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہیں۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تم ان بیویوں سے خلوت کر چکے ہو۔ اگر خلوت نہ کی ہو تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (۱۲) تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں۔ (منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔ (۳۳/۳۷)۔

(۱۳) نیز یہ بھی حرام ہے کہ (جب ۴/۳ کے مطابق تعدد ازدواج کی ضرورت پڑجائے تو) تم بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔

ان احکام سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ان کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ یاد رکھو! تمہاری ذات کی حفاظت اور نشو و نما صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد ہے: وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ (۴/۲۴) ان عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے جو دوسروں کے نکاح میں ہوں۔ بجز ان کے جن کے ساتھ تم پہلے نکاح کر چکے ہو --- یا لونڈیوں سے۔

ان احکام میں دو تین نکات وضاحت طلب ہیں۔

رضاعت

(۱) رضاعی ماؤں اور رضاعی بہنوں سے نکاح حرام ہے۔ قرآنِ کریم نے رضاعت کی تشریح خود نہیں کی۔ یعنی کتنے عرصہ کے لئے دودھ پلایا ہو۔ نہ ہی رضاعی بہن کے متعلق متعین طور پر کہا ہے کہ ان دونوں بچوں نے کتنے عرصہ تک اکٹھے دودھ پیا ہو۔ اسلامی مملکت اس ضمن میں جزئی توانین خود وضع کرے گی۔ ویسے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے رضاعی ماں وہ ہو گی جو بچے کو اس کی دو سال

کی عمر کے اندر دودھ پلائے اور رضاعی بہن وہ جو اس بچے کیساتھ ماں کا دودھ پئے۔ یہ بہرحال ہمارا استنباط ہے۔ اس کی قانونی حیثیت اسلامی مملکت ہی متعین کر سکتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح حرام ہے۔

(ii) صلبی بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔ منہ بولے بیٹوں کے متعلق دوسرے مقام پر ہے۔ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳/۴) وہ حقیقی بیٹے نہیں بن جاتے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے متبنیٰ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔

(iii) "محصنٰت" سے نکاح حرام ہے۔ محصنٰت کے معنیٰ پاکدامن عورتیں بھی ہیں اور شادی شدہ عورتیں بھی۔ آیت (۴/۲۴) میں محصنٰت سے مراد وہ عورتیں ہو سکتی ہیں جو کسی اور کے نکاح میں ہوں۔ ان سے نکاح حرام ہوگا۔ صدرِ اول میں البتہ ایک واقعہ سامنے آگیا تھا جس میں اس حکم میں استثناء کی ضرورت لاحق ہوگئی تھی۔ ابتدائی ہجرت کے بعد مکہ میں ایسی عورتیں رہ گئیں جو خود تو اسلام لے آئی تھیں لیکن ان کے خاوند مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں وہ عورتیں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ چلی آئیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے: فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ .... (۶۰/۱۰) انہیں ان کے غیرمسلم خاوندوں کی طرف مت لوٹاؤ۔ نہ یہ اُن کے لئے حلال ہیں، نہ وہ ان کے لئے حلال۔ انہیں یہیں رکھو۔ البتہ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا۔ جو کچھ (ان کے ساتھ نکاح کے سلسلہ میں) ان کے خاوندوں کا خرچ آیا ہو وہ انہیں ادا کردو۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ .... (۶۰/۱۰) اس کے بعد ان سے نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ اسلام چھوڑ دینے سے نکاح باقی نہیں رہتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت کو جزئی قوانین وضع کرنے ہوں گے۔

(iv) قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ آیا ہے جس کے عمومی معنی غلام اور لونڈیاں لئے جاتے ہیں۔ غلامی کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول صفحہ ۲۶ آیت (۲/۱۷) اور جلد دوم صفحہ ۳۵۵ آیت (۲/۵۸) میں گذر چکی ہے۔ یہ زمانۂ نزولِ قرآن کا ذکر ہے۔ اب غلاموں اور لونڈیوں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(v) نکاح سے متعلق آیات میں عورت کو کچھ دینے کی شرط بھی آتی ہے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

(۴) نکاح کے لئے قرآنِ کریم نے کوئی رسم تجویز نہیں کی حتیٰ کہ اس میں "نکاح پڑھانے" کا بھی ذکر نہیں۔ لیکن چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسلامی حکومت معاہدات کی توثیق کے لئے جو ضابطہ مقرر کرے اس کا اطلاق اس معاہدہ پر بھی ہوگا۔ قانونی ضرورت کے علاوہ، معاشرتی طور پر بھی ضروری ہے کہ اس امر کا اعلان ہو کہ فلاں مرد اور عورت نے باہمی نکاح کیا ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے۔ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ۔ (۵/۵) "نکاح سے مقصد ازدواجی زندگی کی پابندیاں پوری کرنا ہیں۔ نہ محض جنسی خواہش کی تسکین، اور نہ ہی پوشیدہ تعلقات"۔ نکاح کا اعلان پوشیدہ تعلقات کے امکان کو ختم کر دے گا۔ اس لئے یہ ازدواجی زندگی کی لازمی شرط ہوگی۔ جو نکاح پوشیدہ رکھا جائے، قرآنِ کریم کی رُو سے جائز نہیں ہوگا۔

(۵) سورۃ النور میں ایک آیت ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (۲۴/۳)

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:۔

زانی مرد صرف زانیہ (عورت) یا مشرکہ سے نکاح کرتا ہے اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک سے نکاح کرتی ہے۔ مومنوں پر یہ حرام ہے۔

اس ترجمہ کی رُو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مرد کا نکاح کسی پاکدامن عورت سے اور اسی طرح زانیہ عورت کا نکاح کسی پاکباز مرد سے جائز نہیں۔ زانی اور زانیہ یا تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں یا مشرکوں سے۔ لیکن یہ مفہوم ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں نکاح کا لفظ اپنے بنیادی معانی (مجامعت) کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مومن مرد یا مومن عورت میں سے ایک بھی پاکباز رہنا چاہے تو فعل زنا کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے (زنا بالجبر کا سوال الگ ہے)۔ بلا اس فعل کا ارتکاب وہ کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے (یعنی مشرک)۔ مومن ایسا نہیں کر سکتے۔ اس سے فعل زنا کی شناعت کی وضاحت مقصود ہے۔

———(۰)———

تعددِ ازدواج

ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال بڑی اہمیت

رکھنا ہے۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم نے وحدتِ زوج یعنی ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کا اصول مقرر کیا ہے۔ (فَوَاحِدَۃً - ۴/۳ اس کی سند ہے۔ پوری آیت آگے چل کر سامنے آئے گی) اگر کسی وقت بیوی سے نباہ کی صورت نہ رہے تو اس اصول کی رو سے اس کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔ اس کی جگہ دوسری بیوی لائی جاسکے گی۔ سورۃ النساء کی آیت (۴/۲۰) میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ۔ "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو اس کے لئے پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کرو" (اسے طلاق کہتے ہیں)، اس مقام پر ہم نے ان آیات کے حوالے صرف یہ بتانے کے لئے دیئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اصول وحدتِ زوج کا ہے (ان آیات کی تشریح و تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی)۔ لیکن بعض ہنگامی حالات میں قرآنِ مجید نے اس اصول میں استثناء (RELAXATION) بھی کی ہے۔ یہ ہنگامی حالات کس قسم کے ہوسکتے ہیں؟ اس کے لئے صدرِ اول کے اسلامی معاشرہ کو سامنے لانا چاہیئے۔

مدنی زندگی میں مخالفین کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مسلمانوں کی مقدار پہلے ہی (مقابلتًہ) بہت کم تھی۔ ان جنگوں میں شہادات کی وجہ سے ان میں اور بھی کمی واقع ہوگئی ــــ اور کمی بھی نوجوانوں میں کیونکہ جنگوں میں اکثر و بیشتر نوجوان ہی شریک ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی مقدار زیادہ ہوگئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں اپنے سابقہ (غیر مسلم) شوہروں کو چھوڑ کر (ہجرت کرکے) مدینہ آگئیں۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ انہیں ان کے شوہروں کی طرف لوٹایا نہ جائے۔ ان سے یہیں شادی کر لی جائے۔ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتی (حتیٰ کہ اہلِ کتاب سے بھی نہیں)۔ اس سے معاشرہ میں عجیب سی صورت پیدا ہوگئی۔ بیوہ عورتیں (اور ان کے یتیم بچے) نیز شادی کی عمر تک پہنچی ہوئی (جوان ناکتخدا) لڑکیاں، کثیر تعداد میں، اور اصول وحدتِ زوج کا۔ اس نے ایک تمدنی مشکل پیدا کردی۔ ان عورتوں کو باعزت مقامِ حفاظت دینا نہایت ضروری تھا۔ اس مشکل کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء پیدا کرکے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیجائے تاکہ یہ مشکل مسئلہ حل ہوجائے۔ یہ تھا وہ استثنائی حل جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ

اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا - (۴/۳)

اگر تم دیکھو کہ بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، ناکتخدا جوان لڑکیوں کے مسئلہ کا اور کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو اس مشکل کے حل کے لئے تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان بے شوہر عورتوں میں سے جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں (۴/۱۹) نکاح کر لو۔ اور جیسا بھی حالات کا تقاضا ہو دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح میں لے آؤ۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ تم اس طرح مختلف افراد خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک بیوی کے اصول پر کاربند رہو ۔۔۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے پہلے اپنے نکاح میں لا چکے ہو۔ بے انصافی یا کثرتِ اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لئے وحدتِ زوج کا اصول زیادہ مناسب رہے گا۔

اس آیت میں پہلا (غور طلب) لفظ یتامیٰ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربی زبان میں یتیم کا لفظ ان بچوں تک محدود نہیں جن کے ماں باپ مر چکے ہوں۔ اس میں ایسی عورتیں بھی شامل ہیں جن کا شوہر نہ ہو، خواہ وہ بیوہ ہوں اور خواہ وہ ناکتخدا جوان لڑکیاں۔ خود قرآنِ کریم نے "یتٰمی النساء" (۴/۱۲۷) کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ "یتیم عورتیں" یعنی وہ عورتیں جو تنہا یعنی بلا شوہر کے ہوں۔

دوسرا لفظ تَعُوْلُوْا ہے (مادہ ع - و - ل) ہے جس کے معنیٰ ہر وہ شے ہیں جس کے بوجھ تلے انسان دب جاتے۔ اہل و عیال میں عیال کے معنیٰ بال بچوں کا بوجھ ہیں۔ اسی سے "عالی المیزان" ہے جس کے معنیٰ ہیں ترازو کے ایک پلڑے کا جھک جانا۔ اس کے دونوں پلڑوں کا وزن برابر نہ رہنا۔ یہاں سے اس کے معنیٰ ناانصافی کے آتے ہیں۔

اب آئیے آیۂ زیر نظر (۴/۳) کی طرف۔ اس میں تعدد ازدواج دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

(۱) اگر معاشرہ میں بے شوہر عورتوں کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے اور اس کا کوئی مناسب حل نہ مل سکے تو وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء کر کے ان عورتوں سے شادی کی اجازت ہے۔

(۲) یہ اجازت پھر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ افرادِ خاندان میں عدل قائم رکھا جا سکے اور (اگر بال بچوں کی پرورش انفرادی ذمہ داری ہے تو) تمام اہل و عیال کی مناسب پرورش ہو سکے۔ یہ مسئلہ بوجھ نہ بن جائے جہاں تک عدل کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے خود ہی بتا دیا کہ اس سے مراد مساویانہ سلوک اور برتاؤ ہے نہ کہ جذبات کا عدل۔ اسی لئے جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر کہا گیا:-

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ
الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا
رَّحِيمًا ۔ (۴/۱۲۹)

تم ہزار چاہو۔ جذباتی عدل تم قائم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے اس عدل کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو عدل مقصود اور ممکن ہے وہ یہ ہے کہ تم کسی ایک بیوی کی طرف اس قدر نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی اُدھر لٹکی رہ جائے۔ یہی وہ اصلاحی شکل ہے جس سے قانونِ خداوندی کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔ اس سے تم گھر میں ناہمواریوں کے مضرات سے محفوظ رہ سکو گے اور راحت اور سکون کی زندگی گزار سکو گے۔

قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کے متعلق صرف یہی ایک آیت (۴/۳) ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ یہ اجازت کتنی شرطوں سے مشروط ہے۔ یعنی

(۱) معاشرہ میں ایسے ہنگامی حالات کا پیدا ہو جانا جس میں بے شوہر عورتوں اور یتیم بچوں کی کثرت ایک مسئلہ (PROBLEM) بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ اسلامی مملکت ہی کرے گی کہ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں یا نہیں۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ گھر میں عدل (مساویانہ سلوک اور برتاؤ) کو قائم رکھ سکو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہو گی۔ اس کے بغیر مساویانہ سلوک کی صورت بھی ممکن نہیں ہو گی۔ اور

(۳) تیسری شرط یہ کہ تم اس قدر عیال داری کا بوجھ برداشت کر سکو۔

اگر ایسے ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوتے تو ایک سے زیادہ بیویوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اجازت بے سہارا عورتوں کے لئے ہے، باعزت مقامِ حفاظت مہیا کرنے کے لئے ہے۔ آپ سوچئے کہ جس اجازت کی ابتداء ہی "وَاِنْ خِفْتُمْ" سے ہوئی ہے (اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو) تو اس شرط کے بغیر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت قرآن سے تو نہیں مل سکتی!

(۰)

ازواجِ مطہرات

قرآنِ کریم نے حضورؐ نبی اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج (مطہرات) کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ ایک وقت میں حضورؐ کے حرم میں کتنی بیویاں تھیں۔ نہ ہی ان کی کل تعداد بتائی ہے لیکن ایک سے زیادہ ازواج کا ذکر ضرور آیا ہے۔ قرآنی تحدید (چار کی حدبندی) کی روشنی میں

بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی تعداد ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی کتاب "معراج انسانیت" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کا جواز وہی ہنگامی حالات تھے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بعد میں یہ ہنگامی حالات ختم ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ خوش حال اور مرفہ الحال بھی ہو گیا۔ لیکن اس مرفہ الحالی میں سب سے غریب گھرانہ سربراہِ مملکت حضورؐ نبی اکرم کا تھا۔ اس تبدیلیٔ احوال و ظروف پر حضورؐ کی ازواج مطہرات کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو کاشانۂ نبوی کو چھوڑ کر اور جگہ چلی جائیں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ـ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ـ (۳۳/۲۸-۲۹)

اے رسول! تم اپنی بیویوں پر اس حقیقت کو واضح کر دو کہ (اگر تمہیں میری رفاقت میں رہنا ہے تو تمہاری زندگی کا مقصد اس مشن کی تکمیل ہو گا جسے میں لے کر اٹھا ہوں لیکن) اگر تمہارے پیش نظر محض طبعی زندگی کے مفاد اور دنیاوی زیب و زینت کی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر ہماری زندگی باہمی رفاقت کی نہیں ہو سکتی۔ (رفاقت، مقصد کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اگر مقصد میں اشتراک نہیں تو پھر رفاقت کیسی؟ یہ لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ ہنگامی حالات میں تیرے ہاں آئی تھیں۔ اُس وقت اولین مقصد ان کی حفاظت اور پناہ دہی تھا۔ اب جبکہ حالات اعتدال پر آ چکے ہیں انہیں اپنے سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کی اجازت ہونی چاہیئے۔ بنا بریں) تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا کہ تم طوعاً و کرہاً میرے ساتھ رہو۔ اگر تمہاری منشا الگ ہو جانے کی ہو تو) میں تمہیں ضروری سامان دیئے دیتا ہوں اور نہایت عمدگی سے رخصت کر دیتا ہوں (۳۳/۵۱)۔ (تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اب ایک مملکت حاصل ہو گئی ہے اس لئے تمہاری زندگی شاہانہ ٹھاٹھ کی ہو گی۔ مملکت کے ساتھ جو ذمہ داریاں آتی ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہو گا کہ اس گھر کا معیار مملکت کے غریب ترین فرد کی زندگی کا معیار ہو۔ اس لئے مجھے اور میرے ساتھ میرے متعلقین کو غریبوں کی سی زندگی بسر کرنی ہو گی)۔

اگر تم نظامِ خداوندی کے لئے زندگی وقف کر دینا چاہو اور طبعی زندگی کے قریبی مفاد پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دو تو تم میں سے جو بھی اس طرح حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے گی خدا کا قانونِ مکافات اسے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔

یہ اذنِ خداوندی ازواجِ مطہرات تک پہنچا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس آستانہ عالیہ کو چھوڑنے کا خیال تک نہ کیا۔ اس کے بعد حضورؐ نبی اکرم سے بھی کہہ دیا گیا کہ چونکہ وہ ہنگامی حالات ختم ہو چکے ہیں جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی تھی اس لئے آپ بھی اب نہ کوئی نئی شادی کر سکتے ہیں نہ ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں لا سکتے ہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا۔ (۳۳/۵۲)

اس کے بعد تمہارے لئے کسی نئی عورت سے شادی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہ کہ ان بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کسی اور عورت سے نکاح کر لو خواہ اس کی خوبیاں تمہیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگیں۔ اب تیری بیویاں وہی رہیں گی جو تیری بیویاں بن چکیں۔

یاد رکھو! خدا کا قانون تمام امور کی نگہداشت کرتا ہے۔

(۰)

(یہاں ان آیات کو ضمناً درج کیا گیا ہے۔ ان کی تشریح اور دیگر متعلقہ آیات کا اضافہ مناسب مقام پر کیا جائیگا)

یہاں پر آپ کے دل میں یہ سوال ابھرے گا کہ قرآن کریم کے اس قدر واضح احکام و ہدایات کے علی الرغم یہ جو ہمارے ہاں بلا مشروط چار چار تک شادیوں کا معمول چلا آ رہا ہے تو یہ سلسلہ کیسے شروع ہو گیا اور اس کی سندِ جواز کیا ہے؟ اس کا جواب اس دورِ ملوکیت سے پوچھئے جب قرآنِ مجید کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور نفسانی خواہشات کا اتباع زندگی کا شعار بن گیا۔ اور سند اس کی وہ وضعی روایات قرار پا گئیں جو اس مقصد کے لئے جعلی سکوں کی طرح "خفیہ ٹکسالوں" میں ڈھلنی شروع ہو گئیں۔ اس طرح یہ اجازت بلا مشروط ہو گئی۔ آپ کو نکاح کی کسی مجلس میں شرکت کا موقع ملے تو نکاح خواں (مولوی صاحب) جو کچھ پڑھتے ہوں اسے کان لگا کر سنیئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت (۴/۳) کی ابتدا ہی "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ" سے کریں گے یعنی "وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى —— (شرط) کے الفاظ غائب کر جائیں گے اور اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو جائیں گے کہ بلا مشروط تعدد ازواج کی قرآنی سند حاصل ہو گئی —— میں نے ایسے مطبوعہ نکاح نامہ کے فارم بھی دیکھے ہیں جن پر یہ آیت "فانکحوا ما طاب لکم" سے شروع کی گئی تھی —— ان حضرات کو اس کا بھی علم نہیں کہ قرآن کریم میں ان کی اس تحریف کے باوجود "فانکحوا" کا (ف) کس طرح ان کی اس فریب دہی کا پردہ چاک کر رہا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، جملہ شرطیہ میں، پہلے "اگر" ہوتا ہے اور اس کے بعد "تو"۔ (مثلاً اگر تم آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا) اگر کوئی شخص "اگر" والی شرط کو حذف کر کے بات یوں شروع کرے ۔ تو میں جاؤں گا ۔ تو یہ بے معنی جملہ اس کی جہالت (بلکہ حماقت) کی دلیل ہوگا۔ اس سے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ "ان خفتم" کے بغیر "فانکحو" سے بات شروع کرنا کس قدر جہالت یا فریب دہی ہے!

ایک لطیفہ اور بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی صاحب لڑکی والوں کے گھر میں بیٹھے نکاح پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اور دولہا کے کان میں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تم دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ یہ تو غنیمت ہے کہ لڑکی والے (قرآن کریم کے) عربی زبان کے ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ مولوی صاحب ان کے ہونے والے داماد کو کیا پٹی پڑھا رہے ہیں تو وہ انہیں کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔ اس مقام پر ہندوؤں کی مقدس کتاب (وید) کے اشلوکوں کے متعلق ایک بات یاد آگئی۔ ہندوؤں کے ہاں بھی شادی کی تقریب پر کچھ مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور ان میں ویدوں کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ ان اشلوکوں کے متعلق ہندوؤں کے ایک ممتاز ودوان (عالم) پنڈت گنگا پرشاد آپا دھیائے (ایم۔اے) پردھان آریہ سماج الہ آباد نے اخبار آریہ متر بابت ۶ر جون ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔

> وہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵۔ منتر ۳۸ منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا ور (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کریگا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سروا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یدی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے ورُدھ (خلاف) یا تو بھیانک ورُدھ (خوفناک مخالفت) ہوگی یا لوگ اسے اپیکشا کی درشٹی سے (بنظرِ حقارت) چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (بُری) ہیں۔

(دیکھیے میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" ص۱۳۷۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۷۷ء)

"مذہب" خواہ کوئی بھی ہو، گپت ودیا (یعنی جسے عوام نہ سمجھ سکتے ہوں) بڑا پردہ پوش اور بھرم قائم رکھنے کا موجب ہوتا ہے!

(۰)

قرآنِ کریم نے اسلامی معاشرے سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں لوگوں کے لئے نکاح

میں آسانیاں ہوں۔ فرمایا:۔

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَ الصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَ اِمَآئِكُمۡ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۔ (۲۴/۳۲)

تمہارے معاشرہ کا یہ بھی فریضہ ہے کہ جن لوگوں ـــــ مردوں یا عورتوں ـــــ کی شادی نہ ہوئی ہو (خواہ وہ کنوارے ہوں، یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں) ان کے نکاح کا مناسب انتظام کرے نیز تمہارے غلاموں اور لونڈیوں[1] میں سے جو شادی کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے نکاح کا بھی بندوبست کیا جائے۔ (یعنی معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ لوگوں کو مناسب رشتہ تلاش کرنے میں آسانیاں ہوں۔ اور) جسے متاہل زندگی بسر کرنے کے لئے معاشی امداد کی ضرورت ہو اس کا بھی مناسب انتظام کیا جائے۔

یہ سب اس خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف سے ہونا چاہیئے جو بڑی وسعتوں کا مالک اور ہر ایک کے حالات سے باخبر ہے۔ (قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم شدہ نظامِ مملکت کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔)

لیکن قرآنِ کریم کی رو سے نکاح کرنا کوئی حکم یا فریضہ نہیں۔ جو لوگ کسی وجہ سے بطیبِ خاطر مجرد رہنا چاہیں یا جن کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہوسکے، ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہیں ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیئے:۔

وَ لۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۔ (۲۴/۳۳)

جن لوگوں کے لئے رشتے کا انتظام نہ ہوسکے انہیں ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنی عفت کو محفوظ رکھنا چاہیئے تاآنکہ نظامِ خداوندی ان کے لئے ضروری سہولتیں بہم پہنچا دے۔

یہاں سے ایک اور اہم سوال کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم نے کھانے پینے کی چیزوں کی حرمت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اگر کسی وقت اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو بقدرِ ضرورت حرام چیزوں کے کھا لینے کی اجازت ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس نے نہ اضطراری کیفیت کا ذکر کیا ہے، نہ ایسی صورت میں کسی ناجائز طریق کے اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے (قرآنی حدود و شرائط کے مطابق) نکاح کی شکل کو جائز طریق قرار دینے کے بعد واضح طور پر کہہ دیا کہ فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

---

[1] جیسا کہ متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم میں جہاں جہاں غلام اور لونڈیوں کا ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربی معاشرہ میں موجود تھیں۔

الْعٰدُوْنَ ۔ (۲۳ : ۷) ۔ جو کوئی جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس کے سوا کوئی اور شکل اختیار کرے تو وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی ہوگی۔

انسانی جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضوں (بھوک، پیاس، نیند وغیرہ) اور جنسی جذبہ میں بنیادی فرق ہے جسم کی پرورش کے طبیعی تقاضے از خود بیدار ہوتے ہیں۔ اگر انہیں پورا نہ کیا جائے تو انسان بیمار ہوجاتا ہے اور اس کے بعد نوبت موت تک آسکتی ہے۔ (مثلاً آپ کسی کام میں اس طرح منہمک ہوں کہ آپ کو دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہو۔ اس دوران میں آپ کو پیاس لگے تو اس کی تسکین (پانی) کا تقاضا بیدار ہونا شروع ہوجاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اس قدر شدت اختیار کرجاتا ہے کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کی تسکین (پانی پینے) کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ پانی نہیں پیتے تو بیمار ہوجاتے ہیں۔ اور چند دنوں تک اس حالت کو جاری رکھیں تو آپ پر موت وارد ہوسکتی ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی یہ صورت نہیں۔ جب تک آپ اس کا خیال نہ کریں یہ بیدار ہوتا ہی نہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آپ اس کی تسکین کی صورت پیدا نہ کریں تو آپ بیمار پڑجائیں یا آپ کی موت واقع ہوجائے۔ جنسی خواہش کو بار بار بیدا کرنے کے بعد اس کی تسکین نہ کی جائے، یا غلط طریقوں سے تسکین کی جائے تو اس سے البتہ بعض اعصابی بیماریاں اور نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسے اصطلاح میں جنسی بدنہادی (SEX - PERVERSION) کہتے ہیں۔ لیکن اگر اسے بیدار نہ کیا جائے تو اس سے عوارض کا پیدا ہونا تو ایک طرف، انسان کے مضمر جوہر اس قدر توانائی حاصل کرلیتے ہیں کہ عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کے ضبطِ خویش کو قرآن "عفت" کہہ کر پکارتا ہے۔ میں اس موضوع پر تفصیل سے دیگر مقامات پر لکھ چکا ہوں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم۔ میں "جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر" اور "ضبطِ ولادت" سے متعلق خطوط ملاحظہ فرمائیں۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے منکوحہ بیوی سے مباشرت کے سوا، جنسی جذبہ کی تسکین کی کوئی شکل جائز نہیں!

—— (۰) ——

مہر

قرآنِ کریم نے نکاح کے سلسلہ میں ایک اور شرط کا بھی ذکر کیا ہے۔ سورۃ النسآء میں محرمات کی تفصیل دینے

کے بعد کہا ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ۔ (۴/۲۴) "ان عورتوں کے سوا باقی عورتوں سے نکاح حلال ہے بشرطیکہ تم انہیں نکاح کے لئے چاہو کچھ مال دے کر"۔ اس "مال دینے" کو اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔ (مہر اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ مہارت، ماہر، مُہر وغیرہ الفاظ اسی مادہ سے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے صَدُقٰتِهِنَّ کی اصطلاح آئی ہے۔ (۴/۴) یا اُجُوْرَهُنَّ کی (۴/۲۴؛ ۵/۵؛ ۳۳/۵۰؛ ۶۰/۱۰؛ ۴/۲۵)۔ اجُور، اجر کی جمع ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ تعلقات کا "معاوضہ" ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ کسی چیز کا معاوضہ (اُجرت) نہیں۔ یہ کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مرد کی طرف سے اپنی ہونے والی بیوی کے لئے تحفہ ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً۔ ۴/۴)۔ جو بڑا ہی بلیغ اور (SUGGESTIVE) ہے۔ نحل، شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ نحلة کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح شہد کی مکھی سینکڑوں میل کی مسافت کر کے پھولوں کے رس کا ایک قطرہ لاتی ہے اور اسے بغیر کسی معاوضہ کے چھتہ میں جمع کر دیتی ہے، مرد کی طرف سے مہر اسی طرح تحفۃً بیوی کو دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحفہ کا مفہوم اس سے بھی زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ جیسا کہ جلد دوم صفحہ ۱۲۵-۱۱۸، زیرِ آیت (۲/۳۶) میں بتایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم مرد اور عورت کو مساوات کا درجہ دیتا ہے لیکن ازدواجی رشتہ استوار ہونے کی صورت میں قرآن کہتا ہے کہ عورت کا وزن مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ نکاح کے ترازو میں عورت کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے، اور دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کے لئے مرد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی رکھے۔ اس طرح مرد + تحفہ = عورت، کی مساوات (EQUATION) صحیح بیٹھتی ہے۔ یہ ہے مہر کی صحیح پوزیشن۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے مہر کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں صَدُقٰتِهِنَّ تو قابلِ فہم ہے۔ یعنی مرد اپنی ہونے والی بیوی کے لئے محبت اور لطافت کے جو جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے، ان کی صداقت کے ثبوت (یا دلیل) میں کچھ تحفہ دیتا ہے۔ لیکن قرآن میاں بیوی کا جو مقدس رشتہ استوار کرتا ہے اس کی روشنی میں "اُجُوْرَهُنَّ" کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

اُجُوْرَهُنَّ سے مراد

اس سلسلہ میں اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اس لئے اس نے اپنے ہاں وہی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ ان کے مفہوم کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عرب انہیں کن معانی

ہیں استعمال کرتے تھے۔ اگر ان معانی میں اور ان میں جن میں انہیں قرآن استعمال کرتا ہے، کچھ فرق ہے تو قرآن اپنے معانی کی وضاحت کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی صراحت کر دیتا ہے کہ اس لفظ یا اس اصطلاح کا قرآنی مفہوم کس طرح عربوں کے ہاں مروج یا قدیم سے مختلف ہے۔ (مثلاً) عربوں کے ہاں خاوند کو بعل کہتے تھے۔ بعل زمانہ قدیم میں ایک بُت کا نام تھا (۳۷/۱۲۵) اور خود عرب بھی اپنے بتوں کو بعل کہتے تھے۔ ان کے ہاں چونکہ خاوند کی حیثیت "خدا" (ہماری زبان میں "مجازی خدا") کی ہوتی تھی اس لئے انہوں نے خاوند کے لئے یہ لفظ وضع کر لیا تھا۔ ان کے لغت کی رُو سے قرآن کریم نے بھی خاوند کے لئے یہی لفظ (بعل۔ جمع بعول) استعمال کیا ہے۔ (۲/۲۲۸؛ ۴/۱۲۸؛ ۱۱/۷۲؛ ۲۴/۳۱)۔ لیکن اُس نے نکاح کے معاملہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام میں خاوند کی حیثیت بعل (خدا) کی نہیں، برابر کے رفیقِ حیات کی ہے۔ لہٰذا، ہم قرآن کے استعمال کردہ لفظ (بعل) کو اس کے لغوی معنوں میں نہیں لیں گے۔ اس سے مراد قرآنی حیثیت و مقام کا خاوند لیں گے۔

اس مثال سے لفظ اُجُوْرَهُنَّ کا استعمال اور اس کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس نے نحلۃ کے الفاظ سے اجر (معاوضہ) کے تصور کی جڑ کاٹ دی۔ عورت کے ساتھ خلوت کے معاوضہ کا تصوّر تو پاکیزہ ذہنوں کو اُن متعفن اور تاریک گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں بوئے فحش کے بھبکے ابھرتے ہیں۔ قرآن کا عطا کردہ میاں بیوی کا تعلق پاکیزگی اور نظافت کی حسین و جمیل جنت اپنے آغوش میں رکھتا ہے۔ اس میں معاوضہ کا کیا سوال؟ وہاں تو "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت ہوتی ہے۔

یہ ہے مہر کی قرآنی پوزیشن۔ چونکہ اس کا پیش (یا ادا) کرنا، حکمِ خداوندی ہے، اس لئے اس کے لئے فریضہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ (۲/۲۳۶-۳۷)

مہر تحفہ ہے اور تحفہ کی کوئی مقدار یا تعداد متعین نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ اس کا ادا کرنا فرض ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اسے خاوند کی حیثیت (استطاعت) کے مطابق ہونا چاہیئے۔ استطاعت کی نسبت سے یہ "سونے کا ڈھیر" بھی ہو سکتا ہے۔ (۴/۲۰)

مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیئے لیکن سورۃ بقرہ کی آیت ۲۳۶ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ نکاح ہو جائے لیکن مہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ ارشاد ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً (۲/۲۳۶) "اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ تم ایسی عورتوں کو طلاق دے دو جنہیں تم نے چھوا نہیں یا جن کا مہر مقرر نہیں کیا جا سکا۔" اس آیت کا بنیادی تعلق تو طلاق سے

ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ یہاں ہم نے اسے صرف یہ بتانے کے لئے درج کیا ہے کہ ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ نکاح ہو جائے لیکن مہر مقرر نہ کیا جا سکا ہو۔ لیکن ایسی صورت شاذ ہو گی ..... معمول یہی ہے کہ مہر نکاح کے وقت مقرر اور ادا کیا جائے۔

(۱) اگر مہر نکاح کے ساتھ ادا نہ کیا گیا ہو تو میاں بیوی کی رضامندی سے اس میں بعد میں کمی بیشی بھی کی جا سکتی ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ۔ (۴/۲۴) "اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ مہر مقرر ہو جانے کے بعد تم باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی کر لو"۔ دوسری جگہ ہے:۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا۔ (۴/۴)

تم اپنی بیویوں کا مہر کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر اس طرح ادا کر دیا کرو جس طرح شہد کی مکھی شہد دے دیتی ہے۔ ہاں! اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے بلا تامل اپنے صرف میں لا سکتے ہو۔

(۲) نکاح کے بعد قبل از خلوت طلاق ہو جائے تو:۔

(i) اگر مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو خاوند کی استطاعت کے مطابق اسے کچھ دے دینا چاہیئے:۔

لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۔ (۲/۲۳۶)

اور اگر ایسی صورت ہو کہ تم نے ابھی اپنی منکوحہ بیوی کو چھوا نہیں۔ اور نہ ہی اس کا مہر مقرر ہوا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے، تو، اس صورت میں بھی قانون کے مطابق طلاق دیدینے میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن چاہیئے کہ اس مطلقہ کو کچھ ساز و سامان دیدیا جائے۔ صاحبِ وسعت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی بساط کے مطابق ــــ تاکہ مطلقہ ہونے کی وجہ سے اس عورت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔ اس قسم کا محسنانہ سلوک تم پر واجب ہے۔

(ii) اگر مہر مقرر ہو چکا تھا تو اس کا نصف ادا کرنا ہو گا:۔

وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَن

تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۔ (۲/۲۳۷)

اور اگر ایسا ہو کہ تم نے اپنی منکوحہ سے مقاربت نہیں کی، لیکن اس کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور طلاق کی نوبت آجائے، تو اس صورت میں اس کے مہر کا نصف ادا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اگر صورت وہ ہو جسے (۲/۲۲۹) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مرد کو کچھ معاوضہ دلایا جانا مقصود ہو، تو عورت اپنا حق چھوڑ سکتی ہے۔ اور اگر شکل یہ ہو کہ نکاح کی گرہ کو مرد کھولنا چاہتا ہے (یعنی طلاق کا مطالبہ اس کی طرف سے ہے) تو وہ نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس قسم کا باہمی مراعات کا برتاؤ قانونِ خداوندی کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے تم آپس میں حسنِ سلوک کو کبھی نہ بھولو — الگ بھی ہو تو فراخ دلی کا ثبوت دے کر الگ ہو۔ اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ عورت بذاتِ خود اپنا حق چھوڑ دے یا "جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے" وہ چھوڑ دے۔ ان الفاظ (بیدہٖ عقدۃ النکاح) سے ہمارے ہاں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ "نکاح کی گرہ" خاوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو اسے باندھے رکھے اور جس وقت چاہے اسے کھول دے عورت (بیوی) کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہوتا ہے طلاق کے متعلق تفصیلی گفتگو تو آگے چل کر کی جائے گی، یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ یہ کہنا کہ طلاق کا کلی اختیار مرد کو حاصل ہے، بیوی اس کے قبضہ میں ہوتی ہے، قرآن کی تعلیم، ہدایات، قوانین اور منشاء کے خلاف ہے۔

طلاق کا حق

نکاح ایک معاہدہ ہے اور جس طرح اس کے باندھنے کے لئے فریقین کو کلی اختیار ہوتا ہے، اسی طرح اسکے کھولنے (ختم کرنے) کا اختیار بھی فریقین کو یکساں حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے (نکاح کے عنوان میں) بتایا جا چکا ہے۔ نکاح کے معاملہ میں عورت خود مختار ہوتی ہے لیکن اگر وہ چاہے تو کسی کو اپنی طرف سے "مختار نامہ" دے سکتی ہے۔ بیدہٖ عقدۃ النکاح سے مراد وہ شخص ہے جسے عورت نے اپنا مختار مقرر کیا ہو یا خود عدالت جس نے طلاق کے تضمنات کا فیصلہ کرنا ہو۔ بہر حال اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عورت چاہے تو اپنا حقِ مہر چھوڑ سکتی ہے۔ (اسی طرح مرد بھی اپنا حق چھوڑ سکتا ہے یعنی وہ چاہے تو عورت کو نصف مہر کے بجائے پورا مہر ادا کر دے) لیکن یہ باہمی رضامندی کی صورت ہے۔ قانونی پوزیشن یہی ہے کہ عورت کو نصف مہر ادا کرنا ہو گا۔

طلاق کی صورت میں مہر کی کچھ اور شرائط بھی ہیں لیکن اسے ہم طلاق کے عنوان میں بیان کریں گے۔

واضح رہے کہ لڑکی کو جہیز دینا محض ایک رسم ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اگر لڑکی کے ماں باپ

جہیز ایک رسم ہے

یا دیگر اعزہ اور احباب اسے کچھ تحفتہً دینا چاہیں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن لڑکے کی طرف سے جہیز کا مطالبہ ایسی پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے تو مرد پر فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ عورت کو کچھ تحفہ دے، نہ یہ کہ الٹا اس سے کچھ طلب کرے۔ چونکہ ہمارے معاشرہ میں اچھے رشتوں کی کمی ہے اور لڑکی کے والدین اس باب میں پریشان رہتے ہیں، اس لئے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو جہیز کا مطالبہ ان کی اس پریشانی کو (EXPLOIT) کرنا ہوتا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جس رشتہ کا آغاز ہی استحصال کی نیت سے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آغاز کیا، یہاں تو کبھی تک (ایامِ جاہلیہ کی طرح) خاوند ساری عمر یہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے شادی کر کے اسکے والدین پر احسانِ عظیم کیا ہے اور وہ عمر بھر کے لئے اس کے ذلیل ہو گئے ہیں اور انہیں ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ اگر اس کے سسرال والے اس کے کسی مطالبہ کو نہیں مانتے (خواہ وہ کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ہو) تو وہ اپنی بیوی کو تنگ کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ماں باپ کو مجبور کر کے اس کے "لعل" کے نہایت نامعقول مطالبہ کو پورا کرائے۔ اور وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ اسے اس کے میکے بھیج دے گا۔ یہ اُس دَور کی ذہنیت کا مظاہرہ ہے جب آدمی ہنوز انسانیت کی سطح پر نہیں پہنچا تھا۔ شریف انسان کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے تو نسبی اور سسرالی رشتوں کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ (۲۵/۵۴)۔ تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے۔

——— (٠) ———

اس طرح نکاح کی تکمیل سے ایک مرد اور عورت، قرآنی قانون کی رُو سے، میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نکاح سے مقصد سکینت، رحمت، مودّت۔ یعنی مرد اور عورت کی جنت بداماں ازدواجی زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے میاں بیوی کی باہمدگر پیوستگی اور جذبیت کو ایک نہایت خوبصورت استعارہ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔ (۲/۱۸۷) "تمہارا باہمی رشتہ جسم اور لباس کا سا ہے۔ وہ تمہارے لئے بمثل لباس کے ہیں۔ تم ان کے لئے مانند لباس کے ہو" تم دونوں کے درمیان کوئی اور حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انتہائی قرب، راز داری اور اعتماد کی صورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے باہمی رشتے کا تعلق تو جذبات سے ہے لیکن بایں ہمہ، قرآنِ کریم زندگی کے اس نہایت اہم مسئلہ کے قانونی پہلو کو بھی نظرانداز

نہیں کرتا اور بتاتا ہے کہ اس رشتہ میں حقوق اور ذمہ داریوں کی شکل کیا ہوگی، اسے اس نے چار لفظوں میں ایسی جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ [1]۔ (۲۲۸/۲)۔ "قانونِ خداوندی کی رُو سے عورتوں کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں، اتنے ہی ان کے حقوق ہیں"۔ یعنی ہر ذمہ داری کے مقابلہ میں ایک حق۔

اس مقام پر ایک آیت کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے جلد دوم ص ۱۲۵-۱۱۷، زیر آیت (۱/۴)میں بتایا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے مردوں اور عورتوں کی حیثیت مساوی ہے اور کسی ایک جنس کو دوسری جنس پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس کے خلاف ہمارے قدامت پرست طبقہ کا عورت کے متعلق جو پست نظریہ ہے، اس کی وضاحت بھی وہاں کر دی گئی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے اپنے نظریہ کی تائید میں جو آیت پیش کی جاتی ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ (۳۴/۴) اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اس کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے مناسب مقام یہی ہے۔ پوری آیت یہ ہے:-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔ (۳۴/۴)۔

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

> مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے۔ پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑ دو ان کو بیچ خواب گاہ کے۔ اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

---

[1] اس آیت میں وللرجال علیھن درجۃ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کی تشریح عدت کے ضمن میں کی جائے گی۔

یعنی چونکہ مرد کماتے ہیں اور عورتوں پر اپنا روپیہ صرف کرتے ہیں اس لئے وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ مرد کی فرمانبردار رہے اور اگر اس کی فرماں برداری میں کوئی فرق آجائے تو مرد کو یہ بھی حق حاصل کہ اسے مارے پیٹے۔

یہ ہے عورت کی پوزیشن اس قرآن کی رُو سے جو ہمارے مروجہ ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچوں، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے .... جب میں کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ ترجمے قرآن کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ جنھوں نے یہ ترجمے کئے تھے عربی کے بڑے بڑے عالم تھے۔ پھر کیا ہوا کہ یہ صحیح ترجمہ نہ کر سکے. اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے وہ ممالک بھی موجود ہیں جن کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اگر وہ بھی قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تو پھر اور کون صحیح مفہوم سمجھے گا۔

ترجمے صحیح کیوں نہیں ہوتے

یہ اعتراضات بظاہر بڑے وزنی ہیں اس لئے ان کے جواب کے لئے اصل حقیقت کا سمجھنا ... ضروری ہے۔ جن بزرگوں نے یہ ترجمے کئے ہیں ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ قرآن کے فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہیں لامحالہ اہل زبان ہی کی طرف رجوع کرنا تھا۔ ہمارے ہاں تیسری صدی ہجری سے لے کر ان بزرگوں تک سینکڑوں تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھیں. ان میں سے بعض مفسرین، تفسیر کے علاوہ، عربی ادب کے بھی امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کشاف کے مصنف علامہ زمخشری یا تفسیر جلالین، جس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے مترجمین کے لئے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح عربی ممالک کے باشندوں کے لئے بھی ان عربی تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی جو کچھ ان عربی کی تفسیروں میں لکھا گیا ہے، اسے قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہمارے ترجموں میں قرآن کریم کا جو مفہوم دیا گیا ہے (یا جو مفہوم خود عربی بولنے والے سمجھتے ہیں) وہ دراصل قرآن کا وہ مفہوم ہے جو ہمارے اسلاف کی تفاسیر میں درج ہو چکا تھا مثال کے لئے یہی (زیرِ نظر) آیت دیکھئے۔ اس میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ہیں قَوّٰمُوْنَ کا ترجمہ کیا گیا ہے حاکم۔ ہمارے بزرگوں نے قوّامون کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان عربی تفاسیر کو دیکھا تو کشاف میں اس کا مفہوم لکھا تھا مسیطرین۔ یعنی داروغے۔ اور جلالین میں لکھا تھا۔ متسلطین یعنی عورتوں پر مسلّط۔ اب ظاہر ہے کہ جب ہمارے مترجمین نے دیکھا کہ یہ ائمہ تفسیر و ادب، قوّامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلطین

بتاتے ہیں تو انہوں نے اس کا ترجمہ حاکم کر دیا۔ یہ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ ہے لیکن یہ ترجمہ قرآن کے لفظ قوامون کا نہیں بلکہ قوامون کے اس مفہوم کا ترجمہ ہے جو کشاف اور جلالین میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا، ہمیں (ان ترجموں کے بجائے) یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان تفاسیر میں یہ مفہوم کس طرح آ گیا۔

یہ تفاسیر اس دور میں لکھی گئی تھیں جب ہمارے معاشرے پر ملوکیت کا استبداد غالب آ چکا تھا اور ہماری "شریعت" اور "طریقت" مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات سے متاثر ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جس میں عورت کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر قرار پا چکی تھی۔ ان تفاسیر میں سب سے پہلے طبری کی تفسیر لکھی گئی۔ (باقی تفسیریں درحقیقت اسی تفسیر پر لکھی ہوئی "طرحی غزلیں" ہیں) طبری کا انداز یہ ہے کہ اس میں قرآن کا مفہوم روایات کی رُو سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ روایات کس طرح وضع ہوئیں اور انہیں کیسے مرتب اور جمع کیا گیا اس کے لئے کتاب "مقامِ حدیث" ملاحظہ کیجیے۔ روایات کی تاریخ سے اس حقیقت کا سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ روایات کے وضع کرنے میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ یہ روایات عکس ہیں اس معاشرے کا جس میں یہ وضع کی گئی تھیں (نہ کہ رسول اللہ کے عہدِ مبارک کا) اب ظاہر ہے کہ قرآن کا جو مفہوم ان روایات کی رُو سے متعین کیا گیا تھا وہ کس قسم کا ہو گا، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پھر اسی آیت کی مثال سامنے لائیے جو اس وقت زیرِ نظر ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ کشاف وغیرہ نے قَوَّامُوْنَ کا مفہوم منسلّطین اور مسیطرین بیان کیا ہے۔ اور اسی آیت سے عورتوں کو مارنے پیٹنے کا جواز نکالا ہے۔ اس آیت کی "شانِ نزول" میں جو روایات

روایات

ہماری کتابوں میں لکھی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرمؐ سے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہو گئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپؐ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر آپؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہو گئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپؐ کے پاس آئیں۔ اس پر آپؐ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے لیکن جب آپؐ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔ لہٰذا حکم یہی رہا کہ چونکہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ تین باتیں یاد

دیکھو جو میں نے رسولؐ اللہ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔ .... دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی[1]

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

یہ ہیں وہ روایات جو زیرِ نظر آیت کی تفسیر میں ہماری سب سے قدیم کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ انہی روایات کی بنا پر قوامون کا مفہوم متسلطین (غلبہ وتسلط کے مالک) اور مسیطرین (داروغہ) لیا گیا اور اسی مفہوم کا ترجمہ ہمارے ہاں حاکم کیا گیا۔ پھر انہی کے مطابق ہماری فقہ کے احکام مدون ہوئے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے امام جصاص نے احکام القرآن میں انہی روایات وتفاسیر کی بنا پر عورتوں کو مارنے پیٹنے اور بند رکھنے کے تمام فقہی قوانین بیان کر دیئے ہیں۔

ایک اور دشواری

ان روایات کی وجہ سے ایک بڑی مشکل اور بھی واقع ہو گئی۔ اگر ہمارے یہ مفسرین حضرات' قرآنی آیات کا مفہوم اپنی طرف سے متعین کرتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اتنی گنجائش رہ سکتی تھی کہ ان کے بیان کردہ مفہوم سے اختلاف کر سکتے۔ لیکن جب انہوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کردہ احادیث درج کر دیں تو ان کا متعین کردہ مفہوم رسولؐ اللہ کا بیان فرمودہ مفہوم قرار پا گیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ اس مفہوم سے اختلاف کا خیال تک بھی ذہن میں لا سکتا۔ چنانچہ جس کسی نے اس مفہوم سے اختلاف کا خیال ظاہر کیا اسے فوراً کہہ دیا گیا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسولؐ اللہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے؟ اب کون سا ایسا سوختہ بخت مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں رسولؐ اللہ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ اس طرح ان تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم ابدی طور پر مستند قرار پا گئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم رسولؐ اللہ کے متعین فرمودہ نہیں تھے۔ بلکہ یہ ان روایات کی رُو سے متعین کئے گئے تھے جو رسولؐ اللہ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وضع کی گئیں۔ رسولؐ اللہ کا متعین فرمودہ مفہوم وہ ہو سکتا تھا جسے رسولؐ اللہ قرآن کے ساتھ خود ایک کتاب میں لکھ کر یا لکھوا کر مستند طور پر امت کو دے کر جاتے۔ رسولؐ اللہ نے کوئی ایسی تفسیر امت کو نہیں دی۔ اس لئے ان کتب تفسیر میں بیان کردہ مفہوم رسولؐ اللہ کا نہیں، خود ہمارے مفسرین کا مفہوم ہے جو اس دور میں متعین کیا گیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن جس کی تائید میں وہ روایات درج کر دی گئیں جو رسولؐ اللہ

[1] یہ روایات تفسیر ابن کثیر۔ پارہ پنجم میں درج ہیں۔

کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔

اس سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" میں قَوّٰمُوْنَ کا ترجمہ حاکم، متسلّط، اور داروغہ کس طرح کیا گیا۔ اس مقام پر ایک لطیف بات کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہوا کہ ان روایات کی رُو سے ممکن ہے کوئی غیر مسلم یہ اعتراض کر دے کہ رسول اللہ نے عورتوں کے ساتھ اس قسم کے سخت سلوک کی اجازت کیسے دے دی، اب دیکھئے کہ اس اعتراض سے بچنے کی صورت کیا پیدا کی گئی! ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے اس عورت کو جس نے اپنے خاوند کی شکایت کی تھی، بدلہ لینے کی اجازت دی تو خدا کی طرف سے (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ والی) آیت نازل ہوگئی۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا اَرَدْنَا اَمْرًا اَرَادَ اللّٰهُ غَيْرَهٗ۔ یعنی ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔ آپ سمجھے کہ یہ بات کیا ہوئی! اس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسول اللہ تو چاہتے تھے کہ عورتوں سے عدل و انصاف کیا جائے۔ لیکن جب خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا تو رسول اللہ مجبور ہوگئے۔ لہٰذا آپ کو بھی اسی کے مطابق تعلیم دینی پڑی۔

اس روایت کے وضع کرنے والے نے بزعم خویش، رسول اللہ کو تو اس اعتراض سے بچا لیا، لیکن اتنا نہ سوچا کہ وہی اعتراض اب خود خدا پر بھی عاید ہوگیا۔ بلکہ اعتراض کی شدت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ گئی کہ خود رسول اللہ نے خدا کے حکم کی سختی کو محسوس کیا، جبھی تو کہا کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور ہی حکم دے دیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ جو اپنی مرضی کو پورے پورے طور پر خدا کی مرضی (یعنی قانونِ خداوندی) سے ہم آہنگ رکھتے (اور ہم آہنگ رکھنے کی تمنّا کرتے) تھے، کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور حکم دیدیا۔[1]

(۰)

اب آیت "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" کے صحیح مفہوم کی طرف آئیے۔

آیت کا صحیح مفہوم

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ۔ (عام مردوں) اور اَلنِّسَآءُ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی

[1] جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا وہ خدا کی طرف سے وحی (غیر متلو) کی رُو سے ہوتا تھا، وہ غور کریں کہ رسول اللہ نے یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور حکم دے دیا۔

ہے، اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن نے تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاۤءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ عَلَى الْمَرْأَةِ۔ کے معنے دیئے ہیں مانھا۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوامٌ علیھا کے معنی ہیں مائنٌ لھا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاۤءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں۔ اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) تقسیم کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ (بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشو و نما پائیں گی (فَالصّٰلِحٰتُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنِتٰتٌ کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد، اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ صلاحیتیں غیر محل میں صرف ہو جائیں گی۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کرسکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویاں (فَالصّٰلِحٰتُ) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرماں بردار (قٰنِتٰتٌ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری

ہیں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں، اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں اور عصمت کی حفاظت۔ گویا صٰلِحٰتٌ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورہ احزاب (۳۳/۳۵) میں یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر "فرماں بردار" ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا، یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں' اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔

عورتوں کو مارنا

اب آگے بڑھئیے۔ آیت کا باقیماندہ حصہ یہ ہے۔ (وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۔) چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرماں برداری کرنا ہے، اس لئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کر لے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اُسے مارے۔

لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی فرائض کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رو سے وہ اکتسابِ رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیمِ کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت[1] (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں، بلا عذر اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسلِ انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں

---

[1] یعنی ایسا طریق جس میں قاعدے اور قانون کی کوئی پابندی نہ کی جائے۔

کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خواب گاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISH-MENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رُو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغے ہیں۔ اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم رکھیں۔ کیونکہ بیوی مرد کی کمائی کھاتی ہے۔ بیوی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خاوند کی تابعدار رہے۔ اور اگر وہ اس کی فرماں برداری نہ کرے تو میاں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنا حکم منوائے۔

(۰)

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی

(i) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا کیوں ہے؟ اور

(ii) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر کیوں قرار دیا گیا ہے؟

وراثت میں لڑکی کا حصہ

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو ۴/۱۱)۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں، عورت کو اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت۔ اس کے برعکس، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶)۔ یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶) (تفصیل قانونِ وراثت کے ضمن میں اپنے مقام پر ملے گی۔)

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیت) کر جائے۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لڑکی کا حصہ کم مقرر کرنے سے نہ تو اس کے حقوق میں کمی آجاتی ہے اور نہ ہی معاشرہ میں اس کا مقام مرد سے نیچے رہ جاتا ہے۔

——— (٠) ———

عورتوں کی گواہی

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطور گواہ بلا لیا کرو۔ اس سے آگے ہے۔ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی بیان کر دی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ " ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ لیکن قرآن نے تَضِلَّ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ واضح تر الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED)۔ اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آیئے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

(i) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ یہ اس لئے ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ الجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور اُن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن مردوں کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی روک تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو ۲۴/۶-۹)

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے۔

وہ تو زمانۂ نزولِ قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں، ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گردوپیش اجنبی مرد ہوں۔ وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان پہچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا سامنے ہونا اس کے لئے باعث تقویت ہوگا۔ اگر اسے کہیں ہچکچاہٹ ہوگی تو اس کی ساتھی اسکی بات صاف یا پوری کر دیگی۔ قرآن کریم نے اسی قسم کی عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَۃِ وَھُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ۔ (۴۳/۱۸) "یہ زیورات میں پلی ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔" اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے

تو ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی کھڑی کر دو تاکہ اس کا حوصلہ بندھا رہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے انسان (مرد ہو یا عورت) کی اس قسم کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے جنتی معاشرہ کی عورت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فصیح البیان (عُرُبًا) ہو گی۔ (۵۶/۳۷)

―――― (۰) ――――

ان تصریحات کے علاوہ، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ ان دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادات مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی ط (۲/۲۸۲)۔ اگر ایسا ہو کہ اُن میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی دوسری اس کی بہن اسے یاد دلا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہیں آئیگا۔ اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پا جائے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر لڑکیوں کی پرورش "زیورات" میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملاتِ زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ بن سکیں اور یوں "غیر مبین" (گونگی) بن کر رہ جائیں۔ بلکہ انہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے تو پھر وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

―――― (۰) ――――

ہم نے پہلے نسبی اور سسرالی رشتوں کے متعلق اشارہ کیا تھا۔ اب اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ عام دستور کے

نسبی اور سسرالی رشتے

مطابق لڑکا (خاوند) شادی کے بعد بھی اپنے ماں باپ اور دیگر اعزہ و اقرباء کے ساتھ یا قریب رہتا ہے۔ لیکن لڑکی (بیوی) اپنے تمام اعزہ و اقرباء (اہلِ خاندان) کو چھوڑ کر اس نئے خاندان میں آکر بستی ہے۔ اس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ لڑکے (خاوند) کے تمام سابقہ رشتے تو برقرار رہتے ہیں لیکن لڑکی کے رشتے دار ان دونوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے کہا کہ نہیں! اس رشتے سے ان دونوں خاندانوں میں قرب پیدا ہونا چاہیئے (جیسا کہ اشارۃً پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے اس نے کہا کہ سسرالی رشتہ بھی ایسا ہی اہم ہے جیسا نسبی رشتہ۔ ارشاد ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا۔

خدا وہ ہے جس نے انسان کی پیدائش ایک قطرۂ آب سے کی، اس کے بعد تمدنی اور معاشرتی تقاضوں کی رُو سے انسانوں میں باہمی رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ نسبی (ددھیالی رشتے اور سسرالی (ننھیالی) رشتے۔ یہ اسی خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کی رُو سے ہوتا ہے۔

اس طرح مرد اور عورت کے خاندان ایک رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں اور ان کے معاشرتی دوائر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ لڑکے کی شادی اس وقت کرنی چاہیئے جب وہ معاشی طور پر خود کفیل ہو۔ اور اپنے گھر کا بوجھ خود اٹھا سکے۔ شادی کے بعد انہیں اپنے الگ گھر میں رہنا چاہیئے نہ کہ لڑکے کے ماں باپ کے ساتھ۔ سینکڑوں گھرانوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ازدواجی زندگی کی خوشگواری کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کا گھر الگ ہو جس میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ سورۃ النور کی آیت (۲۴/۶۱) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "اس میں کچھ حرج نہیں کہ تم اپنے گھر سے کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم ماں باپ کے گھر کو الگ قرار دیتا ہے۔ مشترکہ گھرانے (JOINT FAMILY) کا دستور تو ہندوؤں میں تھا۔ وہیں سے ہمارے ہاں بار پا گیا۔ اس کے نتائج بڑے تلخ ہوتے ہیں۔

(۰)

جنسی اختلاط

ازدواجی زندگی افزائشِ نسل کا ذریعہ ہوتی ہے جو نتیجہ ہوتی ہے میاں بیوی کے جنسی اختلاط کا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں بھی ہدایات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے :-

۲/۲۲۲ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ. (۲/۲۲۲)

نکاح کے بعد مقاربت کا سوال آتا ہے۔ سو ایام حیض میں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے اس لئے کہ حیض، عورت کے لئے ایک قسم کی واماندگی کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مجامعت نقصان کا باعث۔ لہٰذا ان ایام میں عورتوں

سے الگ رہنا چاہیئے تاوقتیکہ وہ اس سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہ عرصہ ختم ہو جائے، تو جس طرح خدا کے طبیعی قانونِ تولید کا اشارہ[1] ہے۔ تم اس طرح ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔

اگر تم اس سے پہلے ایسا نہیں کرتے تھے تو اب صحیح راستے کی طرف لوٹ آؤ۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ لوگ وہی ہیں جو غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کریں اور ناخوش آیند امور سے دُور رہیں۔

ایامِ حیض کے علاوہ (طُہر کی حالت میں بھی) روزے کے دنوں میں مباشرت ممنوع ہے۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

یہ کبھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے، رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی —— بیویوں سے جنسی اختلاط قربِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے) میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیال پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے۔ (۵/۲۷)۔ لہٰذا، خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وسوسے پیدا ہو رہے تھے، ان سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشائے خداوندی کے مطابق اپنی بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو۔

اس کے بعد کہا: وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (۲/۱۸۷) اعتکاف کی حالت میں بھی مباشرت ممنوع ہے۔ (روزے اور اعتکاف کے متعلق پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ دیکھئے عنوان صیام اور حج)۔

(۰)

آیت (۲/۲۲۲) میں ایک اہم نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس میں کہا ہے کہ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ

---

[1] قرآن کریم نے طبیعی قوانین کے فطری طریق کو بھی ہدایتِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے (۲/۲۸۲؛ ۲۰/۵۰؛ ۸۷/۳)

حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ لیکن قرآن کریم ـــ میں اس قسم کا حکم کہیں نہیں دیا گیا (کہ مباشرت کیسے کرنی چاہیئے) اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" کا مطلب کیا ہے؟ اَمر کے متعلق جلد اول صفحہ ۲۸۳ زیر آیت (۲/۱۱۷) بتایا جا چکا ہے کہ اس کے بنیادی معنی راستے کی نشاندہی کرنے (DIRECTIVE) یا ہدایات کے ہیں حکم کے معنوں میں یہ ثانیاً استعمال ہوتا ہے۔ طبیعی افعال کے متعلق خدا کی طرف سے رہنمائی جبلّی طور پر حیوانات کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہی خدا کا امر ہے جو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ تو وحی کی رُو سے ہدایت ہے جو خارج سے ملتی ہے۔ طبعی افعال کے متعلق جبلّت یا فطری صلاحیت "امر اللہ" کا حکم رکھتی ہے۔ اس آیت میں دیکھئے حالت حیض میں مباشرت سے احتراز کے لئے وحی کے ذریعے حکم دیا گیا کیونکہ یہ چیز حیوانی جبلّت میں نہیں اور اس کے بعد معاشرتی طریق کے متعلق اتنا کہہ دیا کہ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ جبلّی ہدایت کے مطابق۔

فطری تقاضا

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی ہیں جب انسان انہیں استعمال میں لاتا ہے تو اس کے ان افعال کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی جلد اول صفحہ ۱۸۴ ۔ زیر آیت (۲/۷) گزر چکی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں "من حیث امرکم اللہ" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی فطری تقاضا کے مطابق۔

یہ فطری تقاضا کیا ہے، اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ فطرت افزائش نسل چاہتی ہے اور اس کا ذریعہ نر اور مادہ کا جنسی اختلاط ہے۔ قرآن کریم ہمارے ذوق سلیم کی رعایت سے جنسیات (SEX) سے متعلق امور پر گفتگو ایمائی (SUGGESTIVE) انداز سے کرتا ہے۔ اسی انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے فطرت کے اس منشا کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

۲/۲۲۳ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۲۲۳)

جنسی اختلاط کا مقصد

میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے مقصود افزائش نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمہاری بیویوں کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ جس طرح کسان اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اُگانا مقصود ہو اسی

طرح تم بھی اس وقت اپنی "کھیتی" میں جاؤ جب تم (اولاد پیدا کرنا) چاہو۔

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ، اولاد پیدا کرنا ہی نہیں؛ اصل مقصود اپنی ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ حیاتِ جاوید، بقائے ذات سے حاصل ہوتی ہے اولاد کے ذریعے نہیں۔ اس لئے تم یہ بھی دیکھو کہ تم نے بقائے ذات کے لئے کیا کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔ زندگی کی خوشگواریاں انہی کے لئے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے ایسے اہم اور نازک مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعے کس قدر لطیف انداز میں واضح کر دیا ہے۔ کسان اپنے کھیت میں کلبہ رانی (ہل چلانا) اس وقت کرتا ہے جب تخم ریزی مقصود ہو۔ اور تخم ریزی سے مقصود کھیت میں فصل اگانا ہوتا ہے۔ لہٰذا میاں بیوی میں جنسی اختلاط اس وقت ہونا چاہیئے جب بچہ پیدا کرنا مطلوب ہو۔ چونکہ افزائش نسل کا مقصد پورا کرنے کے لئے کچھ مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں (مثلاً استقرارِ حمل، وضع حمل، بچوں کی پرورش اور انسان کی صورت میں، ان کی پرورش، تربیت اور تعلیم وغیرہ) اس لئے فطرت نے اس عمل (اختلاط) میں حظ (PLEASURE) کا عنصر رکھ دیا تاکہ وہ اس مشقت طلب معاملہ میں ترغیب کا کام دے۔ اس سے واضح ہے کہ جنسی اختلاط کا حقیقی مقصد افزائش نسل ہے۔ حظ و کیف محض ترغیب کی خاطر ہے۔

افزائش نسل کا فطری مقصد حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے لیکن اس سلسلہ میں فطرت نے ان دونوں میں ایک اہم فرق رکھا ہے۔ حیوانات کی صورت میں اسے (REGULATE) کرنا، فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ایک سانڈ (بیل) سال بھر گایوں کے گلہ میں چرتا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ کسی گائے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن جب فطرت کے پروگرام کے مطابق ان کے استقرارِ حمل کا زمانہ (MATING SEASON) آتا ہے، وہی بیل جنسی اختلاط کے لئے دیوانہ ہو جاتا ہے اور گائے بھی اس کی طرف کھنچے چلی جاتی ہے۔ اس اختلاط کے بعد ان میں پھر وہی بے رغبتی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حیوانات کے جنسی جذبہ پر فطرت نے خود (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ وہ اسے اس وقت کھولتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس میں حیوانات کا اپنا اختیار کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے موجبِ اختیار پیدا کیا ہے اس لئے یہ (دیگر امور کی طرح) اولاد پیدا کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں بھی فطرت کے پروگرام کی پابندی پر مجبور نہیں۔ مشیتِ خداوندی یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنے

حالات کے مطابق اولاد پیدا کرنے کا (PLAN) خود بنائے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اسی طرح جیسے کسان اپنے

اولاد ایک پروگرام کے مطابق

پروگرام کے مطابق کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے۔ اسی لئے حیوانات کی صورت میں اولاد کی پرورش کا مسئلہ ایسا دِقت طلب نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی صورت میں مسئلہ صرف اولاد کی پرورش کا نہیں ہوتا، ان کی تعلیم اور تربیت کا بھی ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری بڑی محنت طلب بھی ہوتی ہے اور مناسب ذرائع اور اسباب کے میسر آنے کی متقاضی بھی۔ اس لئے انسان کی صورت میں نہایت ضروری ہے کہ اس کی اولاد اس کی (PLANNING) کے مطابق وجود میں آئے۔

لیکن جس طرح انسان اپنی ہر قوت اور صلاحیت کے استعمال کے معاملہ میں اپنے اختیار و ارادہ کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے (MIS-USE) ہی نہیں (ABUSE) کرتا ہے، اس نے جنسی اختلاط کے معاملہ میں بھی یہی کچھ کیا۔ اس نے افزائشِ نسل کے فطری مقصد کو تو رکھا بالائے طاق اور حصولِ لذّات کو مقصود بالذات قرار دے کر اس میں ایسا غرق ہوا کہ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہی نہیں، مدہوش ہو گیا اور اس طرح اس کرۂ ارضی کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ بے محابا جنسی اختلاط سے کثرتِ اولاد کا خطرہ تھا۔ اس خطرہ کو مانعِ حمل ادویات اور تدابیر سے دور کر لیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوشش (بلکہ روش) کہ جنسی اختلاط کی لذت تو حاصل ہو جائے لیکن اس سے حمل قرار نہ پائے، دورِ جدید کی اختراع ہے، یہ صحیح نہیں۔ انسان کی دیگر بدنہادیوں (PERVERSIONS) کی طرح یہ بھی قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے اور قوموں کو تو چھوڑیئے خود ہمارے ہاں کی کتبِ روایات میں اس کا

عزل

تذکرہ موجود ہے۔ اُس زمانے میں اس کا طریق عزل تھا۔ یعنی جنسی اختلاط میں مادۂ تولید رحم کے اندر خارج نہ ہو، باہر خارج ہو۔ اسے آج کی اصطلاح میں (EXTRAXIT) کہا جاتا ہے۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

> حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہو گی۔ (بخاری جلد اول۔ ترجمہ اردو شائع کردہ نور محمد۔ کراچی صفحہ ۴۹۲)

ایک اور روایت میں ہے:-

ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبی (رص) کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پالیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسول خدا (رص) سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔

(بخاری۔ جلد اول ص۵۷۳ ترجمہ اردو۔ شائع کردہ نور محمد۔ کراچی)

ہمارے ہاں (پاکستان میں) جب ضبط ولادت (FAMILY PLANNING) کی اسکیم جاری ہوئی تو عزل کے جواز اور عدم جواز کے متعلق مذہبی پیشوائیت میں بحث چل نکلی۔ دونوں نے اپنی اپنی تائید میں روایات اور ائمۂ سلف کے فتاوٰی پیش کئے۔ اس کی مخالفت کرنے والے ان روایات کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے جو فریق ثانی نے ان کے حق میں پیش کی تھیں لیکن ان کا مسلک عجیب معذرت خواہانہ تھا۔ مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس باب میں لکھا تھا:۔

عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں، ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دیدیا۔ اس طرح کے جوابات نبی (رص) سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا ہے تو وہ ہرگز ضبط ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی پشت پر ایک باقاعدہ مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

ہم مودودی صاحب کے اس جواب پر کسی قسم کا تبصرہ لاحاصل سمجھتے ہیں۔ اس سے تو بہرحال انہیں بھی انکار نہیں کہ روایات کی رُو سے صحابہؓ میں سے بعض نے عزل کی بابت دریافت کیا اور حضورؐ نے اس کی اجازت دی!

لیکن حیرت ہے کہ مودودی صاحب ضبطِ ولادت کے لئے عزل کو تو خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ قرار دیتے ہیں لیکن استمنا بالید (مشت زنی۔ MASTURBATION) کو کچھ ایسا جرم نہیں سمجھتے۔ اسی باب میں کسی نوجوان نے ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

مشت زنی

ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ لیکن عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور

عملِ قومِ لوط اور وطیِ بہائم کی بہ نسبت کمتر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کرلے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ستمبر ۱۹۶۲ء۔ ایڈیشن صفحہ ۲۰۲)

یہ اُس خدا کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) جنہیں جنسی خواہش کی تسکین کا جائز ذریعہ (نکاح) میسر نہ آئے، وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ لیکن اس ساری بحث میں قولِ فیصل قرآنِ کریم کا وہ ارشاد ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ۔

(۱) جنسی اختلاط کا ایک ہی ذریعہ جائز ہے اور وہ ہے نکاح۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۲۳/۷) "جو اس کے سوا کوئی اور طریق اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے"۔

(۲) اور نکاح کے ساتھ جنسی اختلاط کا مقصد اس نے بتایا ہے: مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ۔ (۴/۲۴-۲۵؛ ۵/۵)۔ محصنین کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور مسافحین کے معنی ہوتے ہیں بہا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جائز جنسی اختلاط کا مقصد مادہ تولید کو بیوی کے رحم میں محفوظ رکھنا ہے نہ کہ اسے بہا دینا۔ اس سے فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ (۲/۲۲۳) تم بیوی سے مقاربت اس وقت کرو جب تمہارا مقصد یہ ہو کہ مادہ تولید اس کے رحم میں محفوظ رہے۔ یعنی استقرارِ حمل کے لئے۔ اس مادہ کو بہا دینے کے لئے نہیں۔ کسان اپنے کھیت میں کبھی اس لئے تخم ریزی نہیں کرتا کہ پانی کی لہر آئے اور اسے بہا کر لے جائے۔

(۰)

لیکن اس آیت میں "اَنّٰى شِئْتُمْ" کے ایک اور مفہوم نے تو قیامت ہی ڈھا دی۔ "اَنّٰى" کے معنی "جب" کبھی ہیں اور "جہاں سے کبھی"۔ "جب" کے لحاظ سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جب جی چاہے آؤ"۔ اور جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ "جب جی چاہے" سے مراد ہے "جب افزائشِ نسل مطلوب ہو"۔ لیکن ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم اپنی کھیتی میں" جہاں سے "جی چاہے آؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے مطلب کیا لیا گیا؟

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ جو کچھ لکھنا پڑ گیا۔ کیا اس سے قرآنِ پاک کی اس تفسیر (مطالب الفرقان) کے ان اوراق کو آلودہ کروں؟ یہ احساس میرے دامنگیر تھا لیکن دوسری طرف یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی!

"تفسیر القرآن بالقرآن" کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر (وضعی) روایات کی رُو سے کی جاتی ہے، اس کی کچھ مثالیں بھی سامنے آتی رہیں۔ اُس احساس اور اس اہمیت کے تقابل اور موازنہ کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ دل پر پتھر رکھ کر ہی سہی، اس کی مثال پیش کر دینی چاہیئے۔ سو اسے (بصد معذرت) درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری کتب احادیث میں سب سے بلند مقام بخاری کو حاصل ہے۔ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آیت نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

نافع مولیٰ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمر قرآن پڑھتے میں کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ ایک روز قرآن پڑھنے میں، میں ان کے پاس چلا گیا۔ جب وہ سورۃ بقرہ پڑھتے ہوئے اس آیت (نساء کم) پر پہنچے تو مجھ سے کہا کہ تجھے معلوم ہے یہ آیت کب نازل ہوئی۔ میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے اس کا شانِ نزول بیان کیا اور پھر آگے پڑھنے لگے۔ عبدالصمد کہتے ہیں ابن عمر سے یہ بھی روایت پہنچی ہے کہ بعض آدمی عورتوں سے اغلام کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی عورت سے الٹا لٹا کر جماع کرے اس کی اولاد بھینگی ہوگی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ قول غلط ہے۔ عورتوں سے جس ہئیت سے چاہو جماع کرو۔

بخاری کی دو شرحیں بڑی مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ایک حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری اور دوسری علامہ بدرالدین عینی کی عمدۃ القاری۔ علامہ عینی نے پہلے بخاری کی حدیث نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:۔

ہم سے اسحاق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ میں ایک روز قرآن کریم لے کر ان کے پاس بیٹھا اور انہوں نے سورہ بقرہ پڑھی۔ حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے۔ جانتے بھی ہو کس بارے میں نازل

ہوئی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تو ابن عمرؓ نے فرمایا۔ فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے۔ اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (السختیانی) نے بیان کیا نافع سے۔ انہوں نے ابن عمر سے کہ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے ...... میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحییٰ ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے اپنے باپ سے۔ انہوں نے عبیداللہ سے۔ انہوں نے نافع سے۔ انہوں نے ابن عمرؓ سے۔

اس کے بعد علامہ مذکور لکھتے ہیں:۔

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے[1]۔ یعنی لفظ فی کے بعد — حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلها۔ یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابوقلابۃ الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یاتیها فی الدبر (اپنی بیوی سے دبر میں جماع کرے) لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری)

یہ رہی علامہ عینی کی شرح۔ اب حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

ابن العربی نے سراج المرید میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے۔ یاتیها فی ..... اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث، عورت سے دبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارے میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے۔ جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جو جابر کی حدیث میں آ رہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کے لئے۔ جیسا

---

[1] ان حضرات کی دیانت ملاحظہ فرمائیے۔ بخاری کے متن (عربی) میں قال یاتیها فی ..... کے الفاظ موجود ہیں اور فی کے بعد جگہ خالی ہے۔ لیکن بخاری کا اردو ترجمہ جیسے نور محمد — کارخانہ تجارت کتب (کراچی) نے شائع کیا ہے اس میں یہ فقرہ ہی غائب کر دیا گیا ہے۔ (اردو ترجمہ بخاری، جلد دوم۔ ص ۴۳۳)

کہ دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے۔ اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوصی سبب کا۔ یہ اصول اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو۔ لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کے لئے مخصص ہو جائیں گی۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارہ میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے۔ اور ائمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے جیسے امام بخاری۔ ذہلی، بزار، نسائیؒ اور ابو علی نیشاپوری وغیرہ کہ اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی۔ (فتح الباری)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابن حجر کے نزدیک اس مسئلہ میں (کہ عورت سے دبر میں جماع جائز ہے یا نہیں) اختلاف ہے۔ بعض اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تصریح ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

امام مالکؒ کا مسلک

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابن شعبان نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بہت سی روایتوں سے امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی ہے اور ابو بکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالک بن انسؓ کی خدمت میں حاضر تھا ان سے مجامعت فی الدبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا اور فرمایا۔ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں پایا جس کی میں دین کے بارے میں پیروی اور اقتدار کر سکوں اور وہ اس کے حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دبر میں جماع کرنے کے بارے میں۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے یہ آیت پڑھی نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ

اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز واضح ہوگی اور میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب؛ اس کے بارے میں تو امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو کہتے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسولؐ اللہ سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عینی)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پر اس کے جواز کے قائل تھے اور خود اس پر عمل پیرا اور امام شافعیؒ کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امام اعظمؒ کے ایک شاگرد امام محمدؒ سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :۔

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارے میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسن کے درمیان ہوا۔ ابن الحسن نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر میں استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام ابن الحسن نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا۔ مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی۔ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں، اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حاکم نے کہا کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں کیونکہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔ (فتح الباری)

بخاری میں ایک اور روایت بھی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ عطاء کہتے ہیں کہ :۔

کچھ حرج نہیں اگر کوئی شخص اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے سوا (اور جگہ) مباشرت کرے۔

(اردو ترجمہ۔ جلد اول صفحہ ۴۹۲ ۔ کتاب البیوع)

آپ نے غور فرمایا کہ ہماری کتب احادیث و تفاسیر کی رُو سے اس آیت کی کس قسم کی تفسیر سامنے آتی ہے؟ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے "اَنّٰی شِئۡتُمۡ" کا ترجمہ تو "جہاں سے چاہو" ہی کیا ہے لیکن حاشیہ میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ :۔

یہود، عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احول پیدا

پیدا ہوتا ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری۔ یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ یعنی اس سے مقصد اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے۔ سو تم کو اختیار ہے کہ آگے سے یا کروٹ سے یا اس کی پشت سے پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو۔ مگر یہ ضروری ہے کہ تخم ریزی اس خاص موقع میں ہو جہاں پیداواری کی امید ہو۔ یعنی مجامعت خاص فرج میں ہو۔ لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو۔ یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم اس نتیجہ پر تو صحیح پہنچ گئے کہ قرآنِ کریم کی رو سے میاں بیوی کے اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے لیکن چونکہ " اَنّٰى شِئْتُمْ " سے متعلق روایات میں یہودیوں کا ذکر آیا ہے، اس لئے انہیں ان روایات کے حوالے سے یہ وضاحت کرنا پڑی۔ لیکن اگر قرآن کو قرآن ہی سے سمجھا جائے تو نہ اس قسم کی دوراز کار تاویلات کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی کثافتوں سے اس کتابِ مطہر کے معانی کو آلودہ کرنے کی جرأت پیدا ہو سکتی ہے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں متصل آیات میں سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ آیت (۲/۲۲۲) میں مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ سے فطری طریق کی طرف اشارہ کر دیا۔ حیض کے دنوں میں مجامعت سے منع کر کے اس کی وضاحت کر دی۔ اور آیت (۲/۲۲۳) میں عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دے کر اختلاطِ جنسی کا مقصد صراحت سے بیان کر دیا۔ لیکن قرآنِ کریم کو چھوڑ کر جب آپ نے روایات اور ان پر مبنی تفاسیر کی طرف رخ کیا، تو اس متعفن دلدل میں پھنس کر رہ گئے جسے ہم بادلِ صد ناخواستہ سامنے لاتے ہیں۔

(۰)

تعلقات میں کشیدگی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے زوجین کے انتخاب میں ہم آہنگی اور یک رنگی پر بڑا زور دیا ہے۔ اور ازدواجی رشتہ کا مقصد باہمی مودّت، سکینت اور رحمت سے، گھر کو جنت بنانا بتایا ہے۔ لیکن ان تمام احتیاطوں کے باوجود ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بعض کشیدگی محض عارضی رنجش کی وجہ سے ہو گی جس کی عام وجہ سریع الغضب ہونا ہے۔ یعنی یونہی (TEMPER-LOOSE) کر جانا۔ (مثلاً) انسان غصے میں آ کر بیہودہ بکواس شروع کر دیتا ہے اور جہالت کی وجہ سے بیوی

ظہار

کو "ماں" کہہ دیتا ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور لغو بات۔ (عربوں کے ہاں اسے ظہار کہتے تھے) اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر اپنے کئے پر خود ہی نادم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ غصے کی حالت میں بیوی کو "ماں" کہہ دینے سے وہ سچ مچ "ماں" نہیں بن جاتی۔ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔىْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (۳۳/۴) "ظہار سے تمہاری بیویاں تمہاری مائیں نہیں بن جاتیں"۔ اسی لئے اس قسم کی لغو باتوں کو حقیقت پر محمول نہیں کر لینا چاہیئے۔ سورہ البقرہ میں پہلے کہا:-

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲۲۴/۲)

۲/۲۲۴

عائلی زندگی کے سلسلہ میں دوسری بات یہ یاد رکھو کہ بعض لوگ، یونہی کوئی لغو سی قسم کھا لیتے ہیں (کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا)۔ پھر جب ان سے بھلائی اور تقویٰ اور لوگوں میں اصلاح کے کاموں کے لئے کہا جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ایک قسم کھا رکھی ہے، اس لئے ہم ان کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے۔

اور پھر فرمایا:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (۲۲۵/۲)

۲/۲۲۵

یاد رکھو! خدا اس قسم کی لغو باتوں پر گرفت نہیں کرتا جو تم، یونہی بلا سوچے سمجھے کھا لو۔ وہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے کھاؤ (۸۹/۵)۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ نیز اس کا قانون ایسا نہیں جو یونہی ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک اٹھے۔ اس میں بڑی سہار ہے اور مقصد تمہاری حفاظت ہے نہ کہ تباہی۔

لیکن چونکہ اس قسم کی بیہودہ حرکات سے گھر کی فضا مسموم ہو جاتی ہے اس لئے قرآن کریم ان کی روک تھام کے لئے ان پر تھوڑا سا تاوان ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے کہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ - (۵۸/۴)

(لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ معاشرہ میں اس قسم کی لغویتوں کو عام ہونے دیا جاتے سنجیدہ لوگوں کا معاشرہ ایسا نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا) جو لوگ اپنی بیوی کو ماں (یا ایسے ہی کوئی اور الفاظ) کہہ بیٹھیں اور اس کے بعد پشیمان ہو کر اپنی اس بیہودہ بات کو واپس ... لینا چاہیں (تو انہیں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنا سیکھیں اور یونہی جوجی میں آتے منہ سے نہ نکال دیا کریں۔ وہ جرمانہ یہ ہے کہ) قبل اس کے کہ وہ بہ حیثیت میاں بیوی ایک دوسرے کے پاس جائیں، ایک غلام آزاد کریں۔ یہ اس لئے ہے کہ تم آئندہ کے لئے نصیحت پکڑو اور اللہ تمہارے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

جس کے پاس غلام نہ ہو یا غلام آزاد کرانے کی استطاعت (یا اُس زمانے کے غلاموں کے ختم ہو جانے کے بعد جب غلام باقی ہی نہ رہیں تو) اس صورت میں وہ تعلقات زناشوئی سے پہلے دو ماہ کے متواتر روزے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لئے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھو جو اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے۔

یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جن کے اندر رہنا ضروری ہے (اگر اس باب میں سہواً غلطی ہو جائے تو اس کے ازالہ کی شکل وہ کفارہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن جو لوگ سرے سے ان حدود ہی کا انکار کریں تو وہ کافر ہیں) اور کافروں کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

ایلاء

یہ تو رہا غصہ کی حالت میں ظہار سے متعلق۔ لیکن کوئی شخص عمداً بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے۔ (اسے ایلا کہا جاتا ہے)۔ تو ظاہر ہے ایسی شکل کو دائماً یا غیر متعین عرصہ کے لئے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے کہا کہ

۲/۲۲۶-۲۲۷

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں، تو عورت کو اس معلق حالت میں غیر متعین عرصہ کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس عرصہ میں باہمی تعلقات کی طرف رجوع کریں تو انہیں اس کی اجازت ہے۔ کیونکہ قانونِ خداوندی میں اس قسم کی لغزشوں سے حفاظت

اور مرحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ (۸/۵ ؛ ۳۳/۴ ؛ ۸۹/۵)

لیکن اگر وہ معاہدۂ نکاح سے آزاد ہو جانے کا فیصلہ کر لیں (جسے طلاق کہتے ہیں) تو انہیں ایسا کر لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (اسے معلوم ہے کہ جب نباہ کی شکل باقی نہ رہے تو پھر الگ ہو جانا ہی بہتر ہوتا ہے)۔

اس مقام پر قرآنِ کریم نے اس قسم کے توڑنے کے کفارہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن دوسرے مقام پر ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۸۹/۵)

اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے فلاں فلاں حلال چیزوں کے نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس لئے اب اس قسم کو کس طرح توڑیں؟ تو یاد رکھو۔ لغو اور مہمل قسموں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا (۲۲۵/۲) باقی رہیں وہ (غلط) قسمیں جو تم نے قصد و ارادہ سے نہایت محکم طور پر کھائی ہوں تو انہیں بھی توڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں کچھ کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ کھانا ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو کپڑا دینا یا کسی غلام (گردن) کا آزاد کرانا[1]۔ لیکن جسے یہ کچھ میسر نہ ہو (یا حالات ایسے ہوں جن میں یہ کچھ ممکن نہ ہو۔ مثلاً کوئی محتاج یا غلام موجود نہ ہو) تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری اُن (غلط) قسموں کا جو تم نے بالارادہ کھائی ہوں۔ لیکن جو قسمیں قوانینِ خداوندی کے خلاف نہ ہوں، ان کی پاسداری نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ قسمیں درحقیقت عہد و پیمان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور عہد کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے (خواہ وہ عہد دوسروں کے ساتھ کیا گیا ہو یا خود اپنے ساتھ)۔

اس طرح اللہ اپنے احکام و قوانین کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

---

[1] محکوموں اور مظلوموں کی آزادی اسی زمرہ میں آجائے گی۔

چونکہ ایلاء میں بھی قسم دل کے ارادے سے کھائی جاتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کیلئے بھی یہی کفارہ ہوگا۔

لیکن اگر یہ شخص چار ماہ کے عرصہ میں رجوع نہیں کرتا تو پھر، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے (۲/۲۲۶-۲۲۷)، نوبت طلاق تک پہنچ جائے گی۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ظہار اور ایلاء سے متعلق احکام کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو بساتے نہیں اور ادھر لٹکی ہوئی چھوڑے رکھتے ہیں، یا مفقود الخبر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے ضروری قوانین وضع کرے۔

(٠)

طلاق

میاں بیوی کی کشیدگی کی انتہائی شکل وہ ہے جس میں معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ طلاق کے لغوی معنیٰ آزاد ہو جانے یا آزاد کرانے کے ہیں۔ نکاح کے معاملہ کو تو قرآنِ کریم نے فریقین کی رضامندی پر چھوڑا تھا اس لئے کہ وہ ان کا انفرادی مسئلہ تھا لیکن فسخ نکاح کا معاملہ انفرادی نہیں رہتا۔ اس میں فریق مقابل اور اکثر اوقات اولاد کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے اس نے اسے معاشرہ کا مسئلہ قرار دیا ہے اور اسلامی مملکت کو ہدایات دی ہیں کہ اسے اس باب میں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بات یہیں سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام روش ہے کہ مرد کا جس وقت جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر بیوی کو (اکثر اوقات مع بچوں کے) گھر سے نکال باہر کرے یہ قطعاً خلافِ قرآن ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں میاں بیوی برابر کے فریق ہوتے ہیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کے فسخ کرنے میں بھی وہ برابر کے فریق ہوں گے۔ یہ تو معاہدہ کے بنیادی تصوّر کے خلاف ہے کہ اس کے استوار کرنے میں تو زوجین برابر کے فریق ہوں لیکن اس کے فسخ کرنے کا کلّی اختیار ایک فریق (خاوند) کو حاصل ہو اور فریقِ ثانی (بیوی) مجبور و مقہور ہو۔ قرآنِ کریم کی رو سے اس میں نہ خاوند کو (UNILATERALLY) کوئی اختیار ہوتا ہے نہ بیوی کو۔ یہ معاملہ معاشرہ (مملکت) کے طے کرنے کا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم اس باب میں معاشرہ کو کیا ہدایات دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ
أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ
عَلِيمًا خَبِيرًا - (۴/۳۵)

اگر تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو۔ اس طرح اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کرلیں (یا دونوں ثالث ان میں اصلاح کی نیت سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں) تو قانونِ خداوندی ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قانون علم و آگہی پر مبنی ہے۔

آپ دیکھیے اس میں "اِنۡ خِفۡتُمۡ" (اگر تمہیں اس کا..... اندلیشہ ہو) کا مخاطب معاشرہ (مملکت) ہے۔ لہٰذا میاں بیوی کی باہمی کشیدگی کے دور کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ مملکت ایک مصالحتی بورڈ کی تشکیل کرے۔

دوسرے "شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا" میں میاں اور بیوی دونوں شامل ہیں اس لئے جس طرح خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ باہمی کشیدگی کی صورت میں تشکیلِ مصالحتی بورڈ مقرر کرنے کے لئے مملکت کی طرف رجوع کرے، اسی طرح بیوی کو بھی حق حاصل ہے۔ بیوی کے متعلق دوسری جگہ ہے:۔

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا ؕ وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۔ (۴/۱۲۸)

(جو عورتیں سرکشی پر اتر آئیں ان کے متعلق (۴/۳۴) میں حکم دیا جا چکا ہے)۔ اس کے برعکس اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی محسوس کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ جن شرائط پر بھی چاہیں آپس میں مصالحت کرلیں۔ اس لئے کہ مصالحت بہرحال جھگڑے سے بہتر ہوتی ہے۔ (مصالحت کیلئے ثالثوں کے تقرر کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ۴/۳۵)۔ مصالحت کے معاملہ میں بالعموم روپے پیسے کا سوال سدِ راہ ہو جایا کرتا ہے اور معاملات سلجھنے نہیں پاتے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعت میں بخل ہوتا ہے۔ اگر تم اس جذبہ پر قابو پاکر حسنِ سلوک سے کام لو اور اس طرح قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہوتا ہے۔

اس طرح باہمی مصالحت ہو جائے تو ہو المراد۔ ورنہ بیوی کو بھی عدالت میں سلسلہ جنبانی کرنی ہوگی۔ عدالت میں عورت کے اپنے معاملہ کے متعلق بحث کرنے کا ذکر خود قرآنِ کریم میں آیا ہے جہاں فرمایا:

قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّتِىۡ تُجَادِلُكَ فِىۡ زَوۡجِهَا وَتَشۡتَكِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسۡمَعُ

تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۵۸/۱)

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو تجھ سے (اے رسولؐ) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اپنی مظلومیت کے متعلق خدا سے فریاد کر رہی تھی (اس نے عدالتِ خداوندی میں استغاثہ دائر کیا تھا)۔ اللہ تم دونوں کے سوال و جواب سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اگر مصالحتی بورڈ کی مصالحت کی کوششیں ناکام رہ جائیں تو عدالتِ مجاز فسخِ نکاح کا فیصلہ سنا دے گی۔ یہ بات کہ یہ فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوگا، قرآنِ کریم سے واضح ہے۔ سورہ الطلاق میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ۔ (۶۵/۱)

اے رسولؐ! جب تم طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرو تو لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے بعد عدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے[1]۔ اسے ضروری پورا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اس کا حساب رکھو اور اس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ ($\frac{۲}{۲۲۸-۲۳۲}$; $\frac{۳۳}{۴۹}$)

دیکھئے! یہاں خطاب تو النبی (بصیغۂ واحد) سے ہے لیکن اس کے بعد طَلَّقْتُمْ (تم طلاق دو) میں جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ عام دستور کے مطابق عدالت کے لئے جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ دوسرے، طلقتم سے پہلے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ کہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ طلاق کا فیصلہ لوگ از خود نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ نبی (یعنی اسلامی مملکت یا عدالت) کی وساطت سے کیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں طلاق کے متعلق ہدایات دی ہیں اس سے مراد عدالت کے ذریعے فسخِ معاہدہ کا فیصلہ ہے جس کا اولین قدم مصالحتی بورڈ کی طرف رجوع کرنا ہے۔

بادی النظر میں ذہن اس طرف جاتا ہے کہ جب مصالحتی بورڈ اپنی کوشش میں ناکام رہ جائے تو عقدِ نکاح از خود فسخ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اس میں بعض دیگر امور فیصلہ طلب ہوتے ہیں جن کے لئے عدالت کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

(۲) اگر عدالت مجاز دیکھے کہ عورت بے قصور ہے اور مرد ہی نباہ نہیں کرنا چاہتا تو وہ عورت سے کچھ دلائے بغیر طلاق کا فیصلہ کر دے گی۔ سورۃ النساء میں ہے:۔

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا

---

[1] عدت کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی۔

فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَأْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ (۴/۲۰-۲۱)

اگر تم یہ فیصلہ کر لو کہ موجودہ بیوی کو طلاق دے کر کسی اور جگہ نکاح کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض نئی عورت سے شادی کرنے کا شوق طلاق کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شرائط کے مطابق جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا طلاق تک کی نوبت پہنچ جائے۔ اور تم اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو (البتہ اگر طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہو تو پھر اس میں سے کچھ لیا جا سکتا ہے (۲/۲۲۹) یا اگر اس سے بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو تو۔ ۴/۱۹) لیکن جب ایسی صورت نہ ہو اور تم اس (بیچاری) کے خلاف ناحق تہمتیں لگا کر کچھ وصول کرنا چاہو تو یہ ایک کھلا ہوا گناہ ہے۔ یعنی ایسی معیوب حرکت جس کے مذموم ہونے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

جو کچھ تم نے اسے دیا تھا وہ کیسے واپس لے سکتے ہو۔ درآں حالیکہ تم میں زناشوئی کے تعلقات رہ چکے ہیں اور تمہاری بیویاں نکاح کے وقت تم سے اپنے حقوق کے تحفظ کا پختہ عہد بھی لے چکی ہیں لہٰذا تمہارے لئے اس معاہدہ کا احترام ضروری ہے۔

(ضمناً) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مرد اگر کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ پہلی بیوی کو (قاعدے قانون کے مطابق) طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اصول وحدتِ زوج (ایک وقت میں ایک بیوی) کا ہے۔

(۳) لیکن عورت اگر فحش کی مرتکب ہو تو عدالت اس سے کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ (۴/۱۹)

(جیسا کہ مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بیوی کا انتخاب اپنی مرضی سے کریں (۴/۳) اسی طرح نکاح کے لئے عورتوں کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ (ایسا کرنا حلال ہی نہیں) اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اگر وہ تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں اس نیت سے روک رکھو کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ ہتھیا لو۔ ایسا قطعاً جائز نہیں۔

بجز اس کے کہ ان سے کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب ہوا ہو۔ (اس صورت میں عدالت تمہیں اس میں سے کچھ دلا سکتی ہے)۔

(ضمناً) آیت کے پہلے الفاظ سے واضح ہے کہ عورت کی رضامندی کے بغیر (اکراھًا) نہ اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نکاح کے بعد اسے باندھ کر رکھا جا سکتا۔ یعنی نہ اسے نکاح کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی (نکاح کے بعد) اسے اس کی رضامندی کے خلاف بیوی بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنا "حلال ہی نہیں"؛ حرام ہے۔ یہ آیت عورت کے حق طلاق کی مؤثق سند ہے۔

(۴) اسی طرح اگر عدالت دیکھے کہ مرد بے قصور ہے اور عورت نباہ نہیں کرنا چاہتی تو وہ مرد کو کچھ ہرجانہ دلا سکتی ہے۔

۲/۲۲۹ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۲/۲۲۹)

طلاق کی صورت میں اس کی اجازت نہیں کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ ہاں اگر کسی وقت ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف یہی چیز ان کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہو رہی ہو اور دوسری طرف میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے میں انہیں خدشہ ہو کہ (تعلقات کی کشیدگی کی بنا پر) وہ حقوق و واجبات ادا نہیں کر سکیں گے جو قانونِ خداوندی نے ان پر عائد کر رکھے ہیں — اور معاشرہ کا نظامِ عدالت بھی اسی نتیجہ پر پہنچے اور سمجھے کہ خاوند کو واقعی کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور معاہدۂ نکاح سے آزادی حاصل کر لے۔

یہ قانونِ خداوندی کی حدود ہیں جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ جو کوئی ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہوگا۔

(نوٹ) اس آیت کے پہلے چند الفاظ " اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ " اس مقام پر حذف کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں ان کے مناسب مقام پر سامنے لایا جائے گا۔

(۵) عدالت کے اس فیصلہ (طلاق) کے بعد عورت کی عدت شروع ہو جائے گی۔ عدت کے متعلق تفصیلی احکام تو آگے چل کر درج کئے جائینگے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ

(۱) عدت اس عرصہ کو کہتے ہیں جس میں مطلقہ یا بیوہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی۔

(۲) عدت کے عرصہ میں اس امر کی گنجائش ہوتی ہے کہ سابقہ میاں بیوی پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں۔ اس کی شرائط آگے چل کر بیان کی جائینگی۔

اسی سلسلہ میں حسب ذیل ہدایات غور طلب ہیں:۔

(i) سورۃ الطلاق میں ہے:۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۔ (۶۵/۲)

جب وہ مدت (عدت) ختم ہونے کو ہو تو انہیں (عورتوں کو) یا تو "معروف" طور پر رکھ لو۔ یا معروف طور پر الگ کر دو۔

"معروف" کے معنیٰ ہیں مملکت کے وضع کردہ قاعدے اور قانون کے مطابق۔

(ii) سورۃ بقرہ میں ہے:۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۔ (۲/۲۲۹)

یا انہیں معروف طور پر روک لو اور یا حسن سلوک کے ساتھ الگ کر دو۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ عدت کے دوران ان (سابقہ میاں بیوی) کو رشتۂ ازدواج کی استواری کا موقع دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں واضح ہیں۔

(ا) اگر طلاق بیوی نے حاصل کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس خاوند کے ہاں بسنا نہیں چاہتی اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ (اس کا سابقہ) خاوند اسے زبردستی دوبارہ اپنے ہاں لے جائے۔ ہاں اگر وہ عورت اپنا ارادہ بدل لے تو اور بات ہے۔

(ب) اگر خاوند نے طلاق حاصل کی ہے حالانکہ بیوی اس کے ہاں بسنا چاہتی تھی اور مرد اپنی اصلاح کا ارادہ کر لیتا ہے تو یہ رشتہ دوبارہ استوار ہو سکتا ہے۔ بُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۔ (۲/۲۲۸)۔ "اگر وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو وہ اس سابقہ بیوی کو واپس لے لینے کا زیادہ حقدار ہے"۔

"حقدار" کے معنیٰ یہ نہیں کہ وہ بطور استحقاق اس عورت کو دوبارہ بیوی بنا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنی اصلاح کرلے تو وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عورت کی رضامندی بہر حال ضروری ہوگی۔ لیکن عورت کو تنگ کرنے کی نیت سے ایسا نہ کیا جائے۔ ارشاد ہے:۔

۲/۲۳۱ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (۲/۲۳۱)

جب مطلقہ عورت کی عدت کا زمانہ ختم ہونے کو آئے تو (جیساکہ ۲/۲۲۸ میں کہا گیا ہے) یا اُسے نکاح میں لے آؤ یا قاعدے کے مطابق رخصت کردو۔ [اور یہ فیصلہ دو معتبر گواہوں کے روبرو کرو تاکہ بات واضح ہو جائے۔ (۶۵/۲)]

اور یاد رکھو! ان عورتوں سے دوبارہ نکاح اس نیت سے نہ کرو کہ ان پر زیادتی کرکے انہیں تکلیف پہنچائی جائے۔ جو ایسا کرے گا وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کو یونہی مذاق نہ سمجھو۔ اس کے نتائج وعواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔ یہ تو اللہ کی نوازشات میں سے ہے کہ اس نے تمہیں ایسا واضح ضابطۂ قوانین عطا کر دیا ہے۔ اور صرف قانون ہی نہیں بتایا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ قانون کی غرض وغایت کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے نتائج کیا نکلیں گے!

لہٰذا، تم ان قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔

(ضمناً) آیت کے ان الفاظ پر دوبارہ نگاہ ڈالیے۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا — احکامِ خداوندی کا مذاق نہ اڑاؤ۔ ذرا سوچیے کہ کیا اس وعیدِ خداوندی کے مورد ہم ہی نہیں؟ ہم نے جس طرح طلاق کے مسئلہ کو اضحوکہ اور تماشا بنا رکھا ہے اس سے توصاف ظاہر ہے کہ یہ وعید ہمارے ہی لئے ہے۔

(۲) اگر انہوں نے ازدواجی رشتہ کو استوار کرلیا ہے تو ہوالمراد — لیکن اگر الگ ہوجانے کا فیصلہ

کیا ہے تو اس کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ سورہ الطلاق میں ہے :۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۔ (۶۵/۲)

جب ان عورتوں کی عدت کی مدت قریب الاختتام ہو تو خواہ انہیں معروف طور پر روک لو اور خواہ معروف طور پر الگ کر دو۔ اس کے لئے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوگی جنہیں چاہیے کہ وہ (فریقین کی خاطر نہیں بلکہ) خدا کی خاطر شہادت کو قائم رکھیں۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ غور طلب ہے۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ طلاق کے عدالتی فیصلہ کے بعد عدت کے دوران معروف طریق سے رشتۂ ازدواج استوار ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے نکاح کی تجدید کی ضرورت ہوگی یا صرف باہمی رضامندی کافی ہوگی۔ فرق ان میں یہ ہوگا کہ تجدید نکاح کی صورت میں مہر دوبارہ دینا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں ایک مقام پر نکاح کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا ہے۔

۲/۲۳۲ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ..... (۲/۲۳۲)

جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں اور سابقہ میاں بیوی قاعدے اور قانون کے مطابق پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے (نکاح) کا ارادہ کریں تو تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو۔

یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ "بالمعروف" ہوگا۔ یعنی ان قواعد و ضوابط کی رو سے جنہیں اسلامی مملکت قرآنی حدود کے اندر وضع کرے۔ لہٰذا وہ مملکت اس باب میں جو فیصلہ بھی کرے وہ "معروف" کی شرط کو پورا کر دیگا۔

(۷)

تین مرتبہ کی طلاق

طلاق کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات واضح ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جو احکام شریعت رائج ہیں ان کی رو سے خاوند کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے (ARBITERARILY) بیٹھے بٹھائے بیوی کو طلاق دے دے لیکن اگر بیوی اس کے مظالم سے رستگاری حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالتوں

کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ اس کے لئے اصطلاح بھی الگ ہے۔ یعنی "خُلع" جس کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ مروجہ قانونِ شریعت کی رُو سے زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جاتی ہے کہ خاوند اگر چاہے تو اپنا "حق طلاق" مشروط یا غیر مشروط طور پر بیوی کو تفویض کر سکتا ہے۔ یعنی طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل ہوتا ہے، بیوی کو نہیں۔ وہ اس کے رحم و کرم پر ہی رہتی ہے۔ یعنی اس بات کا تو عورت کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس مرد کے حبالۂ نکاح میں آنا چاہتی ہے یا نہیں۔ لیکن جب وہ ایک دفعہ اس جبل (پھندے) میں پھنس جائے تو اس سے چھٹکارا پانے کا اسے کوئی اختیار نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام ہمارے دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں جب مرد عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ شریعتِ خداوندی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھنے کے سلسلہ میں ایک اور اہم گوشہ سامنے آتا ہے۔ جب عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر دیا تو یہ ایک طلاق ہو گئی۔ (یاد رکھیئے! قرآنِ کریم کی رُو سے طلاق کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب عقدِ نکاح فسخ ہو جائے)۔ اگر یہ میاں بیوی عدت کے دوران پھر سے ازدواجی رشتہ استوار نہ کریں اور علیحدہ ہو جائیں، تو اگر یہ چاہیں تو اس کے بعد بھی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) ازدواجی رشتہ استوار کر لیں لیکن اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے (یعنی اُسی طریق کے مطابق جس کا پہلے ذکر آچکا ہے، عقدِ نکاح فسخ ہو جائے) تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو گی۔ اس طلاق کے بعد بھی اس کی گنجائش ہو گی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) پھر سے میاں بیوی بن جائیں۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے جو اس میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ کی طلاق ہو گی تو پھر انہیں اس کی اجازت نہیں ہو گی کہ یہ (عدت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں نکاح کر لیں۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کر لے اور اس سے طلاق ہو جائے (یا یہ بیوہ ہو جائے) تو اس صورت میں یہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ البقرہ (۲/۲۲۹) میں ہے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ۔ ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ کی طلاق کی صورت میں اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

۲/۲۳۰ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ‌ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ۔ (۲/۲۳۰)

اگر کسی میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ کی طلاق (اور تین مرتبہ کے نکاح) کے بعد تیسری مرتبہ طلاق ہوجائے تو اس کے بعد یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں! البتہ اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور اس سے بھی طلاق ہوجائے تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرے۔

یہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق وہ قوانین جنہیں اللہ ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو معاشرتی زندگی کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم کے یہ احکام کس قدر واضح ہیں۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ (۲/۲۳۱)۔ "ہمارے احکام کا مذاق مت اڑاؤ"۔ تو اس کی تین مثال ہمارے ہاں کے "شرعی احکام" ہیں۔ ان احکام کی رُو سے، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین مرتبہ "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ دے (یعنی طلاق کا لفظ تین مرتبہ کہدے) تو یہ تین مرتبہ کی طلاق (طلاق ثلاثہ یا طلاق بائن) قرار پاجاتی ہے جس کے بعد نہ یہ جوڑا میاں بیوی رہتا ہے نہ ہی یہ آپس میں نکاح کرسکتے ہیں۔ البتہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ عورت

حلالہ! "ایک رات کے لئے" کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ وہ اس کے ساتھ شب بسری کرنے کے بعد دوسری صبح اسے طلاق دیدے، تو پھر یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح کرسکتے ہیں۔ اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔ یہ صورت جس قدر حیات سوز اور غیرت کش ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ شرمناک اور الم انگیز پہلو یہ ہے کہ غصہ میں آکر "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" تو مرد کہتا ہے اور اس کے بعد یہ اپنی اس حرکت پر نادم بھی ہوجاتا ہے لیکن اس کی سزا اس بے گناہ بیوی کو بھگتنی پڑتی ہے ـــ اور سزا بھی ایسی جس کے مقابلہ میں وہ عفت مآب موت کو ترجیح دے۔ یعنی ایک رات کے لئے کسی غیر مرد سے ہم بستری! اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اسے "شریعتِ خداوندی" کہہ کر پکارا جاتا ہے (معاذ اللہ۔ استغفر اللہ)۔ میرے پاس اکثر اس قسم کے استفسارات آتے رہتے ہیں کہ مرد نے غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیا۔ مولوی صاحب نے فرما دیا کہ اب تو حلالہ کرنا ہوگا۔ بال بچوں والی عصمت مآب' (اور اکثر حالات میں) معمر بیوی سر پیٹ رہی ہے۔ اس کی غیرت اسے اس کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ لیکن مولوی صاحب اس پر مُصر ہیں کہ حلالہ کرنا ہی ہوگا۔ اکثر و بیشتر اس "کارِ خیر" کے لئے خود اپنے آپ کو پیش کردیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی میرے سامنے پیش کئے گئے جن میں حلالہ کرنے والا اس عورت کو طلاق

نہیں دیتا۔ یا اس کے لئے بھاری رقم مانگتا ہے۔ یہ سب کچھ شریعتِ حقّہ کے نام پر ہوتا ہے اور "اربابِ شریعت" کے دل میں خوفِ خدا کا ذرا سا احساس بھی بیدار نہیں ہوتا کہ اس یکسر خلافِ اسلام ہی نہیں خلافِ انسانیت شرمناک فعل کو ختم کریں۔ ختم کرنا تو ایک طرف، حکومت کی طرف سے نافذ کردہ عائلی قوانین (FAMILY - LAWS -1961.) میں تھوڑی سی اصلاح کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے خلاف ہماری مذہبی پیشوائیت نے قیامت برپا کر دی۔ اب بھی جس وقت ان کی "اسلامی حمیت" جوش میں آتی ہے تو ان کی طرف سے سب سے پہلا مطالبہ ان قوانین کو منسوخ کرنے کا پیش ہوتا ہے[1] ـــــ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

(۰)

مُتعہ

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے نکاح، مرد اور عورت کے مابین ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ، طلاق یا زوجین میں سے کسی ایک کی وفات سے منقطع ہوتا ہے۔ طلاق نہ ہو تو یہ عمر بھر تک قائم رہتا ہے۔ اس میں مدّت کا سوال ہی نہیں۔

لیکن عربِ جاہلیہ میں جنسی اختلاط کی ایک اور شکل بھی رائج تھی جس میں یہ اختلاط ایک معینہ مدّت کیلئے معینہ معاوضہ کے عوض روا رکھا جاتا تھا۔ اسے وہ متعہ سے تعبیر کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اسے ختم کر دیا لیکن شیعہ حضرات کے ہاں اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرا منصب چونکہ قرآنی احکام و ہدایات کی تبیین ہے اس لئے میں فرقہ وارانہ بحث میں نہیں الجھا کرتا۔ بنابریں، میں شیعہ حضرات کے اس مسلک کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سُنّی حضرات جو اس قسم کے جنسی تعلقات (مُتعہ کو) زنا قرار دیتے ہیں، ان کی کتب روایات میں اس کے متعلق کیا کچھ مذکور ہے۔

سُنّیوں کی سب سے معتبر کتاب بخاری شریف ہے۔ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں (جلد دوم صفحہ ۵۹ ۷ ، مطبوعہ کرزن گزٹ پریس دہلی، و جلد سوم صفحہ ۱۴۶، مطبوعہ مصر) حسب ذیل حدیث آئی ہے۔

---

[1] مسودہ کی نظرِ ثانی کے وقت (جنوری ۱۹۷۹ء میں) ملک میں شرعی قوانین کے ملکتی قوانین کی حیثیت میں نفاذ کا چرچا عام ہو رہا ہے۔ اس میں بھی عائلی قوانین (۱۹۶۱ء) کی تنسیخ کا مطالبہ پیش پیش۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب کی اشاعت تک صورتِ حالات کیا ہو!

عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان (اپنے مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا) نہ ہوتا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع نہ کرا دیں؟ حضورؐ نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔ پھر ہمیں اجازت دی کہ عورتوں سے کسی کپڑا وغیرہ کے عوض میں "نکاح" کر لیا کریں۔

بخاری کے بعد صحیح مسلم کا مرتبہ ہے۔ اس میں یہ روایت تین طریقوں سے آئی ہے۔ اس میں ایک جگہ "اِلیٰ اَجَلٍ" کا اضافہ ہے" یعنی رسول اللہ نے ہمیں اجازت دی کہ ہم ایک میعاد مقررہ کے لئے عورتوں سے کپڑے وغیرہ کے عوض نکاح کر لیا کریں" دوسری جگہ لکھا ہے کہ اس میں لڑائیوں کے زمانے کی تخصیص نہ تھی۔

(صحیح مسلم مطبوعہ مجتبائی۔ دہلی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۵۰)

جمع الفوائد (شیخ محمد بن محمد سلیمان سوسی مالکی مطبوعہ میرٹھ ج ۱۔ ص ۲۲۲) میں اس روایت میں اتنا فرق ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ لڑائیوں پر جاتے تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر حضورؐ نے مذکورہ بالا اجازت دی تھی (یعنی ایک وقتِ معین کے لئے نکاح کی اجازت)

یہی روایت مسند امام ابی عبداللہ محمد بن ادریس شافعی مطبوعہ مصر ص ۱۴۵ میں بھی ہے۔ نیز شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے منتقی الاخبار میں اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے اور صاحب کنز الاعمال (ص ۲۹۵ ج ۸) نے لکھا ہے کہ امام طبری نے تہذیب الآثار میں اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث صحیح بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۲ صفحہ ۷۶۷۔ و مصر جلد ۳ ص ۱۵۰) میں یوں درج ہے۔

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے کہ حضورؐ کا فرستادہ شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمھیں اجازت دی گئی ہے کہ تم متعہ کرو۔ اب تم متعہ کر سکتے ہو۔

صحیح مسلم (ص ۴۵۰) میں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ کے منادی کرنے والے نے آکر اعلان کیا کہ تم لوگوں کو متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دوسری روایت (مسلم ص ۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے خود تشریف لا کر متعہ کی اجازت کا اعلان فرمایا۔

تیسری حدیث بخاری (مطبوعہ دہلی جلد ۱ ص ۷۶۷ و مصر ص ۱۵۰) میں یوں ہے۔

سلمہ بن اکوع کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد و عورت آپس میں قرارداد کریں تو تین راتوں تک ان کی مباشرت کی میعاد ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو اس مدت میں اضافہ کریں اور اگر چاہیں

تو جدائی اختیار کر لیں۔

صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی ص۴۵۱) میں ہے کہ حضورؐ نے جنگ اوطاس والے سال تین دن کے میعادی متعہ کی اجازت دی۔ یہی روایت جمع الفوائد، سنن، دارقطنی اور کنز العمال میں بھی ہے۔

اب ذرا اس کی تفصیل سنیئے۔ صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی صفحہ نمبر ۴۵۱) میں ہے۔

سبرہ جہنی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت دی تو میں اور ایک اور شخص بنی عامر کی ایک عورت کے پاس اکٹھے گئے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ اپنی چادر دے گا۔ اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی لیکن میں اس کی نسبت جوان تھا۔ وہ عورت جب اس کی چادر کی طرف دیکھتی تھی تو اس کی طرف مائل ہو جاتی تھی اور جب میری طرف دیکھتی تو مجھے پسند کرتی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تم اور تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ تین روز تک میں اس کے پاس رہا۔

غور فرمایا آپ نے کہ جناب امام مسلم نیشاپوری صحابہ کبارؓ کا کیا نقشہ کھینچ رہے ہیں! (استغفر اللہ! استغفر اللہ!)

کنز العمال (جلد ۸ ص۲۹۴) میں سبرہ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حجۃ الوداع میں:۔

جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر حضورؐ نے ہمیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے آکر عرض کیا کہ عورتیں متعہ کے لئے راضی نہیں ہوتیں جب تک کوئی میعاد مقرر نہ کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میعاد مقرر کر کے متعہ کر لو۔

آپنے دیکھا کہ ہمارے راویوں کے بیان کے مطابق نبی اکرمؐ اپنے آخری حج میں صحابہؓ کو کیا تعلیم دے رہے ہیں! (اللّٰھم اغفرلنا۔ اللّٰھم اغفرلنا)۔

اہل سنت والجماعت حضرات کی مدافعت (DEFENCE) یہ ہوتی ہے کہ حضورؐ نے بیشک متعہ کی اجازت دی تھی لیکن بعد میں اس کی ممانعت فرما دی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جی میں خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ماتھے سے ایک بہت بڑے کلنک کے ٹیکے کو دھو دیا۔ لیکن یہ سادہ لوح اتنا نہیں سمجھتے کہ جو رسول (ان راویوں کے بیان کے مطابق) اپنی نبوت کے آخری سالوں تک متعہ جیسے فعل کی اجازت دیتے رہے، اس رسول کے متعلق (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دنیا کیا رائے قائم کریگی؟

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ متعہ کی ممانعت کی جس قدر روایات ہیں ان میں ایسا تضاد رکھ دیا گیا ہے

کہ سوچنے والا اس مخمصے میں پھنس جاتا ہے کہ یہ کیا پریشان کن روایات ہیں۔ مثلاً کنز العمال (جلد ۸ صفحہ ۲۹۵) میں ایک ہی راوی (سبرہ جہنی) سے (جن کی روایات اوپر گزر چکی ہے کہ حضورؐ نے متعہ کی اجازت حجۃ الوداع میں دی تھی، تین مختلف روایات ہیں جن میں سے

ایک میں ہے کہ حضورؐ نے خیبر کے دن متعہ سے ممانعت فرمائی۔ دوسری میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے دن ممانعت فرمائی اور تیسری میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ممانعت فرمائی۔

لیکن شرح مسلم نووی (مطبوعہ دہلی جلد ۱ صفحہ ۴۵۰) میں اسحٰق بن راشد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے جنگِ تبوک میں متعہ سے منع فرمایا۔

اندازہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح کثرتِ تعبیر سے خواب کو پریشان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ متعہ ایک سے زیادہ مرتبہ جائز قرار دیا گیا اور ایک سے زاید مرتبہ اس کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ امام مسلمؒ نے اس باب کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے۔

باب نکاح المتعۃ وبیان انہٗ ابیح ثم نسخ واستقر تحریمہٗ الی یوم القیٰمۃ۔

باب نکاح متعہ اس امر کے بیان میں کہ وہ مباح تھا پھر منسوخ ہوا۔ پھر مباح ہوا اور اس کے بعد پھر منسوخ ہوا اور پھر قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم رہی۔

چلئے! ایک بات طے تو ہوئی کہ حضورؐ نے جب آخری بار متعہ کی ممانعت فرما دی تو پھر وہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا۔

لیکن ٹھہریئے! اسی صحیح مسلم کے (جس نے اوپر لکھا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعہ قیامت تک کے لئے حرام ہو گیا) کچھ ورق آگے الٹیے اور دیکھیئے کہ ان میں کیا نظر آتا ہے۔ جلد ۱ صفحہ ۴۵۱ پر درج ہے۔

عطا کی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہؓ عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ آئے تو ہم ان کی ملاقات کو گئے اور مختلف لوگوں نے ان سے سوالات دریافت کئے۔ پھر متعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم لوگوں نے عہدِ رسول اللہ اور عہد ابوبکرؓ اور عہد عمرؓ میں برابر متعہ کیا ہے۔

لیجئے! رسول اللہ اسے قیامت تک کے لئے حرام قرار دے چکے ہیں لیکن صحابہ کبارؓ حضرت عمرؓ کے زمانے تک متعہ کئے جا رہے ہیں (معاذ اللہ!)۔ اسی مسلم میں دوسری روایت یوں آئی ہے۔

ابو الزبیر کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم لوگ برابر ایک مٹھی بھر جو یا آٹے کے

عوض میں متعہ کرتے رہے ہیں۔جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن حریث والے واقعے میں اس کی ممانعت کی۔

کنز العمال میں اس کی اجرت "ایک پیالہ بھر ستو" لکھی ہے۔اس کی تائید فتح الباری (شرح بخاری) جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ نے بھی کی ہے۔

کنز العمال (صفحہ ۲۹۴) میں اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔تحریر ہے:۔

ام عبداللہ بنت ابی فتیحہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی شام سے آیا اور ان کے مکان میں قیام کیا۔اس نے کہا کہ بغیر عورت کے مجھے تکلیف ہے تم میرے لئے کوئی عورت تلاش کرو جس سے میں متمتع ہوسکوں۔وہ کہتی ہیں کہ میں نے اسے ایک عورت کا پتہ دیا اور اس نے اس سے متعہ کیا اور اس پر کچھ عدول لوگوں کی گواہیاں قرار دیں۔پھر ایک طویل زمانے تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے بعد شام واپس چلا گیا۔کسی نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔انہوں نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے۔میں نے کہا۔ہاں! انہوں نے فرمایا کہ جب وہ پھر آئے تو مجھے اطلاع دینا۔جب وہ آیا تو میں نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔انہوں نے اُسے بلوا بھیجا اور کہا کہ یہ تم نے کیا کیا تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ایسا رسولؐ اللہ کے سامنے کیا۔انہوں نے منع نہیں کیا یہاں تک کہ حضورؐ کا انتقال ہوگیا۔پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایسا ہوا۔انہوں نے بھی منع نہیں کیا۔پھر خود آپ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا رہا۔آپ نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں پہلے ممانعت کرچکا ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیتا۔اچھا جدائی اختیار کرلو تاکہ نکاح اور مسافحت (زنا) میں تمیز ہوسکے۔

ابھی تک تو صرف صحابہؓ (مردوں) ہی کا ذکر تھا۔مندرجہ بالا روایت میں ایک صحابیہؓ کا ذکر بھی آگیا کہ انہوں نے اس "کارِ خیر" میں کس قدر مدد کی۔(یا اللہ! توبہ!) لیکن اسی پر اکتفا تھوڑا ہے۔ذرا آگے بھی بڑھئیے۔لیکن ایسا کرنے سے پہلے حیاء سے کہیئے کہ وہ آنکھیں بند کرلے۔غیرت سے کہیئے کہ وہ ننگا ہوں سے اوجھل ہوجائے۔شرم سے کہیئے کہ وہ اپنا منہ چھپالے کہ اب ذکر آرہا ہے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ الصدیقہؓ کی بہن حضرت زبیرؓ کی رفیقۂ حیات حضرت اسماء ذات النطاقین رضی اللہ عنہا کا۔یہ ذکر ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (صفحہ ۵۷۶) میں۔وہاں لکھا ہے۔(توبہ! توبہ! نقلِ کفر، کفر نباشد)

روی النسائی والطحاوی عن اسماء بنت ابی بکر قالت فعلنٰها علی

عَهدِ رسولؐ اللہ۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہمارے ساتھ متعہ ہوا۔

اسی بنا پر جب حضرت اسماء کے بیٹے (عروہ) نے حضرت ابن عباس رضؓ سے کہا کہ "تم کو خدا کا خوف نہیں کہ تم متعہ کی اجازت دیتے ہو" تو حضرت ابن عباس رضؓ نے کہا کہ "اسئل امّك یا عروه" ذرا جا کر اپنی والدہ سے پوچھو۔ (زاد المعاد ابن قیم۔ جلد ۱۔ صـ ۲۱۹)

یٰلیتنی متّ قبل هذا وکنت نسیًا منسیًا۔

بہرحال، یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ رسولؐ اللہ نے متعہ کی ممانعت کی تھی یا نہیں کی تھی، لیکن حضرت عمر رضؓ نے اسے ضرور بند کر دیا چنانچہ زاد المعاد (ابن قیم) جلد ۱ صـ ۲۴۳ میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ "دو متعہ تھے جو رسولؐ اللہ کے زمانے میں رائج تھے لیکن میں انہیں بند کرتا ہوں۔ ایک متعۂ حجؐ اور دوسرا عورتوں کے ساتھ"۔[1] آپ کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ چلئے! حضرت عمر رضؓ کے زمانے ہی میں سہی، یہ لغویت تو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سازش ہی کیا جو اس طرح ختم ہو جائے! ابھی سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ فتح الباری (شرح صحیح بخاری) جلد ۹ صـ ۱۳۸ پر ہے:۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ابن عباس رضؓ کے تمام اصحاب جو اہل مکہ اور یمن سے تھے جواز متعہ کے قائل تھے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطا اور تمام فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے تھے۔

یہ ہیں وہ احادیث مقدسہ اور ہمارے ائمہ کے اقوال اُس متعہ کے متعلق جسے (اس روایت کی رُو سے جو درج کی جا چکی ہے) خود حضرت عمر رضؓ نے مسافحت (زنا) قرار دیا تھا۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سنی حضرات مناظروں اور مباحث میں ان اعتراضات کا کیا جواب دیتے ہیں[2]، ہمیں تو صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ یہ تمام روایات اور ان کی شرحیں سنیوں کی اپنی کتابوں کے اندر موجود ہیں۔ اور کتابیں وہ ہیں جنہیں رسولؐ اللہ کی غیر متلو وحی کہا جاتا ہے۔ جنہیں قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہٗ معہٗ) ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کی تعلیم سے ہمارے "علمائے کرام" کو سندِ فضیلت

---

[1] متعہ حج (حج اور عمرہ کے تمتع (۲/۱۹۶) کے بند کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

[2] شیعہ حضرات کے ممتاز مجتہد سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ "متعہ اور اسلام" میں ان تمام روایات کو نقل کیا ہے اور سنیوں میں سے کسی نے ان سے انکار نہیں کیا۔

ملتی ہے۔ جن کے درس نمازوں کے بعد مسجدوں میں باعثِ سعادتِ کونین تصور کئے جاتے ہیں۔ جنہیں مسلمان اس لئے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہ کبار رضی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کتابوں میں ہے۔

لیکن ٹھہرئیے! ابھی تک معاملہ صرف روایات تک محدود تھا، قرآن سامنے نہیں آیا تھا۔ اب دیکھئیے کہ اس سلسلہ میں کس طرح قرآن کو بھی ساتھ ہی لپیٹنے کی کوشش کی۔

امام طبری کی تفسیر اہلِ سنت والجماعت کے ہاں ام التفاسیر کہلاتی ہے۔ یہ سب سے پہلی مدون تفسیر ہے۔ بعد کی تمام تفسیریں قریب قریب اسی کے تتبع میں لکھی گئیں۔ دیکھئیے کہ حضرت امام طبری متعہ کی سند کس طرح لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ابوثابت کا بیان ہے کہ ابنِ عباس رضی نے مجھے ایک مصحف دیا اور کہا کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت کے مطابق ہے۔ یحییٰ بن عیسےٰ جو اس روایت کے ناقل ہیں، نصیر بن ابی الاشعث سے ان کا بیان ہے کہ اس مصحف کو نصیر کے پاس دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّی (یعنی تم عورتوں سے متعہ کرو ایک میعادِ مقررہ کے لئے۔

ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ نساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں؟ کہا پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّی۔ میں نے کہا۔ نہیں! میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس رضی کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم بہ منھن۔ ابن عباس رضی نے کہا۔ الیٰ اجلٍ مسمّی۔ میں نے کہا کہ میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا خدا کی قسم خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے[1]۔

ابواسحٰق کی روایت ہے کہ ابن عباس رضی نے پڑھا۔ فما استمتعتم بہ منھن الیٰ اجلٍ مسمّی۔ پانچویں روایت شعبہ کی ہے۔ اس میں بھی ابواسحٰق سے ایسی ہی روایت ہے۔ قتادہ

---

[1] اسے اختلافِ قرأت کہتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئیے کتاب "مقامِ حدیث" شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام۔

کا بیان ہے کہ ابی بن کعب کی قرأت میں یوں ہے۔ فما استمتعتم به منهن الیٰ اجلٍ مسمّی۔ عمرو بن مرہ کی روایت ہے کہ میں نے سعید بن جبیر کو پڑھتے سنا۔ فما استمتعتم به منهن الیٰ اجلٍ مسمّی۔

یہ اقتباس کسی شیعہ بزرگ کی کتاب کا نہیں۔ بلکہ سنیوں کے جلیل القدر امام طبری کی تفسیر کا ہے۔ اور جن حضرات کی طرف یہ روایات منسوب ہیں وہ بلند پایہ صحابی رضؓ ہیں جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آیت اُس طرح نازل نہیں ہوئی تھی جس طرح قرآن میں درج ہے بلکہ اس اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی جس سے متعہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ غور کیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے آپ دیکھئے کہ سنیوں کی نہایت معتبر کتب روایات اور مستند تفاسیر میں خدا، رسول، صحابہ رضؓ، تابعین وغیرہ کی کس قسم کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ان روایات اور تفاسیر کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ

(i) جو آیات قرآن میں درج ہیں وہ اسی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختلف صحابہ رضؓ کی قرأتوں کی رو سے ان کی تنزیلی شکلیں کچھ اور تھیں۔

(ii) خود رسول اللہؐ نے صحابہ رضؓ کو مٹھی بھر جَو یا آٹے کے عوض میں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور یہ اجازت نبوت کے آخری دور تک جاری رہی۔

(iii) عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہ رضؓ کے اسلامی معاشرہ میں متعہ عام تھا اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، نہ مردوں کو نہ عورتوں کو۔

(iv) رسول اللہؐ نے اپنے آخری زمانہ میں متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عہد حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کے ابتدائی زمانہ تک متعہ برابر جاری رہا۔

(v) حضرت عمر رضؓ نے متعہ کو بند کر دیا لیکن اس کے باوجود صحابہ رضؓ، تابعین اور فقہائے مکہ اسے جائز سمجھتے رہے۔

(vi) اور جنہوں نے اسے طوعاً وکرہاً ناجائز سمجھا وہ بھی یہ کہتے رہے کہ عمر رضؓ نے خدا کی ایک بہت بڑی رحمت کو روک دیا۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر مظہری (ص۷۵ج۲) میں لکھتے ہیں:-

محدث عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں ابن جریج سے اور انہوں نے عطا سے روایت کی ہے کہ ابن عباس رضؓ کہا کرتے تھے کہ متعہ کو جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمر رضؓ نے

اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

کیا آپ کسی طرح بھی باور کرنے کو تیار ہیں کہ یہ احادیث واقعی رسول اللہ کی ہو سکتی ہیں۔ پھر سن رکھیے کہ یہ احادیث شیعہ حضرات کی احادیث کی کتابوں سے نہیں لی گئیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں درج ہیں۔ اور ان کے انکار کرنے والے کو "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

(۰)

شاید آپ کہہ دیں کہ یہ عہد کہن (اسلاف) کی باتیں ہیں۔ انہیں چھوڑیے۔ سنیوں کے ہاں اب تو متعہ کو حرام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہریے اور خود اپنے زمانے کے ایک مفسر کی بات سنیئے جو اپنے آپ کو شیعہ نہیں کہتے — یعنی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ وہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اگست ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:۔

فرض کیجیے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور ایک عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں[۱]۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں[۲] جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔

یعنی یہ صاحب جنسی جذبہ میں "اضطراری حالت" کے قائل ہیں اور اس کا علاج متعہ بتاتے ہیں! یہ وہ بات ہے جو (معاذ اللہ۔ صد ہزار بار معاذ اللہ) خدا کو بھی نہیں سوجھی تھی کیونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے جنسی خواہشات کے ضمن میں اضطراری حالت کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس کہا یہ کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳)۔ "جنھیں نکاح میسر نہ آسکے وہ ضبطِ نفس سے کام لیں"۔

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں (من حیث القوم) جنسی خواہش (SEXUAL URGE) کی اس قدر شدت کیوں ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس قوم کو "از روئے شریعت" حسب ذیل قسم کے احکام بتائے جائیں، ان میں جنسی

---

[۱] وہ کون سی شرعی شرائط ہیں جن کے مطابق وہاں نکاح ممکن نہیں؟

[۲] عارضی کیوں۔ مستقل کیوں نہیں؟

جذبات کی شدت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ (مثلاً) :-

(۱) ایک وقت میں چار چار عورتوں سے شادی۔ اور وہ بھی اس چھوٹ کے ساتھ کہ جب جی چاہے ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ نئی بیوی لے آئیں۔ اس سے آپ ایک شخص کی عمر بھر میں بیویوں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مشہور مغربی مفکر اور مؤرخ برفا (BRIFFAULT) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE MOTHER)۔ اس میں وہ ایک کُرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔

(۲) بیویوں کے علاوہ لونڈیاں جن پر نہ تعداد کی پابندی ہے نہ ہی نکاح کی ضرورت، ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے سلاطین اور امراء کے محلات میں لونڈیوں کی کس قدر بھرمار ہوتی تھی۔

(۳) نابالغ لڑکیوں سے نکاح اور مباشرت کی شرعاً اجازت۔

(۴) نکاح کے علاوہ اضطراری حالت میں متعہ کی اجازت۔ بلکہ استمنا بالید (MASTORBATION) کی بھی۔ اور عزل کی بھی۔

(۵) یہ تو اس زندگی میں — مرنے کے بعد جنت میں کفار کی کمسن لڑکیوں کو نوخیز جوان لڑکیوں میں تبدیل کر کے "مومنین" کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ان کی بیویاں محلات میں ساتھ رہیں گی اور یہ لڑکیاں (حوریں) سیرگاہوں میں دادِ عیش دیں گی۔

جس قوم کو یہ کچھ "شرعاً جائز" بتایا جائے وہ جنسی خواہشات پر کنٹرول کیسے رکھ سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے بھی سن لیجیے۔ قرآنِ کریم نے جنسی بدنہادی یا بے راہ روی کا نتیجہ اثم بتایا تھا جس کے معنی اضمحلال ہیں۔ اس اضمحلال کی تشریح ایک مغربی محقق کی زبانی سنیے جس نے عمر بھر جنسیات کے مسئلہ پر تحقیقِ عمیق کے بعد

ڈاکٹر انون کی تحقیق

اس کے نتائج کو ایک ضخیم کتاب میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ محقق ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. UNWIN)۔ اور ان کی کتاب کا نام ہے (SEX AND CULTURE)۔ اس میں وہ ان قوموں کے متعلق جنھوں نے جنسی جذبہ کی تسکین کے زیادہ مواقع مہیا کر رکھے ہوں، لکھتا ہے :-

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے

اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) ..... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ...... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں۔ اور کبھی دیگر ایسی اشیا کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو نسیاً منسیا ہوجاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ (ص ۳۴۵-۳۴۶)

اس کے برعکس وہ لکھتا ہے کہ

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق توانائیاں مدت مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن وتہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (ص ۴۳۲)

قرآن ایسا ہی معاشرہ تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

(۰)

عدت ہم طلاق سے متعلق موضوع میں دیکھ چکے ہیں کہ مطلقہ عورت ایک معین عرصہ تک کسی

دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی۔ اس مدتِ انتظار کو عدت کہا جاتا ہے۔ یہ عدت صرف عورت کے لئے ہے مرد کے لئے نہیں۔ سورہ بقرہ میں جو کہا گیا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (۲/۲۲۸)۔ عورت کی جس قدر ذمہ داریاں ہیں اسی قدر اس کے حقوق ہیں۔ البتہ ایک بات میں مرد کو اس پر فوقیت حاصل ہے (درجہ۔ ایک درجہ ہیں)۔ اور وہ فوقیت یہ ہے کہ طلاق (یا بیوگی) کے بعد عورت ایک مدت تک دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی اور مرد پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ عدت سے مقصد یہ ہے کہ اس دوران میں یہ متعین ہو جائے گا کہ اگر عورت حمل سے ہے تو اس کا ہونے والا بچہ اس کے سابقہ شوہر کی اولاد ہے۔ اس کا تعین اس مولود کے لئے نہایت ضروری تھا اس لئے یہ حکم دیا گیا۔ جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے' قرآن کریم نے خود اس حکمت کی وضاحت کردی ہے:۔

(۲) مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔

۲/۲۲۸
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ
اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... (آیت کا باقی حصہ پہلے گزر چکا ہے)

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) اتنا عرصہ روکے رکھیں جتنے میں ان کے تین حیض پورے ہوں۔ [جنھیں کسی وجہ سے حیض نہ آتا ہو' ان کی عدت تین ماہ کی ہے (۶۵/۴)۔ اور جس عورت کی طلاق مقاربت سے پہلے ہو جائے' اس کی کوئی عدت نہیں۔ (۳۳/۴۹)] اگر وہ حاملہ ہوں تو انہیں اس امر کا اظہار کر دینا چاہیئے۔ ان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کر دیا ہے وہ اسے چھپائے رکھیں۔ خدا کے قانون (اللہ اور آخرت) کو مان لینے کے بعد اس قسم کی جزئیات تک کی پابندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ [حمل کی صورت میں ان کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔ (۶۵/۴)]

وہ جو کہا گیا ہے کہ "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ (۶۵/۱)۔ جب عورتوں کو طلاق دو تو اس طرح دو کہ ان کی عدت کا شمار ہو سکے" تو اس سے یہی مراد ہے۔ یعنی حیض کی رُو سے شمار کرنے کی سہولت۔

(۳) جو عورتیں ایسی سن رسیدہ ہوں کہ وہ حیض آنے کی طرف سے ناامید ہو چکی ہوں' یا جنھیں کسی طبعی نقص کی وجہ سے حیض نہ آسکتا ہو' ان کی عدت تین مہینے ہوگی۔ اور حاملہ عورتوں کی مدت وضع حمل تک۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ

ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۔ (۶۵/۴)

[جیسا کہ (۲/۲۲۸) میں بتایا جاچکا ہے، عدت کی مدت عام حالات میں تین حیض کا زمانہ ہے لیکن] جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو چکا ہو اور اس وجہ سے یہ دشواری لاحق ہو کہ ان کی عدت کا شمار کس طرح کیا جائے تو ان کے لئے تین حیض کے بجائے تین مہینے عدت کے شمار کرو۔ یہی عدت ان عورتوں کے ضمن میں شمار کرو جنہیں کسی عارضہ کی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ (بعض طبائع کو شاید عدت کی یہ مدت لمبی معلوم ہو کیونکہ اس مدت میں انہیں مطلقہ بیوی کے اخراجات کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن اس میں ملول خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں) جو شخص بھی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا، نظامِ خداوندی اس کے لئے آسانیاں پیدا کر دیگا۔ (متعلقہ عدالت کو ایسی شکلیں بھی سامنے رکھنی چاہئیں اور ان کا حل تجویز کرنا چاہیئے)۔

(۴) جس عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دی گئی ہو اس کے لئے کوئی عدت نہیں۔ اس لئے کہ اس کی صورت میں "حمل" معلوم کرنے کا سوال ہی نہیں ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۔ (۴۹/۳۳)

اے جماعتِ مومنین! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں (قانون کے مطابق) طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو تو تمہارے لئے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت کا شمار کرو (جس میں ان کا نان نفقہ تمہارے ذمہ ہوتا ہے اور جس میں وہ دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتیں)۔ تم انہیں مناسب سامان دے کر نہایت خوشگوار انداز سے رخصت کر دو۔ (نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جب دیکھا جائے کہ وہ معاہدہ نبھ نہیں سکتا تو قاعدے اور قانون کے مطابق اسے فسخ کر دیا جائے۔ اس میں تلخی پیدا ہونے کی کون سی بات ہے۔ (۲/۲۲۸-۲۳۲ ؛ ۶۵/۱-۴)

(ضمناً آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم جنسی تعلقات کو کس طرح ایمائیت کے انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ مباشرت کے لئے بھی "قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ" کے الفاظ لایا ہے۔ یعنی قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو۔

(۵) بیوہ عورتوں کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔

(۲/۲۴۱-۲۴۲) وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۔ كَذٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۲۴۱-۲۴۲)

مطلقہ عورتوں کو قاعدے قانون کے مطابق عدّت کے دوران سامانِ زندگی مہیا کرو (۶۵/۶) یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمھارے لئے واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے کر انہیں سمجھ سکو۔

انہیں گھر سے نکالا نہیں جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ کسی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (۶۵/۱) "نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو نہ وہ خود ہی وہاں سے نکلیں۔ بجز اس کے کہ وہ کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں"۔ اس صورت میں مرد پر اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔ ذرا آگے چل کر ہے۔ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ۔ (۶۵/۶) "تم اپنی حیثیت کے مطابق انہیں وہیں (یا ویسے ہی) رکھو جہاں (یا جیسے) تم خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لئے کسی قسم کی اذیت مت دو"۔ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا۔ (۶۵/۷)

مطلقہ کا خرچ، یا دودھ پلانے کی اُجرت کا معاملہ طے کرنے کے سلسلہ میں اس بات کو مدنظر رکھو کہ صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ دے اور جس کا ہاتھ تنگ ہو تو جو کچھ اللہ نے اُسے دے رکھا ہے وہ اس کے مطابق دے۔ یاد رکھو! خدا کا قانون کسی پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر اس فالتو خرچ سے اس پر کچھ تنگی آجائے تو قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کی تنگی کو آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ مطلقہ عورت اپنے گھر میں رہے۔ کسی دوسری جگہ نہ چلی جائے۔ لیکن قرآن کریم کے اس حکم سے کہ مرد اُسے تنگ نہ کرے (۶۵/۶) یہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ اگر مرد اُسے تنگ کرے تو وہ (عدالت کی اجازت یا اطلاع کے بعد) کسی اور جگہ سکونت اختیار کر سکتی ہے۔

(۷) بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خورونوش کا انتظام ضروری ہے جس کے لئے چاہیئے

کہ مرد وصیت کر جائے۔ اگر وہ خود کسی اور جگہ چلی جائے تو یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

۲/۲۴۰ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۔ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۔ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲/۲۴۰)

تم میں سے جو لوگ بیوہ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں انہیں چاہیئے کہ اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور انہیں سامانِ زندگی دیا جائے۔ لیکن اگر وہ از خود چلی جائیں اور قاعدے اور قانون کے مطابق اپنے لئے کچھ اور فیصلہ کرلیں تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون بڑی قوت والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حکمت پر مبنی ہے۔

(۸) عدت کے دوران عورت دوسری جگہ شادی تو نہیں کر سکتی لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کی ممانعت نہیں۔

۲/۲۳۵ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۳۵)

ان عورتوں کی عدت کے دوران میں اگر تم ان سے نکاح کی بابت کچھ اشارۃً کنایۃً کہہ دو یا اپنے دل میں اس کا ارادہ پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں — خدا کو اس کا علم ہے کہ تمہیں ان سے نکاح کرنے کا خیال آئے گا — لیکن ان سے خفیہ خفیہ نکاح کا وعدہ مت لے لو۔ ہاں! (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) قاعدے قانون کے مطابق ان سے بات چیت کر لو۔ لیکن عدت کے دوران نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ (ظاہری اعمال تو ایک طرف) خدا تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے — اور یہ بھی سمجھ لو کہ ان حدود و قیود سے خدا تم پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تمہارا معاشرہ غلط روی کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ خدا ایسا نہیں کہ وہ تمہاری غلط روی پر یونہی بھڑک اٹھے اور تمہیں سخت قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دے — یہ کچھ مستبد حکمران کیا کرتے ہیں۔ خدا ایسا نہیں کرتا۔

اگر وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ شادی کرنا چاہے (عدت کے دوران یا اس کے بعد) تو اس کے راستے میں

روڑے نہیں اٹکانے چاہئیں:۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ
۲/۲۳۲ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ
مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى
لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۳۲)

جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدّت کے قریب پہنچ جائیں، اور یہ سابقہ میاں بیوی پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں اور آپس میں قانون کے مطابق نکاح کرنا چاہیں، تو (اے افرادِ معاشرہ!) تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو۔ یہ تلقین ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت میں تمہاری ذات کی نشوونما کا سامان اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ یاد رکھو! یہ قوانین اس خدا کے عطا کردہ ہیں جو ان باتوں کو جانتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے (اس لئے تم ان کی اطاعت کرو۔ ان کے نتائج خودبخود بتا دیں گے کہ یہ کس قدر حقیقت اور حکمت پر مبنی ہیں)۔

(۰)

رضاعت

قرآنِ کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ ماں اپنے بچے کو اتنی مدّت تک ضرور دودھ پلائے۔ اس کا فیصلہ بچے کی حالت کے مطابق ماں باپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے قرآنِ کریم نے عمومی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے جنین کو اپنے بطن میں رکھتی ہے اور پھر اُسے دودھ پلاتی ہے تو اس میں اس کے اڑھائی برس صرف ہو جاتے ہیں۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ (۴۶/۱۵) "ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں اسے اپنے بطن میں رکھتی ہے پھر دردِ زِہ کا کرب اٹھاتی ہے اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے تک تیس ماہ کی مدّت لگ جاتی ہے"۔ دوسری جگہ (قانونی مقاصد کے لئے) دودھ چھڑانے کا وقت دو سال بتایا ہے۔ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ۔ (۳۱/۱۴)۔

(۲) لیکن جب معاملہ قانونی حیثیت اختیار کر لے تو بات متعین ہونی چاہیئے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ عورت کو:۔

(۱) بچے کا باپ رضاعت کی اُجرت دے۔ اس صورت میں رضاعت کی مدّت دو سال ہوگی۔ لیکن اگر وہ باہمی رضامندی سے اس سے کم مدّت میں دودھ چھڑانا چاہیں یا کوئی دوسرا انتظام مناسب خیال کریں تو ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

۲/۲۳۳ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ
يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۔ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ
لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۔ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ
تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ
اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ۔ (۲/۲۳۳)

اگر طلاق کی صورت میں ماں کی آغوش میں دودھ پیتا بچہ ہو اور باپ چاہے کہ وہ اس بچے کو پوری مدت تک دودھ پلائے تو ماں کو چاہیئے کہ وہ پورے دو سال تک بچے کو دودھ پلائے (۳۱/۱۴؛ ۴۶/۱۵)۔ اس صورت میں قاعدے اور قانون کے مطابق اس عورت کی روٹی کپڑے کا انتظام اُس مرد کے ذمے ہوگا۔ یہ انتظام اس مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے اس باب میں اصول یہ ہے کہ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (فیصلہ کرنے والی عدالت کو چاہیئے کہ اس چیز کو پیشِ نظر رکھے کہ) نہ تو اس بچے کی وجہ سے ماں کو ناحق تکلیف پہنچے اور نہ ہی اس کے باپ کو۔ اگر اس بچہ کا باپ (اس اثنا میں) فوت ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اس کے وارث کے سر پر ہوگی۔

اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے (قبل از وقت) دودھ چھڑا کر (کوئی اور انتظام کرلینا چاہیں) تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تم بچہ کے لئے کسی اور دودھ پلانے والی کا انتظام کرنا چاہو تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ جو کچھ تم نے بچے کی ماں سے طے کیا تھا وہ اسے پورا پورا دے دو۔

بہرحال تم ہمیشہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل اور نیت پر نگاہ رکھتا ہے (اس لئے نہ تو قانون کی محض رسمی پابندی کرو اور نہ ہی اس سے گریز کی راہیں تلاش کرو)۔

دوسری جگہ ہے :-

وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ - (۶۵/۶)

اور اگر وہ حمل سے ہیں تو وضع حمل تک تو تمھیں ان کا خرچ بہر حال برداشت کرنا ہے اور اگر وضع حمل کے بعد وہ تمہاری خاطر بچے کو دودھ پلائیں (یعنی تم کوئی اور انتظام نہ کرو اور باہمی رضامندی سے یہ طے پاجائے کہ وہی بچے کو دودھ پلائیں۔ تو) انہیں ان کی دودھ پلائی کی اُجرت دو۔ ان امور کی تفاصیل کو باہمی مشورے سے قاعدے قانون کے مطابق طے کرلیا کرو اور اگر تم میں سے کسی پر یہ انتظام گراں گزرے تو تم کسی دوسری عورت کا انتظام کرلو جو بچے کو دودھ پلائے۔

حضانت

ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں نابالغ بچے کس کی تحویل میں رہیں، اس کی بابت قرآن مجید نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ عدالتِ مجاز متعلقہ حالات کے پیشِ نظر کرے گی۔ اس باب میں اصول یہ پیشِ نظر ہونا چاہیئے کہ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ - (۲/۲۳۳)۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے جس سے ماں یا باپ کو کسی قسم کی مشقت یا مضرت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان امور کے متعلق اسلامی حکومت خود قوانین وضع کریگی۔

زیرِ نظر باب میں عائلی زندگی سے متعلق قرآنِ کریم کے احکام اور ہدایات فی الجملہ آگئے ہیں۔ اور آیات (۲/۲۴۰) آیات (۲/۲۴۲) کی تفسیر بھی سامنے آگئی ہے۔ ان کے درمیان آیات (۲/۲۳۸-۲۳۹) کی تشریح رہ گئی ہے اسے پیش کرکے اس موضوع کو ختم کیا جائے گا۔ آیات یہ ہیں :-

۲/۲۳۸-۲۳۹

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ - وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ. فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ . (۲/۲۳۸-۲۳۹)

ان کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:-

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار۔ پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

ان آیات میں مفسرین اور مترجمین نے صلوٰات سے مراد نمازیں لیا ہے۔ ان میں اختلاف ہے تو "صلوٰۃ الوسطیٰ" (درمیانی نماز) کے مفہوم میں ہے لیکن عام طور پر اس سے مراد عصر کی نماز لی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ پانچ نمازوں (فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء) کے درمیان پڑتی ہے۔

یہ آیات عائلی قوانین کے درمیان آئی ہیں جن کا سلسلہ آیت (۲/۲۲۱) سے شروع ہوا ہے۔ ان سے پہلے بھی طلاق، مہر، عدت وغیرہ سے متعلق احکام ہیں اور ان کے بعد بھی۔ اس لئے ربط کے لحاظ سے یہاں نماز سے متعلق احکام کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے اس میں میری کوتاہیٔ فہم کا قصور ہو (خوف کی حالت میں صلوٰۃ نماز کے متعلق احکام (۴/۱۰۳-۱۰۱) میں آئے ہیں۔ ان کی تفسیر متعلقہ مقام پر کی جائے گی)۔

صلوٰۃ کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول صفحات ۹۷-۱۴۰ زیر آیت (۲/۳) میں کی جا چکی ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ صلوٰۃ کے بنیادی معنی قوانینِ خداوندی سے وابستگی اور ان کی رُو سے عائد کردہ فرائضِ منصبی کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات میں صلوٰۃ سے مراد وہ فرائض ہیں جو سیاق و سباق کی آیات میں عائلی زندگی کے ضمن میں عائد کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے میں نے ان آیات کا حسبِ ذیل مفہوم لیا ہے۔

یہ ہیں (عائلی زندگی کے سلسلہ میں) تمہارے فرائضِ منصبی جن کی محافظت ضروری ہے۔ لیکن تمہارا مرکزی فریضہ جس کی محافظت اشد ضروری ہے، یہ ہے کہ تم زندگی کے ہر گوشے میں ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں کمربستہ کھڑے رہو۔ خوف کی حالت میں پیادہ چل رہے ہو یا سواری پر اور حالتِ امن میں اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (۳/۱۹۰؛ ۴/۱۰۳)۔ ہر حال میں قوانینِ خداوندی کو اس طرح سامنے رکھو جس طرح اس نے تمہیں بتایا ہے — تم اس سے پہلے ان امور سے واقف نہیں تھے۔

—————(٠)—————

فلسفہ موت و حیات

تجدیدِ یادداشت کے لئے اسے دہرا دینا غیر محل نہ ہوگا کہ سابقہ (چھٹا) باب (آیات ۲/۱۹۰ تا ۲/۲۱۸) میں قتال (جنگ) کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی ضمن میں

قرآن کریم نے بتایا کہ جہادِ زندگی میں کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنے ہوش و حواس نہ کھوئے اور اپنی اسکیموں کو اتفاقات (CHANCES) پر نہ چھوڑے بلکہ حسنِ تدبیر سے انہیں کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔ اور دوسرے یہ کہ باہر کی دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کی گھر کی زندگی بڑی پُرسکون اور اطمینان بخش ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق ضروری ہدایات سابقہ صفحات میں (آیات ۲/۲۱۹ تا ۲/۲۴۲) سامنے لائی گئیں۔ ان اہم متعلقہ مباحث کے بعد قتال (جنگ) سے متعلق سلسلۂ کلام کو پھر جاری کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں بنی اسرائیل کی داستان کے دو مزید اوراق سامنے لائے گئے ہیں۔

مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحات ۳۸۶-۳۸۵ پر مذکور آیات (۲/۹۴-۹۶) کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ان میں یہ کہا گیا ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ جنت کا گھر ان کے لئے ریزرو (مخصوص) ہے۔ ان سے کہا گیا کہ جب واقعہ یہ ہے (جیسا تم کہتے ہو) تو تم دنیا میں اس قدر ذلّت وخواری کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہو۔ تم اس دنیا کو خیرباد کہو اور مر جاؤ۔ مرنے کے بعد جنت کی خوشگواریوں کے مزے لوٹو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تم دیکھو گے کہ یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کے کرتوت کیا ہیں۔ اس لئے موت کے نام سے ان کی جان جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں موت انہیں جا دبوچتی ہے۔ لیکن جو اس کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت تو نہیں کی کہ یہ واقعہ کس قوم یا جماعت سے متعلق ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق بھی بنی اسرائیل ہی سے ہے۔ ارشاد ہے:۔

۲/۲۴۳ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۔ (۲/۲۴۳)

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جو قوتیں تمہارے نظام کی راہ میں حائل ہوں گی تمہیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ (۲/۲۱۸-۲۱۹)۔ لیکن خارجی قوتوں کا مقابلہ وہی قوم کر سکتی ہے جس کا داخلی نظام پُرسکون اور اطمینان بخش ہو۔ اس کے لئے تمہیں عائلی زندگی کے متعلق قوانین دیئے گئے (۲/۲۲۱-۲۴۲)۔ اب تم پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ یعنی اس موضوع کی طرف کہ تمہاری اجتماعی زندگی میں استحکام کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے تم قوم بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ پر غور کرو۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب دشمن کا سامنا ہوا تو وہ اپنا گھر بار

سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوتے ـــــ انہوں نے اس قدر بزدلی کا ثبوت کیوں دیا؟ محض اس لئے کہ وہ موت سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ زندگی کے اس اصول کو بھول گئے کہ زندہ وہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔ (۲/۹۴)۔ جو موت سے بھاگتا ہے اسے موت آگے بڑھ کر دبوچ لیتی ہے ـــــ جب انہوں نے اس راز کو پا لیا تو انہیں حیاتِ نَو عطا کر دی گئی۔ وہ دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور آخر الامر فتحمند ہوئے۔

یہی وہ قانونِ حیات ہے جس سے اقوامِ عالم کو افضلیت و فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس قانون کی قدر دانی نہیں کرتے۔

خطرات کا مقابلہ انسان کے اندر وہ فولادیت پیدا کرتا ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ۔ (۲۱/۱۰۳) کائنات کا عظیم ترین حادثہ بھی انہیں مغموم و محزون نہیں کر سکتا۔ بقولِ اقبالؒ ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی ــــ وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی ــــ یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اور اس قسم کی فولادیت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا ــــ نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز ــــ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی زندگی خطرات کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ "پل صراط" پر سے گزرے بغیر انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا!

مذکورہ صدر آیات میں کہا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (۲/۲۴۳)۔ انسانوں کے ساتھ خدا کا برتاؤ فضل و عنایات کا ہے۔ اس سے نگاہ کا رُخ ایک اور سمت کو مڑ جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو جان عطیۃً (وہبی طور پر) دی ہے اور یہ بات بذل و سخا اور جود و عطا کے خلاف ہے کہ جو چیز کسی کو عطیۃً دے دی جائے اسے اس سے واپس لے لیا جائے۔ اس لئے خدا انسان سے جان واپس نہیں لیتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ لیکن یہ "ناشکرا" اس عطیۂ عظمیٰ کی قدر نہیں کرتا اور اسے مفت میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

جانے کہ دادند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

(۰)

اگلی دو آیات میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ حیاتِ جاوداں کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوم سے جو موت کے ڈر سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی کہا کہ بھاگو نہیں۔ جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور

۲/۲۴۴ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ. (۲/۲۴۴)

ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم موت سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے حق و انصاف کی راہِ خداوندی میں دشمنوں کا جم کر مقابلہ کرو۔ ان سے ڈٹ کر لڑو۔ یاد رکھو! تمہاری کوئی قربانی ضائع نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اللہ ہر ایک بات کو سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

(۰)

قرآنِ کریم نے نظامِ اسلامی کے قیام اور استحکام کے سلسلہ میں کہا ہے کہ إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱) "اللہ مومنین سے ان کا مال اور ان کی جان خرید لیتا ہے اور ان کے عوض انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ قتال فی سبیل اللہ میں تو جان حاضر کر دی جاتی ہے۔ لیکن اس قتال (اور ہر قسم کے جہاد فی سبیل اللہ) کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آیت (۲/۲۴۴) کے تسلسل میں کہا:

۲/۲۴۵ مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (۲/۲۴۵)

تمہاری اجتماعی قوت کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے نہایت حسن کارانہ انداز سے "قرض" دو۔ اسے "قرض" اس لئے کہا جاتا ہے کہ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دولت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے پاس چلی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ روپیہ کسی اور کے پاس نہیں جاتا یہ چند در چند (کئی گنا ہو کر) تمہارے پاس واپس آرہا ہوتا ہے۔

یاد رکھو! دولت کا بڑھنا اور گھٹنا خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ تم اپنے لئے جس قسم کے قوانین جی چاہے بنالو، آخر الامر نتیجہ خدا کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوگا۔ تم اس سے ہٹ کر کہیں اور جا نہیں سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اور وہ قانون یہ ہے کہ دولت جس قدر نظامِ حق و انصاف کے قیام اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کی جائے وہ اسی قدر بڑھتی ہے۔

قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کی طرف سے ایثارِ مال کو ہر جگہ قرض کہہ کر پکارا ہے ـــ بلکہ قرضِ حسنہ کہہ کر ـــ اس

اصطلاح میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ نظامِ خداوندی اپنے ابتدائی مراحل میں جب وہ ہنوز زیرِ تشکیل ہوتا ہے۔ افرادِ جماعت سے ہر قسم کی قربانی کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہ ہنوز اس قابل نہیں ہوتا کہ انہیں اس کے بدلے میں کچھ دے سکے۔ لیکن جب وہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو وہ انہیں ایک ایک کے بدلے میں سو سو دیتا ہے۔ اس لئے اس نے افراد کے اس مالی ایثار (عطیات) کو قرض کہہ کر پکارا ہے جو دُگنا چوگنا واپس دے دیا جاتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری میں قرض اور ربوٰ کی بحث ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر صرف ایک نکتہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ربوٰ کے ضمن میں کہا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۳/۱۲۹)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ "دُگنا چوگنا" کیا جاتا ہے اور اسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو قرض خدا واپس کرتا ہے اس میں "فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً" کو خدا کی طرف سے فضل و رحمت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ بات واضح ہے۔ سودی کاروبار میں مقروض جو کچھ اصل زر سے زائد دیتا ہے، بامرِ مجبوری، دل پر پتھر رکھ کر دیتا ہے۔ لیکن نظامِ خداوندی، افرادِ قوم کو جو کچھ دیتا ہے بطیبِ خاطر دیتا ہے، جبر و اکراہ سے نہیں دیتا۔ اس لئے افراد کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ قرضِ حسنہ بن جاتا ہے۔

اس آیت میں قبض اور بسط کے الفاظ بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئے ہیں۔ قبض کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنی گرفت میں لے کر ہاتھ سکیڑ یا کھینچ لینا۔ اور بسط کے معنی ہوتے ہیں دستِ کرم کو دراز کرنا، وسیع کرنا، کشادہ کرنا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرض کے معاملہ میں بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ خدا (یا نظامِ خداوندی) نے جو کچھ لیا ہے وہ اس کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ اس نے اسے اپنی گرفت میں لے کر مٹھی میٹ لی ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ اس نے اسے دگن چوگنا کر کے واپس دینے کے لئے لیا ہے۔ خدا کے قابض اور باسط ہونے کے یہی معنی ہیں۔ چونکہ اللہ کو دیئے ہوئے قرض کی واپسی کے متعلق آگے چل کر تفصیلی آیات ہمارے سامنے آئیں گی اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں خود لفظ "قرض" کے متعلق تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے کیونکہ اس تشریح سے اللہ کو دیئے ہوئے "قرض" کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

لفظ قرض کا مفہوم

قرض کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کاٹنا۔ چبانا۔ آپ نے جگالی کرنے والے مویشیوں (گائے بیل وغیرہ) کو دیکھا ہو گا۔ وہ چلتے چلاتے اِدھر اُدھر منہ مارتے ہیں اور جو کچھ میسر آتے اُسے اسی طرح نگلتے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ آرام سے بیٹھ کر اس نگلے ہوئے چارہ کو منہ میں لوٹاتے ہیں اور آہستہ آہستہ چبا کر اسے معدہ میں واپس بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح وہ چارہ ہضم

ہوکر جزوِ بدن بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جگالی کے اس عمل کو عرب القریض کہتے تھے۔ اس سے قرضِ حسنہ کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ یعنی تمہارا مال اگر تمہارے پاس رہے تو وہ ایسا چارہ ہوتا ہے جو ہضم ہوکر جزوِ بدن بننے کے قابل نہیں ہوتا لیکن جب تم اسے نظامِ خداوندی کو دیدیتے ہو تو وہ تمہیں اس شکل میں واپس کرتا ہے جس سے وہ جزوِ بدن بن کر ممدِ حیات ہو جائے۔ نظامِ خداوندی جو کچھ افرادِ معاشرہ سے لیتا ہے وہ اسے، انہیں حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کی لِم اور غایت۔ یعنی جان و مال کے عوض جنّت۔!

(۰)

قتال کی رو سے حیاتِ نو عطا ہونے کے قانونِ خداوندی کے بعد ایک اور واقعہ کی طرف آیئے جس میں بنی اسرائیل کا نام لیا گیا ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۴۶ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ‌ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا‌ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآٮِٕنَا‌ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲/۲۴۶)

اس ضمن میں وہ واقعہ بھی غور طلب ہے جو موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے سردارانِ قوم کو پیش آیا۔ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کے زیرِ کمان اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس وقت تو تم جنگ کے لئے اس قدر شوق اور آمادگی کا اظہار کر رہے ہو لیکن (تمہاری جو نفسیاتی کیفیت ہو چکی ہے اس سے) کچھ بعید نہیں کہ جب تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم اس سے گریز کرو۔ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں، درآنحالیکہ ہم اپنے گھروں سے نکال باہر کئے اور اپنے بچوں تک سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔

لیکن ہوا وہی جو ان کے نبی نے کہا تھا۔ جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے بجز معدودے چند، سب گریز کی راہیں نکالنے لگے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ جو لوگ قانون شکنی اور نافرمانی

کے عادی ہو چکے ہوں ان میں نظم وضبط کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور صلاحیت کہاں رہ سکتی ہے؟ اللہ ان کی اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اور اسی لئے ان کے نبی نے ان سے کہا تھا کہ جب جنگ سامنے آئے گی تو تم بھاگ کھڑے ہو گے۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد (حضرت) یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ قرآنِ کریم میں حضرت الیسع کا نام زمرۂ انبیاء میں آیا ہے (۶/۸۶ و ۳۸/۴۸) یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے (حضرت) یوشع بن نون مراد ہیں یا تورات کے لیسعیاہ نبی۔ ان کے زمانے میں فلسطین کا کچھ علاقہ بنی اسرائیل کے زیر نگین آگیا لیکن ازاں بعد ۱۰۰۰ ق.م کے قریب حضرت داؤد اور (حضرت) طالوت کی زیر سرکردگی سارے کے سارے فلسطین پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ زیرِ نظر واقعہ کا تعلق اسی زمانہ سے ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں تَوَلَّوْا (وہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے) سے ان کی اسی دوں ہمتی اور پست حوصلگی کی وضاحت کی گئی ہے جس کی طرف آیت (۲/۲۴۶) میں اشارہ کیا گیا تھا۔ بہر حال قوم نے اپنے نبی سے کمانڈر مقرر کرنے کے لئے کہا جس مقصد کے لئے قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے وہ اگلی آیت میں سامنے آتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۔ (۲/۲۴۷)

بہر حال جب انہوں نے کمانڈر مقرر کرنے کی درخواست کی تو ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی اس پر اعتراض کر دیا کہ وہ ہم پر کیسے کمان کر سکتا ہے؟ اُس کے مقابلہ میں اس منصب اور اقتدار کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت کہاں ہے؟ ان کے نبی نے ان سے کہا جنگ کی کمان کے لئے مال و دولت معیار نہیں ہوا کرتا۔ اس کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا علم کس قدر ہے اور جسمانی توانائی کا کیا حال ہے۔ طالوت کو یہ کچھ فراوانی سے میسر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں اور قوتوں کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہی صرف نہیں کرتا دوسرے لوگ بھی ان سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔ اللہ کا یہی قانون ہے جس کے مطابق

کسی کو منصب و اقتدار کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اور اس کا یہ قانون کشادہ نگہی اور علم وحقیقت پر مبنی ہے وہ تمہارے خود ساختہ معیاروں کا پابند نہیں۔

کمانڈر کا انتخاب

غور کیجئے۔ بنی اسرائیل ہدایات خداوندی کو فراموش کر کے اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں مال و دولت ہی معیارِ عزو جاہ رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک ایک فوج کے کمانڈر کا تقرر بھی اسی معیار کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی اسے کسی دولت مند گھرانے کا فرد اور کسی امیر کبیر باپ کا بیٹا ہونا چاہیئے تھا۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس غلط نگہی کی تردید کی اور کہا کہ معیارِ انتخاب اہلیت ہونی چاہیئے نہ کہ دولت۔ فوج کے کمانڈر کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عسکری نظام کا پورا پورا علم حاصل ہو اور اس کے ساتھ جسمانی قوت بھی۔ (حضرت) طالوت کا انتخاب اسی معیار کے مطابق روبعمل لایا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم ایک تاریخی واقعہ کے ضمن میں بھی کس قدر محکم اصولِ حیات سامنے لے آتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات بیان ہی اس مقصد کے لئے کرتا ہے۔

اس مقام پر ذرا رُکیئے اور اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ پر غور کیجئے۔ آیت کے آخری حصہ میں کہا گیا ہے۔ وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”اللہ جسے چاہتا ہے اپنی حکومت عطا کر دیتا ہے“ مَنْ یَّشَآءُ“ کا ترجمہ ”جسے چاہتا ہے“ اسی مقام پر نہیں کیا جاتا۔ قرآنِ کریم کی تمام آیات میں ان (اور ان جیسے دیگر) الفاظ کا ایسا ہی ترجمہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے عقیدۂ جبر کے لئے بطور سند پیش کر دیا جاتا ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ انسان اس باب میں مجبور واقع ہوا ہے۔ اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے مسئلہ تقدیر کہا جاتا ہے[1]۔ جس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ (بالخصوص صفحات ص۱۶۳ ؛ ص۱۸۴ — ۱۸۰ ؛ ص۲۷۲ پر)۔ وہاں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ”مَنْ یَّشَآءُ“ کے معنیٰ ہوتے ہیں“ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ اس کی تائید زیر نظر آیت سے نہایت وضاحت سے ہو گئی۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا کہ طالوت کا انتخاب کس معیار کے مطابق کیا گیا تھا اور اس کے بعد کہا کہ ” وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ“ اگر ”مَنْ یَّشَآءُ “ کا ترجمہ ”جسے چاہتا ہے“ کیا جائے تو آیت کا مفہوم یوں ہو گا کہ ”طالوت کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کا علم بھی وسیع ہے اور جسمانی قوت بھی اور اللہ جسے چاہتا ہے اقتدار سونپ دیتا ہے۔“ آپ دیکھتے ہیں کہ اس طرح ان دونوں ٹکڑوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی ربط نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں۔

”مَن یّشاء“ کے صحیح ترجمہ کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ منصب و اقتدار تمہارے خود ساختہ معیاروں کی

---

[1] تقدیر کے متعلق تفصیلی بحث میری تصنیف ”کتاب التقدیر“ میں ملے گی۔

رو سے نہیں عطا ہوتا۔ وہ خدا کے قانونِ مشیت کی رُو سے عطا ہوتا ہے اور خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ منصب و اقتدار اس کو ملتا ہے جو اس کے لئے ضروری صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سے "مَنْ یَّشَآءُ" کا مفہوم کیسے واضح ہو گیا۔

قوت اور رائے

مناصب اقتدار کے لئے علم اور قوت دونوں کو معیار قرار دے کر قرآنِ کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب علم کے ساتھ قوت اور قوت کے ساتھ علم وابستہ ہو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اہلِ حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں — قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی ضوابطِ قانون (الکتاب) کے ساتھ الحدید (شمشیر خارہ شگاف) بھی نازل فرمائی ہے (۵۷/۲۵)۔ زندگی ان دونوں کے امتزاج سے باقی رہ سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ ذرا آگے چلو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ طالوت کے انتخاب میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ اس کے ہاتھوں جو کارنامے سرزد ہوں گے وہ اس انتخاب کے معیار کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔ فرمایا:۔

۲/۲۴۸ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۲۴۸)

اُن کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا کہ خدا نے جو اقتدار و اختیار طالوت کو سونپا ہے اس کا (پہلا) نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تمہارے موجودہ قلوب کی جگہ (جو خوف و اضطراب کے نشیمن ہیں) ایسا قلب عطا ہوگا جو سکون و اطمینان سے لبریز ہوگا۔ نیز وہ تمہیں ان تمام بہترین اور باقی رہنے والی خصوصیات اور تعلیمات کا وارث بنا دے گا۔ جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کے متبعین نے چھوڑی ہیں اور جن کی حفاظت خدا کی کائناتی قوتیں کرتی چلی آرہی ہیں۔

اگر تم خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو تمہارے لئے یہ بات اس امر کا پختہ نشان بن جائے گی کہ طالوت کا انتخاب فی الواقعہ صحیح تھا۔

"تابوت سکینت"، کے متعلق تورات (کتاب خروج اور سموئیل) میں لکھا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا لکڑی کا

صندوق تھا جسے سونے سے مڑھا گیا تھا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات تھے جب فلسطینیوں نے بنی اسرائیل کو شکست دی تو وہ اس مقدس صندوق کو لوٹ کر لے گئے۔ لیکن اس کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے تو انہوں نے اسے ایک گاڑی پر رکھا۔ گاڑی کے آگے دو گائیں جوتیں اور انہیں بنی اسرائیل

تابوتِ سکینہ

کے علاقہ کی طرف ہانک دیا۔ اس طرح یہ تابوت (صندوق) انہیں واپس مل گیا۔ ہمارے اکثر مفسرین نے بھی تورات کی اس تفصیل کو اپنے ہاں درج کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے بات کچھ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں ذکر ان خصوصیات کا ہو رہا ہے جن کی بنا پر طالوت کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کی پہلی دو خصوصیات کا تعلق دماغ (فکر) اور جسمانی صحت اور توانائی سے تھا۔ اس کے بعد کہا کہ اتنا ہی نہیں کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس کا اہل ہے، وہ اس قلبِ سلیم کا بھی حامل ہے جو پیروانِ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی ابدیت در کنار (صحیح آسمانی) تعلیم کا خزینہ اور سکون و اطمینان کا پیکر ہے۔ عربی لغت کی رُو سے تابوت کے معنیٰ قلب اور سینے کے بھی ہیں۔

جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے، قرآنِ کریم میں میدانِ جنگ میں مجاہدین (صحابہ کبارؓ) کی مدد کے لئے ملائکہ کے نزول کا ذکر آیا ہے۔ ان کی طرف سے اس تائید و امداد سے مقصود یہ تھا۔ لِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ۔ (۸/۱۰) اور فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا۔ (۸/۱۲) تاکہ مجاہدین کو اطمینانِ قلب اور ثباتِ قدم نصیب ہو۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ۔ (۴۸/۴)۔ "اللہ وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں کو سکینت (سکون) عطا فرمایا"۔ (ملائکہ کے متعلق تفصیلی ذکر جلد دوم۔ باب اول میں آچکا ہے)۔

بہرحال (حضرت) طالوت کے انتخاب کے خلاف اعتراض کرنے والوں کو بتا یا گیا کہ انہیں کس قدر صحت اور توانائی، فکری اور علمی صلاحیت اور قلبی پاکیزگی کا بہرہ وافر عطا ہوا ہے۔ اور وہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے متبعین کی صحیح تعلیم کے بھی حامل ہیں۔ تم آگے بڑھو گے تو قدم قدم پر ان کی اِن خصوصیات کے مظاہر دیکھو گے ؎

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز   یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس کے بعد یہ لشکر جالوت (دشمن) کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم نے پہلے کہا کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ۔ (۲/۱۸۳) "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں"۔ اور اس کے بعد کہا کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ (۲/۲۱۶) "تم پر جنگ کو فرض قرار دیا گیا ہے"۔ صیام اور قتال میں کیا تعلق ہے اور قتال میں کامیابی کے لئے صیام کی رُو سے

عائد کردہ پابندیوں کی مشق کس قدر ضروری ہے، اس کا عملی ثبوت زیرِ نظر واقعہ کی اگلی کڑی سے لگ سکے گا جس میں کہا کہ:-

۲/۲۴۹ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (۲/۲۴۹)

بہرحال طالوت کمانڈر مقرر ہوگیا۔ جب وہ لشکر کے ساتھ دشمن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا تو اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں کس قدر ڈسپلن پیدا ہوچکا ہے، ان سے کہا کہ دیکھو! راستے میں ایک ندی آئے گی۔ اس سے پانی نہ پینا۔ جو اس سے پانی پیئے گا وہ سمجھ لے کہ وہ ہمارے لشکر میں رہنے کے قابل نہیں۔ جو اس سے پانی نہ پیئے گا، بجز اس کے کہ یونہی حلق تر کرنے کے لئے چلّو بھر پانی پی لے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ ہمارا ساتھی ہوگا۔ (لیکن کمانڈر کے اس حکم کے علی الرغم) انہوں نے بجز معدودے چند، اس ندی سے پانی پی لیا۔

آپ نے دیکھا کہ جنھوں نے صیام کی پابندیوں سے ضبطِ خویش کی مشق نہیں کی تھی وہ کس طرح راہِ کارزار میں پہلے ہی مرحلہ پر فیل ہوگئے۔ اب آگے بڑھیے:-

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ (۲/۲۴۹)

(اس کے بعد انہوں نے یقین دلایا کہ وہ آیندہ ایسا نہیں کریں گے) چنانچہ جب طالوت انہیں اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان پر پکے رہے تھے ساتھ لے کر پار ہوا تو ان بزدلوں نے جنھوں نے پہلے معافی مانگی تھی، کہہ دیا کہ ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی ہمت نہیں۔

بات صاف ہے۔ جن سپاہیوں میں کچھ وقت کے لئے پیاس پر غلبہ پانے کی بھی سکت نہیں تھی ان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت کہاں سے آجاتی؟ اس کا حقیقی سبب آیت کے اگلے حصہ میں آتا ہے جہاں کہا:

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۲/۲۴۹)

اس پر ان لوگوں نے جنھیں خدا کے سامنے جانے کا خیال (قلبِ انسانی) اس کے قانون مکافاتِ عمل پر پورا پورا

یقین) تھا۔ ان سے کہا کہ دشمن کی تعداد کی کثرت سے مت گھبراؤ۔ خدا کے قانون میں یہ بھی ہے کہ تعداد کی کمی سیرت و کردار کی قوت سے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق (تاریخ میں) کئی واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں کم تعداد کے لوگ گروہِ کثیر پر غالب آگئے تھے۔ اصل چیز استقلال و استقامت ہے جو حق پر ثابت قدم رہے، خدا کے قانون کی تائید اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔

دیکھئے۔ یہاں ان دو گروہوں کے بنیادی فرقوں کو کس وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ ایک گروہ وہ تھا جسے حیاتِ

کثرت و قلت

آخرت پر ایمان تھا۔ اس لئے وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ موت سے خوف کھاتا تھا۔ (آیت (۲/۲۴۳) میں اسی فرق کو سامنے لا کر اس داستان کی تمہید بیان کی گئی تھی۔)

اس آیت میں قرآنِ کریم نے فتح و ظفر کے ایک اور عظیم راز کا افشا کیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ دنیا میں افراد کی کثرت و قلت معیارِ فتح و شکست نہیں۔ معیار ان افراد کا جوہرِ ذاتی ہے۔ چھوٹی سی جماعت جو ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کی قوتوں سے مسلح ہو، بہت بڑی بھیڑ (CROWD) پر نہایت آسانی سے غالب آسکتی ہے۔ تاریخِ عالم پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالیئے۔ ہر مبارزت میں آپ کو اس اصول کے خط و خال ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ نگاہوں کے سامنے واضح مقصد — اور وہ مقصد بھی عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخشیوں کا حصول — دل میں اس مقصد کی صداقت پر یقین اور اس کے حصول کی تڑپ۔ پاؤں میں استقامت، بازوؤں میں قوت، بڑھتی ہوئی ہمتیں، اٹھتے ہوئے قدم اور حیاتِ جاوداں منزلِ مقصود ہے

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

اسی حقیقت کی طرف بدر کے میدان میں مجاہدین کی توجہ ان الفاظ میں مبذول کرائی گئی تھی کہ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۸/۶۶) "اگر تم میں ایک سو ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے"۔ کہ اصلی مقابلہ تعداد کا نہیں ہوتا، افراد کے جوہروں کا ہوتا ہے۔ مغربی جمہوریت کا سنہیا ناس کہ اس نے

مغربی جمہوریت کا باطل نظریہ

انسان کے جوہرِ ذاتی کو یکسر نظرانداز کر کے تعداد کی کثرت و قلت کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا — یعنی جس جھوٹ کی تعداد میں اکیاون ہاتھ اٹھ جائیں وہ سچ قرار پا جائے، اور جس سچ کی تائید میں اُنچاس ہاتھ کھڑے ہوں اُسے جھوٹ سمجھا جائے۔ سوچیئے کہ دنیا میں اس سے بڑا عالمگیر فریب کوئی اور بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بالائے قیامت کہ آج قریب قریب ساری دنیا اس

فریب کو "منزل من اللہ صداقت" کا درجہ دیتے ہوئے ہے۔ قرآن کی رُو سے حق، حق ہے اگر اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھے۔ اور باطل باطل ہے خواہ اس کی تائید میں اکیاون چھوڑ سو فیصد ہاتھ بھی کھڑے ہو جائیں۔ جب تک دنیا اس ابدی صداقت کو تسلیم نہیں کرے گی، فسادِ آدمیت مٹ نہیں سکے گا۔ اور حق کتاب اللہ کے اندر ہے۔

آیت کے آخر میں ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۲۴۹)۔

اذن اللہ کے معنی اس میں باذن اللہ کے معنیٰ کئے جاتے ہیں خدا کے حکم یا اس کی اجازت سے۔ اس سے پھر جبر کا عقیدہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اگر خدا کا حکم ہو تو ایسا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے لغات القرآن میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے مراد اس کا قانون ہے۔ اس آیت میں باذن اللہ کے بعد وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ کے ٹکڑے نے بات واضح کر دی ہے۔ یعنی خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر مستقل مزاج اور ثابت قدم افراد کم مقدار میں بھی ہوں تو وہ دوں ہمت اور پست حوصلہ افراد پر غالب آ جائیں گے۔ خواہ مؤخر الذکر تعداد کے لحاظ سے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ قرآن کریم نے کم تعداد افراد کے غلبہ و نصرت کو ہر مقام پر اسی شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ وہ صابرین یعنی ثابت قدم ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اذن اللہ کے معنیٰ قانونِ خداوندی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ خدا ہر موقع پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس کیلئے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ صابرین کی کم تعداد بھی غیر صابرین کی زیادہ تعداد پر غلبہ حاصل کر لے گی۔

(۰)

اس کے بعد اس داستان کا اگلا ٹکڑا دیکھیے۔ فرمایا:-

۲/۲۵۰ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۲/۲۵۰)

چنانچہ جب یہ باہمت لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے صف آرا ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو دیکھتا ہے کہ ہم تھوڑے ہیں اور دشمن جمّ غفیر لے کر ہمارے سامنے کھڑا ہے، سو، تو ہمارے دلوں کو ہمت اور استقلال سے لبریز کر دے اور ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما دے اور ہمیں ان لوگوں پر غلبہ عنایت کر دے جو تیرے قوانین سے انکار کرتے اور ان سے سرکشی برتتے ہیں۔

دیکھئے! یہ دعائیں (آرزوئیں) کس طرح اس تابوتِ سکینت (قلبِ سلیم) کی پکار پکار کر شہادت دیتی ہیں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور آیت میں جمع کا صیغہ اس حقیقت کی دلالت کرتا ہے کہ جس قسم کا میر کارواں (سربراہ) ہوگا، اسی قسم کے اس کے رفقائے سفر ہو جائیں گے۔ سربراہ کی سیرت کا اس کے متبعین کی ذہنیت اور کردار پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:-

۲/۲۵۱ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۔ (۲/۲۵۱)

چنانچہ انہوں نے خدا کے اس قانون کے مطابق (کہ فتح و ظفرمندی حق پر جم کر کھڑے ہو جانے سے وابستہ ہوتی ہے) اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے دی اور داؤد کے ہاتھوں (جوان کے لشکر میں تھا) جالوت مارا گیا اور خدا نے (اس کے بعد) اسے حکومت و اقتدار اور فہم و فراست عطا فرمایا اور اسے اپنے قانون مشیت کے مطابق (وحی کا) علم بھی دیا۔

یہ ہے طالوت کا واقعہ۔ مقصد اس کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اگر اللہ مستبد اور سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرے تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ اس نے یہ انتظام اس لئے کر رکھا ہے کہ وہ انسانیت کی تباہی اور بربادی نہیں چاہتا، اس کی تعمیر اور ترقی چاہتا ہے۔ (۲۲/۴۰-۳۹)

لیکن یاد رہے کہ مستبد قوتوں کی روک تھام انسانی جماعتوں کے ہاتھوں ہی سے ہوتی ہے۔ خدا براہ راست ایسا نہیں کیا کرتا۔ اس لئے دنیا میں ایسی جماعت کا رہنا بڑا ضروری ہے۔

یہاں فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ کہا گیا ہے۔ ان شرائط نے جنہیں ان مجاہدین نے پورا کیا اور ان آرزوؤں نے جو شدتِ طلب سے عین میدانِ جنگ میں ان کے لبوں پر دعائیں بن کر آئیں اور جن کا عکس ہم سابقہ آیت میں دیکھ چکے ہیں، اذن اللہ کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق انہیں غلبہ نصیب ہوا۔ اور آیت کے آخری الفاظ سے جہاد فی سبیل اللہ کی علت غائی اور منتہیٰ و مقصود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جماعت مومنین صرف اس لئے شمشیر بکف میدانِ جنگ میں اترتی ہے کہ دنیا سے فساد مٹ جائے۔ اس نکتہ کی وضاحت

سابقہ باب میں قتال کے سلسلہ میں بڑی شرح وبسط سے کی جا چکی ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

حضرت داؤد کے متعلق گفتگو متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔

(۰)

اور ان تشریحات کے بعد فرمایا:-

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲/۲۵۲)

۲/۲۵۲ یہ ہیں وہ قوانین جنہیں ہم، اے رسول! حق وصداقت کے ساتھ تمہیں دے رہے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اس قسم کے قوانین اپنے تمام پیغمبروں کو دیتے چلے آئے ہیں اور تو بھی انہی میں سے ہے۔

یہ احکام، قوانین اور حقائق، اسی طرح بذریعہ وحی انبیاء سابقہ کو بھی دیئے گئے تھے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے ان میں تحریف کر دی اور وہ حقیقت کے بجائے افسانے بن کر رہ گئے۔ انہی حقائق کو اب ہم (اے رسول!) تیری طرف منزہ شکل میں نازل کر رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گی اس لئے اس میں یہ حقائق افسانے نہیں بن سکیں گے۔ دنیا میں ہر متلاشئ حقیقت کو اسی کتاب کی طرف آنا پڑے گا۔

تیسرا پارہ شروع

سابقہ آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲/۲۵۲) تو منجملہ مرسلین من اللہ ہے اس کے بعد کہا۔

۲/۲۵۳ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۔ (۲/۲۵۳)

یہ تمام رسول، منصبِ رسالت کے اعتبار سے تو ایک جیسے تھے (۲/۲۸۵)۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ کے لحاظ سے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل رہی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا نے (جبریل کے واسطے کے بغیر) براہِ راست باتیں کیں [مثلاً موسیٰؑ۔ (۴/۱۶۴)] بعض کے درجے (دیگر امور میں) بلند کئے۔ انہی میں عیسیٰؑ ابن مریم بھی ہے جسے ہم نے واضح دلائل دیئے اور مقدس وحی سے اس کے لئے سامان تقویت بہم پہنچایا۔

اگر ہمارا قانونِ مشیت یہ ہوتا کہ انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور زندگی بسر کرے تو ان رسولوں کی اس قدر واضح تعلیم کے بعد ان کے متبعین آپس میں جنگ و جدال اور اختلافات نہ کرتے۔ لیکن چونکہ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے (۱۸/۲۹)۔ اس لئے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا ــــ بعض نے ایمان کی راہ پسند کی۔ بعض نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا ــــ پھر سن لو کہ اگر مشیت کا قانون یہ ہوتا کہ انسان کو جبراً ایک ہی راہ پر چلایا جائے تو یہ کبھی آپس میں جنگ و قتال نہ کرتے۔

(ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار بنایا ہی کیوں؟ نہ اسے اختیار دیا جاتا نہ دنیا میں جنگ و قتال ہوتے۔ لیکن ان امور کے فیصلے تمہاری منشاء کے مطابق نہیں ہو سکتے)۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جو تمام نظامِ کائنات کو اپنے محیطِ کل ارادے (پروگرام) کے مطابق چلا رہا ہے۔ انسان کا صاحبِ اختیار ہونا بھی اسی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔

اس آیت میں دو ایک نکات غور طلب ہیں:۔

(۱) حضرات انبیاء کرام پر ایمان لانے کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (۲/۲۸۵ نیز ۳/۸۴ نیز ۴/۱۵۲)۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ وَرَفَعَ دَرَجٰتٍ۔ (۲/۲۵۳ نیز ۱۷/۵۵)۔ اس کے متعلق زیرِ آیت (۲/۱۳۶) باب دوم میں بتایا جا چکا ہے کہ جہاں تک ان حضرات کے رسولؐ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغامبر) ہونے کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان کی تعلیم کے دائرہ اثر و نفوذ اور جو پروگرام ان کے سپرد کیا گیا تھا اس کے بروئے کار لانے کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشکلات اور تصادمات کے اعتبار سے ان میں اختلافِ مدارج ہے۔ بایں ہمہ بحیثیتِ رسالت یہ حضرات یکساں واجب التکریم اور مستحقِ احترام

ہیں۔ اس باب میں اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا میں ہر ملک اور ہر قوم میں مرسلین من اللہ آتے رہے۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ (۴۰/۷۸ ؛ ۴/۱۶۴) ان میں کچھ وہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا (متعینہ طور پر) ذکر نہیں کیا گیا۔ اہل مذاہب جن ہستیوں کو اپنے مذہب کا "بانی" کہتے ہیں ہم ان میں سے کسی کے خلاف بھی گستاخی کا کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان انبیاء میں سے ہوں جن کا متعین طور پر ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔

سوچئے کہ کیا اس قسم کی کشادہ نگہی کی تعلیم کہیں اور بھی ملتی ہے؟

(۲) دوسری بات یہ کہی گئی ہے مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ۔ (۲/۲۵۳)۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے خدا نے "کلام" کیا۔

کلام اللہ سے مراد

قرآن کریم میں صرف ایک نبی (حضرت موسیٰؑ) کے متعلق "كَلَّمَ اللّٰهُ" کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ النساء میں ہے: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴/۱۶۴) سورۂ اعراف میں ہے۔ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ۔ (۷/۱۴۳-۱۴۴) یہ وہ مقام ہے جب طور پر حضرت موسیٰؑ کو شرفِ ہمکلامی سے نوازا گیا تھا۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف وحی ملتی تھی، وحی کے متعلق حسب ذیل مقامات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ جلد اوّل، آیت (۲/۴)۔ صفحہ ۱۴۰-۱۴۱؛ آیت (۲/۲۳)۔ صفحہ ۳۰۸-۳۰۹ — جلد دوم آیت (۲/۷۳) صفحہ ۱۲۹؛ آیت (۲/۱۱۸) صفحہ ۱۸۶؛ آیت (۲/۹۷-۹۸) صفحہ ۳۸۷۔

ان مقامات میں بتایا جا چکا ہے کہ کوئی غیر از نبی یہ جان ہی نہیں سکتا کہ خدا کی طرف سے وحی کیسے ملتی تھی۔ اور اب جبکہ وحی کا سلسلہ (حضور رسالتمآب کی ذاتِ اقدس پر) ختم ہو گیا اس لئے کوئی بھی اس راز کو نہیں پا سکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہے۔ قرآن کریم میں تمام انبیاء کرام کے سلسلہ میں وحی (أوحينا) کا لفظ آیا ہے حتیٰ کہ طور کے ایک مقام کو چھوڑ کر خود حضرت موسیٰؑ کے لئے بھی اوحینا ہی کا لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے ۷/۱۱۷؛ ۱۶۰ ؛ ۱۰/۸۷ ؛ ۲۰/۷۷ ؛ ۲۶/۵۲؛ ۶۳)۔ دوسری طرف وحی کے ذریعے عطا کردہ قرآن کریم کو خدا نے کلام اللہ کہہ کر پکارا ہے (۲/۷۵ ؛ ۹/۶ ؛ ۴۸/۱۵) اور قرآنی قوانین و حقائق کو "کلمات اللہ" سے تعبیر کیا ہے (۶/۱۱۶)۔ لہٰذا وحی اور کلام اللہ ایک ہی بات ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (۴۲/۵۱)۔ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے۔ بجز ان دو طریقوں کے۔ یعنی جبریل کی وساطت سے قلبِ نبوی میں خدا

کی وحی کا القاء۔ یا پس پردہ خدا کی بات اس تک پہنچ جاتے " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلوہ گاہ طور پر یہ دوسرا طریق اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت جو بھی تھی، وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس لئے اب خدا کسی انسان سے براہِ راست بات نہیں کرتا۔ نہ کرے گا۔[1] اب انسانوں کے ساتھ خدا اپنی کتاب کے ذریعے ہی باتیں کرتا ہے۔ یعنی جب کوئی شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو خدا اس سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اسے کلام اللہ کہا ہے۔ یہ وہ تیسرا طریق ہے جسے سورۂ شوریٰ کی مندرجہ بالا آیت کے آخری حصہ میں یوں بیان فرمایا ہے۔ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلاً فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۤءُ (۵۱/۴۲)۔ غیر از نبی انسانوں تک خدا کا کلام رسولوں کی وساطت سے پہنچتا تھا۔ اس کا یہ کلام اب ہم تک اس کی کتاب کے توسط سے پہنچتا ہے۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا ہے۔ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (۲۵۳/۲)۔ اس سلسلہ میں جلد اول زیر آیت (۲/۲)۔ صفحہ ۲۷۶-۲۷۷ پر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی آیات کا تعلق عالمِ امر میں قوانین خداوندی سے ہے۔

(۴) انسانوں کو صاحب اختیار و ارادہ کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول اور جلد دوم میں انسان اور تقدیر سے متعلق عنوانات دیکھئے۔ (نیز کتاب التقدیر)

(۵) اس آیت میں کہا ہے کہ انبیاء سابقہ کی امتوں نے اختلاف افتراق سے کام لیا جس کا آخری نتیجہ باہمی جنگ و قتال تھا۔ اس کے بعد امتِ مسلمہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دیکھنا کہیں تم بھی ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے جلد اول و دوم میں فرقہ سازی، تفرقہ انگیزی، اختلافات وغیرہ سے متعلق عنوانات دیکھئے۔

(۶) اس میں نوعِ انسان کے دو گروہوں میں بٹ جانے کا ذکر ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ (۲۵۳/۲)۔ ایمان میں مشترک انسان اور کفر میں مشترک انسان۔ یہی قرآن کریم کی رُو سے قومیت کا معیار ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رُو سے دنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ جماعتِ مؤمنین ایک قوم اور جو ان میں سے نہیں وہ دوسری قوم۔ اسی کو (موجودہ اصطلاح میں) "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔

———— (٠) ————

قوموں کے عروج و زوال کی ان داستانوں کے بعد فرمایا :-

---

[1] اولیاء اللہ کے کشف والہام کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ اس موضوع پر الگ گفتگو کی گئی ہے۔

۲/۲۵۴ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ
يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ
الظّٰلِمُوۡنَ ۔ (۲/۲۵۴)

اے جماعت مومنین! انبیائے سابقہ اور اقوامِ گزشتہ کے یہ تمام احوال و کوائف اس لئے بیان کیے گئے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ زندگی کی خوشگواریاں حاصل کرنے کا راز نظامِ خداوندی قائم کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے' اسے اس مقصد کے لئے کھلا رکھو۔ اس وقت تم ایسا کرنے پر قادر ہو لیکن اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان خوشگواریوں کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ وہ جنس نہیں جسے تم جس وقت چاہو بازار سے خرید لو۔ نہ ہی یہ کسی دوست سے احساناً مل سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی سفارش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو اس حقیقت سے انکار کرتا ہے وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔

اس میں جس قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے وہ اپنی پوری تشریح و توضیح کے ساتھ جلد دوم۔ آیت (۲/۴۸) صفحہ ۲۴۰–۲۲۸ میں سامنے آچکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔ جس خدا کا یہ قانون ہے اس کی چند اہم صفات کا تعارف اگلی آیت میں کرایا گیا ہے۔

۲/۲۵۵ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَـىُّ الۡقَيُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ
مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ
اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ
بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ
وَلَا يَـئُوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ۔ (۲/۲۵۵)

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس کے الفاظ کا تشریحی مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے پہلے ان الفاظ کو سامنے لایا جاتا ہے۔

آیۃ الکرسی

اللہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول آیت (۱/۱) صفحہ ۱–۸ میں بحث ہو چکی ہے۔ لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی کچھ مزید وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

دین (یا مذہب) کا بنیادی نقطہ خدا پر ایمان ہے۔ دہریوں کو چھوڑ کر (جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں)

دنیا کا ہر شخص کہے گا کہ وہ خدا کو مانتا ہے، خواہ خدا کے لئے اس کے ہاں الفاظ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن (یہ چیز بظاہر ناقابلِ فہم یا کم از کم تعجب انگیز دکھائی دے گی کہ) قرآن کریم ان کے اس ماننے (ایمان) کو ماننا (ایمان) تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں ایک گروہ ایسا تھا جو کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کا مدعی نہیں تھا (جیسے کفار یا مشرکین عرب) اور ایک گروہ جو کسی نہ کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان رکھتا تھا۔ (جیسے یہودی اور عیسائی جنھیں قرآن اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے) ان اہل کتاب کے خدا پر ایمان کے دعوے سے تو انکار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ خدا تو ایک طرف وہ وحی، ملائکہ، رُسل، حیات بعد الممات پر بھی ایمان کے مدعی تھے۔ جہاں تک اول الذکر گروہ کا تعلق ہے خدا کو وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں مانتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (۲۳/۸۴-۸۵)۔ "ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ ارض اور جو کچھ اس میں ہے، کس کی ملکیت ہے تو یہ فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ کی"۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ (۲۳/۸۶-۸۷) "ان سے پوچھو کہ اس وسیع کائنات اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے۔ یہ فوراً جواب دیں گے کہ اللہ"۔ اس کے بعد ہے: قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ۔ "ان سے پوچھو کہ اشیائے عالم پر اقتدار کس کا ہے۔ یہ بلا تأمل کہیں گے کہ اللہ کا"۔ (۲۳/۸۸-۸۹) لیکن اس کے باوجود وہ نہ صرف ان کفار و مشرکین کو بلکہ اہل کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ قرآنِ کریم ان کے ایمان باللہ کو ایمان باللہ کیوں تسلیم نہیں کرتا؟ بات واضح ہے۔

سب سے پہلے ایمان کا مطالبہ

خدا (اللہ) ایک مجرد حقیقت ہے۔ انسانی خیال و قیاس و گمان و وہم سے بالا۔ غیر محسوس اور غیر مرئی۔ لہٰذا، جب کوئی کہتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے تو وہ اسی خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے جس کا تصور اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصور ہر فرد کا الگ الگ ہو سکتا (بلکہ ہوتا) ہے۔ جب قرآن کریم بھی خدا (اللہ) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے تو وہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت و ماہیت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کو انسان سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کوئی محدود (FINITE)، لامحدود (IN-FINITE) کا تصور نہیں کرسکتا۔ اس لئے قرآن ذاتِ باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ وہ اس کی صفات (ATTRIBUTES) کا ذکر کرتا ہے اور نہایت وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ ان صفات سے خدا کا جو تصور (CONCEPT) ذہنِ انسانی میں آتا ہے، قرآنِ کریم اس تصور کے مطابق خدا (اللہ)

پر ایمان کو صحیح ایمان قرار دیتا اور تسلیم کرتا ہے۔ خدا کی ان صفات کے متعلق کبھی کوئی انسان صحیح طور پر نہیں بتا سکتا تھا۔ انہیں خدا نے خود بتایا۔ خدا نے جو وحی انبیاء سابقہ کی طرف بھیجی تھی اس میں بھی اس نے اپنی صفات کو بتایا ہوگا۔ لیکن وہ وحی اپنی منزہ شکل میں کہیں موجود نہیں۔ اس لئے اب خدا کی صفات اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں اور انہی صفات کے مطابق خدا پر ایمان، معیارِ خداوندی کے مطابق سچا ایمان قرار پا سکتا ہے۔ ان صفات کے سوا جو صفات بھی اس کی طرف منسوب کی جائیں گی وہ انسانی ذہن کی وضع کردہ (یا محرف) ہوں گی۔ اس لئے وہ ناقابلِ قبول قرار پائیں گی۔ یہ وجہ ہے جو ان کے متعلق کہا گیا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ (۲۳/۹۱) ذہنِ انسانی خدا کی جو صفات بھی وضع کریگا، خدائے حقیقی ان سے منزہ اور بلند و بالا ہوگا۔ لہٰذا، معیارِ خداوندی کے مطابق مؤمن (خدا پر ایمان رکھنے والا) اس کو کہا جائے گا جو ان صفات کے مطابق خدا کو مانتے جو قرآن کریم میں خود خدا نے بیان کی ہیں۔ یہی وجہ ہے جو اس نے دنیا بھر کے "خدا کو ماننے" کے مدعیوں کے متعلق کہہ دیا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (۲/۱۳۷)۔ اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ راہِ راست پر ہیں۔ (یہ آیت اور اس کی تشریح سابقہ صفحات میں آچکی ہے) ان صفات کو قرآن کریم میں اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۲۰/۸) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ قرآن کریم کے اوراق میں درخشندہ موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر ہمارے لئے وجہِ فروغِ دیدہ ہوتی جائیں گی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، دین (اسلام) کا بنیادی نقطہ، خدا کا صحیح تصور ہے اور وہ تصور ان صفات کے صحیح طور پر سمجھنے ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ان صفات اور ان کے صحیح طور پر سمجھنے کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ زیرِ نظر آیت میں ان میں سے کچھ صفات ہمارے لئے وجہِ تابندگیٔ قلب و نظر بنتی ہیں۔ فرمایا۔

صفاتِ خداوندی

اَللّٰهُ — اللہ وہ ہے:۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ — جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

جب اسلام بطورِ دین (نظامِ حیات) سامنے آئیگا تو اس میں اس صفتِ خداوندی کو اساسی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کا مفہوم جلد اول آیت (۲/۱) ص۱۴۳-۱۲۰ میں گزر چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس صفتِ خداوندی پر ایمان سے خدا کا تصور محض نظری یا اعتقادی نہیں رہ جاتا، عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی اس ایمان کے بعد، انسان دنیا کے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت یا محکومیت قبول

اور اختیار نہیں کر سکتا۔ آپ نے غور فرمایا! اس ایک صفتِ خداوندی پر ایمان جہانِ انسانیت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے! اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم · کہ دانم مشکلاتِ لَآ اِلٰہ را

لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو وہ ان "تمام" مشکلات کو آسان کر دیتا ہے۔ مذہب میں آکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے معنی ہو جاتے ہیں: خدا کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ یعنی اگر تم خدا کی پرستش، بندگی (پوجا پاٹ) کرتے رہو تو تم مومن ہو، خواہ اطاعت اور محکومیت کسی کی اختیار کر لو۔ دیکھا آپ نے کہ مذہب کے فریب نے لَآ اِلٰہ کی مشکلات کو کس طرح آسان کر دیا؟

وحدت الوجود کا نظریہ اور اربابِ شریعت کے بعد جب اہلِ طریقت آگے بڑھے تو انہوں نے سارا جھگڑا ہی چکا دیا۔ تصوف کا بنیادی عقیدہ وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے، خدا ہی ہے: ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ · خود رِند و سبوکش

خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد · بشکست و رواں شد

اور اس عقیدہ کے ماتحت انہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مفہوم یہ متعین کیا کہ دنیا میں جن معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے وہ سب اللہ ہی ہیں۔ ہر پتھر کی مورتی جس کی پوجا کی جاتی ہے، اللہ ہے۔ ہر انسان جس کی لوگ پرستش کرتے ہیں، ہر حیوان جسے دیوتا مانا جاتا ہے۔ اللہ ہی ہے۔ یہ بھی اللہ وہ بھی اللہ۔ (معاذ اللہ۔ صد ہزار بار معاذ اللہ)۔ اور اسے نہ صرف عینِ دین بلکہ مغزِ دین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے اس قسم کے عقائد وضع کئے اور جو ان کا اتباع کرتے ہیں، انہیں مقربینِ بارگاہِ خداوندی اور اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ سچ ہے۔ حق کا تو ایک متعین مقام ہوتا ہے۔ باطل کی پستی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ (وحدت الوجود کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم۔ آیت ۲/۱۳۱۔ صفحہ ۸۸ دیکھئے۔

(۲) **اَلْحَیّ** ۔ زندہ اور زندگی عطا کرنے والا۔

اَلْحَیّ وہ اپنی ذات میں زندہ ہے۔ اسے کسی اور نے حیات (زندگی) عطا نہیں کی۔ وہ اپنی مخلوق کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ۔ (۲۱/۳۰) "اس نے ہر شے کو پانی کے ذریعے زندگی عطا کی"۔ خود انسانوں کے متعلق ہے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔ (۲/۲۸)۔

"تم بے جان تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اس طرح مخلوق بھی حَيٌّ (زندہ) ہوگئی۔ لیکن خدا کے الحی (زندہ) اور مخلوق کے زندہ ہونے میں ایک فرق تو یہ ہے کہ خدا از خود زندہ ہے۔ اُسے کسی نے زندگی عطا نہیں کی۔ اور مخلوق کو خدا نے زندگی عطا کی ہے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ اَللّٰه ـــ الحي لا يموت ہے (۲۵/۵۸)۔ ایسا زندہ جسے موت نہیں آئے گی۔ لیکن مخلوق کے متعلق ہے۔ هُوَ يُحْيِ وَيُمِيْتُ (۵۶/۱)" جس خدا نے تمہیں زندگی عطا کی ہے وہی تم پر موت بھی طاری کرتا ہے"۔ لہٰذا، لَا يَمُوْتُ صرف خدا کی ذات ہے۔ اہلِ جنت کیلئے حیات ابدی کا ذکر آیا ہے لیکن خدا کی ابدیت اور انسانوں کی ابدیت میں بڑا فرق ہے۔ اس کی تشریح جنت کی زندگی سے متعلق عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔

(۳) اَلْقَيُّوْمُ ـــ اس کے دو معنی ہیں۔ (۱) جو اپنے قائم، محکم اور استوار رہنے میں کسی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ جو قائم بالذات ہو (SELF - SUBSISTING)۔ اور (۲) اپنی مخلوق کے معاملات کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ ان کی پیدائش اور سامانِ زیست بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے مقاماتِ حیات کا علم رکھے۔ جو ہر شے پر نگران ہو۔ جس کے بغیر کوئی شے قائم نہ رہ سکے۔

اَلْقَيُّوْمُ

(۴) لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ـــ سنة (مادہ و۔س۔ن)۔ نیند کی ابتدائی کیفیت یا اونگھ کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی کسی چیز سے غافل ہو جانے کے بھی ہیں۔ اور نومٌ نیند کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ (خدا) مخلوق کو زندگی اور سامانِ پرورش عطا کرنے کے بعد ان کی طرف سے غافل اور بیخبر نہیں ہو گیا۔ وہ ان کی ہر حالت سے باخبر اور ان کا ہر مقام میں نگران ہے۔

نہ نیند نہ اُونگھ

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اپنا نظریہ پیش کرتا ہے تو اس سے بالواسطہ کسی نہ کسی باطل عقیدہ کی تردید بھی کر دیتا ہے۔ ہندو دھرم میں عقیدہ ہے کہ ایشور پر ماتما سو رہا ہے اور یہ کائنات اس کا خواب ہے۔ جب وہ نیند سے بیدار ہو جائے گا تو کائنات خود بخود معدوم ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم میں لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کہہ کر اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ کائنات کے بالحق پیدا کئے جانے کے متعلق جلد دوم آیت (۲/۱۱) ص۸۹ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔

مغربی مادیئین کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کر دیا۔ لیکن اب اسے اس کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔ جس طرح ایک کلاک کو کوک (چابی) دے دی جاتی ہے تو وہ مدتِ معینہ تک خود بخود چلتا رہتا ہے اسی طرح نظمِ کائنات بھی ایک خود کار مشین کی طرح سرگرمِ عمل ہے۔ نہ خدا اس میں اب کوئی دخل دیتا ہے نہ کائنات

کو اس کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ خدا اس کی نگرانی کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں، اس نظریہ کی بھی تردید کر دی۔ اس نے دوسری جگہ کہا ہے۔ یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے اپنی حیات، قیام اور نشوونما کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ پھر ان اشیائے کائنات کی یہ کیفیت نہیں کہ ان کی ضروریات کے تقاضے غیر متبدل ہیں۔ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شے کا کوئی تقاضا ایک دفعہ پورا کر دیا جائے تو پھر اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایسا نہیں۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹)۔ ان کے تقاضے ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور خدا کی ربوبیت ہر نئے تقاضے کے مطابق سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کی مستقل اور مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے اور ایسا کچھ وہی خدا کر سکتا ہے جسے نیند تو ایک طرف اونگھ تک بھی نہ آئے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس نگرانی کی طرف سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنی مخلوق کے احوال و ظروف سے ہر آن واقف اور باخبر ہو۔

(۵) لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ کائنات کے کسی ایک گوشے سے نہیں۔ پوری کی پوری کائنات سے۔ آیت کے اس ٹکڑے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اس خدا کی ملک ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جملہ کارگہِ کائنات اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ اس کے لئے سرگرمِ عمل ہے اور یہ (خدا) ہر قدم پر اس کی نگرانی بھی کرتا ہے اور ضروری سامانِ قیام و نشوونما بھی مہیا کرتا ہے۔

(۶) مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ اشیائے کائنات اس کے پروگرام کی تکمیل میں بلاچون وچرا سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ ان میں سے کسی کو یارائے سرتابی نہیں، مجالِ سرکشی نہیں۔ (تفصیل اس اجمال کی جلد دوم، باب اول صفحہ ۲۲ میں ملائکہ کے عنوان میں گزر چکی ہے۔ نیز زیرِ آیت ۲/۳۴ صفحہ ۹۸ میں۔) لیکن انسان اس میں کوتاہی بھی کرتا ہے اور اس سے سرتابی بھی برتتا۔ لیکن جب وہ ایسا کرتا ہے تو اسے اس غفلت اور سرتابی (قانون شکنی) کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں اور اس کے متعلق خدا کا نظامِ عدل ایسا ہے کہ اس میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ وہ اس کے قانون کے مطابق ہو۔ شفاعت کے متعلق بحث جلد دوم۔ زیرِ آیت ۲/۴۸ صفحہ ۲۳۲ پر ہو چکی ہے۔

(۷) یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ۔ اس باب میں کسی کی مداخلت کی اس لئے بھی گنجائش نہیں کہ حاکم (اللہ تعالیٰ یا اس کا قانونِ مکافات) ہر ملزم کے ماضی اور حال سے پوری طرح واقف

ہوتا ہے۔ (قانونِ مکافات کے متعلق جلد اول زیرِ آیت (۲/۴) صفحہ ۱۵۲-۱۴۹ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ مزید تفصیل وہاں دیکھ لی جائے)۔

(۸) وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ۔ خدا کے علم کی تو یہ کیفیت ہے کہ زمان و مکان کے حدود بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن انسان کو تو اسی قدر علم حاصل ہو سکتا ہے جس قدر اس کے حصول کی استعداد اسے خدا نے عطا کر رکھی ہے۔ حصولِ علم کے ذرائع سماعت و بصارت اور قلبؔ فہم اور ادراک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دسترس یا وسعت کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا اس کا علم بہرحال محدود ہے۔ دوسرا ذریعۂ علم، وحیِ خداوندی کے ذریعے عطا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم اتنا ہی ہے جتنا خدا نے دینا چاہا۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کی رُو سے انسان کا اکتسابی علم یا وحی کی رُو سے عطا شدہ علم، علمِ خداوندی کے مقابلہ میں بہرحال محدود ہے۔

(۹) وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ۔ اس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے۔ کرسی کے معنی علم اور اقتدار دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ سابقہ ٹکڑے میں علم کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اس لئے اس ٹکڑے میں علم کے مفہوم کو ترجیح دی جائے گی۔ (لفظ کرسی کی نسبت سے اس آیت کو عام طور پر آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔

(۱۰) وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا۔ اتنی وسیع و عریض کائنات (عصرِ حاضر کے ماہرینِ علم الافلاک تو اسے ناپید اکنار بھی کہتے ہیں اور وسعت پذیر (EXPANDING) بھی۔ اس قسم کی کائنات کے ذرہ ذرہ کے متعلق علم۔ اس کی نگرانی، اس کے ہر تقاضا کا پورا کرنا، انسانی اعمال کے نتائج و عواقب کا مرتب کرنا۔ عقلِ انسانی اپنے اندازہ کے مطابق یہی تاثر لے سکتی ہے کہ ایسا پروگرام تھکا دینے والا ہے۔ لیکن تھک جانا تو محدود توانائی کا نتیجہ ہے۔ جو ذات لامتناہی توانائیوں کی مالک اور سرچشمہ ہو اس کے لئے تھک جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازی تھی جو اس نے (محرف تورات میں) کہا کہ خدا نے چھ دن لگاتار محنت کر کے کائنات کو پیدا کیا اور ساتویں دن (تھک کر) آرام کرنے لگا۔ (سبت۔ ہفتہ کی تعطیل اسی "سنتِ خداوندی" کے اتباع میں ہے)۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ اس قدر لامتناہی توانائیوں کا مالک کبھی تھکا نہیں کرتا۔

(۱۱) وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

عُلُوٌّ کے معنی بلندی یا کسی کے اوپر ہونے کے ہیں۔ بلندی کے اعتبار سے اس میں شرف و عظمت یعنی

بلندی مدارج سب آجاتے ہیں۔ اور اوپر ہونے کے اعتبار سے اس کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم میں ذاتِ باری تعالیٰ کی یہ صفت مختلف شکلوں میں آئی ہے۔ مثلاً سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ (۶/۱۰۱)۔ ذہنِ انسانی خدا کے متعلق جو تصور پیدا کرے گا وہ (خدا) اس سے بلند و بالا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ فَتَعَالَی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (۲۰/۱۱۴)۔ اس میں ملک (اقتدار) کی نسبت سے تعالیٰ کے معنی صاحبِ غلبہ و اقتدار ہوں گے۔ دیگر مقامات پر عُلُوًّا کَبِیْرًا (۱۷/۴۳) اَلْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ (۲۲/۶۲) یا اَلْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) بھی آئے ہیں۔ ان مقامات میں کبریائی کی جہت سے غلبہ و اقتدار، بلندی و برتری مقصود ہوگا

الاعلیٰ

ان جہات کی رو سے خدا کی جامع صفت اَلْاَعْلٰی (۸۷/۱) آتی ہے۔ اول تو لفظ اَعْلٰی کے معنی ہی سب سے بلند و برتر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ (اَلْ) نے اس تخصیص کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ کائنات میں خدا کا غلبہ و تسلط تو ظاہر و باہر ہے۔ انسانی دنیا میں اس کی اس بلندی و کبریائی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اس کے قوانین کو انسانی معاشرہ میں غلبہ و تمکن حاصل ہو۔ اور یہ غلبہ و تمکن ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے جو اس مقصد کے لئے جان تک کی بازی لگا دیں۔ چنانچہ اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت ہی یہ بتائی ہے کہ جَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی وَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ (۹/۴۰) تاکہ انسانوں کا خود ساختہ نظام پست (مغلوب) ہو جائے اور خدا کا نظام غالب آ جائے۔ جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں یہ نظام غالب آتا ہے ان کے متعلق بھی کہا کہ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸) "عارضی تغیرات اور زمانے کی گردشوں سے مت گھبراؤ۔ مت ملولِ خاطر ہو۔ چونکہ تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہو اس لئے آخر الامر غالب تم ہی آؤ گے"۔ آیت (۸۷/۱) میں خدا نے اپنے آپ کو الاعلیٰ کہا تھا۔ یہاں اس کے قوانین کو غالب کرنے والی جماعت کو الاعلون کہا ہے۔ یوں صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ البشریت عبدِ مومن کی سیرت و کردار میں منعکس ہوتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے مومنے بالاتے ہر بالا ترے

عَظِیْم

عظم کے معنی ہڈی کے ہیں۔ چونکہ انسانی پیکر میں ہڈیاں اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے عظمت کا لفظ انتہائی اہمیت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ "بہت بڑا" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ عذاب کے لئے بھی آیا ہے۔ (عَذَابٌ عَظِیْمٌ) اور اجر اور فوز کے لئے بھی۔ (اَجْرٌ عَظِیْمٌ، فَوْزٌ عَظِیْمٌ وغیرہ)

ان معانی کی رُو سے اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ عام الفاظ میں تو یہ کہ ذاتِ خداوندی انتہائی بلندیوں اور عظمتوں کی مالک ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی اساس و بنیاد (عظم) سے لے کر اس کی انتہائی بلندیوں (علو) تک میں ذاتِ خداوندی کو غلبہ و تسلط حاصل ہے۔

یہ ہیں ذاتِ خداوندی کے اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی میں سے چند ایک۔ یہ اور ان کے علاوہ دیگر صفاتِ خداوندی کی رُو سے ذاتِ خداوندی کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس کے مطابق خدا کی ہستی پر ایمان لانا، ایمان باللہ کہلائیگا۔ (میں نے جملہ صفاتِ خداوندی کی تفصیل اپنی کتاب "من و یزداں" میں بیان کی ہے)۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جائے کہ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کا ادراک ذہنِ انسانی کے لئے ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ اسے کسی مثال سے بھی سمجھایا نہیں جاسکتا کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲/۱۱) "اس کی مثل کوئی شے نہیں"۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت (پہچاننے) کا مطالبہ نہیں کیا "اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی صفات سے (جو اس نے خود قرآنِ کریم میں) بیان کی ہیں، اس کا تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی خدا پر صحیح ایمان اور دین کی بنیاد ہے۔

(۰)

لَاۤ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ

دین کی اس بنیاد کو سامنے لانے کے بعد کہا:-

لَاۤ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (۲/۲۵۶)

۲/۲۵۶

اس قدر عظیم قوتوں کا مالک خدا اگر چاہتا تو جس طرح خارجی کائنات میں اس کا نظام از خود قائم ہے انسانی دنیا میں بھی از خود قائم ہو جاتا اور انسان اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا۔ لیکن ہم اس باب میں زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ اسے انسانوں کو اپنے دل کی رضامندی سے قائم اور اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہم نے کیا یہ ہے کہ (وحی کے ذریعے) صحیح اور غلط راستے واضح کر دیئے ہیں اور انسان سے کہہ دیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔

سو جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی

کانصب العین بنالے گی تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ نظام اس خدا کا تجویز کردہ ہے جو ہر بات کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یہ آیۂ جلیلہ دنیائے "مذاہب" میں انقلابِ عظیم کا اعلامیہ ہے۔ دنیا میں جس قدر کشت وخون مذہب کے نام پر ہوا ہے دیگر وجوہات یا محرکات کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا۔ ان سب کے خلاف قرآنِ کریم نے اعلان کر دیا کہ دین (عرفِ عام میں مذہب) کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں۔ وحی نے غلط اور صحیح راستوں کو واضح کر دیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے جونسا راستہ اختیار کرلے۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں اس اصلِ عظیم کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانیت کو بالغ تصور کر کے اپنی ہدایات دی ہیں۔ اس لئے کسی بات کے منوانے کے لئے جو طریقے اس کے عہدِ طفولیت (بچپن کے زمانے) میں کارفرما یا مؤثر تھے ان کا دور ختم ہوگیا۔ اب یہ ہر بات اپنی عقل وبصیرت کی رُو سے، اپنے فیصلہ سے مانے گا۔ انسانی اختیار وارادہ کے متعلق حسبِ ذیل مقامات دیکھیئے:۔

(۱) جلد اول۔ آیت (۱/۵) صہ ۴۲ ؛ آیت (۲/۴) صہ ۱۶۳ ؛ آیت (۲/۷) صہ ۱۸۸-۱۸۰۔ آیت (۲/۲۲) صہ ۳۱۴-۳۰۹

جلد دوم۔ آیت (۲/۳) صہ ۱۵ ؛ آیت (۲/۴۳) صہ ۱۰۰ ؛ آیت (۲/۴۸) صہ ۲۳۰۔

"دین میں جبر" کے موضوع پر اس جلد کے چھٹے باب میں (زیرِ آیت ۲/۱۹۴-۱۹۰) بڑی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ملخص اس تمام بحث کا یہ ہے کہ نہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اس میں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر آنے کے دروازے بھی ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہیں اور باہر نکلنے کے دروازے بھی۔ اس لئے کہ ایمان تو نام ہی ابدی صداقتوں کو دل ودماغ کی پوری رضامندی سے ماننے اور ان پر قائم رہنے کا ہے جہاں یہ رضامندی ختم ہوئی، ایمان بھی ختم ہوگیا۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ دین کے معاملہ میں اکراہ کی اس لئے ضرورت نہیں (یا وہ جائز نہیں) کہ رشد اور غوایت کے (یعنی صحیح اور غلط) راستے واضح طور پر سامنے آچکے ہیں۔ جب قرآنِ کریم نے کہا کہ قَدْ تَّبَيَّنَ

رُشد

الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط اور صحیح میں یہ امتیاز قرآنِ مجید میں کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ غلط اور صحیح کے تعین کے لئے قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

ہر وہ عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک جو قرآن کے مطابق ہے، رُشد ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غوایت ہے۔

رشد کا مفہوم پانچویں باب میں (زیر آیت ۲/۱۸۶) بیان کیا جا چکا ہے۔

غوایت

غَیّ - (مادہ غ - و - ی) کے بنیادی معنی بھٹک جانا، گمراہ ہو جانا، دھوکا کھا جانا ہیں (اس کے مزید معانی متعلقہ مقامات میں سامنے آتے جائیں گے) زیر نظر آیت میں یہ لفظ رشد کے مدمقابل آیا ہے۔ اس لئے جب رشد کے معنی صحیح راستہ ہوں گے تو غوایت کے معنی غلط راستہ ہوں گے۔ اس حقیقت کو یاد رکھیے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ (MEANS ARE JUSTI-FIED BY THE ENDS ACHIEVED) "جس ذریعہ سے بھی مقصد حاصل ہو جائے اسے جائز سمجھا جائے گا"، بڑا گمراہ کن نظریہ ہے۔ جائز نصب العین تک جانے کے ذرائع بھی جائز ہونے چاہئیں۔ ذرائع کو نصب العین سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اس آیت میں اگلی بات یہ کہی گئی ہے کہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ... یعنی ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے جب تک طاغوت سے انکار نہ کیا جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جا سکتا۔

طاغوت

طاغوت کا مادہ (ط - غ - ی) ہے جس کے معنی حدود شکنی یا سرکشی اختیار کرنا ہیں۔ ان معانی میں وسعت کے لحاظ سے ہر اس قوت کو طاغوت کہا جاتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتے۔ (دیکھیے لغات القرآن)۔ زیر نظر آیت میں یہ لفظ (طاغوت) اللہ کے بالمقابل آیا ہے، اس لئے اس کے معنی "خدا کے مدمقابل کھڑا ہو جانے والے" ہوں گے۔ اس کے متعلق جلد اول، آیت (۲/۹) صفحہ ۲۱۵ پر بحث ہو چکی ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ جب تک پہلے ہر غیر قرآنی نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک، مشرب کو ذہن سے نکالا نہ جائے، اللہ پر ایمان لایا نہیں جا سکتا۔ بات بالکل واضح ہے۔ دو متضاد چیزیں یکجا ہو نہیں سکتیں۔ اسے جمع بین النقیضین کہتے ہیں جو ناممکنات میں سے ہے۔ جو کچھ تختی پر پہلے لکھا ہے، جب تک اسے مٹایا نہ جائے، نئے نقوش اس پر ثبت نہیں ہو سکتے۔ خود قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (۵۶/۷۹)۔ تطہیر قلب و دماغ کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ مثبت (POSITIVE) تک آنے کے لئے منفی (NEGATIVE) عمل "لاینفک" ہے۔ یہی وہ ابدی طریق ہے جسے لَآ اِلٰہَ - اِلَّا اللّٰہُ - کے نہایت مختصر جملہ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ لَآ منزلِ اول ہے جس کے بعد اِلَّا کی منزل آتی ہے۔ جب روس میں کمیونزم کے انقلابی نعرہ کا آغاز ہوا تو دنیا

روسی کمیونزم

میں تہلکہ مچ گیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے فلسفہ پر قرآنی روشنی میں نگاہ ڈالی تو انہیں اس میں بڑا بنیادی سقم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندِ بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

لیکن

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا برگ و سازِ امتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

کردۂ کارِ خداونداں تمام — بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
درگذر از لا اگر جوئندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

نظامِ عالم کے لئے اساسِ محکم اِلّا ہے۔ اور یہ اِلّا قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اسی لئے انہوں نے روس سے کہا کہ

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (جاوید نامہ)

یہ تمام تنقید و تلقین درحقیقت تفسیر ہے "کفر بالطاغوت و ایمان باللہ" کی۔ روس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ لا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کرنے کے بعد اِلّا کی طرف نہ بڑھا۔ لیکن ہماری شوریدہ بختی کی وجہ یہ ہے کہ ہم لا کی منزل (کفر بالطاغوت) طے کئے بغیر، اِلّا (ایمان باللہ) کے مدعی بن گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارا مروجہ مذہب ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ:

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود — حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است — حرم چوں دیر بود، او برہمن بود (ارمغانِ حجاز)

جب تک ذہنوں سے "رام" نہ نکلے "رحیم" ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کعبہ کبھی بیت اللہ نہیں بن سکتا جب تک اسے تمام بتوں سے پاک نہ کر دیا جائے۔ ہمارے حقیقی اسلام پر آنے کا طریق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ "مروجہ مذہبِ اسلام" کے ایک ایک عنصر کو قرآنِ کریم کے معیار پر پرکھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر کے اس کی جگہ قرآنی عنصر کو اختیار کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲۵۶)

زندگی کے لئے ایسا محکم سہارا ہاتھ آجائے گا جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں۔ (مادہ کے لحاظ سے) عُروۃ ایسے درختوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں پائیدار ہوں اور ان کے پتے سردی میں بھی نہ جھڑیں۔ چنانچہ جب مویشیوں کے لئے کہیں اور چارہ نہ ملے تو یہ درخت ان کی زندگی کا سہارا بن جاتے ہیں۔ ایسے درختوں پر ہر موسم میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نہج سے ہر وہ شے جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے، عُروۃ کہلاتی ہے۔

اول تو عُروۃ ہی ایسا محکم اور قابلِ اعتماد سہارا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وثقیٰ کہہ کر اس کی محکمیت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ وثاق ایسی مضبوط رسّی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے اور وہ کبھی نہ ٹوٹے۔

اور ان دونوں (عروۃ اور وثقیٰ) کی تفسیر لَا انْفِصَامَ لَهَا سے کر دی۔ اِنْفِصَامٌ کسی چیز کے تڑخ جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی اس کا ٹوٹ جانا تو کجا وہ تڑخ تک بھی نہ سکے۔

اس قسم کا ہے وہ محکم سہارا جو کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ حبل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (۳/۱۰۲) "تم اللہ کی رسی کو اجتماعی طور پر نہایت مضبوطی سے تھامے رکھو" ظاہر ہے کہ حبل اللہ سے مراد کتاب اللہ ہے۔ یہی وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جو کبھی دغا نہیں دیتا۔ لیکن اس حبل اللہ کے محکم سہارا بننے کی شرط کیا ہے؟ وَلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ تم میں اختلاف اور افتراق پیدا نہ ہو جائے۔ جونہی امت فرقوں میں بٹی، نہ عروۃ الوثقیٰ باقی رہا نہ حبل اللہ۔ اس کے بعد خوش فہمی یا خود فریبی باقی رہ گئی کہ ہم نے حبل اللہ کو تھام رکھا ہے۔ اسے تھاما ہوتا تو ذلت اور پستیوں کے گڑھوں میں کیوں گرتے۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے | مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادہ | کہ افتاد است از بامِ بلندے (ارمغانِ حجاز)

(۰)

اس تمسک بالعروۃ الوثقیٰ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اسے اگلی آیت میں بیان کر دیا جہاں کہا:-

۲/۲۵۷ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۲۵۷)

اس نظام کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ اللہ کا قانون اس جماعت کا نگران و محافظ اور یار و مددگار ہوگا۔ جو اس کی صداقت پر یقین رکھ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ انہیں غلط راستوں کی تاریکیوں سے نکال کر صحیح راہ کی روشنی میں لے آئے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس نظام کی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان کے معاملات دنیا کی سرکش (غیر خداوندی) قوتوں کے سپرد ہو جاتے ہیں جو انہیں صحیح راستے کی روشنی سے ہٹا کر غلط راہوں کی تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں ۔ اُن تاریکیوں میں جہاں انسانیت کی کھیتی جھلس کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے اور اس تباہی سے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس آیت کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اللہ مومنین کا ولی بن جاتا ہے۔ چونکہ ولی اللہ، اولیاء اللہ، ولایت وغیرہ تصورات نے ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس لئے یہ نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔

ولی کے معنی

وَلِیٌّ کا مادہ (و۔ل۔ی) متعدد معانی کے لئے آتا ہے۔ ان میں سے ہمارے زیر نظر موضوع سے متعلق حسب ذیل معانی ہیں:۔

(۱) اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قُرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔

(۲) اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے لینا۔ اسی سے اَلْوِلَایَۃُ سلطنت اور حکومت کو کہتے ہیں اور وَالِی نگران اور حاکم کو۔ اَلْوَلِیُّ بھی نگران، ناظم، اور حاکم کو کہتے ہیں۔

(۳) ولی کے معنی کسی کی طرف رجوع کرنا۔ یا کسی کی اطاعت کرنا بھی ہیں۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت گزار۔ یا کسی کی پیروی کرنے والے کو کہیں گے۔

ان تصریحات سے الولی کے دونوں معانی واضح ہو گئے۔ جب اللہ کو ولی کہا جائے گا تو اس کے معنی نگران، حاکم اور مطاع کے ہوں گے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ سورۂ کہف میں اس حقیقت کی ان الفاظ سے وضاحت کر دی۔ فرمایا۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) "خدا کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں۔ اس لئے کہ خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ یہاں ولی کے معنی "حاکم" (مطاع) کے واضح ہیں۔ اسی سے لفظ مولا ہے۔ یعنی جس کی اطاعت کی جائے۔ جسے حاکم تسلیم کیا جائے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِكُمْ

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۹-۱۵۰)

اے جماعتِ مومنین! تم اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ نظام کسی شخص کی موت سے درہم برہم نہیں ہو سکے گا (۳/۱۴۴)۔ اس میں خرابی واقع ہو گی تو اس طرح کہ تم ان لوگوں کی بات نہ ماننے لگ جاؤ (اور ان جیسے کام کرنے لگ جاؤ) جو اس نظام کے مخالف ہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ لوگ تمہیں پھر اسی راستے کی طرف لے جائیں گے جس پر تم اس سے پہلے چلتے تھے۔ اس سے تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

تمہیں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرنی چاہیئے۔ وہی تمہارا مربی اور دمساز ہے' اور وہی حامی و ناصر۔

یہاں دیکھیے۔ پہلی آیت میں غیرِ خدا کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے: **هُوَ مَوْلٰىكُمْ** یعنی اطاعت صرف خدا کی کی جائے گی۔ وہی مطاع اور حاکم ہے۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

جیسا کہ واضح ہے' خدا کی یہ اطاعت اس کی کتاب کی رو سے کی ہوتی ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی اطاعت خود اللہ کی اطاعت ہے۔ فرمایا:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (۷/۳)

اے جماعتِ مومنین! تم اسی ضابطۂ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روشِ زندگی یہی ہے۔ لیکن) بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ (وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)

اولیاء اللہ

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ لہٰذا اولیاء اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا (کی کتاب) کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں ان کی خصوصیات کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا:۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۱۰/۶۲)

یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اولیاء اللہ) بن جاتے ہیں۔ انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے' نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی

یہاں اولیاء اللہ کی خصوصیت یہ بتائی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اور دوسری جگہ کہا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸)

آدم سے کہا گیا کہ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۵/۳۵) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔ (۲۰/۱۲۳-۱۲۴)

یہاں یہ بتادیا کہ "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔" نتیجہ ہوتا ہے ہدایاتِ خداوندی کے اتباع کا۔ لہٰذا آیت (۱۰/۶۲) اور (۲/۳۸) کے ارتباط سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ ہدایاتِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں انہیں اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ آیت (۱۰/۶۲) آپ کے سامنے آ چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو خوف و حزن نہیں ہوتا۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔ (۱۰/۶۳)۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۱۰/۶۴)۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگواریوں کی حامل ہوگی۔ اور آخرت کی زندگی بھی۔ یہی وہ مومن اور متقی ہیں جن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (۴۱/۳۰)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لئے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ (۳/۱۲۴) اور وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (۳/۱۲۴-۱۲۵؛ ۸/۹-۱۲؛ ۴۶/۱۳)

وہ ان سے کہتے ہیں

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (۴۱/۳۱)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ (اس لئے تمہیں یہ جنتی زندگی، اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی) اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ہوگا

جسے تمہارا جی چاہے گا۔ اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ (جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ
تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا)

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ یہ جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے۔ انہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کا عقیدہ دنیا کے ہر مذہب میں چلا آرہا ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں جس جس قسم کے غلط عقائد وضع اور اختیار کر رکھے تھے، قرآن کریم نے ان کی ایک ایک کر کے تردید کر دی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ بزرگ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں اس لئے لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا دوسروں کو نفع پہنچانا تو ایک طرف یہ اپنی ذات کو بھی (قوانینِ خداوندی سے ہٹ کر) کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ (۱۳/۱۶) "ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو اور عقیدہ یہ رکھتے ہو کہ وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانا تو ایک طرف، یہ تو خود اپنی ذات کے لئے بھی اس قسم کا اختیار نہیں رکھتے"۔ مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ نبی اکرم سے بڑھ کر "ولی اللہ" کون ہو سکتا تھا۔ خود حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (۱۰/۴۹) "ان سے کہو کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے"۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے یہ ہمیں بھی خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعت قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس عقیدے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ سورۃ الزمر، آیت ۲-۳ میں ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق خدا کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو۔ اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ پھر سن رکھو کہ اطاعت خالصۃً احکام و قوانینِ خداوندی کی ہوگی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کر لیتے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت

اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ. اللہ ان کی ان باتوں کا ابھی فیصلہ کرتا ہے۔ جن میں یہ (دین کی اصل وحقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ۔ (۳۹/۳) جو جھوٹا اور ناشکر گزار ہے، خدا اسے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔ صحیح راستے پر وہی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (۱۸/۱۷) اور جو کوئی اس کی راہنمائی کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کرلے تو اس کا نہ کوئی ولی ہوسکتا ہے نہ مُرشد۔ مُرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعہ کی جاتی ہے جسے اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے نازل کیا ہے:

یہ وسیلہ ہیں

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اولیاء اللہ" خدا تک پہنچنے (یا اپنی دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں اور ہم اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت پیش کردی جاتی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳۵/۵)۔ اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔ اس لفظ "وسیلہ" سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے اور پھر اس پر اشخاص پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کردی جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جو نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۱۵۷/۷)۔ قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ (۲/۱۹)۔ بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ "وسیلہ" کے معنی ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جد و جہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصدِ زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے، قرآن کے متعدد مقامات سے

واضح ہے۔ مثلاً اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ۔ (۴۹/۱۳)۔ خدا کے ہاں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ اور اگر "وسیلہ" کے معنی "ذریعہ" کئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ۔

خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق

جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میں ہر اس شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ (۲/۱۸۶) انہیں چاہیئے کہ میری فرماں برداری کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ "مرشد" تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا ــــ نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو، نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو، نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو۔ (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ "خدا اور بندے کے تعلق" کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔

"اولیاء اللہ" کے غلط تصور کی رُو سے خدا اور انسانوں کے درمیان اس کے "خاص بندوں" کی کڑی کو کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس حکایت سے لگائیے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ دریا کے اِس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اُس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ۔ پیچھے پیچھے آپ کا ایک مقرب مرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو کسی پُل یا کشتی کے بغیر، پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اُس پار پہنچ جاتے۔ اسی طرح شام کو واپس آ جاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فریدؔ یا فریدؔ پکارتے

یا فرید۔ یا فرید

رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن پانی پر چلتے، مرید نے سنا کہ خود باباؒ صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فرید" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں نہ کہوں۔ اس نے جونہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی میں گر گیا اور لگا غوطے کھانے۔ باباصاحبؒ نے اسے سنبھالا اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا! اس نے ڈرتے کانپتے بات سنائی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہِ راست کوئی راہ ورسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری جان نہ پہچان۔ اُسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فریدؒ کی خدا سے راہ ورسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ ورسم ہے، تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ ورسم خدا سے براہِ راست ہو جائے گی تم بھی اسے پکار لینا!

یہ اور اسی قسم کی دیگر حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے۔ اولیاء اللہ۔ خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لاینفک کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا.... ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں۔ وہ سب کی سنتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔

مُردے ہماری نہیں سُن سکتے

حالانکہ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دینا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بےخبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۔ (۴۶/۵-۶) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ (اپنے ان پکارنے والوں کے) دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے۔

یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں کا یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار، ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ان کا تعلق اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا

دُعَآءَكُمْ ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنتے ہی نہیں: وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۔ اور اگر بفرضِ محال وہ تمہاری پکار کو سن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۔ (۳۵/۱۴-۱۵) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں بھی آمریت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے۔ سوچئے کہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ غیب کی

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

باتیں جانتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ ان سے کہدو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔ اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے[1] کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں سے متعلق ہیں، شہیدوں سے متعلق نہیں، شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ

او کشتۂ دشمن است ، ایں کشتۂ دوست

شہداء یعنی مقتولین فی سبیل اللہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول زیر آیت (۲/۱۵۴) صفحہ ۲۵۵ اور زیر نظر جلد آیت (۲/۱۵۴) صفحہ ۱۱۰ پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

اولیاء اللہ کی طرف منسوب کردہ کرامات کے متعلق (معجزات کے ضمن میں) جلد اول آیت (۲/۲۵) صفحہ ۳۱ دیکھیے۔

---

[1] علم غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ سے ارشاد ہے: قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰) ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں؛ نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں" اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دوسرے رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعے دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۳/۴۴) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔

علاوہ ازیں خود نفسِ تصوف کے متعلق جلد اول اور جلد دوم میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ حوالوں کے لئے دیکھئے انڈکس جسے اسی جلد کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ تصوف کے موضوع پر ... ایک مبسوط کتاب بھی میرے زیرِ ترتیب ہے۔ اس کے شائع ہونے پر اس کی پوری تاریخ اور حقیقت سامنے آجائے گی۔

ظلمات سے نور کی طرف

اولیاء اللہ کے متعلق اس تفصیلی گفتگو کے بعد آئیے آیۂ زیرِ نظر (۲۵۷) کی طرف۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ جماعتِ مومنین کا ولی ہے۔ اس کی اس ولایت کا مقصد کیا ہے۔ وہ کرتا کیا ہے؟ فرمایا۔ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ "وہ انہیں ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے"۔ ظلمت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اول زیرِ آیت (۲/۱۷) صـ۲۶ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا بتایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ظلمات (تاریکیوں) سے نور (روشنی) کی طرف لاتا کیسے ہے۔ اس کے لئے سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے:۔

الٓرٰ۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (۱۴/۱)

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ ضابطۂ قوانین ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تو اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (۵/۱۶؛ ۳۳/۴۳) اور ان کے نشو و نما دینے والے کے قانون کے مطابق، انہیں اس کے تجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ (۱۴/۱)

یعنی خدا کی کتاب نوعِ انسان کو زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کتاب کی صداقت سے انکار کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کو روشنی سے تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں بھی جہنم کی زندگی گزارتے ہیں اور اگلی دنیا میں بھی۔

نور و ظلمات کی اس کشمکش کی وضاحت کے لئے داستانِ حضرت ابراہیمؑ کا ایک نیا گوشہ سامنے لایا گیا ہے اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔

آٹھواں باب

قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آیات ۲/۲۵۸ تا ۲/۲۸۶ ختم سورۂ بقرہ

۱۔ اسوۂ ابراہیمیؑ — ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں۔
۲۔ مُردوں کو زندہ کرنے کا طریق۔
۳۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تفصیلات، تضمنات، مقاصد اور منتہیٰ۔
۴۔ معاشی نظام کی بنیاد — دل کی رضامندی۔
۵۔ ربٰو کی بحث — یہ نظامِ سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔
۶۔ تجارت اور ربٰو میں فرق۔
۷۔ ربٰو کا نظام، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔
۸۔ کاروباری معاملات کے لئے تفصیلی ہدایات
۹۔ ایمان — خود رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا۔
۱۰۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ کا مفہوم
۱۱۔ مومنین کی حسین دعائیں۔

اپنے مولا کے حضور

(ختم سورۂ بقرہ)

آٹھواں باب

قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آیات ۲/۲۵۸ — ۲/۲۸۶

قرآنِ کریم نے دو عظیم الشان ہستیوں کی سیرتِ طیبہ کو جماعتِ مومنین (بلکہ پوری نوعِ انسان) کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔ ایک نبی اکرمؐ (۳۳/۲۱) اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کے ضمن میں صرف انہی کی زندگی کو (اسوہ) قرار نہیں دیا گیا، ان کے ساتھ ان کے متبعین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ جس آیت میں اس اسوہ کا ذکر آیا ہے وہ یوں ہے:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ...... (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے رفقاء کے طرزِ عمل میں نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے سخت بیزار ہیں (۳۷/۸۵-۸۶) ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بناء پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی، تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ (اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔ ۳/۱۱۷؛ ۵۸/۲۲)

اسوۂ حسنہ

آپ دیکھئے۔ اس میں اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کی زندگی کو ہمارے لئے اسوہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت (۶۰/۶) میں اس حقیقت کو یہ کہہ کر دہرایا گیا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ یعنی ان سب (حضرت ابراہیمؑ

مع ان کے رفقاء کی زندگی کو ہمارے لئے اسوہ کہا گیا ہے۔ اسوہ کے معنیٰ ماڈل کے ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس زندگی کو اللہ تعالیٰ دوسروں کے لئے ماڈل قرار دیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس زندگی کے ضروری خط وخال خود ہی بیان کر دے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی دوسروں کے لئے ماڈل نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو اپنی کتاب (قرآنِ مجید) میں واضح طور پر بیان کر دیا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو جو ہمارے لئے ماڈل (اسوۂ حسنہ) قرار دیا گیا ہے تو وہ ماڈل بھی قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے۔ (تشریح اس نکتہ کی اپنے مقام پر کی جائے گی)۔ یہاں صرف حضرت ابراہیمؑ کی انقلاب انگیز زندگی کے نمایاں خطوط سے بحث کی جائے گی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ حیات کے اس مقام پر ان کے طرزِ عمل کو اسوہ کہا گیا ہے: اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ۔ (۶۰/۴) جب انہوں نے اپنی پوری کی پوری قوم کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ

اسوۂ ابراھیمی

ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے، ان سے سخت بیزار ہیں۔ ہم تمہارے غلط مسلک کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ اس بناء پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت رہے گی تاآنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہ اس قوم کے ساتھ تصادم کی آخری منزل تھی۔ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں اس سے پہلے بھی اس انقلاب آفریں زندگی کی دو چار اہم کڑیاں بیان کی ہیں۔ ان میں سے پہلی کڑی وہ ہے جہاں انہوں نے خود اپنے والد سے برملا کہدیا کہ آپ کس باطل مسلک کی پیروی کر رہے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجئے اور حق کے اس مسلک کا اتباع کیجئے جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم، زیرِ آیت (۶/۷۴) صفحہ ۳۴۸-۳۴۷ پر بیان کی جا چکی ہے۔ اس اعلان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ذہن میں رکھیئے کہ یہ کسی عام باپ کو سرزنش کرنے کا واقعہ نہیں تھا۔ آج ہم اس امر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کہ قدیم زمانے میں سلطنتوں میں پروہتوں (PRIESTS) کا مقام کیا ہوتا تھا۔ اس کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مملکت کا عملاً اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور ان کے سامنے خود بادشاہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد مملکت کے اسقفِ اعظم (مہامنتری) تھے اور ان کے بیٹے (حضرت ابراہیمؑ) کو یہ منصب بلند ورثہ میں ملنے والا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر آپ اندازہ لگا لیجئے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنے باپ کو اس تنبیہہ کا نتیجہ کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے اس نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر انتہائی جرأت اور بیباکی سے باپ کو تنبیہہ کر دی اور خندہ پیشانی سے اس کا نتیجہ بھگت لیا — یعنی نہ صرف اس جاہ و منزلت

اورشان وشوکت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، بلکہ گھر بار تک کو چھوڑنا پڑا۔

یہ تو پھر اپنے گھر میں اپنے باپ سے تصادم تھا، اگلا قدم خود بادشاہ کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ اور بادشاہ بھی وہ جسے تاریخ نمرود کہہ کر پکارتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

۲/۲۵۸ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (۲۵۸)

"کیا تم نے اس شخص کی سرگزشت پر بھی غور کیا جس نے ابراہیمؑ سے' اور تو اور خود خدا کے بارے میں بھی حجت بازی شروع کر دی تھی۔ ایسے کرنے کی اُسے جرأت کیسے ہوئی؟ محض اس لئے کہ وہ اس ملک کا بادشاہ تھا۔ اس نے نشۂ حکومت کی بدمستی میں اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھ لیا اور اس زعم باطل میں مبتلا ہو گیا کہ اسے حق حاصل ہے کہ جس کے خلاف جی چاہے زبان درازی کرے۔

بادشاہ سے مناظرہ

حضرت ابراہیمؑ خدا کی طرف سے دعوت دیتے تھے۔ اس نے کہا کہ کون ہے تمہارا رب؟ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (۲/۲۵۸) حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت ہے۔ بات بالکل صاف اور واضح تھی لیکن وہ توکٹ حجتیاں کر رہا تھا۔ کہنے لگا: اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ (۲/۲۵۸)۔ یعنی اگر اس بات سے کوئی خدا بن سکتا ہے تو مجھے خود مقامِ الوہیت حاصل ہے۔ میں خود خدا ہوں کیونکہ میں روز لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہوں۔ جس کی چاہتا ہوں گردن اڑا دیتا ہوں۔ جسے چاہتا ہوں بخش دیتا ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو جواب دیا تھا اس سے مراد یہ ہو کہ میں جس نظامِ خداوندی کے قیام کی دعوت دیتا ہوں، اس کی ایک اہم خصوصیت انسانی جان کا احترام ہو گا۔ اس میں موت اور حیات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے، کسی فرد کی مرضی کے مطابق نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ میں کسی ایسے نظام کو نہیں جانتا۔ میری مملکت میں میرا حکم ہی نظام اور قانون ہے۔ وہ اس زعمِ باطل میں کیوں مبتلا ہو گیا؟ اس لئے کہ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اسے حکمرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ وہ قوت کے نشہ میں مدہوش تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ شخص حقائق کی طرف سے گریز کی راہ اختیار کر کے اپنی سطح بین رعایا کو محسوسات کی نگاہ فریبیوں میں الجھانا چاہتا ہے۔ اگر کوئی عام مناظر ہوتا تو اپنی بات کی پچ میں نظری بحث میں الجھ جاتا اور بادشاہ کے جواب کی تردید میں دلائل پر دلائل دیئے چلا جاتا تاآنکہ مناظرہ جھگڑے کی نذر ہو کر ختم ہو جاتا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں تھا۔ ان کا مقصد احقاقِ حق تھا۔ اس کے لئے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کی طرف

خدا کی وحی یہ کہہ کر راہنمائی کرتی ہے کہ: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔ (۱۶/۱۲۵) "تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بطریقِ حکمت وموعظت دعوت دو، اور ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے گفتگو کرو۔" لہٰذا وہ (بادشاہ) اگر محسوسات کی طرف آگیا تھا تو حکمت کا تقاضا تھا کہ اس کے سامنے محسوس دلیل پیش کی جاتی۔ اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ۔ (۲/۲۵۸) "میرے خدا کے قانون کے مطابق سورج مشرق کی جانب سے طلوع ہوتا ہے۔ اگر تمہاری مملکت میں تمہارا قانون (یا حکم) چلتا ہے تو سورج کو حکم دو کہ وہ مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو۔" بات واضح ہو جائے گی کہ خود تمہاری مملکت میں بھی کس کا قانون کارفرما ہے۔ تمہارا یا میرے خدا کا! فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ۔ (۲/۲۵۸) یہ دلیل ایسی مسکت اور بدیہی تھی کہ وہ لاجواب ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے اعترافِ حقیقت نہ کیا۔ نشۂ حکومت کا پیدا کردہ پندارِ نفس اعترافِ حقیقت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جایا کرتا ہے فرعون اور اس کے مصاحبوں کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (۲۷/۱۴)۔ "وہ دل میں تو دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے لیکن ان کا پندارِ نفس اور نشۂ حکومت کی بدمستی انہیں اعترافِ حقیقت کی اجازت نہیں دیتے تھے اس لئے وہ بلادلیل و برہان اس سے انکار کئے چلے جاتے تھے۔" اسی لئے قرآن حکیم نے مندرجہ بالا واقعہ کے آخر میں کہا: وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (۲/۲۵۸)۔ ظالمین راہِ ہدایت کی طرف نہیں آیا کرتے۔

(۰)

اس کے بعد قرآن کریم سرگزشتِ خلیلی کی اس کڑی کو سامنے لایا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کے استفسار پر سمجھایا گیا ہے کہ اقوام مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے کا طریق کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کو پیش کیا ہے جس میں انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہی اور قریب سو سالہ غلامانہ زندگی کے بعد حیاتِ تازہ عطا ہوئی تھی۔ اسے مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں زیر آیت (۲/۴۰) ص۱۶۲-۱۶۰ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

۲/۲۵۹ چونکہ آیت (۲/۲۵۹) بھی وہاں (مع مفہوم) درج کی جا چکی ہے اسلئے اسے یہاں دوبارہ درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

اس کے بعد وہ آیت سامنے آتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کو بتایا گیا ہے کہ مردہ اقوام کو از سرِ نو زندہ کرنے

کا طریق کیا ہے۔ یہ آیت مع اس کے مفہوم اور تشریح کے جلد دوم زیر آیت (۵۵/۲) صفحہ ۲۷۳ پر درج کی جا چکی ہے۔ لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید تشریح طلب ہیں' اس لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے:۔

۲/۲۶۰ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲/۲۶۰)

ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

اور یاد کر وجب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کہ کیونکر زندہ کرے گا تو مردے۔ فرمایا۔ کیا تو نے یقین نہیں کیا۔ کہا کیوں نہیں۔ لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے۔ پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ۔ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑہ۔ پھر ان کو بلا۔ چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

اس ترجمہ کی رُو سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے پوچھا یہ تھا کہ "تو کیونکر مردے زندہ کرے گا"۔ ظاہر ہے کہ (زندہ کرے گا) سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ تو مردوں کو قیامت کے دن کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس پر خدا نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں "تمہیں اس کا یقین نہیں کہ ہم مردے زندہ کریں گے ؟" انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ایمان تو ہے، لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ دل کی تسکین چاہتا ہوں۔

آپ اس جواب کے ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ "مجھے اس پر ایمان تو ہے لیکن میرا دل اس سے مطمئن نہیں"۔ آپ سوچئے کہ جس بات پر دل مطمئن نہ ہو اسے ایمان کہا جا سکتا ہے؟ ایمان تو کہا ہی اسے جاتا ہے جو دل اور دماغ کے پورے اطمینان اور سکون کے بعد لایا جائے۔ اگر کسی شخص (اور شخص بھی عام نہیں۔ خدا کے ایک جلیل القدر نبی) کی یہ کیفیت ہو کہ وہ خدا سے کہے کہ میرا ایمان تو ہے لیکن مجھے یقین یا اطمینان اسی صورت میں میسر آسکے گا جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ تو واقعی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، تو کیا اس کے ایمان کو (معاذ اللہ) ایمان کہا جائے گا؟ اور اگر ایمان حاصل ہونے کی شرط یہ ہے کہ خدا سچ مچ مردوں کو زندہ کر کے دکھا دے تو پھر اس قسم کا ایمان تو صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے حصہ میں آیا۔ باقی دنیا کا ایمان بغیر اطمینان اور تسکین قلب کے رہ گیا۔

ہمارے مفسرین اور ان کے تتبع میں مترجمین کی دشواری یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کریم کو روایات کے تابع رکھتے

ہیں۔ انہی کی رُو سے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے اور اسی تفسیر پر مبنی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ آیہ زیر نظر کی تفسیر میں، بخاری میں حسب ذیل روایت درج ہے:۔

حضرت ابراہیم کو شک

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ہم شک کرنے میں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ (بخاری۔ کتاب التفسیر۔ اردو ترجمہ جلد سوم ص ۶۸)

بخاری کی شرح فتح الباری میں اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) وسوسۂ شیطانی سے ایسا کہا تھا!

آپ سوچئے کہ ان روایات کی رُو سے بات کہاں تک پہنچتی ہے؟ ان کی رُو سے خدا کے ایک جلیل القدر نبی کو اس باب میں شک گزرتا ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور اس کا ایک اور عظیم المرتبت نبی یہ کہتا ہے کہ نحن احق بالشک من ابراھیم۔ "ہم (حضرت) ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کے حقدار ہیں"۔ آپ غور کیجئے کہ جس ایمان کے بارے میں ایسے ایسے جلیل القدر انبیاء کے ریب و تشکیک کا یہ عالم ہو، تو دوسروں کے ایمان کی کیا کیفیت ہو گی! اور انبیاء بھی وہ جن کی زندگی کو خود خدا نے دنیا بھر کے لئے ماڈل قرار دیا ہے! حضرات انبیاء کرام کا ایمان تو شک و ارتیاب کی طوفانی دنیا میں روشنی کے بلند مینار کی طرح روشن اور مستحکم ہوتا ہے جو ہر ڈگمگانے والی کشتی کے مسافروں کے لئے دلیل راہ اور وجۂ استقامت بنتا ہے۔ اگر ان کے ایمان کی بھی (معاذ اللہ) یہ کیفیت ہو تو پھر دنیا میں ایمان کہاں تلاش کیا جائے گا؟ اور پھر یہ کچھ اس حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس نے ابھی ابھی بادشاہِ وقت کے سامنے کہا تھا کہ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۔ (۲/۲۵۸)۔ "میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے"۔ اگر انہیں خدا کے زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان نہ ہوتا تو وہ فریقِ مقابل کے سامنے یہ دلیل کس طرح پیش کر سکتے تھے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اطمینان کی خاطر جس طرح مردوں کو زندہ کر کے دکھایا، اس کی تفصیل بھی روایات کی زبانی سُن لیجئے۔ مولانا محمود الحسن (مرحوم) کے (مذکورہ صدر) ترجمہ کی تشریح میں حاشیہ پر لکھا ہے:۔

حضرت ابراہیمؑ حسب ارشاد الٰہی چار جانور لائے۔ ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، ایک کبوتر۔ اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تاکہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں۔ پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے۔ پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا۔ اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا۔ پھر دھڑ ملا۔ پھر پر لگے۔ پھر پاؤں اور دوڑتا چلا آیا۔ پھر اسی طرح چاروں آ گئے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، چونکہ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن نے جو کچھ سمجھانا تھا سمجھا جا چکا ہے اور وہ ہماری کتب روایات اور تفاسیر میں درج ہو چکا ہے، اس لئے ہمارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ ہم از خود اس پر غور و فکر کریں۔ ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ فلاں روایت میں یہ آیا ہے اور فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے۔ اگر یہ حضرات خود قرآن مجید پر غور کرتے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ قرآن کریم میں حیات اور ممات کے الفاظ، افراد کی طبعی موت اور زندگی کے لئے ہی نہیں آئے، یہ الفاظ قوموں کی موت اور زندگی کے لئے بھی آئے ہیں۔ (مثلاً سورۂ انفال میں ہے: يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴) "اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جس سے تمہیں زندگی حاصل ہو"۔ غور کیجئے یہاں خطاب يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے ہے۔ یعنی ان لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے جو طبعی طور پر زندہ ہیں اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلاتی ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں زندگی سے مراد طبعی زندگی نہیں بلکہ عزّ و شرف کی حیاتِ ملّی ہے۔ دوسرے مقام پر... رسول اللہؐ سے کہا گیا: إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ...... إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا ...... (۲۷/۸۰-۸۱)۔ "تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ نہ ہی ان بہروں کو سنا سکتا ہے کہ جب تو ان سے بات کرے تو وہ منہ موڑ کر چل دیں۔ تُو تو انہیں ہی سنا سکتا ہے جو (حق و صداقت پر مبنی بات) ماننے پر آمادہ ہوں"۔

اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ "تو قرآن کے ذریعے انہی لوگوں کو آگاہ کر سکتا ہے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں"۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے قوموں کی "زندگی" اور "موت" سے کیا مراد ہے! یہی مفہوم زیرِ نظر آیت میں "مردوں" سے ہے۔ یعنی "مردہ قوم"۔ اس قسم کے الفاظ ہم ہر روز اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں۔ "عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا" وغیرہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی مرحلہ تھا کہ جس مردہ قوم کی طرف وہ مبعوث ہوتے تھے اُسے کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے؟ انہیں اس کا تو یقین تھا کہ مردہ قومیں دوبارہ زندہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس طریق سے وہ زندہ ہوتی ہیں وہ اس کے متعلق اپنا اطمینان چاہتے تھے۔ انہوں نے خدا سے کہا تھا کہ مجھے بتا کہ اس قسم کی مردہ قوم کو میں کس طریق سے (كَيْفَ) زندہ کروں! اور خدا نے ایک مثال کے ذریعے وہ طریق بتا دیا تھا یعنی عملِ "تزمیل"۔ ان سے کہا گیا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کرو کہ یہ وحشی انسان جماعتی زندگی کے خوگر ہو جائیں جو مرکز کی

آواز پر لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے اُڑ کر آ جاتے ہیں۔ ان کی وحشت کا تو یہ عالم تھا کہ خود حضورؐ نبی اکرم کے زمانے میں جب اعراب نئے نئے زیر تربیت آتے تھے تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ جمعہ کے اجتماع میں بیٹھے ہیں حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ یعنی انہیں مخاطب کر کے کچھ حقائق سمجھا رہے ہیں۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ا نْفَضُّوْآ اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا ۔ (۶۲/۱۱) "ادھر سے مالِ تجارت لئے کوئی قافلہ آ نکلتا ہے، یا کسی تماشا گر کی ڈگڈگی کی آواز کان میں پڑتی ہے تو یہ حضورؐ کو وہیں برسرِ منبر چھوڑ کر بھاگ اٹھتے تھے۔ لیکن جب ان نامانوس وحشی پرندوں کی تربیت ہو گئی تو ان میں ایسی قلب ماہیت ہو گئی کہ لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (۲۴/۳۷) "بیع وتجارت کی کوئی کشش انہیں ذکر اللہ سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تھا وہ طریق تربیت جو حضرت ابراہیمؑ کی درخواست پر انہیں بتایا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ وحشی پرندوں کو سدھانے والے کیا کرتے ہیں؟ جب ان پرندوں کو پکڑا جاتا ہے تو وہ اڑ جانے کے لئے بے حد مضطرب و بیتاب ہوتے ہیں۔ وہ پھڑپھڑاتے ہیں۔ قفس کی تیلیاں توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سدھانے والا انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کرتا ہے کہ وہ انہیں جنگل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کی آواز پر پھڑپھڑاتے ہوئے اس کے پاس آ جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ حق وصداقت سے دور بھاگنے والی (مردہ) قوموں کو اس طرح اپنے ساتھ مانوس کیا جاتا ہے، تب جا کر انہیں حیاتِ تازہ عطا ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ طلب ہوتا ہے۔

اس قسم کا منصب ہوتا ہے ایک رسول، اور اس کے اتباع میں ایک مصلح کا۔ وحشی جانوروں کو سدھانا آسان کام نہیں ہوتا۔

یہ تھا كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کا جواب۔

———(۰)———

اس آیۂ جلیلہ میں دو نکات اور بھی غور طلب ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ مجھے ایمان تو ہے لیکن میں اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ان کا ایمان کس بات پر تھا اور وہ اطمینان کس بات کا چاہتے تھے؟ انہیں ایمان خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا تھا۔ یعنی انہیں اس پر یقین کامل تھا کہ جب خدا نے کہا ہے کہ یہ مردہ قوم زندہ ہو سکتی ہے تو یہ یقینی بات ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ جب مجھ سے کہا گیا ہے کہ ان میں زندگی پیدا کروں تو مجھے یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ میں کون سا طریقہ اختیار کروں جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غلط طریق اختیار کر لوں جس کی وجہ سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے اور اس طرح (میں نہیں لیکن)

دنیا اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ خدا کا وعدہ ہی غلط تھا۔ وہ اس لئے اپنا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا جائے وہ بالکل صحیح ہونا چاہیئے۔

اس سے یہ اہم نکتہ سامنے آجاتا ہے کہ خدا کے قوانین (مواعید) تو سب برحق ہیں لیکن ان کا صحیح نتیجہ اسی صورت میں سامنے آسکتا ہے جب اس منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو پہلی دعا سکھائی ہے ـــ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (۱/۵)۔ تو اس سے مراد صحیح طریقِ عمل کا اختیار کرنا ہے۔ اس کے متعلق اطمینان ہونا ایسا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے نبی نے خدا کے وعدہ (قانون) پر یقینِ کامل کے ساتھ صحیح طریق کی طرف راہنمائی کے لئے خدا سے درخواست کی۔ قرآنِ کریم کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے جہاں زندگی کے بلند مقاصد کا تعین کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے ان مقاصد کے حصول کے طریق بھی خود ہی واضح کر دیئے ہیں۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کو ضابطۂ حیات تسلیم کرنے والوں کے لئے، نہ مقاصدِ حیات کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش ہوسکتی ہے، نہ ان مقاصد کے حصول کے طریقوں کے متعلق ریب وتشکیک کا امکان۔ اس کتاب عظیم کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ (۲/۲)

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے اپنا اطمینان چاہا تو خدا نے ایک آمرِ مطلق کی طرح یہ کہہ نہیں ڈانٹ دیا کہ "جو کچھ ہم نے کہا ہے کیا اس میں تمہیں کوئی شک ہے جو اپنا اطمینان چاہتے ہو؟ ہم نے جو کچھ کہہ دیا ہے تمہیں اسے آنکھیں بند کر کے مان لینا چاہیئے"۔ خدا نے ایسا نہیں کہا بلکہ ان کا اطمینان کرا دیا۔ قرآنِ کریم میں جو ہے کہ خدا نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے جو احکام اور قوانین دیئے ہیں، ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کرانے کے لئے دلائل وبراہین کی رُو سے ان کی غرض وغایت بھی واضح کر دی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ زیرِ نظر آیت (۲/۲۶۰) کے آخر میں کہا گیا ہے: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ عزیز کے معنی غلبہ اور اقتدار کے مالک کے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ "حکیم" کے اضافے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ خدا کا غلبہ واقتدار دھاندلی پر مبنی نہیں حکمت (REASON) پر مبنی ہے۔ اس لئے اسے دلائل وبراہین کی رُو سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے انسان کو خدا کے "عزیز" ہونے پر اطمینان ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اس کے اقتدار کو ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں تسلیم کرتا بلکہ قلب ودماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کرتا ہے

اور اسوۂ ابراہیمیؑ یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان کے متعلق دلائل وشواہد کی بنا پر اطمینان حاصل کرتا چلا جائے۔

(۰)

ان تاریخی شواہد کو پیش کرنے کے بعد جماعت مومنین کے سامنے وہ پروگرام لایا گیا جس کی رُو سے خود انہیں زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہونی تھیں۔ اس پروگرام کی آخری کڑی تو وہ ہے جب اس جماعت کو نظامِ خداوندی کی مدافعت کے لئے سربکف میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ لیکن اس منزل سے پہلے یا اس تک پہنچنے کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت بتائی گئی اور انہیں سمجھایا گیا کہ اس نظام کے قیام کے لئے جو کچھ وہ آج دیں گے، وہ ان کے ہاتھ سے جاتا نہیں رہے گا۔ نظام قائم ہو جانے کے بعد وہ سو سو گنا زیادہ ہو کر واپس مل جائے گا۔ اسی حقیقت کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا گیا کہ یہ مثال نہایت برجستہ اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۶۱ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲/۲۶۱)

انفاق فی سبیل اللہ

ان تاریخی شہادات کے بعد پھر اُسی مقام کی طرف لوٹ آؤ جہاں سے نظامِ خداوندی کی تشکیل کی بات شروع ہوئی تھی (یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی طرف ۲/۲۵۴)۔ اس نظام کے قیام کے لئے اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھنا درحقیقت بیج ڈال کر کھیتی اگانا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں دیکھتی ہیں کہ بیج کا دانہ مٹی میں مل کر ضائع ہو گیا لیکن کسان کی دُور رس نگاہوں کو نظر آتا ہے کہ اس ایک دانہ سے کس قدر بالیں پیدا ہوں گی اور ہر بال میں کس طرح سینکڑوں دانے ہوں گے۔ اس طرح اللہ کا قانونِ مشیت، ہر اس قوم کو جو اس پر عمل پیرا ہو ایک ایک کے سو سو کر کے دیتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانون بڑی فراخیاں اپنے اندر رکھتا ہے اور یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی طرف اجمالی اشارہ آیت (۲/۲۵۴) میں کیا گیا تھا۔ اب اس اجمال کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ انفاق کے متعلق تفصیلی بحث جلد اول زیر آیت (۲/۳)۔ صفحہ ۱۰۵ پر آچکی ہے۔ اس میں انفاق ہی نہیں بلکہ ..... قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا بھی ذکر آگیا ہے۔ نیز (جلد اول) زیر آیت (۲/۴۳)۔ صفحہ ۲۹۴ اور اسی جلد سوم میں زیر آیت (۲/۲۱۹) بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں انفاق سے متعلق آیات جو اب زیر نظر آ رہی ہیں، محتاجِ وضاحت نہیں۔ ان میں البتہ اگر کوئی نیا نکتہ سامنے آئے گا تو اس کی تشریح کر دی جائے گی۔

سَبْعَ کا مفہوم

اس آیت میں لفظ سَبْعَ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے سات (۷) ہیں لیکن اس کا عام طور پر استعمال "متعدد" یا "اکثر" کے مفہوم کے لئے ہوتا ہے۔ (مثلاً) جس طرح ہم اپنے

ہاں کہتے ہیں کہ "تمہیں سوبار منع کیا ہے" "تمہیں ہزار بار سمجھایا گیا ہے" "وہاں لاکھوں آدمی تھے" تو ایسے مقامات پر سو یا ہزار یا لاکھ کی متعینہ تعداد مقصود نہیں ہوتی۔ مفہوم ان سے متعدد بار یا بکثرت ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں جب سَبْعَ (سات) یا سَبْعُوْنَ (ستر) یا سَبْعُمِائَۃٍ (سات سو) بولا جائے گا تو اس سے بھی مراد متعدد یا بکثرت ہوگی۔ ان کی گنتی مقصود نہیں ہوگی۔ ان الفاظ کے سلسلہ میں اس مفہوم کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ قرآن کریم میں سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، کے الفاظ متعدد بار آئے ہیں اور ہمارے ہاں ان کا ترجمہ "سات آسمان" کیا جاتا ہے۔ جس سے کئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے مراد "متعدد فضائی کرے" ہے۔ (یہ بحث جلد اول۔ زیر آیت (۲/۲۹) صـ۳۵۲ میں بھی آچکی ہے)۔

جب اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت افرادِ معاشرہ نہ کسی کو انفرادی طور پر کچھ دیتے ہیں نہ کسی سے انفرادی طور پر کچھ لیتے۔ اُس وقت سارا معاملہ نظامِ مملکت سے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں محتاج افراد کی امداد ذی استطاعت لوگوں کی طرف سے انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ اس میں "خیرات" کا شائبہ پایا جاتا ہے جس کا اثر دینے اور لینے والے ہر دو افراد پر پڑ سکتا ہے۔ دینے والے میں احسان کرنے کا جذبہ جس کا نفسیاتی نتیجہ تکبر یا احساسِ برتری ہوتا ہے اور لینے والے میں ممنونِ احسان ہونے کا جذبہ جس سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم اِس دور کے لئے بھی ایسی ہدایات دیتا ہے جن سے اس قسم کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

(۲/۲۶۲) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۲۶۲)

جو لوگ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے — جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے — اپنی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا کہ اس سے انہوں نے کسی پر احسان کیا ہے۔ اور نہ ہی وہ اس سے دوسروں کے لئے خواہ مخواہ کی مصیبت بن جاتے ہیں (وہ شکریہ تک کے متمنی نہیں ہوتے (۹/۷۶)) تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنتوں کا معاوضہ اور قربانیوں کا صلہ اس نظام کے قیام کی شکل میں بایں نمط ملتا ہے کہ انہیں نہ کسی خارجی خطرہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ داخلی کشمکش یا احتیاج کے خیال سے غمگینی اور افسردگی۔ نہ خوف، نہ حزن۔

کہا یہ گیا ہے کہ اس وقت داد وستد کا یہ معاملہ انفرادی ہے لیکن اس سے صحیح قرآنی معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس سے تم سب ہر قسم کے خطرات وخدشات سے محفوظ و مامون ہو جاؤ گے اور یہ تمہارے موجودہ ایثار کا بہت بڑا صلہ ہوگا۔ اس ضمن میں کہا۔

۲/۲۶۳ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۶۳)

جس مالی امداد کے بعد انسان، احسان جتا جتا کر، دوسروں کے لئے مصیبت بن جائے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ صاحبِ احتیاج کو عمدہ طریق سے جواب دے دیا جائے اور اس طرح اسے اذیت رسی سے محفوظ رکھا جائے۔ یاد رکھو! خدا کا نظام نہ تمہارا محتاج ہے اور نہ ہی ایسا کمزور کہ ذرا ذرا سے دھچکوں سے اس کی بنیادوں میں تزلزل آجائے۔ تم اس کے لئے خوش دلی سے دینا نہیں چاہتے تو نہ دو۔ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن کچھ دے کر احترامِ انسانیت کو تو فراموش نہ کر دو۔

انفاق کا ایک نتیجہ تو تمدنی ہوتا ہے۔ یعنی اس سے ذی احتیاج افراد کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں اور اس لئے معاشرہ کا توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا (اور نہایت اہم) نتیجہ دینے والے کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یعنی اس سے اس کی ذات (نفس) کی نشوونما ہوتی ہے۔ (دیکھئے آیت ۲/۲۶۵)۔ لیکن اگر اس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش (تو ایک طرف ذراسی آلائش بھی) ہو جائے تو پھر یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ اس سے انفاق کا عمل رائیگاں چلا جاتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۶۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۲/۲۶۴)

اے جماعتِ مومنین! اگر تم نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے کچھ دے کر احسان جتاتے پھرو اور دوسروں کے لئے مصیبت بن جاؤ تو اس سے تمہارا انفاق تعمیری نتائج کے بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ دیکھنا! تم ایسا نہ کرنا۔ یہ کچھ تو وہی کر سکتا ہے جسے قوانینِ خداوندی کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر تو یقین نہ ہو لیکن اس خیال سے کہ میں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے اس لئے ان سے بنا کر رکھنا ضروری ہے، اس مد

میں کچھ دیدے۔ اس انفاق کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی چٹان پر ذرا سی مٹی جم جائے (اور یوں دکھائی دے کہ وہ بڑی عمدہ زمین ہے جس میں اچھی کھیتی اُگے گی۔ لیکن) جب اس پر بارش کا ایک تیز چھینٹا پڑے تو سب مٹی بہہ جائے اور نیچے چٹان کی چٹان رہ جائے۔ اس طرح (ایک ایک دانہ کا سینکڑوں دانے بننا تو ایک طرف) فصل کاشت کرنے میں جس قدر محنت صرف ہوتی تھی وہ بھی اکارت چلی جاتی ہے۔

یاد رکھو جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہ رکھیں اور (محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے "نیک کام" کریں تو) ان پر فلاح وسعادت کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ (اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ایمان — صحیح مقصد — کا ہونا اشد ضروری ہے)۔

ان کے برعکس۔

۲/۲۶۵ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲/۲۶۵)

ان کے برعکس جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اُسے قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے اور اس سے (نوعِ انسانی کی پرورش اور) ان کی اپنی ذات کا استحکام وثبات ہو جائے، ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی اونچی زمین پر (جس تک سیلاب نہ پہنچ سکے) ایک باغ اُگایا جائے۔ اس پر اگر زور کی بارش ہو تو دُگنا پھل دے اور اگر یوں ہی ہلکی سی پھوار بھی پڑ جائے تو وہ بھی اس کی شادابی کے لئے کافی ہو۔

خدا کا قانونِ مکافات جو علم وبصیرت پر مبنی ہے، ایسے لوگوں کے اعمال کے خوشگوار نتائج مرتب کرتا ہے۔

"مَرْضَاتِ اللّٰهِ" کا مفہوم (اسی جلد میں) زیرِ آیت (۲/۲۰۷) تفصیل سے بتایا جاچکا ہے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ انفاق سے "تثبیتِ نفس" ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی مقصد یا نتیجہ جس کی طرف آیت (۲/۲۶۳) میں ضمناً ارشاد کیا گیا ہے۔ نفس کی بحث جلد دوم۔ زیرِ آیت (۲/۲۳) صفحہ ۲۳ پر بڑی شرح وبسط سے آچکی ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی

تثبیتِ نفس

پرورش ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان "لیتا" (یعنی اپنے استعمال میں لاتا) ہے۔ اسی طرح اس کی ذات (نفس) کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔ (۹۲/۱۸) اسی کو یہاں تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انفاق سے انسانی ذات میں ثبات واستحکام پیدا ہو جاتا ہے

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس سے مومن، جان مار کر محنت کرتا اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جو مارکس کو نہیں مل رہی تھی۔ (دیکھئے جلد اول صفحہ ۱۱۶) وہ انسانی نفس ہی کا قائل نہیں تھا تو اسے یہ بنیاد کہاں سے مل سکتی تھی؟ اسی لئے اقبالؔ نے روس کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ:-

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستہ اورا اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم صرف قرآنِ کریم سے مل سکتی تھی جو اشتراکی نظام کے مدعیوں کے سامنے نہیں۔ اس لئے وہ نظام ناکام رہ گیا۔ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا۔ (۲/۲۶۴)

جس نظام کی بنیاد مستحکم نہ ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس سے اگلی آیت میں بیان کر دیا۔ فرمایا:-

۲/۲۶۶ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ (۲/۲۶۶)

ذرا سوچو کہ تم میں سے کوئی شخص بھی اسے پسند کریگا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں پانی کی ندیاں رواں ہوں (تاکہ وہ سرسبز و شاداب رہے)۔ اس میں کثرت سے پھل آئے (اور یوں اس شخص کی اپنی اور اس کی اولاد کی زندگی خوشحالی میں گزرے) لیکن اس کے بعد جب وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے چھوٹے چھوٹے ہوں عین اس وقت جھلسا دینے والی آندھی کا بگولا اُٹھے اور سارے باغ کو تباہ کرکے رکھ دے۔ سوچو کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا کیا حشر ہوگا؟

(بعینہٖ یہی حالت ہے ان لوگوں کی جو صرف انفرادی مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہیں اور مستقبل کے متعلق کچھ نہیں سوچتے۔ خدا کا نظامِ ربوبیت قائم ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں ایسی حالت کبھی نہ پیدا ہونے پائے اور کوئی خاندان کسی وقت بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے)۔

یوں اللہ تعالیٰ مختلف مثالوں سے اپنے قوانین کو وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو اور سوچو کہ کیا نوعِ انسان کو محتاجی اور مفلسی اور تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی اور نظام بھی ہو سکتا ہے؟

(ضمناً) اس آیت پر غور و فکر سے ایک اور نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے۔ آج جبکہ قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں، اس قسم کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کے ذرائع آمدنی (جائیداد، مکان، کارخانہ وغیرہ) کسی حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور اس طرح یہ مرفہ الحال خاندان نانِ شبینہ تک کا محتاج ہو گیا۔ یا خاندان کا فردِ کاسب وفات پا گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے دربدر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس قسم کی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے، انشورنس کی اسکیمیں رائج کی گئی ہیں۔ یہ اسکیمیں قرآن کے معاشی نظام کا بدل تو نہیں ہو سکتیں لیکن موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں یہ بہرحال غنیمت ہیں اور ان سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ـــــ شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی! اسے کون بتائے کہ جن اصولوں کی رو سے آپ اسے حرام قرار دے رہے ہیں وہ قرآن کے معاشی نظام کے اصول ہیں اور جب اور جہاں وہ معاشی نظام ہی قائم نہ ہو وہاں اس کے اصول کس طرح کارفرما ہو سکیں گے! یہ وہ بنیادی غلط نگہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بے شمار الجھنیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ باطل کے نظام میں حق کی پیوندکاری ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں جلد دوم میں زیر آیت (۲/۵) ص۳۵۳ کی بحث پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔

انشورنس

ـــــ (۰) ـــــ

اس کے بعد پھر انفاق فی سبیل اللہ کے موضوع کی طرف آجاتے ہیں، فرمایا۔

۲/۲۶۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۔ (۲/۲۶۷)

لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم زمین کی پیداوار میں سے بھی، اور اپنی صنعت و حرفت سے بھی جو کچھ کماؤ اس میں سے بھی بہترین حصہ کو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کھلا رکھو۔ اس قسم کا بھولے سے بھی ارادہ نہ کرو کہ اس میں ایسی نکمی چیزیں دے دی جائیں جنہیں تم ان کی اصلی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ان میں نقص کی وجہ سے ان کی قیمت کم کراؤ۔ یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے اور تم اس کی جھولی میں بچے کھچے ٹکڑے ڈال دو۔ وہ اس قسم کی خیرات سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کا سزاوار ہے۔

(وہ تم سے جو کچھ مانگتا ہے تمہارے فائدے کے لئے مانگتا ہے۔ اپنے لئے نہیں مانگتا۔)

اس آیت میں دو مقامات غور طلب ہیں۔ جیسا کہ آیت (۲/۲۶۱) کے تحت بتایا گیا ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کی بحث

اس سے پہلے نہایت تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس نظام کی رُو سے (۱) زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور خلافِ قرآن ہے۔ اور (۲) انسان جو کچھ اپنی محنت سے کماتے، اس میں سے وہ بقدرِ اپنی ضروریات کے رکھ کر، باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے۔ یہاں ان ہر دو ذرائع کی وضاحت مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ سے کر دی۔ یعنی جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اور جو کچھ زمین سے برآمد ہو۔ زمین سے برآمد ہونے والی اشیار میں زراعت بھی شامل ہے اور معدنیات وغیرہ (ذخائرِ ارضی) بھی۔

پھر، طَيِّبٰتِ اور لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ کہہ کر اس کی بھی تاکید کر دی کہ یہ نہ ہو کہ تم اچھی اچھی چیزیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے ضمن میں خود رکھ لو اور ناکارہ اور ناقص چیزیں "فی سبیل اللہ" دیدو۔ جیسا خیرات کے ٹکڑے گداگروں کی جھولی میں ڈالنے سے کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۱) "تم کبھی کشاد کی راہ نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین متاع دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلی نہ رکھو" ـــ جان مار کر محنت کرنا اور اس کے ماحصل میں سے بہترین چیزیں بطیبِ خاطر دوسروں کے لئے دے دینا، یہ ہے کشاد (عرفِ عام میں، نیکی) کی راہ!

اس کے بعد قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اس راستے میں کون سی چیز روک بن کر کھڑی ہوگی۔ اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ فرمایا۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲/۲۶۸)

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارے انفرادی مفاد کے خیالات تمہیں یہ کہہ کر ڈرائیں گے کہ اگر تم نے سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا تو تم مفلس اور نادار ہو جاؤ گے۔ کل کو تم پہ بُرا وقت آگیا تو کیا کرو گے؟ اس لئے تم اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔

"شیطان" کے متعلق جلد دوم باب اول میں بحث ہو چکی ہے۔ ملخصاً اس سے مراد ہر وہ جذبہ ہے جو انسان کو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے روکے۔ "انفاق فی سبیل اللہ" (قرآن کے معاشی نظام کی تشکیل و قیام کی راہ) میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کے ذاتی مفاد پرستی کے جذبات ہوتے ہیں۔ یہاں ان سے محتاط رہنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن خالی تاکید ہی نہیں۔ ان سے بچنے کا طریق بھی بتایا گیا ہے۔ اور طریق وہ بتایا گیا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ علم النفس (سائیکالوجی) کی رُو سے، ایک قسم کے جذبات کی روک تھام ان سے متضاد جذبات کی رُو

سے کی جاتی ہے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ جذباتی روک مستحکم اور پائیدار نہیں ہوسکتی۔ محکم اور پائیدار روک وہی ہوسکتی ہے جسے انسان عقل و فکر (REASONS) کی رو سے سمجھے اور دلائل و براہین کی رو سے اختیار کرے۔

لیکن خود عقل کی بھی تو دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسانی جذبات کے مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے (خواہ وہ مقاصد کیسے بھی کیوں نہ ہوں) اور دوسری عقل وہ ہے جو قرآنی روشنی میں منزلِ مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اول الذکر کو اقبالؒ "دانشِ برہانی یا عقلِ خود بیں" اور ثانی الذکر کو "دانشِ نورانی یا عقلِ جہاں بیں" سے تعبیر کرتا ہے۔ (تفصیل اس کی جلد اول۔ آیت (۲/۲) صفحہ ۲۵۷ پر گزر چکی ہے)۔ اسی عقل کو قرآن "خیرِ کثیر" عطا کرنے والی حکمت کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ وہ عقل ہے جو انسان کے انفرادی مفاد پرستی کے جذبات کا رُخ کلی مفادِ انسانیت کی طرف موڑ دیتی ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۷۰ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔ (۲/۲۷۰)

جو کچھ تم خرچ کرنے کی چیزوں سے خرچ کرتے ہو۔ یا جو کچھ تم (مالی امداد کے علاوہ دیگر امور میں) اپنے اوپر واجب قرار دے لیتے ہو، تو ان میں سے ہر بات خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہوتی ہے اور وہی تمہارا مؤید و مددگار ہوتا ہے۔ وہ ان کا حامی و ناصر نہیں ہوتا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں۔

ہمارے ہاں نذر کا لفظ منت ماننے کے معنوں میں آتا ہے (نذر نیاز)۔ اور منت بھی وہ جو اولیاء اللہ کے مزاروں یا بزرگوں کے آستانوں پر مانی جاتے۔ لیکن قرآن کریم نے مؤمنین کی نذر کا مفہوم کچھ اور بتایا ہے۔ نذر کے لُغوی معنی ہیں ہر وہ بات جسے انسان اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔ اس آیت میں نذر کا لفظ انفاق کے مقابل آیا ہے۔ انفاق، مال و دولت کے کھلا رکھنے کا نام ہے۔ لیکن معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جن کے پاس مال و دولت نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بجائے دیگر خدمات اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ انہیں ان کی نذر کہا جائے گا۔ مثلاً سورۃ توبہ میں منافقین کے متعلق کہا۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (۹/۷۹)۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جماعتِ مؤمنین میں سے جو صاحبِ استطاعت، اپنے دل کی رضامندی سے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مال و دولت صرف کرتے ہیں یہ انہیں ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور جو ان (مؤمنین) میں ایسے ہیں جن کے پاس دینے کے لئے روپیہ پیسہ نہیں ہوتا لیکن وہ اس مقصد کے لئے اپنی محنت پیش کر دیتے ہیں، یعنی مختلف خدمات

سرانجام دیتے ہیں، تو یہ منافقین ان کی مفلسی پر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں"۔

یہ خدمات ان کی نذریں ہوتی ہیں۔ قبروں اور آستانوں پر نذریں پیش کرنا قرآن کی رُو سے حرام ہے کیونکہ یہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (۵/۳) کے تحت آجاتا ہے۔ (تفصیل اس کی آیت (۲/۱۷۳) کے تحت گزر چکی ہے)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآنی نظام کی تشکیل تک کے عبوری زمانے میں انفاق کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو اس نظام کی اجتماعی ضروریات کے لئے دینا اور دوسرے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انفرادی طور پر دینا۔ اجتماعی ضروریات کے لئے انفاق اگر کھلے بندوں بھی ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ اس سے کسی فرد کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کسی محتاج کو کھلے بندوں کچھ دیا جائے تو اس سے اس کے پندار کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس لئے اُسے ایسے انداز سے دینا چاہیئے کہ "دایاں ہاتھ دے تو بائیں ... کو خبر نہ ہو" اس کے لئے فرمایا:۔

۲/۲۷۱ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲/۲۷۱)

جو کچھ تم اجتماعی ضروریات کے لئے دیتے ہو اُسے کھلے بندوں دو تو بھی اچھا ہے۔ اور (اگر نظام کے ابتدائی مراحل میں اُسے) اہلِ حاجت تک چپکے سے پہنچا دو تو بھی ٹھیک ہے۔ یہ چیزیں ہر صورت میں تمہاری ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کر دیں گی ـــ اور ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ کیونکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

(ضمناً) مندرجہ بالا آیات میں صدقات کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اس کی تشریح ہم آیت (۹/۶۰) کے ضمن میں کرینگے جس میں صدقات صرف کرنے کی مدات کی تفصیل دی گئی ہے اور جنہیں ہمارے ہاں غلطی سے مصارفِ زکوٰۃ کی مدات سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ صدقات ان عطیات کو کہا جائے گا جو ہنگامی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیش کئے جائیں۔ عطیہ کے لفظ سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں احسان مندی کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اگلی آیت میں اس نکتہ کی وضاحت ایک اور انداز میں کر دی گئی ہے۔

صدقات

آپ نے دیکھا کہ انفاق (یا قرآنِ کریم کے معاشی نظام) کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ سب بطیبِ خاطر کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا جبر یا زبردستی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ محض قانون کے زور پر بھی یہ نظام نہ متشکل کیا جا سکتا ہے نہ قائم رہ سکتا۔ اسی لئے حضورؐ نبی اکرم سے کہا گیا کہ آپ کا فریضہ ان حقائق کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے، ان کا زبردستی منوانا نہیں۔ آپ کا فریضہ صحیح راستہ دکھا دینا ہے، اس راستے پر چلانا نہیں۔ جسے اس راستے پر چلنا ہوگا وہ اپنی خوشی سے اس پر چلے گا۔ فرمایا:۔

۲/۲۷۲ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۲)

اے رسولؐ! تم ان لوگوں کو نظامِ خداوندی کی راہ دکھا دو۔ تمہارے ذمے اتنا ہی ہے۔ انہیں اس راستے پر چلا دینا تمہارے ذمے نہیں (۵/۹۹ ؛ ۲۸/۵۶)۔ کسی کا صحیح راستے پر چلنا خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی رو سے اس نے انسان کو اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے — تم ان لوگوں کو اتنا بتا دو کہ تم جو کچھ بھی اس ضمن میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود تمہاری اپنی ذات کو ہوگا، بشرطیکہ یہ کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے خرچ کیا جائے۔ اس کا جذبۂ محرکہ کچھ اور نہ ہو۔ یوں، جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔

اس میں دین (نظامِ خداوندی) کی ایک عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یہ نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے جو دل و دماغ کی پوری رضامندی سے اس کی صداقت کے قائل ہوں اور اس پر عمل پیرا ہونا خود اپنے لئے مفید سمجھتے ہوں۔ اس انفاق کے سلسلہ میں جو کہا گیا ہے کہ یہ مرضات اللّٰہ یا لوجہ اللّٰہ ہوگا تو اس سے یہی بتانا مقصود ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا جبر ہے اور نہ ہی اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہونا چاہیئے۔

معاشی نظام کی بنیاد

جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ اس انفاق سے خود اس کا اپنا بھلا ہوگا۔ اسی سے اس کی ذات کا استحکام ہوگا۔ وہی اس پروگرام پر عمل پیرا ہو سکے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے دل کی رضامندی سے اسے اختیار نہ کرنا چاہے تو، اور تو اور، خود رسول اللہؐ بھی اُسے اس پر کاربند نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۸/۵۶)۔ "تو، (اور تو اور) انہیں بھی زبردستی اس راستے پر نہیں چلا سکے گا جن سے تجھے محبت ہے۔" اس لئے مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ (۵/۹۹)۔ اور یہ ہے عالمگیر معاشی نظام کی وہ بنیاد جو مارکس کو نہیں مل سکی تھی اور جس کے موجود نہ ہونے سے کمیونزم تو ایک طرف، اس کی ابتدائی شکل سوشلزم بھی کہیں عملاً کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایسے نظام، قانون کے زور یا حکومت کے ڈنڈے سے نہیں چلا کرتے۔ یہ صرف دلوں کی رضامندی سے چلا کرتے ہیں۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔

(۰)

جہاں تک انفاق میں حصہ لینے والوں کا تعلق ہے انہیں کہہ دیا کہ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (۲/۲۷۲)

"جو کچھ تم دو گے وہ تمہارے اپنے ہی فائدہ کے لئے ہے"۔ جو کچھ وہ دیتے ہیں اس کے مصرف کے متعلق کہا کہ:-

۲ / ۲۷۳ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲/۲۷۳)

یہ بھی یاد رکھو کہ اس روپیہ کو پیشہ ور بھیک منگوں پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان حقیقی ضرورت مندوں کے لئے ہوگا جو اس نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں کہیں اس طرح محصور ہو جائیں کہ وہ نہ وہاں سے کسی اور جگہ جا سکیں اور نہ ہی وہاں رہتے ہوئے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ ان میں (سیرت کی پختگی کی وجہ سے استغناء کا یہ عالم ہو کہ) ناواقف یہی سمجھے کہ ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ البتہ جاننے والے انہیں ان کے چہروں پر نمودار ہو جانے والے اثرات سے پہچان لیں۔ یہ لوگ لپٹ لپٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے۔

ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تم جو کچھ دو گے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہوگا۔ یعنی اُسے دینے والوں کی نیت کا بھی علم ہوتا ہے اور لینے والوں کی ضروریات کا بھی۔

ایمان، انسان کی سیرت میں کیسا عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اِس آیت میں سامنے آسکتی ہے۔ مجبوری کا یہ عالم کہ نامساعد حالات کے نرغے اور دشمنوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہیں۔ لیکن استغناء کی یہ کیفیت کہ اس کا اظہار تک کسی سے نہیں کرتے، کہ یہ بھی عزتِ نفس کے منافی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اکثر اوقات انسان کے چہرے کی طبیعی علامات اندرونی تقاضوں کی غماز ہو جاتی ہیں۔

مومنین کا استغناء

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو!

ضرورت مندوں کا یہ استغناء؛ اور دینے والوں کا یہ عالم کہ:-

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو   یوں بھیک دے کہ دستِ دعا کو خبر نہ ہو

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد بتا دیا کہ یہ عبوری دور چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد جب یہ نظام قائم ہو جائیگا، تو سب خطرات اور حزن و ملال ختم ہو جائیں گے۔

۲ / ۲۷۴ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (۲/۲۷۴)

اس انداز سے دینے والے وہ لوگ ہیں جو اپنا مال دن رات کھلے بندوں اور خاموشی سے اس مقصد کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ انہی کی قربانیوں سے وہ نظام قائم ہوتا ہے جس میں نہ کسی کو کسی قسم کا خوف وخطرہ رہتا ہے نہ افسردگی اور غمگینی۔

(۰)

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اضداد سے اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ اور یہ انداز بڑا بلیغ اور موثر ہوتا ہے۔ غالب کے الفاظ ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس نے مندرجہ بالا آیات میں اُس نظام کا نقشہ سامنے رکھ دیا جس کی بنیاد انفاق پر ہے۔ یعنی انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔ اس کے ماحصل میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھے اور باقی سب بطیبِ خاطر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ اس کے بعد وہ اس نظام کو سامنے لاتا ہے جو اس نظام کی ضد ہے یعنی اس میں (اپنی کمائی کو دوسروں کو دے دینا تو کجا) انسان خود محنت نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت کے ماحصل کو ان سے چھین لیتا ہے۔ اسے ربٰو کہا جاتا ہے۔

ربٰو کی بحث

ہمارے ہاں ربٰو کا ترجمہ سود (بیاج) کر دیا گیا اور پھر یہ بحثیں چل پڑیں کہ کس کس قسم کا سود حرام ہے، اور کس کس قسم کا حلال؟ کسی نے اس نکتہ پر غور کرنے کی زحمت نہ کی کہ قرآن کہتا ہے کہ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (۲/۲۷۹)۔ اگر یہ لوگ اسے (ربٰو کو) ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں تو ان سے کہہ دو کہ اسے خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ربٰو ایک ایسا جرم ہے جسے نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کے مرادف اور اعلانِ جنگ کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی مملکت میں معاشی نظام بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ربٰو ایک ایسا نظام ہے جو اس نظام کی ضد ہے۔ ربٰو درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔

ربا۔ یربُو (مادہ۔ ر، ب، و) کے معنیٰ زیادہ ہونا، بڑھنا، پھولنا ہیں۔ یہیں سے لفظ ربٰو ہے جس کے بنیادی معنیٰ اصل سے زائد لینا ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں ربٰو کی انفرادی شکل رائج تھی۔ یعنی ایک شخص کسی کو روپیہ بطور قرض دیتا تھا اور جب وہ قرض واپس کرتا تھا تو اُسے اصل سے کچھ زائد ادا کرنا پڑتا تھا۔ قرآنِ کریم نے

جب ربوٰ کو حرام قرار دیا تو اُس کی (اس زمانے کی) مروجہ شکل کی یہ کہہ کر جڑ کاٹ دی کہ:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۷۹)

اگر تم اس سے باز آجاؤ تو تم صرف اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

یعنی اصل زر سے کچھ بھی زاید لینا ربوٰ تھا۔

اس کے بعد ربوٰ نے ایک معاشی نظام کی شکل اختیار کرلی جس میں ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے زاید وصول کرنے کے علاوہ ربوٰ (زاید) کی بیسیوں شکلیں وضع ہوگئیں۔ ان تمام شکلوں پر مشتمل وہ نظام ہے جسے نظامِ سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، قرآنِ کریم نے جو کچھ ربوٰ کے متعلق کہا ہے اس کا اب اطلاق نظامِ سرمایہ داری پر ہوگا۔

قرآن کے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ جلد اول (صفحہ ۱۰۵ و صفحہ ۲۹۴) اور سابقہ صفحات میں زیر آیت (۲/۲۱۹) کہا گیا ہے اس پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے۔ اس سے واضح ہوجائے گا کہ وہ معاشی نظام اِن ستونوں پر استوار ہوتا ہے:۔

۱۔ ذرائع پیداوار، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں۔ لوگوں کی انفرادی ملکیت میں نہ ہوں۔ اسلامی نظامِ زراعت کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کی غذائی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

۲۔ بجز ان کے جو معذور ہوں، ہر فردِ معاشرہ محنت سے کمائے۔ اور

۳۔ اس کمائی میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب ذی احتیاج لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ اسلامی کے حوالے کر دے۔

اس سے واضح ہے کہ اس نظام میں فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہتی اور جب فاضلہ دولت ہی نہیں رہتی تو اس دولت (سرمایہ) کے معاوضہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، سرمایہ داری کا نظام ہے جس میں ہر فرد کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت حاصل اور جمع کرلے اس میں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جس قدر دولت بچے، وہ اس کا مالک ہے۔ اسے جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ یہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی جڑ ہے۔

اگر ایک شخص اپنی فاضلہ دولت (مثلاً ایک ہزار روپے) کو بکس میں بند کر کے رکھ چھوڑے تو اس کے بعد بھی وہ ہزار کا ہزار ہی رہے گا۔ اس میں ایک روپیہ کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ لیکن نظامِ سرمایہ داری میں ایسی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں جن سے یہ فاضلہ دولت بڑھتی رہے۔ مثلاً:۔

۱۔ عمومی سطح پر لوگوں کو سودی قرضے دینا۔

۲۔ اس روپے سے زمین خرید کر اُسے مزارعوں کو کاشت کے لئے دے دینا اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بلا محنت و مشقت ہتھیا لینا۔

۳۔ اس سرمایہ سے صنعت (کارخانے) قائم کر لینا۔ ان میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو کچھ حاصل ہو۔ اس میں سے کم از کم محنت کشوں کو دینا اور باقی سب خود رکھ لینا۔

۴۔ کسی کے کاروبار میں روپیہ (INVEST) کر کے، منافع کا حصہ دار بن جانا۔

۵۔ ایسا کچھ براہِ راست کرنا یا ایسا کرنے والے (بینکوں یا دیگر اقتصادی) اداروں میں سرمایہ لگا کر بالواسطہ، روپیہ کماتے چلے جانا۔

آپ نے دیکھا کہ ان (یا ان جیسی دیگر) شکلوں میں معاوضہ محنت کا نہیں ہوتا، سرمایہ کا ہوتا ہے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری یا ربٰو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں — دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد — محنت کوئی کرتا ہے، اور اس محنت کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ اور اس طرح حاصل کردہ دولت سے وہ مزید ذرائع پیداوار کا مالک بنتا چلا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان معاشی اصولوں کو جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ابدی قوانین قرار دے کر، نظام (سرمایہ داری) کو جو اُس کے نظام کی ضد تھا، حرام قرار دے دیا اور اُسے اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کہہ کر پکارا۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہا تو جس طرح مسلمانوں نے باطل کے دیگر نظام اپنے ہاں رائج کر لئے اسی طرح نظامِ سرمایہ داری کو بھی اپنا لیا، اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے عین اسلام قرار دے لیا۔ (مثلاً) مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

ہمارا موجودہ شرعی نظام

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں[1]، بلاحد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا

---

[1] یعنی زکوٰۃ۔ صدقات وغیرہ

میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زاید ملکیت کو عملاً بے کار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین سنہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن۔ صفحہ ۵۲-۵۳)۔

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اُس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو[1]۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں[2] کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً صفحہ ۶۳)

آپ نے دیکھا کہ نظامِ سرمایہ داری کس انتہائی شکل میں ہمارے ہاں رائج ہے اور اسے کس طرح عین اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ اب سود کی صرف ایک ہی شکل حرام سمجھی جاتی ہے۔ یعنی انفرادی قرضہ پر اصل زر سے کچھ زائد لینا۔ یہ سوال بڑی شد و مد سے زیر بحث ہے کہ بنک کا سود حلال ہے یا حرام!

آپ نے دیکھا کہ اسلام کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ربوٰا سے قرآنِ کریم کا مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کی روشنی میں ربوٰا سے متعلق آیات کو دیکھیے۔ سابقہ آیات میں انفاق اور صدقات کی برکات کو سامنے لایا گیا تھا۔ ان کے برعکس ربوٰا ہے جس میں ہوسِ زر کی وجہ سے انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:-

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

---

[1] اسے "شرعی" اصلاح میں مضاربت کہتے ہیں۔ یعنی (SLEEPING PARTNERSHIP)

[2] اسے "شرعی" اصطلاح میں مزارعت کہتے ہیں۔ یعنی نقد ٹھیکہ یا بٹائی پر زمین کاشت کرانا۔

۲/۲۷۵ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲/۲۷۵)

ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو اپنا پیٹ کاٹ کر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں (۵۹/۹) اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو قرض دیتے ہیں تو ان کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر جتنا دیتے ہیں اُس سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی حالت یوں سمجھو جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگتا پھرے (یعنی ہوسِ زر ان کے سینے میں آگ لگا دیتی ہے جس سے وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے ہیں)۔ یہ لوگ اس روش کے جواز میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ربٰو (روپے پر زیادہ وصول کرنا) تجارت کی مثل ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں (جس طرح تجارت میں دوکاندار گاہک سے اپنے اصل زر سے زائد لیتا ہے اسی طرح ربٰو میں روپیہ دینے والا اپنے اصل سے زیادہ وصول کرتا ہے) یہ ان کی کٹ حجتی ہے۔ تجارت میں انسان روپیہ بھی لگاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ محنت بھی کرتا ہے۔ جو کچھ وہ زائد لیتا ہے وہ اس کے روپے کا منافع نہیں ہوتا اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس ربٰو میں محنت کچھ نہیں کی جاتی۔ محض روپے پر منافع لیا جاتا ہے۔ یہ ناجائز ہے (اس ضمن میں اس اصول کو یاد رکھو کہ جائز صرف محنت کا معاوضہ ہے (۵۳/۳۹) خالی سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کا ماحصل خود لے لینا جائز نہیں ہے۔ اس کو ربٰو کہتے ہیں)۔

سو جس شخص تک خدا کا یہ قانون پہنچ جائے اور وہ اپنی سابقہ روش سے رُک جائے تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے، لے چکا۔ نظامِ خداوندی کی رُو سے اس سے گزشتہ کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن جو اُس سے مڑ کے یا دوبارہ یہی روش اختیار کرلے تو یہ لوگ ہیں جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی اور ان کے لئے اس عذاب سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اس آیت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ نظامِ سرمایہ داری میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے گویا اُسے "شیطان" نے ڈس لیا ہو۔ عربی محاورہ میں شیطان سانپ کو بھی کہتے ہیں جس شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہو، کرب و اضطراب کے علاوہ اس کی پیاس کی شدت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کتنا ہی پانی پیا جائے وہ بجھتی ہی نہیں۔ یہی کیفیت ہوسِ زر کے ڈسے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی دولت جمع کرلے اس کی ہوس مٹتی

ہی نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ (۱۰۲/۱-۲)۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دولت نہیں کماتا بلکہ دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس میں دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ اور بھاگتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ وہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے مؤیدین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح تجارت میں اصل زر سے زائد لینا جائز ہے۔

تجارت اور ربٰو

وہی صورت ربٰو کی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تجارت اور ربٰو میں بنیادی فرق ہے۔ تجارت میں تاجر سرمایہ بھی لگاتا ہے اور محنت بھی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنی لاگت سے زیادہ وصول کرتا ہے وہ اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے نہ کہ سرمایہ کا معاوضہ۔ اس کے برعکس، ربٰو میں بغیر محنت کئے سرمایہ پر بڑھوتی لی جاتی ہے۔ لہٰذا، بیع (یعنی محنت کا معاوضہ) حلال ہے اور ربٰو (صرف سرمایہ پر زیادتی) حرام ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر تاجر اپنی محنت سے زیادہ نفع لیتا ہے تو وہ ربٰو کے زمرہ میں آجائے گا اور حرام

قانون کا اطلاق

ہوگا۔ اسلامی مملکت میں اگر کاروبار انفرادی شکل میں رائج ہوگا تو مملکت طے کرے گی کہ کاروباری انسان کی محنت کا معاوضہ کیا ہوگا۔ وہ اس سے زیادہ منافع نہیں لے سکیگا۔

اس آیت میں " فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ " سے ایک اہم قانونی نقطہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یعنی قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔ اس سے پہلے کے واقعات یا معاملات اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے ربٰوا اور صدقات میں فرق کر کے بتایا۔ فرمایا:-

۲/۲۷۶ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۔ (۲/۲۷۶)

یاد رکھو! ربٰو جس کے متعلق انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس سے سرمایہ بڑھتا ہے درحقیقت خود بھی مٹتا ہے اور اس قوم کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیا جاتا ہے اور جس کے متعلق بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ میں کمی آجاتی ہے، خود بھی بڑھتا ہے اور اس قوم کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

ربٰو سے یہ ذہنیت عام ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے سامانِ زیست کو لوگوں سے چھپا کر رکھا جائے تاکہ وہ اس کے لئے محتاج ہوں اور قرض لینے پر مجبور۔ اور قرض دینے والا ان کی محنت کی کمائی پر عیش اڑائے۔ اس سے انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ سفرِ زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری

کی حامل قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری میں انسان اپنی دولت کو چھپا کر رکھتا ہے۔ آج کل کی اصلاح میں اسے کالا دھن (BLACK MONEY) کہہ کر پکارتے ہیں۔ عربی لغت میں ایسا کرنے والے کو کفار کہا جائے گا۔ یعنی دولت کو چھپا کر رکھنے والا۔

اس نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان محنت کئے بغیر دولت حاصل کرنے کا عادی ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی قوتِ عمل (پہلے کمزور اور پھر) زائل ہو جاتی ہے۔ جس شخص کے قویٰ مضمحل ہو جائیں، اسے عربی زبان میں اَثیم کہا جاتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں پوری کی پوری قوم کی تخلیقی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہودیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب ربٰو ان کے معاشرہ کا عام چلن ہو گیا تو وہ دنیا میں کوئی اور کام کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اسی بنا پر کہا کہ ان کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ: وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۔ (۴/۱۶۱)۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام ہو گیا تھا حالانکہ (شریعتِ موسوی میں) انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کو دوسروں کی محنت کی کمائی باطل طریقوں سے غصب کر لینے کی چاٹ لگ جائے، وہ اس سے کب باز آتے ہیں؟

یہاں کہا گیا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری (ربٰو) میں قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی اور رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی ایک آیت میں کہا گیا ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۳/۱۲۹)

ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دونے پر دونا اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

اور پھر اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ سودِ مرکب (COMPOUND INTEREST) حرام ہے، مفرد سود (SIMPLE INTEREST) حرام نہیں ہے۔ امام راغبؒ نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضٰعَفَةً دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا، آیت کے یہ معنی ہیں کہ تم جو سمجھ رہے ہو کہ ربٰو سے سرمایہ بڑھتا ہے، وہ بڑھتا نہیں، درحقیقت گھٹتا ہے۔ اس سے قومی دولت گھٹ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی شہادت یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عہدِ حاضر کے اقتصادیات کے

ماہرین اس باب میں تحقیق و تفتیش کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ رہے ہیں۔ یہ آیت (۳/۱۲۹) گویا یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا۔ (۲/۲۷۶) کی تفسیر ہے۔ اس نکتہ کی مزید تشریح سورۂ رُوم کی آیت ۳۹ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰/۳۹)

یاد رکھو! جو کچھ تم دوسروں کو اس لئے دو کہ اس کے بدلے میں تمہیں ان کے مال و دولت میں سے اس سے زیادہ ملے جو تم نے انہیں دیا ہے، (تو ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہیں تمہارے حساب کے مطابق کچھ زیادہ مل جائے لیکن) قانونِ خداوندی کی رو سے اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ (یہ تمہیں اس لئے اضافہ نظر آتا ہے کہ تم انفرادی طور پر حساب کرتے ہو۔ اگر تم پوری انسانیت کو سامنے رکھ کر غور کرو تو تم دیکھ لوگے کہ یہ اضافہ نہیں)۔ اس کے برعکس جو کچھ تم اس لئے دو کہ اس سے دوسروں کی نشوونما ہو جائے، اور اس میں تمہیں کسی قسم ذاتی معاوضہ کا خیال نہ ہو، بلکہ یہ تم اس لئے کرو کہ اس سے تمہاری زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائے گی، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دیئے ہوئے مال میں فی الحقیقت اضافے ہوتے ہیں۔ (۲/۲۷۵-۲۷۶؛ ۳/۱۲۹؛ ۴/۴۴)

اُس دور میں تو معلوم نہیں اس کی شکل کیا ہو گی لیکن ہمارے زمانے میں مضاربت (یعنی کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار ہو جانا) یا بینک میں روپیہ جمع کر کے اس کا منافع لینا، اسی زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیے اس سے کاروباری مشارکت اور کمرشل انٹرسٹ سے متعلق مسائل جن کے سلسلہ میں اس قدر بحثیں چلی ہوئی ہیں، قرآن کے معاشی نظام میں کس طرح حل ہو جاتے ہیں۔

ضمناً، آیت (۳/۱۲۹) سے اگلی آیت میں ہے:- وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ (۳/۱۳۰) "محتاط رہو اس جہنم کی آگ سے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری، کفر کے مرادف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام، نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت ہو (۲/۲۷۹)، وہ کفر نہیں تو کیا اسلام ہوگا؟

اس کے بعد وضاحت کر دی کہ اس قسم کا نظام، جماعتِ مومنین کا مسلک نہیں ہو سکتا۔

۲/۲۷۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۲۷۷)

خدا پر ایمان رکھنے، اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہنے والے، بھلا ایسا انسانیت سوز نظام کس طرح قائم کر سکتے ہیں؟ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ اور

اس طرح نوعِ انسان کی نشو و نما کا سامان فراہم کرتا چلا جاتے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے حسنِ عمل کا صلہ، نظامِ ربوبیت کی شکل میں سامنے آتا ہے اور اس طرح انہیں نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے، نہ غمگینی ستاتی ہے۔

ان تشریحات اور تصریحات کے بعد وہ قولِ فیصل سامنے لایا گیا جس میں کہا گیا ہے :-

۲ / ۲۷۹-۲۷۸ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ. (۲ / ۲۷۹-۲۷۸)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں میں انفرادی سود کا کاروبار عام تھا اور معاشرہ میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان آیات کی رُو سے قرآنِ کریم نے اسے (اور اس کے ساتھ پورے نظامِ سرمایہ داری کو) حرام قرار دے دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جو کچھ تم پہلے لے چکے ہو، لے چکے۔ لیکن جو کچھ مقروض کے ذمے، سود میں سے بقایا ہے، تمہیں وہ بھی چھوڑنا ہوگا۔ تمہارے مؤمن ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ تم صرف اصل زر (راس المال) واپس لے سکتے ہو۔ اس سے نہ تم پر کچھ زیادتی ہوگی نہ مقروض پر۔

اور اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کاروبار (اور نظام) کو نہیں چھوڑو گے، تو پھر تمہیں اسلامی مملکت کا باغی سمجھا جائے گا اور یہ نظام تمہارے خلاف اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح مملکت کے باغیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔

اسلامی نظام کے خلاف بغاوت

اس مقام پر ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ اس میں خطاب يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے ہے۔ یعنی جماعتِ مومنین سے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نظامِ سرمایہ داری سے باز نہ آئے تو تمہارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اس سے آپ اس جرم کی سنگینی اور اس نظام کے حرام ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ہمارے ہاں جو صدیوں سے نظامِ سرمایہ داری رائج چلا آرہا ہے تو قرآنِ کریم کی رو سے ہماری پوزیشن کیا ہے۔ ہم میں یہ نظام (سرمایہ داری) اس لئے رائج رہا کہ ہمارے ہاں "مسلمانوں کی سلطنتیں" قائم رہیں۔ اسلامی حکومت کہیں کبھی قائم نہ ہوئی۔

(۰)

اوپر کہا گیا ہے کہ جس مقروض کے ذمے تمہارا قرضہ ہے تم اس سے سود کا بقایا نہیں لے سکتے، صرف اصل زر

لے سکتے ہو. اس کے بعد دیکھیے کہ قرآن کریم کہاں تک آگے چلا جاتا ہے۔ فرمایا:۔

۲/۲۸۰ وَ إِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَ أَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۸۰)

اگر مقروض تنگدست ہے تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ قرض بسہولت ادا کر سکے۔ اور اگر تم اُسے بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے بشرطیکہ تم دور رس نگاہ سے دیکھ سکو کہ اس میں کس قدر اجتماعی مفاد مضمر ہیں۔

سود تو ایک طرف، اصل زر کو بھی چھوڑ دینا بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا. بالخصوص اُس قوم کے لئے جو صدیوں سے ربٰو کی عادی چلی آ رہی تھی۔ اس قسم کی ہمت صرف ایمان کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ:۔

۲/۲۸۱ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۸۱)

تم اس دور کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو جب تمہارے معاملات کے فیصلے قانون خداوندی کی رو سے ہونگے وہ قانون یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کا معاوضہ ملیگا۔ اور پورا پورا معاوضہ۔ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ یہ وہ دَور ہو گا جب قرآن کا معاشی نظام قائم ہوگا۔

تم سوچو کہ اس وقت تمہاری حالت کیا ہو گی! تم نے جو کچھ دوسروں کی محنت کے استحصال سے غصب کیا ہوگا، اُسے ظلم قرار دیا جائے گا اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ عدالتِ خداوندی میں ظلم کی سزا کیا ہوتی ہے! ابھی وقت ہے کہ تم اپنے آپ کو اس سزا سے بچا لو۔

(۰)

اسلامی نظام کے قیام تک کے عبوری دور میں انفرادی قرضوں کی ضرورت پڑے گی۔ قرآنِ کریم نے سودی قرضوں کی ممانعت کر دی. اگلی آیت میں قرضہ بلا سود کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم نے بجز مستثنیات، اصولی ہدایات ہی دی ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق یہ جزئیات خود متعین کرے لین دین

لین دین کے متعلق ہدایات

کے معاملات کی قرآن کے نزدیک کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے ان کی جزئیات تک کا تعین خود کر دیا ہے اور وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ کہ جس آیت میں ان معاملات سے متعلق احکام دیئے گئے ہیں، وہ اس کتابِ ہدایت کی سب سے لمبی آیت ہے۔ اور (جیسا کہ آپ ابھی ابھی دیکھیں گے) اس میں چھوٹی سے چھوٹی فروعی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابلِ غور نہیں کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے فریضہ کی جزئیات تو اس نے خود متعین نہیں کیں، اور لین دین سے متعلق معاملہ کی اس قدر تفصیلی جزئیات خود متعین کر دی ہیں۔ چونکہ یہ آیت بڑی لمبی ہے اس لئے ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو الگ الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا:

۲/۲۸۲ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)

اے جماعتِ مومنین! جب تم ایک مدتِ معینہ کے لئے کسی سے قرضہ کا معاملہ کرو تو اُسے ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔

اس میں اَجَلٍ مُّسَمًّى (ایک مدت تک) کی تخصیص اس لئے کر دی کہ ذرا آگے چل کر دست بدست تجارتی معاملہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ دیکھئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لین دین کے معاملہ کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔ یعنی ایسا کرنا فریضۂ خداوندی ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ ہم نے کبھی اس کا احساس تک بھی کیا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے اور ایسا نہ کرنا اس کی معصیت! ہم اجنبی لوگوں سے معاملہ کرتے وقت تو اسے تحریر میں لے آتے ہیں لیکن جہاں "باہمی تعلقات" ہوں وہاں تحریر کی بات کرنا، دوسرے کے منہ پر طمانچہ مار دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ان سے تحریری معاملہ نہیں کرتے اور پھر اس کے نتائج بھی بھگتتے ہیں! بلا تحریر لین دین کے معاملات میں آخر الامر جس قدر تنازعات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ (۲/۲۸۲) "چاہیئے کہ کوئی کاتب اس معاملہ کو دیانتداری کے ساتھ لکھ دے"۔ غور فرمائیے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ فریقین میں سے کوئی اسے لکھ لے۔ کہا یہ کہ کوئی تیسرا شخص اسے ضبط تحریر میں لائے۔ اس سے اس تحریر کا موثق ہونا واضح ہے۔

ضمناً۔ قرآن کریم کے خلاف سازش کرنے والوں نے یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ قرآن رسول اللہ کی زندگی میں ایک کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوا تھا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں عربوں میں لکھے پڑھے اشخاص بہت کم تھے۔ آپ سوچیئے کہ جس معاشرہ میں عام لین دین کے معاملات کو تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیا وہاں

قرآنِ کریم جیسی اہم دستاویز کو تحریری شکل دینے کے لئے کاتب نہیں مل سکتے تھے؟

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ۔ (۲/۲۸۲)۔ جب کسی کاتب کو اس کے لکھنے کے لئے کہا جائے تو اُسے چاہیئے کہ اس سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے لکھنے پڑھنے کی استعداد عطا فرمائی ہے تو اسے چاہیئے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔

یہاں اس نکتہ پر بھی غور کیجیئے کہ کاتب نے لکھنا پڑھنا خود سیکھا ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے سکھایا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ جن باتوں کو انسان خود اپنی سعی و کاوش سے سیکھتا ہے۔ اُسے بھی خدا کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے کیونکہ انسان کو اس کی بنیادی صلاحیت خدا ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا۔ (۲/۲۸۲) جس نے قرض لیا ہے وہ اس تحریر کو املا کرائے، اور کاتب کو چاہیئے کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر، ٹھیک ٹھیک لکھے۔ اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کرے۔

اس احتیاط پر غور کیجیے کہ یہ تحریر قرض لینے والا لکھوائے! قرض دینے والا نہیں۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ۔ (۲/۲۸۲) اگر قرض لینے والا کم عقل سا ہو، یا ضعیف ہو۔ یا ایسی تحریر لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا کوئی کارمختار (دوست یا سرپرست) عدل و انصاف کے مطابق یہ تحریر لکھوا دے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ ایسی صورت میں بھی قرض دینے والے سے نہیں کہا کہ وہ تحریر لکھوا دے۔ قرض لینے والے کے کسی نمائندہ کو اس کی اجازت دی ہے۔ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ۔ (۲/۲۸۲)۔ اور ایسے معاملات کے وقت اپنے میں سے دو مردوں کو بطور گواہ بلا لیا کرو۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی۔ (۲/۲۸۲)۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں تو فریقین کی رضامندی سے، ایک

دو عورتوں کی گواہی

مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلا لو۔ دو عورتیں اس لئے کہ اگر ایک عورت کو گھبراہٹ وغیرہ کی وجہ سے کہیں مغالطہ ہو جائے۔ یا وہ (CONFUSED) ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

یہ وہ آیت ہے جس سے ہمارے ہاں بات کا بتنگڑ بنا لیا گیا ہے۔ مطالب الفرقان جلد دوم، زیر آیت (۲/۲۸۲)

صفحات ۲۵-۱۸ پر بتایا جاچکا ہے کہ ہمارے ہاں کس طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں، ناقص العقل، فروتر جنس کا سد، تمام برائیوں کی جڑ اور خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس قوم میں جنسیات (SEX) کا غلبہ ہو، اس کے نزدیک عورت کی حیثیت مردوں کے جنسی جذبہ کی تسکین کے ذریعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ عورت کو مقامِ انسانیت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ اسے ایک جنس (COMMODITY) تصور کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہمارے ہاں ایک طرف تو عورت کو تمام برائیوں کی جڑ اور جہنم کا کندہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ماں کی طرف چونکہ جنسی جذبہ کی نسبت نہیں کی جاسکتی اس لئے اسے "عورت" کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ عورت سے ان کی مراد، جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے مقامِ انسانیت نہیں دیا جاتا۔

عورت کے ناقص العقل ہونے کے ثبوت میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ عورت میں مرد کے مقابلہ میں، آدھی عقل ہوتی ہے۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث، سابقہ (ساتویں) باب میں آیت (۲/۲۲۱) کے تحت آچکی ہے۔ اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

اب آگے چلئے۔ فرمایا:۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۔ (۲/۲۸۲) "جب گواہوں کو شہادت کے لئے طلب کیا جائے تو انہیں چاہیئے کہ اس سے انکار نہ کریں"۔

اس قدر تفصیلات کے بعد پھر اس کی تاکید کی کہ ان معاملات کو ضرور تحریر میں لے آیا کرو

وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۔ (۲/۲۸۲)۔ قرض تھوڑا ہو یا بہت، اس کی میعاد کے اندر اسے ضبطِ تحریر میں لانے میں کوتاہی مت کرو۔

اور اس کے بعد اس کی بھی وضاحت کردی کہ اس کے لئے اس قدر تاکید کیوں کی جارہی ہے۔ فرمایا:۔

ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۔ (۲/۲۸۲) یہ چیز قانونِ عدل کے تقاضا کو پورا کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ اس سے شہادت محکم ہوجاتی ہے اور شکوک و شبہات کا بہت کم امکان رہتا ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۚ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۔ (۲/۲۸۲)۔ لیکن اگر تم آپس میں کوئی دست بدست معاملہ کرو۔ جیسے دکاندار آپس میں کرتے رہتے ہیں اور اسے ضبطِ تحریر میں نہ لاؤ تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ البتہ ایسی خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ ضرور رکھ لیا کرو۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (۲/۲۸۲)۔ اسے بھی اچھی طرح یاد رکھو کہ کاتب یا گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔ وہ اسی صورت میں دیانتداری سے یہ فرائض سرانجام دے سکیں گے کہ انہیں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو اور وہ بلا خوف و خطر سچی بات کہہ سکیں۔

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۸۲)۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ تم ہر معاملہ میں قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان معاملات سے پوری پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ بتا دیا ہے۔ سمجھا دیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی معاملات کو صحیح خطوط پر رکھنے کے لئے کس قسم کی ہدایات کی ضرورت ہے۔

اگلی آیت میں ان ہدایات کی تکمیل کر دی جہاں کہا کہ:-

۲/۲۸۳ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۗ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۗ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۔ (۲/۲۸۳)

اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور تمہیں کاتب نہ مل سکے تو قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لو۔ اور اگر تم ایک دوسرے پر اعتماد کرو تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اُسے چاہیئے کہ اس امانت کو (پوری پوری دیانت سے) واپس کر دے اور اس طرح اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرے۔

اور تم شہادت کو کبھی نہ چھپاؤ۔ جو ایسا کرتا ہے (تو اگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ بھی چلے اور وہ ان میں معتبر بنا رہے پھر بھی) اس کا دل مجرم ہوتا ہے اور اس کی ذات کی نشو و نما کی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ خدا کے قانونِ مکافات سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اسے ہر بات کا علم ہوتا ہے۔

آپ نے "رہن با قبضہ" کے الفاظ اکثر سنے ہوں گے۔ آپ نے کسی شخص کو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیا۔ اس قرض پر

رہن باقبضہ

(ازروئے شریعت) سود لینا تو حرام ہے۔ آپ اس مقروض کی زمین رہن رکھ لیتے ہیں اور اس کی آمدنی شیرِ مادر کی طرح ہضم کرتے رہتے ہیں، کیونکہ شریعت نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ مرہونہ جائیداد یا زمین کی آمدنی لے لینا حلال و طیب ہے۔ اگر آپ اس مقروض سے سود لیتے تو وہ پچاس، سو روپے سالانہ سے زیادہ نہ ہوتا۔ اسے تو حرام قرار دیا جاتا ہے لیکن آپ اس کی مرہونہ اراضی سے ہزار، پانسو روپے سالانہ تک کی آمدنی ہڑپ کر جاتے ہیں اور کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یا للعجب! آیت میں مقروض کی کسی شے کو "بطور امانت" اپنے پاس رکھ لینے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ بھی اس صورت میں اور اس وقت تک کہ معاملہ کو تحریر میں نہ لایا جا سکے۔

(o)

اس آیت میں کتمانِ شہادت (شہادت چھپانے) کا نتیجہ یہ بتایا کہ فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ اثم کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی صلاحیتوں یا قوتوں کا مضمحل ہو جانا ہوتے ہیں۔ شہادت چھپانے والے کے دل میں جو کھٹک رہتی ہے کہ اگر راز افشا ہو گیا تو کس قدر رسوائی (اور بعض حالات میں عقوبت) ہو گی اس سے اس کی جرأتیں مفلوج اور بیباکیاں مغلوب ہو جاتی ہیں، اور یہی اثمِ قلب ہے۔

(o)

ہدایات کی تکمیل ہو گئی اور سورہ بقرہ بھی اپنے اختتام تک پہنچنے کے قریب آ گئی۔ جس طرح قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ ہر آیت کے آخر میں ایسے الفاظ (بالعموم صفاتِ خداوندی) لاتا ہے جن سے اس آیت کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے، اسی طرح وہ ہر سورۃ کے آخر میں ایسی آیات لاتا ہے جن میں اس سورۃ کے مقاصد سمٹ کر آ جاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

۲/۲۸۴

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ (۲/۲۸۴) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) میں جو کچھ ہے خدا کے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے"۔ کائنات اور اس میں کارفرما قوتوں (ملائکہ) کے متعلق جلد دوم، آیات (۲/۳۰-۳۱) ص ۶۶ تا ۸۷ میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ ان مقاصد میں جن کی تکمیل کے لئے کائناتی قوتیں مصروفِ کار رہتی ہیں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵/۲۲) "خدا نے ارض و سماء کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی

نہ ہو" اس سے ظاہر ہے کہ کارگہ کائنات کے سرگرم عمل رہنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات نتیجہ خیز

قانونِ مکافات

ہو۔ یہ کس طرح سے ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی علم مزید ترقی کرے تو رموزِ فطرت کا یہ گوشہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ لیکن اتنا تو ہمارا مشاہدہ (اور تاریخ کی مسلّم شہادت) ہے کہ ظالم اور مستبد فراعنۂ دہر کو ان کے اعمال کی سزا ایسی راہوں سے ملتی ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ فَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ۔ (۳۹/۲۵) "ان پر تباہی ان مقامات سے آئی جو ان کے حیطۂ شعور میں بھی نہیں تھے۔" اسی (قانونِ مکافات) کی طرف توجہ منعطف کرانے کے لئے کہا: وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ۔ (۲/۲۸۴) "جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ عملی شکل اختیار کر کے محسوس طور پر سامنے آجائے یا وہ تمہارے ارادے اور آرزو ہی کی منزل میں رہے۔ ان سب کا شمار تمہارے اعمال میں ہوتا ہے جن کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا" (قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق مختلف مقامات پر بحث ہو چکی ہے۔ بالخصوص دیکھئے جلد دوم آیت (۲/۳۸) صفحہ ۲۳۰)۔

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۲/۲۸۴)۔ غلط اور صحیح راستے متمیز ہو کر تمہارے سامنے آچکے ہیں اور ان پر چلنے کے نتائج کی بھی وضاحت ہو چکی ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کر لے جو اُسے تباہیوں کی طرف لے جائے جس کا جی چاہے تباہیوں سے محفوظ رہنے والی راہ اختیار کرے۔ خدا نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ ان ہی پیمانوں کو قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ انہی پیمانوں کی رُو سے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک فرد سے جو عمل سرزد ہوا ہے اس میں وہ کس حد تک صاحبِ اختیار تھا، اور کس حد تک (شعوری یا غیر شعوری طور پر) مجبور۔ اعمال کے نتائج اسکے اختیار و ارادے کی نسبت سے مرتب ہوتے ہیں۔

خدا نے اپنے ان قوانین کا علم اس وحی کی رُو سے دے دیا ہے جو اس رسول پر نازل ہوتی ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ (۲/۲۸۵)۔ "رسول اور جماعتِ مومنین ان صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسول پر نازل ہوتی ہیں"

۲/۲۸۵

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ کہا کہ رسول پر جو وحی نازل ہوتی ہے پہلے وہ خود اس کی صداقت پر ایمان لاتا ہے۔ اس سے ایک بات یہ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ وحی، رسول کی اپنی فکری

خود رسول کا ایمان لانا

تخلیق نہیں ہوتی۔ کسی مفکر کے لئے اس کی اپنی فکری تخلیق پر ایمان لانے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اُسے بالکل سچی اور صحیح سمجھتا ہے۔ ایمان لانے (یا نہ لانے) کا سوال ان امور کے متعلق پیدا ہوتا ہے جو کسی کو خارج سے ملیں۔ رسول کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اس وحی کی صداقت پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے انسان۔ کیونکہ وہ حقیقت (وحی) ان کی بھی فکری تخلیق نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ رسول اور باقی مومن سب اس منزل من اللہ وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ رسول سے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اس ایمان کا اعلان بھی کرے۔ قُلْ "اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ۔ (۴۲/۱۵)"۔ اے رسول! تم کہو کہ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب پر ایمان لایا ہوں"۔ ایمان کے متعلق قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت کو غور و فکر کے بعد تسلیم کرنے کا نام ہے۔ (۲۵/۷۳)۔ اس سے واضح ہے کہ رسول بھی خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی پر غور و فکر کرتا تھا اور یہی مسلک مومنین کا بھی تھا۔ اس سے آپ سوچ لیجئے کہ ہمارے "ایمان" کی حقیقت کیا ہے؟

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵)

یہ سب ایمان لاتے ہیں اللہ پر، ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور ان رسولوں میں بحیثیت رسالت کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (اس کے متعلق اسی جلد میں آیت (۲/۱۳۶) کے تحت گفتگو کی جا چکی ہے)۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ (۲/۲۸۵)۔ وحی کی صداقتوں پر ایمان لانے سے معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ ایمان لانے والے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہی راستہ صحیح ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اس راستے پر چلنا بھی ہوتا ہے۔ جو چلتا ہے وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ جو چلتا ہی نہیں اس کا اس راستے کو صحیح سمجھنا اُسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

اطاعت

قرآن کریم میں سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ سَمِعْنَا کے معنی ہیں احکامِ خداوندی کا دل کے کانوں سے سُن کر انہیں اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور اَطَعْنَا کے معنی یہ ہیں کہ سمجھنے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنا۔ گویا انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تین شرائط لاینفک ہیں۔ وحی کی رُو سے عطا شدہ رہنمائی کی صداقت پر غور و فکر کے بعد یقین کرنا (ایمان)۔ پھر ان صداقتوں پر مبنی احکام کا اچھی طرح سمجھ لینا۔ اور سمجھنے کے بعد ان کے مطابق عمل کرنا۔ اس سے انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ ان احکام کی اطاعت سے مقصد کیا ہے! فرمایا:-

۲/۲۸۶

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ (۲/۲۸۶)

یہ الفاظ اس مقام پر بھی آتے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر چند ایک مقامات پر بھی (مثلاً ۲/۲۳۳ ؛ ۶/۱۵۳ ؛ ۷/۴۲ ؛ ۲۳/۶۲)۔ اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ خدا کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلّف (ذمہ دار) نہیں ٹھہراتا۔ بات بڑی واضح ہے لیکن بہانہ جو اس سے بڑا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی لاکھوں پتی کے پاس آپ ایک فلاحی کام کیلئے عطیہ لینے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو دس روپے دے دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمیں تو آپ سے بہت زیادہ کی توقع تھی اس پر وہ کہتا ہے کہ میری وسعت اتنی ہی ہے اور خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں ٹھہراتا، اسلئے آپ زیادہ کے لئے اصرار نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روش منشائے خداوندی کے خلاف خود فریبی یا ابلہ فریبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یا تو مختلف وسعتوں کیمطابق

ذمہ داری بقدر وسعت

خود ہی احکام دے دیئے ہیں۔ مثلاً روزوں کے احکام کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حکم یہ تھا کہ مہینہ بھر کے روزے پورے کئے جائیں۔ مریض اور مسافر بعد میں گنتی پوری کریں۔ اور اس کے بعد فرمایا۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۔ (۲/۱۸۴)۔ "جو لوگ بمشقت روزہ نباہ سکتے ہوں وہ روزے کے بجائے کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یہ ہے علیٰ قدر وسعت مکلّف ٹھہرانے کی ایک مثال۔ یا (مثلاً) مناسک حج کے سلسلہ میں حجامت نہ بنوانے کا حکم دیا۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی مریض ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلے میں روزے رکھ لے، یا کوئی عطیہ دیدے، یا کوئی اور عملِ خیر کرے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے (۲/۱۹۶)

آپ نے دیکھا کہ یہ تمام رعایتیں اس اصول کی تفسیر ہیں کہ ذمہ داری بقدر وسعت ہوتی ہے۔ اسی طرح قتلِ مومن بالخطاء کے فدیہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد کہا جسے اس کی توفیق نہ ہو وہ دو ماہ کے روزے رکھے (۴/۹۲) یہ متبادل فدیہ بھی وسعت کے پیشِ نظر تجویز کیا گیا ہے۔ اس قسم کی مزید مثالوں کے لئے (۵/۸۹ ؛ ۵۸/۳-۴) دیکھیے۔ ان مقامات میں اللہ تعالیٰ نے علیٰ قدر وسعت خود ہی متبادل احکام دے دیئے ہیں۔ یا مثلاً معاملہ عدالت میں جائے تو اُسے اس کا اختیار دے دینا کہ وہ فریقِ متعلقہ کی وسعت کو مدّنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرے۔ آیت (۲/۲۳۳) سے یہی متبادر ہوتا ہے۔

لیکن ان الفاظ (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو اس سے وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ دنیاوی حکومتوں میں قانون کے نفاذ سے مقصد افرادِ معاشرہ کی آزادی پر پابندی عائد کرنا ہوتا ہے۔ جو احکام خدا نے صادر کئے ہیں وہ بھی پابندیاں عائد کرتے ہیں لیکن (قرآن کہتا ہے کہ) ان پابندیوں سے مقصد تمہاری آزادی کو سلب کرنا نہیں بلکہ اس میں اور وسعت پیدا کرنا

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا

ہے۔ خدا کی طرف سے صادر کردہ احکام سے مقصد نفسِ انسانی کے اختیار میں اور وسعتیں پیدا کرنا ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں میں مختلف مقامات پر ٹھوکریں (FALLS) بنادی جاتی ہیں۔ سطح بین نگاہیں یہ سمجھیں گی کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کو روکنا ہے۔ لیکن دیدہ ور یہ جانتے ہیں کہ ان رکاوٹوں سے مقصد نہر کی روانی کی رفتار کو اور تیز کرنا ہوتا ہے (DISCIPLINED LIFE) سے انسانی صلاحیتوں میں وسعت اور توانائی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس سے فرد کی ذات بھی متوازی (BALANCED) ہوجاتی ہے اور معاشرہ بھی متوازن۔ اور اس کا، بہیئت مجموعی نتیجہ، کاروانِ انسانیت کی ترقی کی راہوں میں کشاد پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے مفہوم لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

می شود از جبر پیدا اختیار!

اور اسکی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے نے کر دی جہاں کہا کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) اس کا

قانون مکافات

عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ جو جیسا کریگا ویسا بھریگا لیکن یہ قرآن ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ غور و فکر کا متقاضی ہوتا ہے۔ لَهَا میں (ل) سے مفہوم فائدہ یا نفع ہے اور عليها میں (على) کے معنی نقصان یا تخریب ہیں۔ اتنے سے فرق سے معانی یہ ہوگئے کہ صحیح کام کا فائدہ بھی کام کرنے والے کو ہوگا اور غلط کام کا نقصان بھی اسی کو۔ یہ قانون مکافاتِ عمل کا بنیادی اصول ہے۔

لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ کَسَبَ (مادہ ک۔ س۔ ب) کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ کمائی کرنے، کچھ حاصل کرنے، یا محض کچھ کرنے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا لیکن عربی زبان میں مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ایک

کسب اور اکتساب میں فرق

ہی مادہ کے باب بدلنے سے معانی میں بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ آپ اس آیت میں دیکھیے۔ لَهَا کے ساتھ کَسَبَتْ آیا ہے اور عَلَيْهَا کے ساتھ اِكْتَسَبَ۔ کَسَبَ اور اِكْتَسَبَ میں باب کا فرق ہے اور اسی فرق سے انکے معانی میں بھی فرق آگیا ہے۔ کَسَبَ کے معنی ہوتے ہیں ایسا کام کرنا جس میں اپنا بھی فائدہ ہو اور اس کیساتھ دوسروں کا بھی فائدہ۔ اور اِكْتَسَبَ کے معنی ہوتے ہیں ایسا کام جو محض اپنے فائدے کے لئے کیا جائے۔ اب آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ جو شخص اس لئے کمائی کرتا ہے کہ اس سے اُسے بھی فائدہ پہنچے اور دوسرے لوگوں کو بھی تو یہ وہ کارِ خیر ہے جس کا اُسے نہایت منفعت بخش صلہ ملیگا اور جو شخص محض اپنے فائدے کیلئے کچھ کرتا ہے دوسروں کا کوئی خیال نہیں کرتا تو ایسی روش زندگی کا انجام نقصان رساں یا تباہ کن ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کے اندر کیسے کیسے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسلئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ نے اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ بقائے دوام اسی عمل کے لئے ہے

جو عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس کے بعد کہا کہ جماعتِ مومنین ان اصولوں کو سامنے رکھ کر آمادہ بہ عمل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے آدم (آدمی) کا سب سے پہلا تعارف یہ

نسیان عزم کی کمزوری ہے

کہہ کر کرایا تھا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (۲۰/۱۱۵) "ہم نے آدم کو ایک حکم دیا تھا لیکن وہ اسے بھول گیا۔ اس سے بھول ہو گئی"۔ (ضمناً) انسان میں نسیان کی جو وجہ قرآن نے بتائی ہے وہ ایک عظیم نفسیاتی حقیقت کا بیان ہے۔ کہا کہ یہ اسکے عزم کی ناپختگی کا نتیجہ تھا۔ اگر عزم پختہ ہو تو انسان اپنے مقصد یا منزل کو بھولتا نہیں۔ یہ عزم کی ناپختگی ہے جس سے خیال کسی دوسری طرف ہٹ جاتا ہے اور انسان اصل مقصد بھول جاتا ہے۔ (بہرحال) آدم سے بھول ہو گئی لیکن جب اسے اس کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اپنی غلطی پر اظہارِ ندامت کیا اور آئندہ سے محتاط رہنے کا اقرار۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (۷/۲۳)۔ "انہوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اس عہد فراموشی سے ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اگر تو ہمیں اسکے تخریبی نتائج سے محفوظ رکھ کر ہماری نشوونما کا سامان بہم نہیں پہنچائیگا تو ہم تباہ ہو جائینگے"۔ اسکے جواب میں کہا گیا کہ اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور تم نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے تو تمہاری بازآفرینی کا امکان ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸)۔ "تم میرے ضابطہ ہدایت کا اتباع کرو۔ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو جائیگا جو تمہارے سہو و خطا سے تمہیں پہنچ سکتا تھا"۔ تفصیل جلد دوم۔ زیرِ آیت (۲/۳۸) صـ۱۳۳ پر گذر چکی ہے)۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے زیرِ نظر آیت میں مومنین کے دل سے ابھر کر لب پر آنے والی آرزوؤں اور التجاؤں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

مومنین کی دعائیں

کہ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ (۲/۲۸۶)۔ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر ہماری فوری گرفت نہ ہو جائے۔ ہمیں مہلت دی جائے کہ ہم اس غلطی کا ازالہ کر لیں"۔ (اسی کو توبہ کہتے ہیں جس کے متعلق جلد اول۔ زیرِ آیت (۲/۵۴) صـ۲۶ ؛ جلد دوم زیرِ آیت (۲/۱۶۰) صـ۲۶۶ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے)۔ "اگر ہمیں اسکے ازالہ کیلئے مہلت نہ ملی تو ہمارا حشر بھی وہی ہو گا جو ہم سے پہلے تباہ ہونے والی قوموں کا ہوا تھا! ہمیں اس سے بچا لے"۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ (۲/۲۸۶)۔ وہ قومیں اپنے جرائم کی وجہ سے ایسے بوجھ کے نیچے دب گئی تھیں جس نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۹۱/۱۴) "خدا کے قانونِ مکافات نے انکے جرائم کی وجہ سے ان پر اس طرح روڈ رولر پھیر دیا کہ وہ زمین کیساتھ بالکل ہموار ہو گئے"۔ بار الٰہا! ہماری یہ حالت نہ ہو۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (۲/۲۸۶) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! ہم پر اتنا بوجھ نہ لاد دینا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو"۔ یہ ترجمہ خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے بندوں پر اتنا بوجھ بھی لاد دیا کرتا ہے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ یہ تو (معاذ اللہ) ظلم ہے۔ استبداد ہے۔ بڑی زیادتی ہے۔ اسی قسم کا تصور سورہ فاتحہ کی آیت (۱/۶) کے غلط ترجمہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس مقام پر (غلط ترجمہ

کی رُو سے) یہ کہا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! دکھا ہمیں سیدھی راہ۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ کہ اُن لوگوں کی راہ جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوگئے"۔ اس سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے گویا خدا لوگوں کو ان راہوں پر بھی ڈال دیا کرتا ہے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائیں اور مومن اس کی دعائیں مانگتے ہیں کہ کہیں ہمارے ساتھ ایسا نہ کر دینا۔ (تفصیل جلد اول ص۵۲ پر گزر چکی ہے) آپ نے غور کیا کہ اس قسم کی آیات کے غلط ترجمہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

زیرِ نظر آیت کا مروجہ ترجمہ (ہم پر اتنا بوجھ نہ لاد دینا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو) ایک تو اس لئے غلط ہے کہ ابھی ابھی خدا کا یہ ارشاد ہماری نظروں سے گزر چکا ہے کہ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲:۲۸۶)۔ "خدا کسی کی وسعت سے زیادہ اسے مکلف ہی نہیں ٹھہراتا"۔ ایسے خدا کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی پر اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا کرتا ہے، قرآن میں تضاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷:۱۵۷)۔ "وہ نوعِ انسان کو ان بوجھوں سے آزاد کر دیگا جن کے نیچے وہ دبی چلی آ رہی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ پھینکے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے"۔ اس خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ انسانوں پر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال دیا کرتا ہے، غلط ہے لیکن جن لوگوں کے نزدیک خدا کی ایک صفت اَلْمُضِلُّ بھی ہے (یعنی (معاذ اللہ) گمراہ کرنیوالا) وہ اگر ان آیات کے اس قسم کے ترجمے کر دیں تو ہمیں تعجب کی کونسی بات ہے؟

آیت کا یہ ٹکڑا درحقیقت اسکے اس حصہ کا ضمیمہ ہے جس میں کہا گیا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲:۲۸۶) خدا انسان پر جو ذمہ داری ڈالتا ہے اس سے اس کی وسعتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ میں کہا یہ گیا ہے کہ ہم پر جس قدر ذمہ داری عائد کی جائے اسی نسبت سے ہماری قوتِ برداشت میں اضافہ ہو جائے یعنی ذمہ داری کے عائد ہونے کے ساتھ ہی وُسْعَهَا کا عمل شروع ہو جائے۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کا اپنی قوم سے خطاب ہے کہ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ میرا ارادہ اور مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق تم[1] میں اصلاح کرتا رہوں۔ اس کے بعد ہے وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۱:۸۸)۔ "لیکن میری استطاعت (قوتِ عمل) اور تمہاری اصلاح کے لئے جو کچھ اور جس قدر چاہیئے، ان میں مطابقت قانونِ خداوندی کی رو سے پیدا ہوگی"۔ توفیق کے معنے دو چیزوں میں مطابقت پیدا ہو جانا ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنے ارادوں اور کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کرتے ہیں کہ وَبِيَدِهِ التَّوْفِيْقُ۔ یعنی ہمارے ارادوں اور مطلوبہ نتائج میں مطابقت خدا کے قوانین کی رُو ہی سے ممکن ہے۔ یعنی ان ارادوں کو کامیاب کرنے کیلئے جس قدر استطاعت درکار ہے وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہی سے حاصل ہوگی۔ یہ معنی ہیں رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے۔ اگر یہ توفیق (مطابقت) نہ ہو تو پھر (حسرت کے الفاظ میں) کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں　　میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

مومنین کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ہمارا شوق بلند ہو اسی نسبت سے ہماری ہمتوں میں بلندی پیدا ہوتی جائے۔ اس لئے کہ ؎ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔

اس کے بعد مومنین کی اگلی آرزوؤں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا (۲:۲۸۶) اگر ہم

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری تصنیف "کتاب التقدیر"۔

سے کوئی بھول چوک ہوجائے تو ہمیں اس کی بھی توفیق ہو کہ ہم اپنے حسنِ عمل سے اس کے غلط نقوش اور مضر اثرات کو مٹا سکیں عفو کے معنیٰ مٹا دینا ہے۔ غلط نقوش مٹتے کس طرح ہیں، اس کے متعلق یہ اصول بتا دیا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ "اعمالِ حسنہ غلط اعمال کے تخریبی نتائج کا ازالہ کر دیتے ہیں"۔ وَاعْفُ عَنَّا کے یہی معنیٰ ہیں۔ یعنی ہمیں اس کا موقع عطا کر دے کہ ہم ایسا کر سکیں اور اس طرح وَاغْفِرْ لَنَا۔ ہم ان کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہ سکیں۔ وَارْحَمْنَا اور ہماری ذات کی نشو و نما کئے جا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام دعاؤں میں مخاطب اللہ کو کیا گیا ہے۔ اگلے دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے (محاکاتی انداز میں) یوں سمجھئے کہ ان دعاؤں کے سننے کے بعد خدا کی طرف سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم ہم سے یہ کچھ کیوں مانگ رہے ہو؟ اس کا جواب دو لفظوں میں یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ، اسلئے کہ

اَنْتَ مَوْلٰىنَا۔ (۲/۲۸۶)

تو ہی تو ہمارا آقا، ہمارا کارساز، ہمارا سرپرست، ہمارا حامی و ناصر، ہمارا آخری سہارا ہے۔ تجھ سے نہ مانگیں تو اور کس سے مانگیں۔

تیرے سوا کوئی شائستہ وفا بھی تو ہو — ہیں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

لفظ "مولٰنا" کے معانی، سابقہ صفحات میں ولی یا اولیاء اللہ کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مؤمن کا

اَنْتَ مَوْلٰىنَا

ایمان اور اس کی پکار اَنْتَ مَوْلٰىنَا ہے۔ یعنی مولا صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی کو مولا سمجھنا کھلا ہوا شرک اور ایسا کہنا، اس شرک کا اعلان ہے۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ یہ جو ہم قدم قدم پر انسانوں کو "مولٰنا" یا مرشدی و مولائی کہتے ہیں تو قرآنِ کریم کی رُو سے اسے کیا کہا جائیگا!

ان تمام آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد آخر میں بتایا گیا کہ ان سے ہمارا مقصود و منتہیٰ کیا ہے! ہم ایسی قوتیں اور صلاحیتیں کیوں چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (۲/۲۸۶)۔ دنیا میں جتنی قوتیں حق کی مخالف اور دینِ خداوندی کی راہ میں حائل ہوں، ہمیں ان پر غلبہ و تسلط حاصل ہو جائے اور اس طرح لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (نظامِ خداوندی آخر الامر تمام انسان ساز نظاموں پر غالب آجائے) کی حقیقت منتظر لباسِ مجاز میں ہمارے (اور ساری دنیا کے) سامنے آجائے۔

بارالہا! ہماری ان آرزوؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرما!

—— (۰) ——

ان حسین آرزوؤں اور درخشندہ امیدوں کے ساتھ سورۃ بقرہ اور اس کے ساتھ مطالب الفرقان کی تیسری جلد

اختتام تک پہنچ گئی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

قرآن کریم کی ایک سورۃ (بقرہ) کی تفسیر مطالب الفرقان کی تین جلدوں کو محیط ہوئی ہے اور اس کے باوجود میری تسکین اور تسلی نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ

حسن این قصہ عشق است، در دفتر نمی گنجد

اس کے بعد بیدہ التوفیق۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انڈکس

مطالب الفرقان جلد اول، دوم و سوم مشتمل بر سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ

جلد اوّل —— سورہ فاتحہ —— (۱:۱-۷)

جلد اول —— سورہ بقرہ —— (۲:۱-۲۹)

جلد دوم —— سورہ بقرہ —— (۲:۳۰-۱۱۲)

جلد سوم —— سورہ بقرہ —— (۲:۱۱۳-۲۸۶)

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدیں یوں تو سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہیں، لیکن چونکہ یہ تصریف آیات کے اصول کے مطابق مرتب کی گئی ہیں، اس لئے ان جلدوں میں قرآن کریم کے بیشتر اہم حقائق و احکام آگئے ہیں۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوا کہ ان تین جلدوں کا جامع انڈکس شائع کر دیا جائے تاکہ زیر نظر موضوع کی تلاش میں آسانی رہے۔ اس انڈکس کے مرتب کرنے میں بڑی کاوش اور احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان رہتا ہے۔ اسی امکان کے پیش نظر متعلقہ جلد کے صفحہ نمبر کے ساتھ آیت کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے کہ اگر صفحہ نمبر میں غلطی ہو گئی ہو تو متعلقہ آیت کو دیکھ لیا جائے۔ اگر اس کے باوجود حوالہ صحیح نہ ملے تو براہ کرم ہمیں مطلع فرما دیا جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ!

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
الف			
ابتلاء کے معنی	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)
ابتلاء کا مفہوم	سوم	۱۱،۴۰	(۲:۱۲۴؛۱۵۵)
(حضرت) ابراہیمؑ کا خدا سے درخواست کرنا کہ مجھے بتا تو مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے	دوم	۲۷۴	(۲:۵۵)
حضرت ابراہیم۔ امت مسلمہ کا مؤسس			
حضرت ابراہیم کی بادشاہ سے مناظرہ			
حضرت ابراہیم کی داستان جلیلہ ز ابتلاء۔ امامت	سوم	۴۰-۳۷	(۲:۱۲۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ابلیس	دوم	۴۲	تمہید سرگذشت آدم
ابلیس اور آدم کی معصیت میں فرق	دوم	۱۰۱	(۲:۳۴)
ابن السبیل کی امداد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
ابن اللہ کے باطل عقیدہ کی تردید	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
ابن مسکویہ اور نظریۂ ارتقاء	اول	۲۲	(۱:۲)
اثری انکشافات کی اہمیت	دوم	۱۵۴	(۲:۴۰)
اثم و عدوان	دوم	۳۵۶	(۲:۸۵)
" "	سوم	۲۵۸؛۳۱۷	(۲:۲۰۶)(۲:۲۱۹)
اجتماعی نظام کا نام اسلام ہے	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
اجرتوں کا نظام باطل ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
احبار و رہبان کے خلاف حضرت عیسیٰ کے وعظ	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
احسان۔ جنگ کے قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو	دوم	۳۵۳	(۲:۸۵)
احسن الخالقین	اول	۲۸۷	(۲:۲۱)
احمدؐ	اول	۷	(۱:۱)
اختلافات۔ ہمارے اختلافات کیسے مٹ سکتے ہیں؟	سوم	۷	(۲:۱۱۳)
اختلافات کتاب اللہ کی حکمرانی سے مٹ سکتے ہیں	سوم	۹	(۲:۱۱۳)
اختیار و ارادہ۔ انسان کی خصوصیت	اول	۴۲	(۱:۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
آخرت پر ایمان	اول	۱۴۴	(۲:۴)
اخروی زندگی کی اہمیت	اول	۳۴۹	(۲:۲۸)
اخروی زندگی پر غور و فکر	سوم	۳۲۷	(۲:۲۱۹)
آدم۔ (آدمی ہی مراد ہے)	دوم	۹۱	(۲:۳۰)
آدم کی توبہ اور اصلاح کی گنجائش	دوم	۱۳۳	(۲:۳۷)
اذان	اول	۱۲۴	(۲:۳)
اذن اللہ کا مفہوم	سوم	۴۲۵	(۲:۲۵۰)
ارتداد کا قرآنی مفہوم (نیز دیکھئے مرتد)	اول	۵۷	(۱:۷)
ارتقاء کا نظریہ	اول	۱۷	(۱:۱)
ارتقاء۔ عمومی اور فجائی	اول	۲۱	(۱:۳)
" "	اول	۲۹۰	(۲:۲۱)
ارض کے فراش ہونے کا مطلب	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
ارض (زمین) پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)
ارض پر ذاتی ملکیت رسول اللہ کے زمانے ہی میں کم ہو گئی تھی	اول	۳۰۷	(۲:۲۲)
ارض و سما کی تخلیق	اول	۳۵۲	(۲:۲۹)
ارض مقدس پر بنی اسرائیل کے قبضے کا واقعہ۔ دوں ہمتی کی انتہا	دوم	۲۹۴	(۲:۵۹)
(موجودہ) ارکانِ اسلامی کا برقرار	اول	۱۳۷	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکھنا ضروری ہے			
آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد کی	اول	۸۴	(۲:۳)
غلط نگہی)			
آزمائش ۔ خدا بندوں کی	دوم	۲۲۱	(۲:۴۹)
آزمائش نہیں کرتا			
ازواج کے معنی ۔ ہم آہنگ رفقاء	اول	۳۳۸	(۲:۲۵)
استبدال و استخلافِ قومی	اول	۱۹۳	(۲:۷)
"	سوم	۲۸۵	(۲:۲۰۹)
استہزا ۔ دنائت کی آخری حد	اول	۲۴۷	(۲:۱۴)
استخلاف فی الارض	اول	۳۰	(۱:۳)
استخارہ	سوم	۳۱۶	(۲:۲۱۹)
استکبار فی الارض بغیر الحق منع ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
استعانت	اول	۳۷	(۱:۴)
استعانت بالصبر والصلوٰۃ	اول	۳۹	(۱:۴)
" "	دوم	۲۲۲	(۲:۴۵)
" " "	سوم	۱۰۹	(۲:۱۵۳)
استغناء کی کیفیت	سوم	۴۷۳	(۲:۲۷۳)
استنتاجی طریق ۔ نتائج خود بتا	سوم	۷۶	(۲:۱۳۹)
دینگے کہ کونسا نظام سچا ہے			
اسٹیٹ ۔ دورِ حاضر کا بت	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
اسلاف کے متعلق بحثوں میں	سوم	۶۹	(۲:۱۳۴)
مت پڑو۔			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
اسلام اجتماعی نظام کا نام ہے	دوم	۲۱۱-۲۱۶	(۲:۴۳)
(ہمارا مروجہ) اسلام کس طرح غیر اسلامی	اول	۱۲۳	(۲:۳)
عقائد و مسالک کا مجموعہ بن گیا ہے			
" " "	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
(صرف) اسلام ہی کیوں سچا دین ہے	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
اسلام عمر بھر کا مسلسل پروگرام ہے	سوم	۶۸	(۲:۱۳۲)
"اسلام یا تلوار" کا گمراہ کن پراپیگنڈہ	سوم	۲۶۶	(۲:۱۹۳)
اسلام کی تشریح و توضیح	سوم	۲۸۲	(۲:۲۰۸)
اسلام کے اصولوں میں لچک نہیں۔	اول	۱۷۸	(۲:۶)
اسلامی نظام نوعِ انسان کی	اول	۲۰	(۱:۱)
ربوبیت کا ذمہ دار			
" رسول اللہ کے بعد	اول	۳۱	(۱:۳)
" اس کے بنیادی مقاصد	سوم	۱۵۶-۱۵۷	(۲:۱۷۷)
اسم سے مراد صفتِ خداوندی ہے	اول	۲	بسم اللہ
(بسم اللہ)			
اسم اعظم	دوم	۳۹۲	(۲:۱۰۲)
اسماء سے مراد ۔ اشیائے فطرت کا علم	دوم	۸۲	(۲:۳۱)
اسمائے خداوندی سے مراد	سوم	۱۴	(۲:۱۱۴)
(حضرت) اسمٰعیل کی حجاز کی طرف	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
نقلِ مکانی			
تورات کا افسانہ	سوم	۵۳	(۲:۱۲۴)
اسوۂ ابراہیمی کے اتباع کا حکم	دوم	۳۴۸	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
اسوۂ ابراہیمی کے اتباع کا حکم	سوم	۴۵۵	(۲:۲۵۸)
اسوۂ حسنہ	اول	۲۲۳	(۲:۹)
" "	سوم	۴۵۶	(۲:۲۵۸)
اشتراکیت اور اسلام کا فرق	دوم	۲۰۲	(۲:۴۳)
"اشرف المخلوقات" کا تصور صحیح نہیں	دوم	۴۱	سرگزشت آدم
اصحاب الفیل	سوم	۲۵۳	(۲:۱۹۹)
اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے کا طریق	دوم	۲۳۵	(۲:۴۸)
اصلاح اور فساد کا مفہوم	اول	۲۳۱	(۲:۱۱-۱۲)
(دین کے) اصول و جزئیات کا باہمی تعلق	اول	۱۲۵	(۲:۳)
اصول ناقابل تغیر، جزئیات قابل تغیر	دوم	۳۱۷	(۲:۷۱)
اضداد (کے تقابل سے وضاحت)	اول	۵۴	(۱:۷)
اطاعت — ایمان کے بعد سمجھ سوچ کر اطاعت	سوم	۴۹۱	(۲:۲۸۵)
اعراب نے یہودیوں کے زیر اثر منافقت اختیار کر لی تھی	اول	۲۰۹، ۲۰۲	(۲:۸، ۹)
اعمال نامہ الحق ہے	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
"اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم" کا مفہوم	دوم	۳۱۲	(۲:۶۷)
افتراق وہ ملعونہ شجر ہے جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
افلاطون کا نظریہ کائنات	دوم	۸۷	(۲:۳۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(نشۂ) اقتدار کی بدمستیاں	اول	۱۶۷	(۲:۶)
آل کے معنی	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)
الاعلیٰ	سوم	۴۳۸	(۲:۲۵۵)
اللہ — صاحب اقتدار (اللہ کے سلسلے میں عنوان خدا بھی دیکھیے)	اول	۸-۹	(۱:۱)
الٰہ الارض بھی خدا ہے اور الٰہ السما بھی	اول	۳۰۰	(۲:۲۲)
الہام کا ذکر قرآن میں نہیں	اول	۹۶	(۲:۳)
الفاظ پر زور — معانی سے روگردانی	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
(باہمی) الفت (کے بجائے جنگ و جدال غضب خداوندی ہے)	اول	۵۴	(۱:۷)
اللہ کا صحیح تصور	اول	۱۰	(۱:۱)
	اول	۸۸	(۲:۳)
اللہ اکبر کا مفہوم	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
اللہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے اس کا مفہوم	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
اللہ اکبر کا مفہوم	سوم	۲۰۰	(۲:۱۸۷)
(حمل) امانات کا مفہوم	سوم	۱۶۴	(۲:۱۷۷)
امانت — حمل امانت کا مفہوم	دوم	۳۹	سرگزشت آدم
امانی کے معنی	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)
(تشکیل) امت کے دو اساسی عنصر	اول	۱۳۸	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
امت کی تشکیل	دوم	۲۱۱ تا ۲۱۹	(۲:۱۴۳)
امتِ مسلمہ کی خصوصیات	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
امتِ مسلمہ کی تشکیل، امتِ واحدہ	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
امر ۔ عالمِ امر	اول	۲۸۳	(۲:۲۰-۲۱)
امر ۔ عالمِ امر و عالمِ خلق	اول	۲۸۳	(۲:۲۱)
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
امنِ عالم کے ذمہ دار	اول	۸۷	(۲:۳)
آمروں کا بظاہر دبدبہ لیکن درحقیقت بزدلی	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)
امی کے معنی	دوم	۳۳۷	(۲:۷۸)
آمروں کا مسلک ۔ اپنے حریفوں کو ذلیل کرکے خوش ہونا	دوم	۱۰۷	(۲:۳۴)
ب			
بابل سحرکاری کا اولین مرکز	دوم	۳۹۹	(۲:۱۰۲)
(ال) باری کا مفہوم	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
باطل پر مبنی نظام پنپ نہیں سکتا	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)
باطل کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
باطل کے معنی	دوم	۱۹۶	(۲:۴۲)
باطل اور حق کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
باطنی علم کا عقیدہ ۔ یہودیوں میں	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
باطنیت ۔ سحر کی	دوم	۴۱۳	(۲:۱۰۳)
پیداوار اور تصوف کی بنیاد	سوم	۱۲۶	(۲:۱۵۹)
باطنیت ۔ یہودیوں کے ہاں	دوم	۴۰۸;۳۹۲	(۲:۱۰۲-۳)
عیسائیوں کے ہاں	دوم	۴۱۱	″
خود مسلمانوں کے ہاں	دوم	۴۱۴	″
بپتسمہ (یا اصطباغ) کا عقیدہ اور رسم	سوم	۷۵	(۲:۱۳۸)
بخت نصر کا حملہ	دوم	۱۹۰	(۲:۴۰)
حزقیل نبی کا خواب	دوم	۱۹۱	″
بخشش کا تصور غیر قرآنی ہے	دوم	۲۸۸	(۲:۵۸)
بدیع السمٰوٰت والارض	اول	۲۸۳-۹۲	(۲:۲۱)
بر کے معنی	دوم	۲۱۹	(۲:۴۴)
بر کی راہ کون سی ہے	سوم	۱۵۷	(۲:۱۷۷)
برہمو سماج کی تحریک	اول	۸۳	(۲:۳)
برہمو سماجی اسلام	اول	۸۳	(۲:۳)
برفو (BRIFFAULT) کی شہادت	اول	۲۶۹	(۲:۱۹)
برق	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
برنباس کی انجیل کی شہادت	دوم	۱۶۵	(۲:۴۰)
"بسم اللہ" وحی ہے (بسم اللہ)	اول	۲۴	(۱:۲)
بسم اللہ کی مزید تشریح	..	..	..

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(خلاصہ بسم اللہ۔ سورہ فاتحہ کے آخر میں)	اول	۶۴	(۱:۲)
بشرٌ مثلکم	اول	۳۱۱	(۲:۲۳)
بصر اور نظر کا فرق	اول	۱۶۸	(۲:۶)
بعثت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۸۱	(۲:۵۶)
بقر (گائے) ذبح کرنے کا واقعہ بنی اسرائیل کا	دوم	۳۱۱	(۲:۶۷)
بلاء کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۴۱	(۲:۴۹)
بناء ۔ سماء کو بناء بنایا	اول	۲۹۵	(۲:۲۲)
بندر بن جانا ۔ اصحاب سبت کا	دوم	۳۰۷	(۲:۶۵)
بنی اسرائیل کی داستان ۔ ابتداء سے آخری تباہی تک	دوم	۱۷۱	(۲:۴۰)
بنی اسرائیل کے دس گم گشتہ اسباط (قبائل)	دوم	۱۵۹	(۲:۴۰)
بنی اسرائیل کو نعماتے خداوندی کی یاددہانی	دوم	۲۲۸	(۲:۴۷)
بنی اسرائیل کے عجیب وغریب	دوم	۲۲۹	(۲:۴۸)
عقائد۔ نجات کے متعلق	سوم	۳۳	(۲:۱۲۲-۲۳)
بنی اسرائیل نے سمندر کیسے پار کیا تھا؟	دوم	۲۴۵	(۲:۵۰)
بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو کس طرح ستایا؟	دوم	۲۷۵	(۲:۵۵)
بنی اسرائیل کے قتل کا واقعہ	دوم	۳۲۳	(۲:۷۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
بنی اسرائیل نے دین کو اپنی نسل تک محدود کر دیا	دوم	۳۰۵	(۲:۶۱-۶۲)
بھوک (اور خوف) عذابِ خداوندی ہیں	اول	۵۲	(۱:۶)

پ

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
پارٹیوں میں بٹ جانا عذاب ہے۔	دوم	۱۷۲	(۲:۴۰)
پاکستان کی تحریک کے دوران، نیشنلسٹ علماء اور اقبالؒ میں وجہ نزاع	دوم	۱۰۶	(۲:۳۴)
پاکستان کی تحریک کے دوران، نیشنلسٹ علماء کا مسلک	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
پاکستان میں سیکولرازم	دوم	۳۶۲	(۲:۸۵)
پانی کے چشمے ۔ بنی اسرائیل کے	دوم	۲۹۷	(۲:۶۰)
پرستش ۔ مذہب میں عبادت، پرستش میں تبدیل ہو جاتی ہے	اول	۳۶	(۱:۴)
پلڑوں کا جھکنا اور اٹھنا ۔ قانونِ مکافات و مہلت	اول	۱۹۷	(۲:۷)
پندار نفس کی بنا پر انکار	اول	۱۶۶	(۲:۶)
پیش گوئیاں اور روایات	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)
پیش گوئیوں کی حقیقت	اول	۹۵	(۲:۳)
پیمان شکن	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)

ت

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
تابوتِ سکینہ (بنی اسرائیل کا)	سوم	۴۲۲	(۲:۲۴۷)
تاریخ سے مفہوم	دوم	۱۵۰	(۲:۴۰)
تاریخ کی اہمیت — قرآن کی رو سے	״	״	״
تاریخ کی مادی تعبیر — مارکسی نظریہ	״	۱۵۱	״
تاریخی شواہد — قرآنی دعاوی کی صداقت کی دلیل	اول	۹۴	(۲:۳)
تالمود (یہودیوں کی فقہ اور روایات کی کتاب)	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
تبلیغ بہرحال کئے جاؤ	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)
تبلیغی جماعت	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
تثبیتِ نفس	سوم	۴۶۶	(۲:۲۶۵)
تجارت کا غلط نظام وجہ فسادِ آدمیت	اول	۲۳۷	(۲:۱۱-۱۲)
تجارت اور ربٰو میں فرق	سوم	۴۸۲	(۲:۲۷۹)
تجرباتی طریق — عقل کا	اول	۲۵۸	(۲:۱۷)
تحاکم الی الطاغوت — شیوۂ منافقین	اول	۲۱۵	(۲:۹)
تحریف — سابقہ کتب میں	دوم	۱۸۳	(۲:۴۱)
تخلیقِ خداوندی میں اضافے	اول	۱۶-۲۲	(۱:۱)
	اول	۲۸۸	(۲:۲۱)
تخلیقی قوت انسان میں	اول	۲۹۰	(۲:۲۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
تخلیقی قوت انسان میں	دوم	۲۴۳	(۲:۸۳)
(خدا کا عمل) تخلیقی ہے۔ تولیدی نہیں	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
ترتیبِ قرآن	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
تزکیۂ نفس	دوم	۲۵	(۲:۳۰)
تسبیح سے مراد	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
تسخیرِ فطرت	دوم	۶۸	سرگزشت
״ ״	״	۸۳	(۲:۳۱)
״ (مقامِ آدم اور مقامِ مومن)	دوم	۸۶	(۲:۳۱)
تصوف کی غلط نگہی	اول	۴۵	(۱:۵)
(الیہ راجعون کا غلط مفہوم)	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
تصوف پر تفصیلی بحث	دوم	۴۰۸	(۲:۱۰۳)
تصوف اور علامہ اقبالؒ	دوم	۴۲۷	(۲:۱۰۳)
	سوم	۴۴۶	(۲:۲۵۷)
تصوف کا غلط نظریہ — علو اور کبریائی مومن کا حق ہے	اول	۲۳۴	(۲:۱۱-۱۲)
تصوف اور دین میں فرق	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
تصوف، خدا کی ذات بے نقاب دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے	دوم	۲۷۸	(۲:۵۵)
تعاون کے لئے شفاعت کا لفظ	دوم	۲۳۵	(۲:۴۸)
تعدّدِ ازواج	سوم	۳۴۵	(۲:۲۲۱)
تعویذ — گنڈے	دوم	۴۱۹	(۲:۱۰۲)
تغیّر و ثبات کا امتزاج	اول	۱۲۹	(۲:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(ہماری کتب) تفاسیر میں قصۂ آدم	دوم	۱۴۲	(۲:۳۹)
تفرقہ انگیزی خدا کا عذاب ہے	اول	۱۹۳	(۲:۷)
	سوم	۲۹۰	(۲:۲۱۳)
تفرقہ انگیزی ـ منافقین کا شعار	اول	۲۱۵	(۲:۹۱)
(مسجد ضرار کی تعمیر)	〃	〃	〃
تفرقہ عذاب ہے	دوم	۱۷۲	(۲:۴۰)
تفرقہ یہودیوں میں	اول	۱۹۱	(۲:۴)
تفرقہ ـــ قوم کو تفرقہ سے بچانے کے لئے عارضی شرک تک برداشت کیا گیا	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
تفریق بین الرسل	سوم	۳۶	(۲:۱۲۴)
	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
(ہماری کتب) تفسیر کی حقیقت	دوم	۳۹۷	(۲:۱۰۲)
تقدیر ـ آغازِ کار انسان کے	سوم	۱۰۵	(۲:۱۵۲)
ہاتھ میں ہے	سوم	۳۲۵	(۲:۲۱۹)
تقدیر ـ (عقیدۂ جبر گمراہی ہے)	اول	۶۳	(۱:۷)
〃 〃	〃	۱۶۳	(۲:۶)
〃 〃	〃	۱۸۰-۸۴	(۲:۷)
تقدیراتِ الٰہیہ ہی قوانینِ خداوندی ہیں۔	اول	۲۷۴	(۲:۲۰)
	سوم	۴۲۰	(۲:۲۴۷)
تقدیس کا مفہوم	دوم	۷۵	(۲:۳۰)
تقلید (کی تباہ کاریاں)	اول	۶۰	(۱:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
تقلید (کی تباہ کاریاں)	اول	۱۶۴	(۲:۶)
	〃	۳۰۷	(۲:۲۲)
	سوم	۱۳۸	(۲:۱۷۰)
تقوٰی کا مفہوم	اول	۷۵	(۲:۲۱)
تکذیبِ دین کا مفہوم	دوم	۱۳۶	(۲:۳۹)
〃 〃 کرنے والے	سوم	۴۵۴	(۲:۲۰۲)
تلاوتِ قرآن پاک ـ مفہوم سمجھے بغیر	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)
تلاوت کے معنی قرآن مجید کا اتباع کرنا ہے	سوم	۳۲	(۲:۱۲۱)
تلاوت بغیر سمجھے	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
تمکن فی الارض ـ خدا کا انعام ہے	دوم	۱۷۶	(۲:۴۰)
〃 〃 بنی اسرائیل کے لئے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
تناسخ کا باطل نظریہ	اول	۴۴	(۱:۵)
	سوم	۱۳۴	(۲:۱۶۷)
تنذیر کا مفہوم	اول	۱۶۱	(۲:۶)
توّاب	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
توبہ کا مفہوم	اول	۲۶	(۱:۲)
	دوم	۲۶۶	(۲:۵۴)
تورات کی تاریخ	دوم	۱۸۴	(۲:۴۱)
تورات میں قصۂ آدم	دوم	۱۳۹	(۲:۳۹)
تولید اور تخلیق میں فرق	اول	۲۸۳،۹۲	(۲:۲۱)
〃 〃 〃	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
توہم پرستی کے خلاف	سوم	۲۳۴	(۲:۱۸۹)
(مذہبی رسوم ومناسک توہم پرستی			
پر مبنی ہوتے ہیں)			
ث			
ثبات وتغیر کا حسین امتزاج	اول	۱۲۹	(۲:۳)
ثمن قلیل — دنیا کی ہر متاع آخرت	اول	۲۵۷	(۲:۱۶)
کے مقابلے میں ثمن قلیل ہے			
ثنویت (دو خداؤں کا عقیدہ)	دوم	۱۸۲	(۲:۴۰)
	اول	۱۳-۱۴	(۱:۱)
ثنویت (شرک ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)
״ (غضب خداوندی اور	״	۵۷	(۱:۷)
ارتداد ہے)			
״ کفر ہے	״	۱۷۱	(۲:۶)
ج			
جادو — رسول اللہ پر	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۲)
جادو کی حقیقت	دوم	۴۰۴	(۲:۱۰۲)
جبر کا عقیدہ پستیٔ کردار کی علامت ہے	دوم	۱۰۰	(۲:۳۴)
جبریل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)
جبلت اور انسان	دوم	۳۲،۴۴	سرگزشت آدم
جہاد (دیکھو جنگ)			

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جہیز	سوم	۳۵۸	(۲:۲۲۱)
جدلیت (ہیگل اور مارکس کا نظریہ)	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)
جذبات اور علم وہدایت کا تعلق	اول	۱۴	(۱:۱)
جذبات سے مغلوب ہو جانے والے	״	۱۴	(۱:۱)
اپنے جذبات کو آلہ بنا لینے والے	״	۱۴	(۱:۱)
(سرکش) جذبات، شیطان کہلاتے ہیں	دوم	۵۰	سرگزشت آدم
جرائم جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کی	دوم	۱۶۲	(۲:۴۰)
تباہی واقع ہوئی			
جرم وسزا کا فلسفہ	سوم	۱۷۱	(۲:۱۷۹)
جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم	اول	۸۹	(۲:۳)
	دوم	۲۳۲	(۲:۴۸)
جزئیاتِ صلوٰۃ اور قرآن	اول	۱۲۵	(۲:۳)
(احکام کی) جزئیات کا تعین	اول	۱۲۵	(۲:۳)
اسلامی نظامِ مملکت کریگا			
جمارا (یہودیوں کا مجموعۂ روایات)	دوم	۱۸۴	(۲:۴۱)
جماعت کی اہمیت	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
جمال وجلال کا سرچشمہ	اوّل	۸	(۱:۱)
جماعتِ مومنین کی اہمیت	دوم	۲۰۱	(۲:۴۳)
جمہوریت (کی غلط نگہی)	اول	۶۲	(۱:۷)
	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
جمہوریت کا باطل نظریہ	״	۴۲۴	(۲:۲۴۷)
جُناح کا مفہوم	״	۱۲۰	(۲:۱۵۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جنّت اور جہنّم کا تمثیلی بیان	اول	۱۴۸	(۲:۴)
	"	۳۳۴	(۲:۲۵)
جنّت کے معنی	اول	۳۳۲	(۲:۲۵)
جنّتِ آدم	"	۳۳۵	(۲:۲۵)
	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
جنّت، اجتماعی زندگی میں ملتی ہے	اول	۳۳۸	(۲:۲۵)
جنّت جانکاہ مشقتوں کے بعد ملتی ہے	اول	۳۳۷	(۲:۲۵)
" " "	سوم	۲۹۶	(۲:۲۱۴)
جنّت کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اسکے دروازے ہر ایک کیلئے کھلے ہیں۔	دوم	۳۷۴	(۲:۱۱۱-۱۲)
جنّت آدم اور جنّتِ مومن میں فرق	دوم	۱۳۸	(۲:۳۹)
حصولِ جنّت کے آسان طریقے	سوم	۲۹۸	(۲:۲۱۴)
جنّت کی شراب	"	۳۲۱	(۲:۲۱۹)
جنسی بدنہادی وجہِ فسادِ آدمیت۔	اول	۲۳۸	(۲:۱۱-۱۲)
جنسی اختلاط کے متعلق بحث			
جنگ اور عیسائیت	دوم	۷۸	(۲:۳۰)
جنگ اور قرآن	دوم	۸۰	(۲:۳۰)
جنگ کا مقصد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے	دوم	۱۹۹	(۲:۴۲)
جنگ کے متعلق تفصیلی بحث	سوم	۲۶۲-۸۰	(۲:۱۹۰-۹۵)
جان کی قربانی	سوم	۲۹۲	(۲:۲۱۶)
جنگِ احزاب کا ہولناک نقشہ	سوم	۲۹۷	(۲:۲۱۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
جنّ و انس	دوم	۵۲	سرگزشتِ آدم
جوّا (میسرہ)	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
جہنّم کے معنی	اول	۳۲۷	(۲:۲۴)
جہنّم کا آغاز یہیں سے ہوجاتا ہے	اول	۱۹۴	(۲:۷)
چ			
چٹپٹی غذاؤں کا مطالبہ۔ بنی اسرائیل کی طرف سے	دوم	۲۹۸	(۲:۶۰)
ح			
حامدون کون ہیں؟	اول	۵	(۱:۱)
حبطِ اعمال ـ اعمال کا بے نتیجہ رہ جانا	سوم	۲۸۸	(۲:۲۱۰)
الحجارۃ کے معنی	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
حجر اسود۔ دیکھئے حج	سوم	۲۵۲	(۲:۱۹۹)
حج سے متعلق احکام	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)
حج ـ عالمگیر انسانیت کا نقطۂ اجتماع	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)
	سوم	۱۲۰	(۲:۱۵۸)
	سوم	۲۳۳	(۲:۱۸۹)
	سوم	۲۳۸	(۲:۱۹۷)
حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کرنا۔	سوم	۲۴۴	(۲:۱۹۹)
حج کے اجتماع میں غیر مسلموں کو دعوتِ مشاہدہ	سوم	۲۳۵	(۲:۱۸۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حدیث کے لفظی معنی	دوم	۳۳۶	(۲:۷۷)
حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟	سوم	۱۷۹	(۲:۱۸۰)
حرام اور حلال کا نظریہ	سوم	۱۴۰	(۲:۱۷۲)
حرام چیزوں کی فقہی فہرستیں	سوم	۱۴۸	(۲:۱۷۳)
حرام چیزوں کی قرآنی فہرست	سوم	۱۴۳	(۲:۱۷۳)
حرام مال سے اجتناب	سوم	۲۰۳	(۲:۱۸۶)
حرث و نسل کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)
حرکت۔ زندگی کا غیر متحرک ہو جانا، عذاب ہے۔	اول	۱۹۰	(۲:۷)
حرمات کے مہینوں کی پابندی	سوم	۲۸۱	(۲:۱۹۴)
حزب اللہ غالب آکر رہیں گے۔	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
حزب اللہ وحزب الشیطان	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
حزقی ایل۔ نبی کا خواب	دوم	۱۶۱	(۲:۴۰)
حسد وانتقام کا جذبہ	دوم	۱۰۹	(۲:۳۴)
حسن، حسنات۔ اعمال حسنہ	دوم	۲۸۹	(۲:۵۸)
الاسماء الحسنیٰ	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸)
حسن کارانہ انداز سے بات چیت	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)
حضانت (بچہ کس کی تحویل میں رہے)	سوم	۴۱۲	(۲:۲۳۷)
حق۔ خدا حق ہے۔ قرآن حق ہے۔ اسلام دین الحق ہے۔ اعمال ناحق ہے	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)
حق کا مفہوم	دوم	۸۹	(۲:۳۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حق کے معنے	دوم	۱۹۵	(۲:۴۲)
(کتمانِ حق)	دوم	۲۰۱	"
حق و باطل کی کشمکش	دوم	۱۹۷	(۲:۴۲)
حقوق اللہ اور حقوق العباد	اول	۱۱۰	(۲:۳)
حقوق اور ذمہ داریاں	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
حقوق اور ذمہ داریوں کا باہمی تعلق	اول	۳۵۴، ۳۵۵	(۲:۲۹)
حقوق و فرائض	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)
حکم اور قانون میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)
حکمت اور کتاب ۔ قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
حکمت اور قوت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲:۲۰۹)
حکومت (اور کتاب و نبوت) انعاماتِ خداوندی سے ہیں	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
حکومت جب منافقین کے ہاتھ میں آجائے۔	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴-۲۰۵)
حکومتِ خداوندی سے مراد کتاب اللہ کی حکمرانی ہے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
حکومت کا غلط نظام فساد ہے	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۵)
حلالہ	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)
حلال اور طیب رزق (نیز دیکھئے عنوان رزق)	اول	۲۹۴، ۳۰۵	(۲:۲۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
حملِ امانت کا مفہوم	دوم	۳۹	سرگزشتِ آدم
حمد اور علوم کائنات	اول	۵	(۱:۱)
حمد کا تفصیلی مفہوم	اول	۳	(۱:۱)
حنیف کا مفہوم	سوم	۷۱	(۲:۱۳۵)
حوادث ارضی وسماوی اور ان سے حفاظت	اول	۲۹۲	(۲:۲۱)
حواریانِ حضرت عیسیٰؑ کی مدافعت	دوم	۳۹۶	(۲:۱۰۲)
حوروں کا مفہوم	اول	۳۳۹	(۲:۲۵)
حیاتِ آخرت	اول	۱۴۹	(۲:۴)
حیات بعد الممات کی اہمیت	اول	۳۴۹	(۲:۲۸)
حیات وممات کا مفہوم	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
خ			
خاسر و نامراد کون ہیں؟	اول	۳۴۵	(۲:۲۷)
ختم اللہ علیٰ قلوبھم کا مفہوم	اول	۱۸۵	(۲:۷)
ختمِ نبوت سے تکمیلِ وحی	اول	۲۴	(۱:۲)
	دوم	۳۶۴	(۲:۸۷)
	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
خدا۔ دیکھئے عنوان "اللہ"			
خدا، انسانی اعمال کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟	اول	۱۸۴	(۲:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
خدا زمان ومکان کی نسبتوں سے بلند ہے	سوم	۱۷	(۲:۱۱۵)
خدا کا غلط تصور ۔ بادشاہ کا سا	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ	دوم	۲۷۶	(۲:۵۵)
	سوم	۲۲	(۲:۱۱۸)
خدا کے ہاں بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی بیوی نہیں	دوم	۳۴۳	(۲:۸۳)
خدع کا مفہوم	اول	۲۰۴	(۲:۹)
خشیت کے معنے	دوم	۳۳۳	(۲:۷۴)
خلافت (دیکھئے "استخلاف فی الارض")			
خلافتِ آدم کا مفہوم	دوم	۶۴	(باب اول)
خلافتِ ارضی ۔ بنی اسرائیل کے لئے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
خلق ۔ عالمِ خلق	اول	۲۷۲	(۲:۲۰)
	"	۲۸۳	(۲:۲۱)
خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ	دوم	۴۴	(۲:۳۰)
خمر	سوم	۳۱۷	(۲:۲۱۹)
(لحم) خنزیر سے متعلق بحث	سوم	۱۴۶	(۲:۱۷۳)
خودی (انسانی ذات)	اول	۱۱	(۱:۱)
خوشنودیٔ باریتعالیٰ کا غلط تصور	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
خوف وحزن خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۴	(۲:۷)
خوف وحزن سے مامونیت	دوم	۱۳۳	(۲:۳۸)
خوفِ خدا کا صحیح مفہوم	دوم	۱۸۰	(۲:۴۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
خیر و شر کا مسئلہ	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)
	؍؍	۲۹۵	(۲:۱۹)
خیر و شر — ان کا مفہوم	دوم	۲۷	(۲:۳۰)
خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں	دوم	۳۸	تمہید سرگزشت آدم (۲:۱۳۰)
د			
درجات و درکات کا معنوی فرق	اول	۲۰۲	(۲:۸)
درود کا مفہوم	سوم	۱۱۳	(۲:۱۵۷)
دعا کا مفہوم	اول	۳۸	(۱:۴)
دعا کا تفصیلی مفہوم	سوم	۲۰۴	(۲:۱۸۶)
دعا کا ضمنی مفہوم	سوم	۱۱	(۲:۱۱۴)
دعائیں — مومنین کی	سوم	۴۹۴	(۲:۲۸۶)
دلائل — قانون اور شمشیر کا باہمی تعلق	سوم	۱۵۳	(۲:۱۲۷)
دنیا اور آخرت دونوں میں حصہ	اول	۱۵۰	(۲:۴)
	سوم	۲۵۵	(۲:۲۰۰)
"دنیا کے مقابلے میں آخرت" کا مفہوم	اول	۲۵۳	(۲:۱۶)
	سوم	۲۵۵	(۲:۲۰۰-۲۰۱)
دنیا میں ذلیل قوم آخرت میں بھی ذلیل ہوگی	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج	اول	۱۴۹	(۲:۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
دنیاوی مفادات کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں	اول	۲۷۱	(۲:۲۰)
دوٹوک بات کرو	دوم	۴۳۰	(۲:۱۰۴)
(زندگی کا) دَوری تصور	اول	۴۴	(۱:۵)
دوستداری کے تعلقات (مغضوب علیہ سے)	اول	۵۹	(۱:۷)
دولت جمع کرنے کی ممانعت	دوم	۲۰۸	(۲:۷۳)
دولت مند طبقہ اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک سمجھتا ہے	اول	۲۴۶	(۲:۱۳)
الدین — خارجی کائنات میں	اول	۲۹	(۱:۳)
؍؍ — انسانی دنیا میں	؍؍	؍؍	؍؍
(یوم) الدین کی خصوصیات	اول	۳۲	؍؍
دین — کتاب اللہ کی حکمرانی کا نام ہے	اول	۳۰	؍؍
دین میں اکراہ نہیں	اول	۴۲	(۱:۵)
	سوم	۲۷۸	(۲:۱۹۰-۹۴)
	؍؍	۴۳۹	(۲:۲۵۶)
الدین، مذہب میں کیسے تبدیل ہوجاتا ہے — ظواہر کو مقصود بالذات سمجھ لینے سے — تغیر پذیر جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے سے	اول	۳۴	(۲:۳)
دین کی سب سے زیادہ مخالفت	دوم	۱۸۸	(۲:۴۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے			
دین، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے	دوم	۱۸۹	(۲:۱۴)
دین ۔ اجتماعی نظام کا نام ہے	دوم	۲۱۳	(۲:۴۳)
دین کا آخرالامر غلبہ	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
دین ۔ یہودیت اور عیسائیت میں قومی تھا۔ قرآن نے اسے عالمگیر قرار دیا۔	دوم	۳۰۵	(۲:۶۱)
دین فروشی	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
دین کے نظام کی تکمیل تدریجاً ہوتی ہے	دوم	۳۶۲	(۲:۸۵)
دین، تمام کا تمام قرآن مجید کے اندر ہے	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۸)
دین کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے	دوم	۳۶۰	(۲:۸۵)
الدین، شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا	سوم	۴	(۲:۱۱۳)
دین میں آمیزش	″	۵	(″)
دین اللہ کا ہوتا ہے۔ اس کی نسبت کسی انسان کی طرف نہیں کرنی چاہیئے	سوم	۷۰	(۲:۱۳۳)
دین کے بنیادی مقاصد	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
دین میں کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں۔	سوم	۲۶۵	(۲:۱۹۳)

ذ

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(انسانی) ذات	اول	۱۱-۱۲	(۱:۱)
	″	۱۶۲	(۲:۶)
ذاتِ انسانی، نفع نقصان کا حقیقی معیار ہے۔	اول	۲۵۳	(۲:۱۶)
(انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی) ذات پر مرتب ہوتا ہے	دوم	۲۲۸	(۲:۴۷)
ذات کی نشوونما، وحی کی رو سے	اول	۲۳	(۱:۲)
	″	۲۵۳	(۲:۱۶)
(صفاتِ خداوندی، انسانی) ذات کی نشوونما کا معیار ہیں	اول	۱۱-۱۲	(۱:۱)
ذات میں اعتدال و توازن	اول	۳۸	(۱:۴)
(انسانی) ذات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے والے	سوم	۶۵	(۲:۱۲۹)
ذبح ابناء کا مفہوم	دوم	۱۷۳	(۲:۴۰)
ذبح بقر کا واقعہ	دوم	۳۱۱	(۲:۶۷)
ذبح کرتے وقت تکبیر کا مفہوم	سوم	۲۰۲	(۲:۱۸۸)
ذرائع اور مقصد میں فرق	سوم	۱۱	(۲:۱۱۴)
ذکر کا مفہوم	دوم	۴۵-۴۷	(۲:۳۰)
	سوم	۱۰	(۲:۱۱۴)
	سوم	۱۰۶	(۲:۱۵۲)
ذلت کی زندگی، آخرت میں بھی عذاب کا موجب ہوگی	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
ذلت کے اسباب	سوم	۱۹۱	(۲:۱۷۷)
ذلت و پستی (غضبِ خداوندی)	اول	۵۵	(۱:۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ذلت وپستی (غضب خداوندی)	اول	۱۹۱	(۲:۷)
ذمہ داریوں اور حقوق کا باہمی تعلق	سوم	۱۰۵	(۲:۱۵۲)
ذی القربیٰ سے حسنِ سلوک	دوم	۳۴۹	(۲:۸۳)
ر			
راجعون (الیہ) کا مفہوم	اول	۲۶۳	(۲:۱۸)
	،،	۴۰	(۱:۵)
	اول	۳۵۰	(۲:۲۸)
رام چندر جی کا اتباع نہیں۔ اسوۂ ابراہیمؑ کا اتباع	دوم	۳۴۸	(۲:۸۳)
رب اور ربوبیت کا مفہوم	اول	۱۶	(۱:۱)
(نظام) ربوبیت کی خصوصیات	سوم	۱۵۴	(۲:۱۷۷)
ربوٰ (سرمایہ داری) کا نظام کفر ہے	اول	۱۷۳	(۲:۶)
ربوٰ کی تفصیلی بحث	سوم	۴۷۴	(۲:۲۷۴)
الرّجال قوّامون علی النساء کی تشریح	سوم	۳۶۳	(۲:۲۲۱)
رجز کے معنی ضعف یا اضمحلال	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
رحمٰن اور رحیم میں فرق	اول	۲۰	(۱:۲)
رحمت کے معنی	اول	۲۰	(۱:۲)
رحم کا صحیح مفہوم۔ عیسائیت کی غلط نگہی	اول	۲۵	(۱:۲)
رزاقیت	اول	۲۸۲	(۲:۲۱)
رزق اللہ ہی رزق کریم اور رزقِ حلال ہو سکتا ہے۔	اول	۲۹۶	(۲:۲۹)
	اول	۳۵۴	(۲:۲۹)
رزق اور اس کی تقسیم	اول	۱۰۵	(۲:۳)
	،،	۳۳۶	(۲:۱۱-۱۲)
رزقِ حلال وطیب	اول	۳۰۵	(۲:۲۲)
رزق کا قرآنی مفہوم	اول	۱۰۵	(۲:۳)
رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۴	(۲:۷)
رزق کی فراوانیاں۔ جنتِ آدم کی خصوصیات	دوم	۱۱۱	(۲:۳۵)
رزق کی اہمیت	سوم	۶۱	(۲:۱۲۶)
رزق کے ساتھ طیب کی شرط	اول	۲۸۳	(۲:۵۷)
رزق کے لئے دعائے ابراہیمؑ	سوم	۶۱	(۲:۱۲۶)
رزقِ کریم کا انتظام	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
رسمی عبادات بے معنی اور بے نتیجہ ہوتی ہیں	دوم	۵۴	باب اول
رسول۔ ہر رسول کا اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں	دوم	۱۹۳	(۲:۱۰)
(ہر) رسول کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
رسول غالب آ کر رہیں گے۔ اس کا مفہوم	دوم	۳۰۲	(۲:۶۱)
رسول کی وفات کے بعد غلبۂ دین	دوم	۳۰۶	(۲:۶۱)
(خود) رسول کو بھی اپنی وحی پر ایمان لانا ہوتا تھا۔	سوم	۴۹۰	(۲:۲۸۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رسول اللہ کی حیات طیبہ بطور اسوۂ حسنہ	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ نے جو معجزانہ کارنامے سرانجام دیئے ان میں فوق الفطرت عناصر کا دخل نہیں تھا	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ کی دو ـــ نبوت اور بشریت	اول	۲۰۲	(۲:۸)
رسول اللہ کے خلاف (معاذ اللہ) الزام تراشیاں	اول	۲۱۲	(۲:۹)
رسول اللہ خدا کے عبد تھے	اول	۳۰۸	(۲:۲۳)
رسول اللہ دعوئے نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے	اول	۳۲۱	(۲:۲۴)
رسول اللہ کی سیرت حضور کا معجزہ تھی	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
رسول اللہ پر قریش تو ایمان لے آئے اہل کتاب نہ لاتے	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
رسول اللہ کی مالی حالت	دوم	۲۱۰	(۲:۴۳)
رسول اللہ کے لئے شافع یا شفیع کے الفاظ نہیں آئے۔ شاہد یا شہید کے الفاظ آئے ہیں	دوم	۲۳۷	(۲:۴۸)
رسول اللہ دل سے چاہتے تھے کہ لوگ ایمان لے آئیں	دوم	۳۳۴	(۲:۷۵ از ۱۱۹)
رسول اللہ نبوت سے پہلے ان پڑھ تھے بعد میں ایسے نہیں رہے تھے	دوم	۳۳۸	(۲:۷۸)
رسول اللہ کی دعا۔ رب زدنی علما	دوم	۳۶۸	(۲:۸۸)
رسول اللہ کی بعثت کے متعلق کتب سابقہ میں ذکر	دوم	۳۶۹	(۲:۸۹)
رسول اللہ پر (معاذ اللہ) جادو	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۳)
رسول اللہ کی یتیمی کی حالت	سوم	۳۲۹	(۲:۲۲۰)
رسول اللہ کی ازواجِ مطہرات	سوم	۳۴۸	(۲:۲۲۱)
رسولوں کا قتل	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
رسولوں کے متعلق لانفرق اور فضلنا بعضھم علی بعض کا مفہوم	سوم	۳۶	(۲:۱۲۴)
	سوم	۴۳	(۲:۱۳۶)
	سوم	۴۳۷	(۲:۲۵۳)
رشد	سوم	۲۰۸	(۲:۱۸۶)
	"	۴۴۰	(۲:۲۵۶)
رشوت کی ممانعت	سوم	۲۰۲	(۲:۱۸۸)
رضا جوئی باری تعالیٰ سے کیا مراد ہے	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
رضاعت	سوم	۴۱۰	(۲:۲۳۳)
رضاعی ماں۔ بہن سے نکاح حرام ہے	"	۳۴۳	(۲:۲۲۱)
رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا مفہوم	سوم	۲۶۰	(۲:۲۰۷)
رعد	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
رقبۃ (فی الرقاب) غلامی کے خلاف جدوجہد۔ تحریر رقبۃ	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
رکوع کا مفہوم	دوم	۲۱۱	(۲:۴۳)
رمی الجمار (حج میں تین شیطانوں کو پتھر مارنا)			دیکھو حج
روایات اور پیش گوئیاں	دوم	۳۵۷	(۲:۸۵)
روایات کی رو سے قصہ آدم		۳۹-۴۴	(۲:۳۹) کے بعد
روح القدس	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷-۹۸)
روح القدس کا ایک مفہوم	دوم	۳۶۵	(۲:۸۷)
روزوں (صیام) کے احکام	سوم	۱۸۴ ۲۲۶	(۲:۱۸۳)
رہن باقبضہ	سوم	۴۸۸	(۲:۲۸۳)
ریب اور شک میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)
ریاکاری	اول	۲۱۳	(۲:۹)
ز			
زاویۂ نگاہ کا فرق	اول	۳۴۲	(۲:۲۶)
(ایتائے) زکوٰۃ — دین کا اہم ستون	اول	۱۰۵	(۲:۳)
(ایتائے) زکوٰۃ۔ صرف اپنا مال نہیں	سوم	۱۶۲	(۲:۱۷۷)
،، کی تاکید	دوم	۴۳۶	(۲:۱۱۰)
زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور قرآنی مفہوم	دوم	۲۰۶	(۲:۴۳)
زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت	،،	۲۰۹	،،
زکوٰۃ — رسول اللہ نے مروجہ زکوٰۃ نہیں دی	،،	۲۱۰	،،
زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی	اول	۲۹۶	(۲:۳۳)
زمین پر ذاتی ملکیت — رسول اللہ کے زمانے ہی میں کم ہو گئی تھی	اول	۳۰۶	(۲:۲۲)
زمین کے فراش ہونے کا اعجاز	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
زمین کے وارث صالحین ہوں گے۔ ابدی قانون	دوم	۲۹۴	(۲:۵۹)
زندگی اور ہلاکت، دلائل و براہین کی رو سے	اول	۱۹۶	(۲:۷)
زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ سائنسدانوں کا اعتراف عجز	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)
زندگی کی نمود کے متعلق قرآنی اشارات	اول	۲۸۹	(۲:۲۱)
س			
(اول) سابقون الاولون کا مقام بلند	اول	۹۴	(۲:۳)
ساحرین دربار فرعون کا ایمان	دوم	۲۵۰	(۲:۵۰)
سازشیں اور سرگرمیاں — منافقین کی	اول	۲۱۱	(۲:۹)
ساکن و منجمد (ہونا زندگی کا) — عذاب ہے	اول	۱۹۰	(۲:۷)
سامری کون تھا؟	دوم	۲۵۶	(۲:۵۱)
سائل سے مراد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
سائیکولوجی کی تحقیق۔ سائنس آف ہسٹری۔ نفس انسانی کے متعلق	دوم	۱۵۰	(۲:۴۰)
	دوم	۳۰	باب اول
سبا اور حضرت سلیمانؑ	اول	۲۴	(۱:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سبت کا واقعہ	دوم	۳۰۷	(۲: ۶۵)
سبح (تسبیح)	دوم	۷۳	(۲: ۳)
سبع سمٰوٰت کے معنی	اول	۳۵۲	(۲: ۲۹)
	سوم	۴۶۳	(۲: ۲۶۱)
سبل السلام کے معنی	اول	۴۷	(۱: ۵)
سبیل (ابن السبیل)	سوم	۱۵۸	(۲: ۱۷۷)
(فی) سبیل اللہ کا مفہوم	سوم	۲۷۴	(۲: ۱۹۳)
سٹیٹ — دورِ حاضر کا بُت — باطل خدا	اول	۳۰۴	(۲: ۲۲)
سجدہ کا قرآنی مفہوم۔ اور ہمارے رسمی سجدے	دوم	۹۸	(۲: ۳۴)
سجدۂ ملائکہ	دوم	باب اول ص ۹۸، ۶۸	
سحر — (جادو) کی حقیقت	دوم	۴۰۴	(۲: ۱۰۲)
سرمایہ دارانہ نظام — پہلے لوگوں کو محتاج بنا دینا پھر ان کی امداد کے لئے خیراتی کام کرنا — یہ فریبِ نفس ہے۔	دوم	۳۵۴	(۲: ۸۵)
سرمایہ داری کا نظام اور قرآن	اول	۱۰۸	(۲: ۲)
	اول	۱۷۳	(۲: ۶)
	اول	۲۳۷	(۲: ۱۱-۱۲)
	سوم	۳۲۵	(۲: ۲۱۹)
	سوم	۴۷۸	(۲: ۲۷۵)
سزا اور جزا کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۱	(۲: ۴۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سسرالی رشتے	سوم	۳۶۹	(۲: ۲۲۱)
سفاہت کے معنی	اول	۲۴۵	(۲: ۱۳)
سقف محفوظ — سماء	اول	۲۹۵	(۲: ۲۲)
سلویٰ	دوم	۲۸۳	(۲: ۵۷)
(حضرت) سلیمانؑ کے خلاف تورات کی یاوہ گوئی اور قرآن کی مدافعت	دوم	۳۹۵	(۲: ۱۰۲)
— لیکن ہماری کتبِ تفاسیر میں	״	۳۹۷	(۲: ۱۰۲)
سماء کو بناء اور سقفِ محفوظ بنایا	اول	۲۹۵	(۲: ۲۲)
سمندر پار کرنا — بنی اسرائیل کا	دوم	۲۴۵	(۲: ۵۰)
سنتِ ابراہیمیؑ (قربانی)	سوم	۲۵۰	(۲: ۱۹۹)
سنت اللہ — قانونِ مکافاتِ عمل	دوم	۱۵۳	(۲: ۴۰)
سوُد (دیکھیے ربوٰ)			
سوّر (دیکھیے خنزیر)			
سورۃ کے معنی	اول	۳۱۶	(۲: ۲۴)
سوشلزم	اول	۱۱۷	(۲: ۳)
״ — فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲: ۹۹)
سیرت — نبی کی سیرت اس کے دعویٰ کی صداقت کی دلیل۔	اول	۹۲	(۲: ۳)
سیکولرازم اور اسلام	اول	۱۳	(۱: ۱)
(مذہب سیکولرازم ہوتا ہے)	اول	۳۴	(۱: ۳)
سیکولرازم میں آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔	اول	۱۴۶	(۲: ۴)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
سیکولرازم ـ خدا کا انکار یا اُسے محض کائناتی خدا ماننا	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)
سیکولرازم ـ انسانی ذات سے انکار	دوم	۳۱	باب اول
〃 ـ دو خداؤں کا عقیدہ	دوم	۱۶۵	(۲:۴۰)
سیکولرازم کے خلاف ـ حضرت عیسیٰ کا جہاد	دوم	۱۶۳	(۲:۴۰)
سیکولرازم فسق ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)
سیکولرازم ـ پاکستان میں	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
〃 ـ مذہب کے نقاب میں	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)
〃 ـ کے تحت حکومت کا انجام	〃	۲۸۷	(۲:۲۰۹)
سیکولرازم کا نظریۂ کائنات	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
سیّآت کے معنی	سوم	۱۳۷	(۲:۱۶۸-۶۹)

ش

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(رسول اللہ کے لئے) شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے	دوم	۲۳۶	(۲:۱۴۸)
شب برات	سوم	۱۹۵	(۲:۱۸۵-۸۸)
شجر ـ جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا ـ سے کیا مراد تھی؟	دوم	۱۱۳	(۲:۳۵)
شخصیت پرستی کی زنجیروں کو توڑ دیا گیا۔	دوم	۹۸	(۲:۳۴)
شراب (دیکھئے خمر)			
شرک (ثنویت شرک ہے)	اول	۵۷	(۱:۷)
شرک کیوں ظلم عظیم ہے	دوم	۱۰۳	(۲:۳۴)
شرک ـ قرآنِ خالص کے ساتھ شخصیتوں کو ملا دینا	دوم	۱۹۰	(۲:۴۱)
شرک، تفرقہ سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
شرک سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔	دوم	۲۶۲	(۲:۵۱)
شرک سے بزدلی	دوم	۲۷۷	(۲:۵۵)
شریعت سازی اور دین فروشی	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
شعائر (محسوس مراسم) بھی ضروری ہیں	اول	۱۳۹	(۲:۳)
	سوم	۱۲۲	(۲:۱۵۸)
شعائر کا مفہوم	سوم	۱۰	(۲:۱۱۴)
شعور کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۷	(۲:۹)
شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ	دوم	۲۳۵	(۲:۱۴۸)
شفاعت کا باطل عقیدہ	دوم	۲۳۳	〃
شفاعت کا قرآنی مفہوم	دوم	۲۳۴	〃
شفیع یا شافع کا لفظ رسول اللہ کے لئے نہیں آیا، شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے	دوم	۲۳۷	〃
شک اور ریب میں فرق	اول	۷۳	(۲:۲)
شکر کا مفہوم	دوم	۲۶۳	(۲:۵۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
شمسی کیلنڈر	سوم	۲۳۰	(۲:۱۸۹)
شمشیر کا مقام دین میں	سوم	۱۵۳	(۲:۱۷۷)
	"	۲۷۷	(۲:۱۹۳)
شہادت کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)
شہداء	اول	۲۵۵	(۲:۱۶)
" (مقتولین فی سبیل اللہ)	سوم	۱۱۰	(۲:۱۵۴)
" کے متعلق افسانے	سوم	۱۱۱	(۲:۱۵۴)
شہر الحرام	سوم	۲۲۹	(۲:۱۸۹)
شیطان	دوم	۵۰	(۲:۳۰)

ص

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
صاعقہ	اول	۲۶۶	(۲:۱۹)
صبر	دوم	۲۲۲	(۲:۴۵)
صبغۃ اللہ کا مفہوم	سوم	۷۴	(۲:۱۳۸)
صحابہ کا ایمان اور مقام	اول	۳۱۳	(۲:۲۳)
" سب مومن تھے		۲۲۵	(۲:۹)
صدقات کا مفہوم	سوم	۴۷۲	(۲:۲۷۲)
صداقت کی تفہیم میں منافقین کی الزام تراشیاں	اول	۲۱۲	(۲:۹)
صراطِ مستقیم ـ ایک عظیم حقیقت	اول	۴۴	(۱:۵)
(زندگی کا سفر دوری نہیں صراط ہے	"	۴۴	(")
(خدا خود) صراطِ مستقیم پر ہے	"	۴۷	(")

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
صفا اور مروہ	سوم	۱۲۱	(۲:۱۵۸)
صفاتِ خداوندی ـ اصل سوال انہی کا ہے	سوم	۴۳۳	(۲:۲۵۵)
صلوٰۃ	اول	۲۵۵	(۲:۱۶)
صلوٰۃ ـ اقامتِ صلوٰۃ دین کا بنیادی گوشہ	اول	۹۷-۱۰۴	(۲:۳)
صلوٰۃ کے عمومی معانی	"	"	(")
الصلوٰۃ ـ اسلامی نظامِ مملکت	"	"	(")
(نماز اور صلوٰۃ میں فرق)	"	۱۲۲	(")
الصلوٰۃ اور معاشیات	"	۱۱۸	(")
صلوٰۃ فریضۂ موقت ہے	اول	۱۲۴	(۲:۳)
صلوٰۃ کی جزئیات قرآن میں نہیں دی گئیں	"	۱۲۵	(۲:۳)
(بلا سمجھے) صلوٰۃ یا تلاوت قرآن مجید	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
(اقامتِ) صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ کی تاکید	دوم	۴۳۶	(۲:۱۱۰)
صلوٰۃ الوسطیٰ	سوم	۴۱۲	(۲:۲۳۸)
صمٌّ بکمٌ عمیٌ	اول	۲۶۳	(۲:۱۸)
صوم (صیام) کے احکام	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۳)
صوم کی غایت	سوم	۱۹۴	(۲:۱۸۷)
صیام ـ بطور کفارہ	سوم	۱۹۴	(۲:۱۸۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
ض			
ضبطِ ولادت	سوم	۳۷۰-۷۷	(۲:۲۲۳)
ضرار (مسجد) — تفرقہ کی بنیاد	اول	۱۷۳	(۲:۹)
	،،	۲۱۷	(۲:۹)
ضلالت کا مفہوم	،،	۵۹	(۱:۷)
ضالین کا اتباع مت کرو	،،	۶۰	(۱:۷)
ط			
طاغوت سے فیصلے کرانا شیوہ منافقین	اول	۲۱۵	(۲:۹)
(کفر) بالطاغوت، ایمان باللہ کی اولین منزل ہے	سوم	۷۲	(۲:۱۳۵)
طاغوت کی راہ میں جنگ	سوم	۲۷۴	(۲:۱۹۳)
طاغوت سے کفر	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
(حضرت) طالوت کا انتخاب	سوم	۴۱۹	(۲:۲۴۶)
طبقاتی تقسیم خلافِ قرآن ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
طبقاتی کشمکش — خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
طغیان کا مفہوم	اول	۲۴۸	(۲:۱۵)
طلاق سے متعلق احکام	سوم	۳۸۵	(۲:۲۲۵)
طواف کا مفہوم	سوم	۳۰۳	(۲:۲۱۵)
طور سے مراد	دوم	۳۰۶	(۲:۶۳)
طیب رزق کا مفہوم	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
طیب رزق کا مفہوم (نیز دیکھئے عنوان "رزق")	اول	۳۰۵	(۲/۲۲)
ظ			
ظہار — بیویوں کو ماں کہہ دینا	سوم	۳۸۲	(۲:۲۲۴)
ظلمات کے معنی	اول	۲۶۱	(۲:۱۷)
ظلمِ عظیم — شرک کیوں ظلمِ عظیم ہے	دوم	۲۶۱	(۲:۵۱)
ظواہر اور غایت کا تعلق	،،	۱۲۳	(۲:۳)
ظواہر کو ترک کر دینے کا نتیجہ	،،	۱۲۳	(۲:۳)
ظواہر کو مقصود و منتہٰی سمجھ لینے کا نتیجہ	،،	۱۲۳	(۲:۳)
— اس سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے	،،	۱۲۴	(۲:۳)
ع			
عاجلہ مفادات سب کے لئے کھلے ہیں	اول	۲۷۱	(۲:۲۰)
عادات و عمرانیات کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	(۲:۳۰)
عاکفین کا مفہوم	سوم	۵۸	(۲:۱۲۵)
	سوم	۱۹۴	(۲:۱۸۷)
عالمِ خلق و امر	اول	۲۸۳	(۲:۲۱)
عالمین کا مفہوم	،،	۱۸	(۱:۱)
(حضرت) عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
عائلی قوانین	سوم	۳۹۴	(۲:۲۳۰)
عبادت کا صحیح مفہوم	اول	۳۵	(۱:۴)
عبادت اپنی آزاد مملکت میں ہی ہو سکتی ہے	؍؍	۳۶	(۱:۴)
عبد۔ رسول اللہ خدا کے عبد تھے	؍؍	۳۰۸	(۲:۲۳)
عبدیت کا مقام ۔ شرفِ انسانیت	دوم	۱۰۳	(۲:۳۴)
عبوری دور سے متعلق احکام	دوم	۳۵۲	(۲:۸۵)
عہد اللہ سے مراد	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)
عہد فراموشی	اول	۳۴۴	(۲:۲۷)
(ایفائے) عہد کا مفہوم	سوم	۱۹۳	(۲:۱۷۷)
عدالتی سزا کو بھی عذاب کہا گیا ہے	اول	۱۹۹	(۲:۷)
عداوت کی لعنت	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
عدت	سوم	۴۰۶	(۲:۲۲۸)
عدل اور رحم میں تطابق	اول	۲۶	(۱:۲)
عدل و احسان کا حکم	دوم	۲۹۱	(۲:۵۸)
عدل کے ایک معنی ۔ کچھ دے دلا کر سزا سے بچ جانا	دوم	۲۳۸	(۲:۴۸)
عذاب کے معنی	اول	۱۸۸	(۲:۷)
عذاب کی شکلیں ۔ بنی اسرائیل پر	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)
عربی زبان کی وسعت	اول	۷۳	(۲:۲)
عربی زبان کی کتاب	اول	۴۲۰	(۲:۴۴)
عرس	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
عرشِ خداوندی	دوم	۶۷	باب اوّل
عزل (اس کی تفسیر از روئے روایات)	سوم	۳۷۴	(۲:۲۲۳)
عزم کی کمزوری (آدم میں)	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)
عزیر کون تھا؟	دوم	۲۵۴	(۲:۵۱)
عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)
عصا کے معنی	دوم	۲۴۷	(۲:۵۰)
عفو	دوم	۳۶۲	(۲:۵۲)
العفو کا مفہوم	سوم	۳۳۶	(۲:۲۱۹)
عقبہ ۔ دین، العقبہ ہے	دوم	۲۲۳	(۲:۴۵)
العقبہ کا مفہوم (العقبہ کے معنی)	سوم	۳۳۳	(۲:۲۲۰)
والعقبۃ ۔ دین کی گھاٹی کیا ہے؟	سوم	۱۵۹	(۲:۱۷۷)
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے	اول	۵۵	(۱:۷)
(امورِ آخرت میں بھی) عقل و فکر	سوم	۳۲۷	(۲:۲۱۹)
عقل کا تجرباتی طریق	اول	۱۱۵	(۲:۳)
؍؍ ؍؍ ؍؍	؍؍	۲۵۸	(۲:۱۷)
عقل تنہا زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی	؍؍	۲۶۰	(۲:۱۷)
علماء ۔ اسلام میں علماء کا کوئی الگ گروہ نہیں	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
علماء کون ہیں؟	اول	۶	(۱:۱)
	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
(ہمارے) علماء کے علم اور کردار کے متعلق	دوم	۳۶۹	(۲:۸۸)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مشہور علماء کی شہادت۔ امام غزالی مفتی محمد عبدہ۔ مولانا آزاد۔ اور علامہ اقبالؒ وغیرہ کی تنقیدات۔	دوم	۳۶۹	(۲ : ۸۸)
علم حاصل کرنے اور اسے بڑھاتے رہنے کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔	دوم	۳۶۸	(۲ : ۸۸)
علو فی الارض، بغیر الحق منع ہے	اول	۲۳۴	(۲:۱۱-۱۲)
علیحدگی۔ مخالفین سے علیحدگی بھی حسن کارانہ انداز سے اختیار کرو	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)
عمرہ	سوم	۱۰۴	(۲:۱۵۲)
"	"	۲۲۸	(۲:۱۸۹)
عمل اور فعل میں فرق	دوم	۳۴۲	(۲:۸۰-۸۲)
عورت کی حیثیت ۔ عیسائیت میں	دوم	۱۱۵-۱۱۶	(۲ : ۳۶)
" " ۔ ہماری وضعی روایات اور تفاسیر کی رو سے	"	"	(")
" " ۔ قرآن کی رو سے	"	"	(")
(شریف) عورتوں سے چھیڑ چھاڑ۔ سنگین ترین جرم ہے	اول	۲۱۸	(۲ : ۹)
(ایک مرد کے عوض دو) عورتوں کی گواہی	سوم	۴۸۵	(۲:۲۸۲)
"عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں" کا مفہوم	سوم	۳۷۷	(۲:۲۲۳)
(حضرت) عیسیٰؑ اور یہودی پیشوائیت	دوم	۲۹۷	(۲ : ۶۰)
" کے انقلاب آفرین وعظ	دوم	۱۹۳	(۲ : ۴۰)
" کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی تردید	دوم	۳۴۳	(۲ : ۸۳)
عیسائیت اور جنگ	دوم	۷۸	(۲ : ۳۰)
عیسائیت میں کفارہ حضرت مسیحؑ کا عقیدہ	دوم	۲۳۹	(۲ : ۴۸)
غ			
غار کا واقعہ ۔ رسول اللہ کی ہجرت کے دوران	دوم	۲۴۴	(۲ : ۵۰)
غضب خداوندی سے کیا مراد ہے	اول	۵۴	(۱ : ۷)
غلاموں کو آزاد کرنا یا کرانا دین کی غایت ہے	سوم	۳۲۸	(۲:۲۲۰)
غلامی کا مسئلہ	اول	۲۶۰	(۲:۱۷)
"	دوم	۳۵۸	(۲:۸۵)
غلامی عذاب ہے	دوم	۱۶۰	(۲:۴۰)
غلامی میں پختگی۔ بنی اسرائیل کی	دوم	۲۶۲	(۲:۵۵)
غلامی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی امداد	سوم	۱۵۸	(۲:۱۷۷)
غلبہ۔ خدا اور رسول کا ۔ دین حقہ کا	دوم	۳۰۲	(۲ : ۶۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
غلطی کا اعتراف، اصلاح کے امکانات روشن کر دیتا ہے	دوم	۱۰۱	(۲:۳۴)
— اس کی ذمہ داری قبول نہ کرنا ابلیسیت ہے	”	”	”
غلو — رسولوں کو خدا اور علماء و مشائخ کو رسول بنا دینا	دوم	۱۹۳	(۲:۴۱)
غلو فی الدین کفر ہے	دوم	۱۹۳	(۲:۴۱)
غوایت — گمراہی	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
غیب کا مفہوم — ایمان بالغیب	اول	۹۰	(۲:۳)
غیب و شہود کائنات	دوم	۹۵	(۲:۳۱)

ف

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(سورۃ) فاتحہ کا خلاصہ	اول	۶۴	(۱:۱-۷)
فاتحین کا مفتوحہ علاقوں میں داخلہ	دوم	۲۸۶	(۲:۵۸)
فاسق کسے کہتے ہیں	اول	۳۴۳	(۲:۲۶)
فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
فاطر السمٰوٰت والارض	اول	۲۸۳،۹۲	(۲:۲۱)
فالیں لینا	سوم	۳۲۴	(۲:۲۱۹)
فتنہ کے معنی	سوم	۲۷۵	(۲:۱۹۳)
فحشاء کے معنی	سوم	۱۳۶	(۲:۱۶۸-۶۹)
فراشاً — زمین کو فراشا پیدا کیا گیا۔	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
فرعون — دورِ جاہلیت کا ند	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
فرعونِ مصر	دوم	۱۵۷	(۲:۴۰)
فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان	دوم	۲۴۹	(۲:۵۰)
فرعون کے منہ میں جبریل مٹی ٹھونس رہا تھا۔	دوم	فٹ نوٹ	”
فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جانا	دوم	۲۵۲	”
فرقان کے معنی	دوم	۲۶۴	(۲:۵۲)
فرقہ اہلِ قرآن کی گمراہی	اول	۱۳۵	(۲:۳)
فرقہ بندی شرک اور کفر ہے۔ خدا کا عذاب ہے	اول	۱۷۲	(۲:۶)
	اول	۱۹۳	(۲:۷)
فرقہ بندی — منافقین کی سازش	اول	۲۱۵	(۲:۹)
فرقہ سازی کے لئے مسجد ضرار کی تعمیر	”	”	”
فرقہ بندی — یہود و نصاریٰ کی باہمی فرقہ بندی اور ہم	دوم	۱۹۲	(۲:۴۱)
	دوم	۲۱۳،۱۸	(۲:۴۳)
	سوم	۶	(۲:۱۱۳)
فساد اور اصلاح کا مفہوم	اول	۲۲۹	(۲:۱۱-۱۲)
فسادِ آدمیت کے اہم گوشے	اول	۲۳۱	(۲:۱۱-۱۲)
فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں	دوم	۷۶	(۲:۳۰)
فسق — اخلاقی پابندیوں سے دور بھاگنے کا نام ہے	دوم	۳۸۹	(۲:۹۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(سیکولرازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ اسی جذبہ کی پیداوار ہیں)			
فضیلت کا قرآنی معیار	اول	۲۴۶	(۲:۱۴)
فطرت ۔ فطرت اللہ اور انسانی	دوم	۳۲	باب اول
فطرت کا غلط عقیدہ ۔			
فطرت کی قوتیں (ملائکہ	دوم	۶۶	باب اول
فطرت کی تسخیر	دوم	۶۸	باب اول
فطرت کے قوانین اور اشیاء کا علم	دوم	۸۲	(۲:۳۱)
فطرت کے قوانین بالحق ہیں	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
فطری حوادث اور انسانی اعمال	اول	۱۸۹	(۲:۷)
فعل اور عمل میں فرق	دوم	۳۴۲	(۲:۸۲)
فقہ اور قرآن	سوم	۱۲۳	(۲:۱۵۹)
فلاحی مملکت بھی نظامِ سرمایہ داری کا فریب ہے	دوم	۳۵۵	(۲:۸۵)
فؤاد اور قلب	اول	۲۰۶	(۲:۹)
(اصحاب) الفیل	سوم	۲۵۳	(۲:۱۹۹)
فیملی لائف کی اہمیت	دوم	۳۴۶	(۲:۸۳)

ق

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
قارون	اول	۱۱۴	(۲:۳)
'قالو بلیٰ' اور یوم الست کے افسانے	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)
قانونِ مکافاتِ عمل	دوم	۱۵۵	(۲:۴۰)
	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۴)
(نیز دیکھئے مکافاتِ عمل)			
قانون کی حکمرانی	اول	۷۱	(۲:۲)
قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۸۳)
قانون اور حکم میں فرق	سوم	۱۸۴	(۲:۱۸۶)
قانون کا اطلاق اس کی تاریخ نفاذ سے ہوگا۔ سابقہ تاریخ سے نہیں	سوم	۴۷۹	(۲:۲۷۵)
قبلہ ۔ مرکزِ ملت ہے	دوم	۲۱۹	(۲:۴۳)
قبلہ کی تحویل کی روایات	سوم	۸۴	(۲:۱۴۲)
(تعیین) قبلہ کا مقصد	سوم	۹۰	(۲:۱۴۴)
قبلہ کی طرف رُخ کرلینا مقصود بالذات نہیں۔	سوم	۱۵۵	(۲:۱۷۷)
قتال۔ (دیکھو "جنگ")			
قتلِ انبیاء و رسل	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
قتل بغیر الحق کا مفہوم	دوم	۳۰۴	(؍؍)
قتل کا واقعہ ۔ بنی اسرائیل کا	دوم	۳۳۳	(۲:۷۳)
قدس ۔ قدوس	دوم	۷۳	(۲:۳۰)
قدیر کے معنی	اول	۲۷۳	(۲:۲۰)
قادرِ مطلق کا مفہوم	اول	۲۷۴	(۲:۲۰)
قرأت کا فن	دوم	۲۹۳	(۲:۵۹)
قرآنِ کریم حضورؐ کے زمانے ہی میں	اول	۷۲	(۲:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مرتب و مدوّن شکل میں موجود تھا			
(فرقہ اہلِ قرآن کی گمراہی	اول	۱۳۵	(۲:۳)
قرآنِ کریم ہی منزل من اللہ ہے	ر	۱۴۱	(۲:۴)
قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم نہ کرنے والے کافر ہیں	ر	۱۶۲	(۲:۶)
قرآن کی آواز کسی تک نہ پہنچنے دو۔ کفار کی ٹیکنیک	ر	۱۶۳	(۲:۶)
قرآن نور ہے	اول	۲۶۲	(۲:۱۷)
قرآن عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	اول	۲۸۰	(۲:۲۱)
قرآن کافی ہے	اول	۳۰۹،۳۱۵	(۲:۲۳)
	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآن کا چیلنج کہ اس جیسی کتاب لاؤ۔	اول	۳۰۸،۱۶	(〃)
قرآن ــ عربی زبان کی کتاب	ر	۳۲۰	(۲:۲۴)
قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
قرآن فہمی کے تین طریقے	دوم	۱۴۸	(۲:۴۰)
قرآنِ کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم	ر	۱۸۷	(۲:۴۱)
قرآن کی ترتیب بھی معجزہ ہے	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
قرآن مجید میں (معاذ اللہ) ابہام ہے (مودودی مرحوم کا عقیدہ)	دوم	۳۲۸	(۲:۷۳)
قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر	دوم	۳۳۹	(۲:۷۸)
قرآن مجید کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
قرآنِ خالص سے نفرت	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ	دوم	۳۶۶	(۲:۸۷)
قرآنِ مجید کو پڑھنا اور سننا اور اس پر عمل نہ کرنا ہمارا شیوہ ہے	دوم	۳۸۳	(۲:۹۳)
قرآنِ کریم خیر ہے ـــ اس کا مطلب	دوم	۴۳۳	(۲:۱۰۵)
قرآن کی حکمرانی	سوم	۹-۱۰	(۲:۱۱۳)
قرآن کو حدیث منسوخ کر سکتی ہے؟	سوم	۱۷۹	(۲:۱۸۲)
قرآنِ کریم کی تفسیریں اور اس کے ترجمے کس طرح کئے گئے۔	سوم	۸۸	(۲:۱۴۲)
قرآنِ کریم بالکل واضح کتاب ہے	سوم	۱۲۴	(۲:۱۵۹)
قرآن کے باطنی معانی	سوم	۱۲۶	(۲:۱۵۹)
قرآن کا نزول ــ تاریخ انسانیت کا عظیم ترین انقلابی واقعہ	سوم	۱۹۰	(۲:۱۸۴)
قرآن ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ	سوم	۱۹۱	(۲:۱۸۴)
قرآن ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔	سوم	۲۲۴	(۲:۱۸۶)
قرآن کی تلاوت سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
قرآنی اصطلاحات کا مفہوم	اول	۹۸	(۲:۳)
قرآنی تعلیم کو مسخ کرنے اور چھپانے کے طریق	سوم	۱۲۵	(۲:۱۵۹)
قربِ خداوندی	سوم	۲۲۳	(۲:۱۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(ذوی) القربیٰ کے لئے انفاق	سوم	۱۵۷	(۲ : ۱۷۷)
قربانی	سوم	۲۴۴	(۲ : ۱۹۹)
قربانی سے متعلق بحث	سوم	۳۳۵	(۲ : ۱۸۹)
قرض حسنہ ۔ خدا کو قرض دینا	سوم	۴۱۶	(۲ : ۲۴۵)
قرعہ اندازی	سوم	۳۲۴	(۲ : ۲۱۹)
قریش کی مخالفت کی وجوہات	دوم	۴۳۲	(۲ : ۲۰۵)
قساوت قلبی ۔ یہودیوں کی	دوم	۳۳۰	(۲ : ۷۴)
قصاص کا حکم ۔ جرم قتل کی سزا	سوم	۱۷۹	(۲ : ۱۷۸)
قلب اور فوآد	اول	۲۰۶	(۲ : ۹)
قلت و کثرت معیار نہیں ۔ صلاحیت معیار ہے ۔	سوم	۴۲۴	(۲ : ۲۴۷)
قمری کیلنڈر	سوم	۲۳۰	(۲ : ۱۸۹)
قوانینِ فطرت اور قرآنی قوانین	اول	۱۹-۱۱	(۱ : ۱)
قوانینِ فطرت خارجی کائنات کا دین ہیں ۔	اول	۳۰-۲۹	(۱ : ۳)
قوانینِ خداوندی ہی تقدیراتِ الٰہیہ ہیں	اول	۲۷۳	(۲ : ۲۰)
اپنے قوانین کی خلاف ورزی خود خدا بھی نہیں کرتا	دوم	۴۴۳-۴۴	(۲ : ۸۳)
قوانین اور حکمت کا امتزاج	سوم	۲۸۳	(۲ : ۲۰۹)
قوت اور علم کا امتزاج	سوم	۴۲۱	(۲ : ۲۴۷)
قوت کا استعمال ۔ جائز اور ناجائز	دوم	۸۰	(۲ : ۳۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(مسلمانوں کی) قوم کا جداگانہ تشخص	اول	۷۷	(۲ : ۲)
قوموں کا استبدال ۔ عذابِ خداوندی ہے	اول	۱۹۲	(۲ : ۷)
قوموں کے عروج و زوال کے قوانین	دوم	۱۵۵	(۲ : ۴۰)
قوموں کی ہلاکت سے مراد	دوم	۱۵۵	(۲ : ۴۰)
قوموں کے عروج و زوال کا ابدی اصول	سوم	۶۹	(۲ : ۱۳۴)
قومیت پرستی وجہِ فسادِ آدمیت	اول	۲۳۹	(۲ : ۱۱-۱۲)
″ ″ کے خلاف مفکرینِ مغرب کی چیخ و پکار	اول	۲۴۱	(۲ : ۱۱-۱۲)
قیامت کے دن کا صحیح مفہوم	سوم	۷	(۲ : ۱۱۳)

ک/گ

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(دستاویزات کے) کاتب کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۴	(۲ : ۲۸۲)
کارل مارکس کا اعترافِ عجز	اول	۱۱۶	(۲ : ۳)
کافۃ ۔ اسلام کا مطالبہ	سوم	۲۸۳	(۲ : ۲۰۸)
کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی	اول	۱۶	(۱ : ۱)
	اول	۲۸۵-۸۶	(۲ : ۲۱)
کائنات میں دینِ خداوندی	اول	۳۰-۳۱	(۱ : ۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے	اول	۱۷۰	(۲:۶)
(آغاز) کائنات کے متعلق سائنسدانوں کا عجز فہم	اول	۲۸۵	(۲:۲۱)
کائنات کی تسخیر	دوم	۶۸	باب اول
	دوم	۸۳	(۲:۳۱)
کائنات کے متعلق افلاطون کا نظریہ۔ وحدت الوجود	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
مادہ پرستوں کا نظریہ	دوم	۸۷	(۲:۳۱)
کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔	دوم	۸۹	(۲:۳۱)
(تخلیق) کائنات اور قانونِ مکافاتِ عمل کا باہمی تعلق	دوم	۹۳	(۲:۳۱)
(اشیاء) کائنات کا محدود علم	دوم	۹۴	(۲:۳۲)
کائنات کا غیب و شہود — مضمر و محسوس	دوم	۹۵	(۲:۳۳)
کائناتی حوادث اور انسانی اعمال	اول	۱۸۹	(۲:۷)
کائناتی خدا اور، ارضی خدا اور سیکولرازم یا کفر ہے۔	اول	۳۰۱	(۲:۲۲)
کائناتی قوتیں — ملائکہ	دوم	۶۷	باب اول
کبریائی شانِ خداوندی ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
کتاب اللہ (کی حکمرانی کا نام الدین ہے)	اول	۲۹،۳۰	(۱:۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کتاب کے ایک حصے پر ایمان، دوسرے سے انکار	اول	۵۷	(۱:۷)
	دوم	۳۵۹	(۲:۸۵)
کتاب کے معنی	اول	۷۱	(۲:۲)
(اہلِ) کتاب سے ایمان کا مطالبہ	اول	۷۳	(۲:۳)
(اہلِ) کتاب میں سے حضورؐ پر بہت کم ایمان لاتے۔	سوم	۲۸	(۲:۱۲۰)
کتاب و حکمت و نبوت — بنی اسرائیل کو ملی تھی۔	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
کتاب — ہر رسول اور ہر نبی کو دی گئی تھی۔	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
کتاب ہر نبی کو ملی تھی	سوم	۷۲	(۲:۱۳۶)
(اہلِ) کتاب کے ہاں کا کھانا	سوم	۱۴۵	(۲:۱۷۳)
کتاب و حکمت — قانون اور اس کی غایت	سوم	۱۸۶	(۲:۱۴۳)
کتبِ سابقہ پر ایمان کے معنی	اول	۱۴۲	(۲:۴)
	سوم	۷۳	(۲:۱۳۶)
(مومنین کو بھی الذین آتینٰھم الکتٰب) کہا گیا ہے	سوم	۳۰	(۲:۱۲۱)
کتمانِ حق	دوم	۲۰۱	(۲:۴۲)
کثرت و قلت کا مسئلہ — معیارِ کامیابی تعداد کی کثرت نہیں۔	سوم	۴۲۴	(۲:۲۴۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کذب کا قرآنی مفہوم	اول	۲۰۵	(۲:۸)
کراماتِ اولیاء	اول	۳۱۰	(۲:۲۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
کرسی خداوندی	سوم	۴۳۷	(۲:۲۵۵)
کسب اور اکتساب میں فرق	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)
کشف و الہام کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
کعبہ (مسجد الحرام) کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
کعبہ ـ نظامِ خداوندی کا مرکز محسوس	سوم	۴۴	(۲:۱۲۴)
" مرکز اجتماع انسانیت	سوم	۵۵-۵۶	(۲:۱۲۵)
" امت میں وحدت پیدا کرنیکا ذریعہ	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
کعبہ کی محسوس علامات کو مقصود بالذات	سوم	۱۰۱	(۲:۱۴۸)
نہ سمجھ لینا			
کفار مومنوں پر غالب نہیں آسکتے	اول	۱۷۴	(۲:۹)
کفار کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات	اول	۱۷۵	(۲:۶)
قائم نہیں کئے جاسکتے			
کفارہ کا مفہوم	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)
کفر بالطاغوت ـ ایمان باللہ سے پہلے	سوم	۴۴۰	(۲:۲۵۶)
کفر بھی (ایمان کی طرح) خود اختیار کیا جاتا ہے	اول	۱۵۹	(۲:۶)
کفرانِ نعمت (دیکھئے "نعمت")			
کلام اللہ	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
"	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)
(خدا سے) ہمکلامی کا عقیدہ	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
کلم اللہ موسیٰ تکلیما کا مفہوم	سوم	۴۲۹	(۲:۲۵۳)
کلمات اللہ سے مراد وحی خداوندی	دوم	۱۳۱	(۲:۳۷)
اور اس پر مبنی نظریہ حیات			
کمانڈر کے انتخاب کا معیار ـ	سوم	۴۲۰	(۲:۲۴۷)
دولت نہیں، صلاحیت			
کیمونزم اور اسلام کا فرق	دوم	۲۰۸	(۲:۴۳)
کیمونزم اور قرآنی نظام کے رزق میں فرق	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
کیمونزم ـ فسق ہے	دوم	۳۱۹	(۲:۹۹)
" ـ ممکن العمل نہیں	اول	۱۱۵	(۲:۳)
" کے فلسفہ کی بنیادی کمزوری	سوم	۴۴۱	(۲:۲۵۶)
گوسالہ پرستی کا واقعہ (بنی اسرائیل کا)	دوم	۲۵۳	(۲:۵۱)
" " کا بیان (تورات میں)	دوم	۲۶۱	(")
" " کے سلسلے میں ہمارے	دوم	۲۶۰	(")
تفسیری افسانے			
کیلنڈر ـ شمسی یا قمری	سوم	۲۳۰	(۲:۱۸۹)
ل			
لاٹری	سوم	۳۲۵	(۲:۲۱۹)
لعنت کے معنی	دوم	۳۷۴	(۲:۸۸)
	سوم	۱۲۹	(۲:۱۵۹)
لونڈیاں (دیکھو "غلامی")			
لین دین کے متعلق ہدایات	سوم	۴۸۳	(۲:۲۸۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
م			
ماحول کے اثرات کا غلط عقیدہ	دوم	۳۳	بابِ اوّل
مارکس کا نظریۂ تاریخ	دوم	۱۵۱	(۲:۴۰)
ماضی پرستی کی تباہ کاریاں	سوم	۷۸	(۲:۱۴۱)
مال و دولت کی اہمیت	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)
مالک کے معنی	اول	۲۸	(۱:۳)
متبنّٰی کی قانونی حیثیت کچھ نہیں	سوم	۳۵۹	(۲:۲۲۱)
متعہ	سوم	۳۹۵	(۲:۲۳۲)
متقین کی خصوصیات	اول	۷۵	(۲:۲)
مثالوں کے ذریعے تبیانِ حقیقت	اول	۳۴۱	(۲:۲۶)
(قرآنی) مثالوں کے چند نمونے	اول	۳۴۳	(۲:۲۶)
محبت — خدا کے ساتھ	سوم	۱۳۰	(۲:۱۶۵)
محسوس حرکات و خیالات کا تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)
محکومی، خدا کا عذاب ہے۔	اول	۱۹۲	(۲:۷)
(حضرت) محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم)	اول	۷	(۱:۱)
محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ	اول	۱۵۴	(۲:۵)
مخالفین سے اعراض۔ لیکن حسن کارانہ انداز سے	دوم	۴۳۵	(۲:۱۰۹)
مذاہب کیسے پیدا ہو گئے	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
(دین کی) مذہب میں تبدیلی	اول	۳۴	(۱:۳)
مذہب پرست طبقہ (مذہبی پیشوائیت)	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)
دین کا سب سے شدید مخالف ہوتا ہے			
اشخاص پرستی اس کا مسلک ہوتا ہے۔	دوم	۱۹۴	(۲:۴۱)
خود ساختہ شریعت کو شریعتِ خداوندی			
بناتا ہے۔			
دین میں غلو کرتا ہے۔			
مذہب کو کاروبار بنا لیتا ہے۔			
بآسانی جنت دلانے کا وعدہ کرتا ہے			
مذہب جب ذریعۂ معاش بن جائے۔	دوم	۳۴۰	(۲:۷۹)
مذہبی آزادی (دیکھئے "جنگ")			
مذہبی پیشوا — یہود کے	دوم	۲۲۰	(۲:۴۴)
مذہبی پیشواؤں کی دین فروشی	اول	۶۲	(۱:۷)
	سوم	۱۴۳	(۲:۱۷۳)
مذہبی پیشوائیت اور دین کا نظام	اول	۳۳	(۱:۳)
〃 〃 فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے	اول	۲۳۵	(۲:۱۱-۱۲)
〃 〃 کا کاروبار	اول	۲۵۶	(۲:۱۶)
〃 〃 یہودیوں کی	دوم	۱۴۳	(۲:۴۰)
مذہبی رسوم و مناسک توہم پرستی پر مبنی ہوتے ہیں	سوم	۲۲۸	(۲:۱۸۹)
مرتد کی سزا (دیکھئے "جنگ")			
(نیز دیکھئے "ارتداد")			
مرشد صرف خدا ہے	سوم	۲۲۵	(۲:۱۸۶)
مرضات اللہ سے مراد	سوم	۲۵۹	(۲:۲۰۷)
مرکزِ ملت — قبلہ	دوم	۲۱۶	(۲:۴۳)
مزارات اور خانقاہیں	دوم	۸۳	(۲:۳۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مزارعت! نظامِ سرمایہ داری ہے	دوم	۳۵۴	(۲:۸۵)
مساکین کے لئے انفاق	دوم	۳۵۰	(۲:۸۳)
	سوم	۱۵۷	(۲:۱۷۷)
مستبد حکمران اور ان کی فساد انگیزی کا نتیجہ	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۶)
مسجد کا مفہوم	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
مسجد الحرام کی دیکھ بھال	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
مسجد ضرار کی تعمیر اور ہماری مسجدیں	اول	۲۱۶-۱۷	(۲:۹)
مسکنت ـ خدا کا عذاب ہے۔	دوم	۲۹۹	(۲:۶۱)
(پیدائشی) مسلمانوں کی پوزیشن	اول	۸۱	(۲:۳)
مشت زنی	سوم	۳۷۵	(۲:۲۲۲)
مشنا (یہودیوں کی روایات کا مجموعہ)	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
مصدق لما معکم کے معنی	دوم	۱۸۲	(۲:۴۱)
مصلحین اور مفسدین ایک جیسے نہیں ہو سکتے	اول	۲۴۴	(۲:۱۱-۱۲)
معاہدات کی پابندی ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہیئے۔	دوم	۳۹۰	(۲:۱۰۰)
معاشی عدم توازن باعث غضب خداوندی ہے	اول	۵۸	(۱:۷)
(قرآن کا) معاشی نظام	اول	۱۰۵	(۲:۳)
	اول	۲۹۴	(۲:۲۲)
	سوم	۳۲۶	(۲:۲۱۹)
	سوم	۴۶۳	(۲:۲۶۱-۷۴)
" " " العفو	سوم	۲۶	(۲:۲۱۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(غلط) معاشی نظام وجہ فساد آدمیت ہے	اول	۲۳۶	(۲:۱۱-۱۲)
معاشی نظام ـ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔	اول	۲۹۶	(۲:۲۲)
معاشی طبقات کی کشمکش۔ خطرناک حد تک	دوم	۱۲۶	(۲:۳۶)
معجزات کا مطالبہ اور انکار	اول	۳۰۹	(۲:۲۳)
	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
معجزہ! ـ رسول اللہ کی سیرت تھی!	اول	۳۲۳	(۲:۲۴)
معراج سے متعلق روایات	سوم	۸۴	(۲:۱۴۲)
معراج نبویؐ (ضمنی تذکرہ)	سوم	۲۲۲	(۲:۱۸۶)
مغضوب علیہ	اول	۵۴	(۱:۷)
مغضوب علیہ اور ضالین کوئی خاص قومیں نہیں۔	اول	۵۵	(۱:۷)
مغفرت کا مفہوم	دوم	۲۸۷	(۲:۵۸)
مفاہمت ـ اصولوں میں نہیں ہو سکتی	اول	۱۷۸	(۲:۶)
مفلحون ـ کون ہیں؟	اول	۱۵۳	(۲:۵)
مقامِ محمود	اول	۷	(۱:۱)
مقتولین فی سبیل اللہ	اول	۲۵۵	(۲:۱۲)
	سوم	۱۱۰	(۲:۱۵۴)
مقربین بارگہ خداوندی	سوم	۲۲۳	(۲:۱۸۶)
مقطعات (حروف)	اول	۷۰	(۱:۲)
مکاتبِ فکر ـ ایک ابلیسی سازش	دوم	۲۵۹	(۲:۵۱)
(قانون) مکافاتِ عمل ـ دین کی بنیاد	اول	۲۵	(۱:۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مکافاتِ عمل (کا قانون)	اول	۵۲، ۱۴۴	(۲:۴)
	سوم	۴۹۲	(۲:۲۸۴-۸۶)
(نیز دیکھیے "قانونِ مکافات")			
	دوم	۱۴۸	(۲:۴۰)
مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق فیصلے	دوم	۲۲۳	(۲:۴۶)
″ ″ کا تشریحی بیان	دوم	۲۳۰	(۲:۴۸)
	سوم	۲۳	(۲:۱۲۲-۲۳)
مکافاتِ عمل - جنت کسی کی اجارہ داری نہیں اسکے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں	دوم	۴۳۷	(۲:۱۱۱-۱۲)
مکافاتِ عمل - اسلاف کے اعمال، ان کی نسلوں کے کام نہیں آتے۔	سوم	۶۸	(۲:۱۳۰)
ملائکہ	دوم	۶۶	باب اول
ملائکہ کی تسبیح و تقدیس	دوم	۷۲	(۲:۳۰)
ملائکہ کا محدود علم	دوم	۹۴	(۲:۳۲)
ملائکہ کا سجدہ	دوم	۹۸	(۲:۳۴)
ملت کا مفہوم	سوم	۲۹	(۲:۱۲۰)
ملکہ سبا	اول	۲۴	(۱:۲)
ملوکیت - دورِ جاہلیت دیکھیے "انداد من دون اللہ"	اول	۳۰۴	(۲:۲۲)
ملوکیت کی تخریب کاریاں	اول	۲۴	(۱:۲)
ملوکیت وجہ فسادِ آدمیت ہے۔	اول	۲۳۳	(۲:۱۱-۱۲)
ملوکیت کی بساط اُلٹ دی گئی ہے	دوم	۲۸۵	(۲:۵۸)
من و سلویٰ	دوم	۲۸۳	(۲:۵۹)
مناسک کا مفہوم	سوم	۱۵	(۲:۱۱۴)
منافقت، احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے۔ جس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔	دوم	۱۷۹	(۲:۴۰)
منافقین	اول	۲۰۲	(۲:۸)
	اول	۲۰۹، ۲۱۴، ۲۲۴	(۲:۹)
منافقین سے معاشرتی تعلقات کا انقطاع	اول	۲۱۹	(۲:۹)
منافقین - اُخروی زندگی کا عذاب	اول	۲۱۹	(۲:۹)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
منافقین حضورؐ کی زندگی ہی میں چھٹ کر الگ ہو چکے تھے	اول	۲۲۴	(۲:۸)
منافقین کے ہاتھ میں حکومت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴-۵)
منعم علیہ کون ہیں؟	اول	۴۹	(۱:۶)
موت اور حیات کا مفہوم	اول	۳۴۶	(۲:۲۸)
موت کا مجازی مفہوم	دوم	۲۸۰	(۲:۵۶)
موت، محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے۔ مومن اس کا استقبال کرتا ہے۔ کافر اس سے بھاگتا ہے۔	دوم	۳۸۵	(۲:۹۴)
موت و حیات کا فلسفہ - زندہ وہ رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا۔	سوم	۴۱۳	(۲:۲۳۸)
مودودی مرحوم کی تفسیر - یہودیوں کے بندر بن جانے کے سلسلے میں۔	دوم	۳۱۰ فٹ نوٹ	(۲:۶۵)
مودودی مرحوم کا مسلک - کہ قرآن کریم میں معاذ اللہ ابہام ہے۔	دوم	۳۲۸	(۲:۷۳)
مودودی مرحوم اور غلامی کی تائید	دوم	۳۵۸	(۲:۸۵)
مودودی مرحوم کی تفسیر میں ہاروت و ماروت کا قصہ	دوم	۴۰۱	(۲:۱۰۲)
″ ″ ″ رسول اللہ پر جادو	دوم	۴۱۷	(۲:۱۰۲)
مودودی مرحوم مذہبی آزادی کے خلاف	--	--	دیکھیے "جنگ"
مودودی مرحوم کی تفسیر: اسلام بزورِ شمشیر پھیلا تھا	سوم	۲۶۵	(۲:۱۹۳)
مودودی مرحوم اور نابالغ لڑکیوں کی شادی	سوم	۳۴۰	(۲:۲۲۱)
مودودی مرحوم کا مسلک عزل اور استمناء بالید (مشت زنی) کے متعلق	سوم	۳۷۵	(۲:۲۲۲)
مودودی مرحوم اور متعہ	سوم	۲۹۵	(۲:۲۳۲)
″ اور نظامِ سرمایہ داری	سوم	۴۷۶	(۲:۲۷۵)
(حضرت) موسیٰؑ کی داستانِ حیات کے اشاراتی کوائف	دوم	۱۷۰	(۲:۴۰)
(حضرت) موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی۔	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
(حضرت) موسیٰؑ کو ستانے کے سلسلے میں ایک وضعی روایت۔ پتھر کپڑے لے کر بھاگ اٹھا۔	دوم	۳۱۹	(۲:۷۱)
(حضرت) موسیٰؑ کا خدا سے ہمکلام ہونا۔	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
(حضرت) موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی درخواست اور انکار۔	سوم	۱۹	(۲:۱۱۸)
"مولانا" صرف خدا کی ذات ہے۔	سوم	۴۹۶	(۲:۲۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
مومن، مشرک کیسے ہوجاتا ہے	اول	۵۸	(۱:۷)
مومن کسے کہتے ہیں ؟	اول	۷۷	(۲:۲)
مومن اور مسلمان میں فرق	اول	۸۲	(۲:۲)
مومن۔ خوف و حزن سے مامون۔ سب پر غالب	دوم	۱۳۵	(۲:۳۸)
مومنین اور خدا کا باہمی معاہدہ	اول	۱۱۱	(۲:۳)
	اول	۲۵۴	(۲:۱۶)
(جماعت) مومنین میں باہمی محبت اور الفت	اول	۵۶	(۱:۷)
	اول	۸۷	(۲:۳)
مومنین کو علوّ فی الارض حاصل ہوگا	اول	۲۳۴	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
مومنین اور تسخیر کائنات	دوم	۸۶	(۲:۳۱)
مومنین کو بھی الذین اوتوا الکتب کہا گیا ہے۔	سوم	۳۱	(۲:۱۲۱)
مومنین کی جماعت کی اہمیت	سوم	۹۰	(۲:۱۴۳)
مہر	سوم	۳۵۳	(۲:۲۲۱)
مہلت کا قانون	اول	۱۹۷	(۲:۷)
میثاق بنی اسرائیل	دوم	۱۷۹	(۲:۴۰)
میثاق کا نظریہ اور اس کی عملی تشکل	سوم	۱۶۳	(۲:۱۷۷)
میرزا غلام احمد کی دلیل کہ مفتری علی اللہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسکی تردید	دوم	۳۰۰	(۲:۶۱)
میرزا غلام احمد نے جہاد منسوخ کر دیا۔	سوم	۳۰۵	(۲:۲۱۶)
میزانِ عدل کو قائم رکھو	اول	۲۴۹	(۲:۱۱۵)
میسرہ	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
میکائیل	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)

ن

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نابالغ لڑکی کی شادی	سوم	۳۳۸	(۲:۲۲۰)
ناپختہ ذہنوں کے ساتھ ایمان لانے والے	دوم	۳۱۵	(۲:۷۱)
النار کے معنی	اول	۳۲۶	(۲:۲۴)
الناس والحجارة کا مفہوم	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
ناسخ ومنسوخ کا قرآنی مفہوم (حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے نیز ناسخ ومنسوخ کی آیت)	دوم	۴۴۴	(۲:۱۰۶)
نبوت۔ ہونے والے نبی کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی	اول	۵۹	(۱:۷)
نبوت (اور کتاب وحکمت) انعاماتِ خداوندی ہیں۔	دوم	۱۷۷	(۲:۴۰)
نبی کی طرف نازل ہونیوالا علم وحی کہلاتا تھا	اول	۴۳ز۴۱	(۱:۲ز۵)
نبی۔ ہر نبی کو کتاب دی گئی تھی	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
نبی کا قلب پرسوز وغمخوار	دوم	۴۳۶	(۲:۱۰۹)
نجات کا غلط اور قرآنی مفہوم	دوم	۱۴۴	(۲:۴۰)
نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب وغریب عقائد	دوم	۲۲۹	(۲:۴۸)
نِدّ۔ خدا کے ہمسر	اول	۲۹۷	(۲:۲۲)
نذر کا مفہوم	سوم	۴۷۰	(۲:۲۶۶)
نزول کے معنی	دوم	۲۸۳	(۲:۵۷)
نزولی ترتیب قرآن کا شبہات خیز نظریہ	اول	۳۱۶	(۲:۲۴)
نسک کے معنی	سوم	۲۴۴	(۲:۱۹۹)
نسل کا باطل عقیدہ۔ تمہید سرگزشت آدم	دوم	۱۱۶	(۲:۳۶)
نسل وحرث کی ہلاکت	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴ز۵)
نسلی امتیاز کا باطل نظریہ	سوم	۴۳	(۲:۱۲۴)
نسخ کا عملی مفہوم	سوم	۲۳۱	(۲:۱۸۹)
نسیان عزم کی کمزوری ہے۔	سوم	۴۹۳	(۲:۲۸۶)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نصاریٰ کہتے ہیں یہودی باطل پر ہیں	سوم	۳	(۲:۱۱۳)
نصرت کے ایک معنی مجرم کی ناجائز مدد کرکے اسے سزا سے بچالینا۔	دوم	۲۳۹	(۲:۴۸)
نظام کن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے	سوم	۴۴	(۲:۱۲۴)
نظامِ خداوندی کی عملی تشکل	سوم	۱۶۵	(۲:۱۷۷)
	سوم	۱۹۷	(۲:۱۸۵)
نظامِ خداوندی کے دشمن لیکن ایمان کے دعویدار	سوم	۲۵۶	(۲:۲۰۴)
نظامِ خداوندی قائم ہوکر رہے گا خواہ کسی قوم کے ہاتھوں ہو۔	سوم	۳۰۲	(۲:۲۱۴)
نظر و بصر کا فرق۔	اول	۱۶۸	(۲:۶)
نعمت کا مفہوم	اول	۴۸	(۱:۶)
نکاح کی تفاصیل و شرائط	سوم	۳۳۶	(۲:۲۲۱)
(کفران) نعمت کا نتیجہ	اوی	۴۸	(۱:۶)
(بقلے) نفس	دوم	باب اول	ص۳۱
نفس (انسانی ذات یا خودی)	اوی	۱۱-۱۲	(۱:۱)
	اول	۱۶۲	(۲:۶)
انفاق سے تثبیتِ نفس	سوم	۴۶۶	(۲:۲۶۵)
نفس۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کے نفس پر مرتب ہوتا ہے۔	اول	۲۰۶	(۲:۹)
نفس امّارہ۔ نفس لوّامہ۔ نفسِ مطمئنہ	دوم	۵۷	باب اول
نفس شعوری و غیر شعوری کا مجادلہ	دوم	۳۰	باب اول

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
نفسیاتی (تبدیلی سے تغیرِ نعماء)	اول	۵۳	(۱:۶)
نفسیاتی امراض	اول	۲۰۶	(۲:۹)
نفسیاتی طریقِ تفتیش	دوم	۳۲۶	(۲:۷۳)
تزکیۂ نفس	دوم	۲۵	(۲:۳۰)
نماز اور الصلوٰۃ۔ محسوس حرکات اور خیالات کا باہمی تعلق	اول	۱۲۲	(۲:۳)
نفع نقصان کا مفہوم اور حقیقی معیار	اول	۲۵۰	(۲:۱۶)
نماز کے اوقات و رکعات کے متعلق اشارات	اول	۱۳۱	(۲:۳)
نماز کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں	اول	۱۲۸	(۲:۳)
نماز — ارکانِ اسلامی کی موجودہ شکلوں کا برقرار رکھنا ضروری ہے	اول	۱۳۹	(۲:۳)
نماز — الفاظ کا مفہوم سمجھے بغیر	سوم	۳۲۲	(۲:۲۱۹)
نمازیں کیسے فرض ہوئیں	سوم	۸۵	(۲:۱۴۲)
نور۔ قرآن کریم نور ہے	اول	۲۶۲	(۲:۱۷)
نوعِ انسانی کے اختلافات کی تاریخ	سوم	۲۹۳	(۲:۲۱۳)
نیشنلزم کی تباہ کاریاں	اول	۲۴۱	(۳:۱۱-۱۲)
نیشنلسٹ علماء کا مسلک تحریکِ پاکستان کے دوران	دوم	۳۶۱	(۲:۸۵)
و			
واعظ — داستان گو	دوم	۲۵۷	(۲:۵۱)
والدین سے حسنِ سلوک	دوم	۲۴۵	(۲:۸۳)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
والدین کی اطاعت کا عقیدہ صحیح نہیں۔ قرآن نے ایسا حکم نہیں دیا۔	دوم	۳۴۷	(۲:۸۳)
وثن کے معنی	سوم	۱۳۹	(۲:۱۷۰)
وجدان، وحی نہیں	اول	۱۴۰	(۲:۴)
وحدتِ انسانیت ـ قرآنی تعلیم کا منتہیٰ	اول	۲۳۹	(۲:۱۱-۱۲)
	سوم	۲۹۰	(۲:۲۱۳)
وحدت الوجود کا نظریہ	سوم	۴۳۴	(۲:۲۵۶)
	دوم	۲۷۹	(۲:۵۵)
وحی کی ضرورت	اول	۱۲	(۱:۱)
وحی، خدا سے براہِ راست ملنے والا علم ہے۔	اول	۲۳	(۱:۲)
	اول	۴۲	(۱:۵)
وحی سب کی سب قرآن کریم میں درج ہے۔ وحی خفی (غیر متلو، غیر مکتوب) کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے۔	اول	۱۴۰-۱۴۱	(۲:۴)
	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)
وحی کا ثبوت	اول	۳۰۸-۹	(۲:۲۳)
وحی کی راہنمائی کی ضرورت	دوم	۱۲۹	(۲:۳۷)
وحی کی دو قسمیں ـ یہودیوں کا عقیدہ (اور مسلمانوں کا بھی)	اول	۱۴۱	(۲:۴)
″	دوم	۱۸۶	(۲:۴۱)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
	سوم	۸۸	(۲:۱۴۲)
	سوم	۱۲۵	(۲:۱۵۹)
وحی کیسے نازل ہوتی تھی ہم جان نہیں سکتے	دوم	۳۸۷	(۲:۹۷)
وحی ہی کلام اللہ ہے	سوم	۴۲۷	(۲:۲۵۳)
وحی پر ایمان ـ خود رسول اللہ کو بھی لانا ہوتا تھا	سوم	۴۹۰	(۲:۲۸۵)
	سوم	۴۰	(۲:۱۲۴)
وراثت کا باطل نظریہ			
وراثت نسلی کا غلط عقیدہ	دوم	۴۶	باب اول
ورد۔ وظائف۔ تعویذ گنڈے۔ اسم اعظم	دوم	۷۵	(۲:۳۰)
سب یہودی تصورات ہیں		۴۱۹	(۲:۱۰۲)
	سوم	۱۱۲	(۲:۱۵۷)
وسعت کے مطابق ذمہ داری۔ ”لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا“ کا مفہوم	سوم	۴۹۲	(۲:۲۸۶)
وصیت کا حکم	سوم	۱۷۷	(۲:۱۸۰)
وضعی روایات اور قصۂ آدم	دوم	۱۴۲	(۲:۳۹)
وقودِ جہنم (جہنم کا ایندھن)	اول	۳۲۸	(۲:۲۴)
ویدانت اور وحدت الوجود کا نظریۂ کائنات	دوم	۸۷-۸۸	(۲:۳۱)
ولی کے معنی	سوم	۴۴۴	(۲:۲۵۷)
ھ			
ہاروت و ماروت کے افسانے (مودودی مرحوم کی تفسیر میں)	دوم	۴۰۰	(۲:۱۰۲)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
(حضرت) ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ	دوم	۲۶۵	(۲:۵۳)
دونوں کو کتاب دی گئی تھی			
ہبہ (اور وصیت)	سوم	۱۷۶	(۲:۱۸۰)
ہبوطِ آدم سے مراد	دوم	۱۲۵	(۲:۳۶)
ہجرت کا مفہوم اور اہمیت	سوم	۴۰	(۲:۱۲۴)
	سوم	۳۰۸	(۲:۲۱۸)
ہدایت کا مفہوم	اول	۴۱	(۱:۵)
(اشیائے کائنات کی) ہدایت	اول	۴۱	(۱:۵)
(رسول) ہدایت (صحیح راستہ) دکھاتا تھا	سوم	۲۶	(۲:۱۱۹)
اس راستے پر چلانا اسکے ذمہ نہیں تھا			
ہلاکت حرث ونسل بیکولر نظامِ حکومت	سوم	۲۵۷	(۲:۲۰۵)
کا نتیجہ			
ہیگل کی جدلیت	دوم	۱۵۲	(۲:۴۰)
ی			
یتامیٰ سے حسنِ سلوک (یتیم کا وسیع مفہوم)	دوم	۳۴۹	(۲:۸۳)
	سوم	۱۵۶	(۲:۱۷۷)
	سوم	۲۳۳	(۲:۲۲۰)

مضمون	جلد	صفحہ	آیت
یتامیٰ کی عزت نہ کرنے کا نتیجہ ذلت	سوم	۱۶۱	(۲:۱۷۷)
یتیموں کے متعلق احکامات۔ دونوں قسم	سوم	۳۳۲	(۲:۲۲۰)
کے یتیم یعنی وہ جن کے ماں باپ نہ ہوں			
اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں			
یہودی پکے منافق تھے	اول	۲۰۴	(۲:۸)
(کیا) یہودیوں کی حکومت قائم ہو	دوم	۱۶۸	(۲:۴۰)
سکتی ہے؟			
یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں کی حالت	دوم	۱۸۸-۹۵	(۲:۴۱)
	دوم	۲۲۰	(۲:۴۴)
یہودیوں میں ہمت و استقلال باقی نہیں رہا تھا	دوم	۲۲۲	(۲:۴۴)
یہودیوں کی قساوتِ قلبی	دوم	۳۳۰	(۲:۷۴)
یہودیوں کی ہوسِ زر	دوم	۳۳۲	(۲:۷۴)
یہودیوں کی پست ذہنیت۔	دوم	۴۲۹	(۲:۱۰۴)
آدابِ معاشرت تک سے عاری ہو چکے تھے			
یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ باطل پر ہیں	سوم	۷	(۲:۱۱۳)
الیسع یا یوشع	سوم	۴۱۸	(۲:۲۴۶)
یوم - یوم الدین	اول	۲۲-۲۹	(۱:۳)
" یومِ الست	اول	۲۹۳	(۲:۲۱)